

# سِذْكَرَةُ الْمَحْدِثِينَ

آسمانِ علم کے روشن ستاروں اور گلستانِ حدیث کے  
مہکتے گلابوں کا روح پرورد آویز  
اور ایمان افزو تحقیقی تذکرہ

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

تالیف: ضیاء الدین اصلاحی

تقریب: فضیلتہ ابنِ الجوزی، مشیر احمد ربانی حفظہ اللہ تعالیٰ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ  
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی اربنہ  
محدث لائبریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

### تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے  
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی  
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے  
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ [KitaboSunnat@gmail.com](mailto:KitaboSunnat@gmail.com)

🌐 [www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)





دارالابلاغ  
پبلشرز



کتاب و سنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ

جملہ حقوق اشاعت برائے دارالابلاغ محفوظ ہیں

## مذکرۃ الحجین

جلد اول

تالیف ..... ضیاء الدین اصلاحی  
 اقتاد ..... مولانا حفص  
 اشاعت اول ..... مئی 2014ء

پاکستان میں ہماری آہستہ آہستہ منزل کاروں سے مل سکتی ہیں

• لاہور - اہلارٹ (نیل روڈ) 35717842 گلبرگ 35717842 ماڈل ٹاؤن (35942233)  
 راولپنڈی - تعلیمات علیہ کی بی بی بازار 55351688 اراٹھرا سائبر 5216287 مکتبہ عائشہ 0321-5075075  
 اسلام آباد - انسداد اسلامک کس 2261356 اہلارٹ 2281420 دارالاسلام شوہم 5370378-0321  
 احمد نئی انڈینش 0321-8014008 4434615 کراچی - فضلی سٹریٹ 32212991 علمی سب خانہ 32628939  
 ر فیصل آباد - مکتبہ اسلامیہ بیرون امین چور بازار 631204 - مکتبہ امجدیہ امین چور بازار 0300-6628021  
 ر پشاور - مروج سب خانہ 214/20 - دارالینت اہلارٹ 051-4541148

جس کی قیمت فروشی طریقے درود بازار لاہور  
**دارالابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز**  
 0300-4453358, 042-37361428

شروری نویں اللہ تعالیٰ سے فضل و کرم اور سائنسی سادہ و عاقبت کے مطابق ہم نے اس کتاب کی کچھ ڈھنگ پر وہف ریڈنگ کے خاص طور پر عربی عبارات میں صحیح الفاظ میں پوری طرح احتیاط کیا ہے۔ لیکن پھر بھی بشری تقاضے کے تحت ان کو کئی غلطیوں کو توڑا اور کرم مطلق فرمائیں۔  
 آئندہ ایڈیشن میں اس کا ازاد کردیا جائے گا۔ ان شاء اللہ (ادارہ)



# تذکرہ الحدیث

آسمان علم کے روشن ستاروں اور گلستانِ حدیث کے  
مہکتے گلبرگوں کا زورچرور دلاویز  
اور ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

جلد اول

قال قال رسول الله ﷺ

ضياء الدين اصلاحي



پبلسشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز  
پاکستان

فون: 4453358 - 0300

دارالابلاغ

# اللہ

## اللہ العظیم



کے نام سے شروع کرتا ہوں  
جو بڑا ہی مہربان  
نہایت رحم کرنے والا ہے

## فہرست مضامین

### حصہ اول

- 27..... \* حرف تمنا: از: - محمد طاہر نقاش
- 27..... \* مقدمہ: از: - جناب مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی ناظم دارالمصنفین
- 36..... 1 امام مالک رحمۃ اللہ علیہ
- 84..... 2 امام ابو داؤد طیالسی رحمۃ اللہ علیہ
- 94..... 3 امام عبدالرزاق بن ہمام رحمۃ اللہ علیہ
- 99..... 4 امام اسد بن موسیٰ رحمۃ اللہ علیہ
- 102..... 5 امام عبید اللہ بن موسیٰ عیسیٰ رحمۃ اللہ علیہ
- 106..... 6 امام عبداللہ بن زبیر حمیدی رحمۃ اللہ علیہ
- 111..... 7 امام سعید بن منصور رحمۃ اللہ علیہ
- 115..... 8 امام محمد بن صباح دولابی رحمۃ اللہ علیہ
- 118..... 9 امام یحییٰ بن عبدالحمید حسانی رحمۃ اللہ علیہ
- 121..... 10 امام مسدد بن مسرہد رحمۃ اللہ علیہ
- 124..... 11 امام نعیم بن حماد خزاعی رحمۃ اللہ علیہ
- 127..... 12 امام عبداللہ بن محمد جعفی رحمۃ اللہ علیہ
- 130..... 13 امام ابوبکر بن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ
- 136..... 14 امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہ
- 149..... 15 امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ



- ۱۶ امام محمد بن یحییٰ عدنی رحمۃ اللہ علیہ..... 204
- ۱۷ امام عبد بن حمید رحمۃ اللہ علیہ..... 207
- ۱۸ امام اسحاق بن بہلول رحمۃ اللہ علیہ..... 210
- ۱۹ امام عبد اللہ دارمی رحمۃ اللہ علیہ..... 213
- ۲۰ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ..... 225
- ۲۱ امام ابو مسعود رازی رحمۃ اللہ علیہ..... 246
- ۲۲ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ..... 250
- ۲۳ امام ابن ماجہ رحمۃ اللہ علیہ..... 288
- ۲۴ امام ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ..... 305
- ۲۵ امام قتی بن مخلد رحمۃ اللہ علیہ..... 325
- ۲۶ امام ابو عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ..... 332
- ۲۷ امام حارث بن ابی اسامہ رحمۃ اللہ علیہ..... 359
- ۲۸ امام احمد بن ابی حاتم نمیل رحمۃ اللہ علیہ..... 364
- ۲۹ امام ابو بکر بزار رحمۃ اللہ علیہ..... 367
- ۳۰ امام ابو مسلم کشی رحمۃ اللہ علیہ..... 371
- ۳۱ امام محمد بن نصر مروزی رحمۃ اللہ علیہ..... 375
- ۳۲ امام ابو محمد بن جارود رحمۃ اللہ علیہ..... 381
- ۳۳ امام ابو عبد الرحمن نسائی رحمۃ اللہ علیہ..... 383
- ۳۴ امام ابو یعلیٰ موصلی رحمۃ اللہ علیہ..... 403
- ۳۵ امام ابن خزیمہ رحمۃ اللہ علیہ..... 406
- ۳۶ امام ابو عوانہ اسقرانی رحمۃ اللہ علیہ..... 417
- ۳۷ امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ..... 422

1

امام عبدالباقی بن قانع

- 446..... نام و نسب اور ولادت
- 446..... خاندان اور وطن... اساتذہ
- 447..... تلامذہ، رحلت و سفر
- 447..... حفظ و ثقاہت اور حدیث میں درجہ
- 448..... رجال... فقہ و قضا
- 448..... مذہب و مسلک... وفات
- 448..... تصنیفات... معجم الصحابہ
- 449..... ابن قانع پر بعض اعتراضات

2

امام سعید بن اسکن

- 451..... نام و نسب... ولادت اور وطن
- 451..... اساتذہ و شیوخ اور تلامذہ
- 451..... طلب علم کے لیے سفر
- 452..... حفظ و ثقاہت... حدیث میں درجہ
- 452..... امامت و شہرت
- 453..... وفات... تصنیفات
- 453..... مصنف، الصحیح المنتقی

3

## امام ابو بکر شافعی

- 454..... نام و نسب..... ❁
- 454..... ولادت و وطن..... ❁
- 454..... اساتذہ، تلامذہ..... ❁
- 455..... حصول علم کے لیے سفر..... ❁
- 455..... ضبط و ثقاہت..... ❁
- 455..... حدیث میں درجہ و مرتبہ..... ❁
- 455..... مذہب و مسلک..... ❁
- 455..... کارنامہ..... ❁
- 456..... وفات، پیشہ..... ❁
- 456..... تصنیفات... فوائد ابو بکر..... ❁

4

## امام ابن حبان

- 457..... نام و نسب... خاندان، وطن..... ❁
- 458..... ولادت... شیوخ و اساتذہ..... ❁
- 459..... تلامذہ اور طلب علم کے لیے سفر..... ❁
- 460..... حفظ و ثقاہت... حدیث میں بلند پایگی اور فقہ..... ❁
- 461..... دیگر علوم... جامعیت... فہم و فراست اور علم کا شوق و ذوق..... ❁
- 462..... منصبِ قضا... مقبولیت و شہرت... فقہی مسلک..... ❁
- 463..... جرح و تعدیل..... ❁
- 463..... فکر و خیال میں جدت..... ❁
- 464..... اخلاق و عادات..... ❁



- 465..... الجاد اور بد عقیدگی کا الزام اور اس کا جواب ❀
- 476..... وفات، تصنیفات ❀
- 478..... کتاب الجرح والتعديل ❀
- 479..... کتاب الثقات ❀
- 479..... کتاب الضعفاء ❀
- 480..... صحیح ابن حبان ❀
- 481..... مختصرات وزوائد ❀
- 482..... ایک شبہ کا جواب ❀

**5**

امام ابو بکر آجری

- 484..... نام و نسب... ولادت و وطن ❀
- 485..... اساتذہ و شیوخ اور تلامذہ ❀
- 485..... حفظ و ضبط اور حدیث میں درجہ ❀
- 485..... فقہ، تدوین و تقویٰ ❀
- 486..... فقہی مسلک ❀
- 486..... وفات ❀
- 486..... تصنیفات، کتاب الاربعین ❀

**6**

امام ابو القاسم طبرانی

- 488..... نام و نسب، ولادت و خاندان ❀
- 488..... وطن، اساتذہ ❀
- 489..... تلامذہ اور تحصیل علم کے لیے سفر ❀
- 490..... حفظ و ثقاہت ❀

- 491..... حدیث میں درجہ اور فقہی مذہب.....
- 491..... ابو بکر چغتایی سے ایک دلچسپ مناظرہ.....
- 493..... دینی غیرت و حمیت.....
- 494..... وفات و تصنیفات.....
- 496..... معاجم ثلاثہ... معجم کی تعریف... معجم کبیر... معجم اوسط.....
- 497..... معجم صغیر.....
- 502..... امام طبرانی پر بعض اعتراضات اور ان کا جواب.....

## 7

## امام ابو عمر و بن نجید

- 506..... نام و نسب، پیدائش و خاندان اور وطن.....
- 506..... اساتذہ و شیوخ.....
- 506..... تلامذہ، حدیث میں درجہ.....
- 507..... زہد و تصوف اور انفاق فی سبیل اللہ.....
- 507..... اخلاص.....
- 508..... حکیمانہ و صوفیانہ اقوال.....
- 510..... وفات... اولاد و احفاد... تصنیفات... جزء ابن نجید.....

## 8

## امام ابو بکر اسماعیل

- 512..... نام و نسب... پیدائش... خاندان اور وطن.....
- 512..... شوقِ علم اور طلبِ حدیث کے لیے سفر.....
- 513..... اساتذہ و شیوخ اور تلامذہ.....
- 514..... حفظ و ضبط... حدیث میں درجہ.....
- 515..... مسند درس... فقہ و اجتہاد... قرأت.....

- 515..... تدریس و اخلاق ❀
- 515..... دولت و ثروت ❀
- 516..... شہرت و مقبولیت ❀
- 516..... فقہی مسلک اور کلامی عقائد ❀
- 517..... وفات... اولاد... تصنیفات ❀
- 517..... مسند عمر، مسند کبیر، مستخرج، معجم ❀

## 9

## امام ابوالحسن دارقطنی

- 519..... نام و نسب... ولادت و وطن... اساتذہ ❀
- 520..... تلامذہ... طلب حدیث کے لیے سفر ❀
- 520..... حفظ و ذکاوت ❀
- 522..... ثقاہت، علل و اسماء الرجال ❀
- 524..... حدیث میں درجہ ❀
- 525..... نقد و خلافیات ❀
- 526..... فقہی مذہب... نحو... تفسیر... قرأت و تجوید... شعر و ادب ❀
- 527..... جامعیت اور فہم و دانش ❀
- 528..... ورع و تقویٰ اور شہرت و مقبولیت ❀
- 529..... لطائف و ظرائف ❀
- 530..... اخلاق و عادات... عقائد... وفات ❀
- 531..... امام دارقطنی پر بعض اعتراضات... شیعیت کا الزام ❀
- 533..... تدریس ❀
- 534..... خود ستائی ❀
- 535..... یانعی کا اعتراض ❀



- 536.....تصعب \*  
 541.....تصنیفات \*  
 545.....کتاب المؤلف والمختلف \*  
 545.....کتاب العلل \*  
 547.....کتاب الاستخیاء اور کتاب الالزامات والتتبع \*  
 553.....سنن دارقطنی... سنن کی اہمیت اور کتب حدیث میں اس کا درجہ \*  
 555.....خصوصیات \*  
 557.....سنن کے نسخے... سنن کے حواشی... تعلیقات اور زوائد \*  
 558.....سنن پر اعتراض \*

**10**  
 امام ابو سلیمان حمد خطابی

- 561.....نام و نسب... ولادت و وطن... نسبیں \*  
 562.....اساتذہ اور تلامذہ \*  
 562.....رحلت و سفر \*  
 562.....جامعیت... اعتراف کمالات \*  
 563.....حدیث میں درجہ \*  
 563.....فقہ... لغت و عربیت... شعر و سخن \*  
 565.....زہد و ارتقاء \*  
 565.....اہانت و مرجعیت اور مسلک \*  
 565.....اخلاق و عادات \*  
 565.....پیشہ اور انتقال \*  
 566.....تصنیفات... اعلاء السنن \*  
 567.....غریب الحدیث اور معالم السنن \*

## امام ابن جمیع

- 570..... نام و نسب... ولادت، خاندان و وطن
- 570..... رحلت و سفر اور اساتذہ
- 571..... تلامذہ، حفظ و ضبط اور حدیث میں درجہ و مرتبہ
- 571..... مدامت عمل اور ذوق عبادت
- 571..... وفات
- 571..... مسند یا معجم

## امام ابو عبد اللہ حاکم

- 573..... نام و نسب، ولادت اور خاندان و وطن
- 574..... اساتذہ
- 575..... تلامذہ شوق علم اور رحلت و سفر
- 576..... حدیث و روایت میں کمال و امتیاز
- 576..... حفظ و ثقاہت و کلامی مذہب
- 576..... تدین و تقویٰ
- 576..... سیاسی و اجتماعی مشاغل... مقبولیت و مرجعیت
- 578..... وفات
- 579..... تصنیفات
- 580..... کتاب العلل
- 580..... تخریج الصحیحین
- 581..... مزکی الاخبار، کتاب الاکلیل
- 581..... المدخل الی علم الحدیث

- 582..... تاریخ نیشاپور
- 583..... معرفة علوم الحديث
- 584..... المستدرک علی الصحیحین
- 585..... مستدرک کی تعریف اور مستدرک کی تالیف کی وجہ
- 586..... مستدرک کی اہمیت... مستدرک کی حدیثوں کی نوعیتیں
- 588..... تلاش و تفحص
- 589..... مستدرک کی خصوصیات
- 593..... طرز استدلال
- 595..... حزم و احتیاط
- 595..... احادیث کے متعلق وضاحتیں
- 596..... مستدرک کی تلخیصات
- 600..... صحیح مستدرک اور حاکم پر بعض اعتراضات کا جائزہ
- 600..... مستدرک اور صحیحین
- 606..... ضعیف و موضوع حدیثیں
- 608..... تساہل کا الزام
- 613..... حاکم کی تصحیح کا حکم
- 617..... رفض و تشیع کا الزام
- 628..... حدیث ”مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلَيْهِ مَوْلَاهُ“ کی بحث
- 632..... حدیث طبر کی وضعیت
- 638..... شافعیات میں نلو اور تعصب کا الزام

### 13

## امام ابوالقاسم تمام رازی

- 648..... نام و نسب، ولادت



- 648..... خاندان اور وطن ❁
- 648..... اساتذہ ❁
- 649..... تلامذہ ❁
- 649..... حفظ و ضبط ❁
- 649..... ثقاہت ❁
- 649..... علل و اساء الرجال میں مہارت ❁
- 649..... حدیث میں درجہ ❁
- 649..... وفات، تصنیفات، فوائد ❁

14

امام ابو بکر بن مردویہ الکبیر اصہبانی

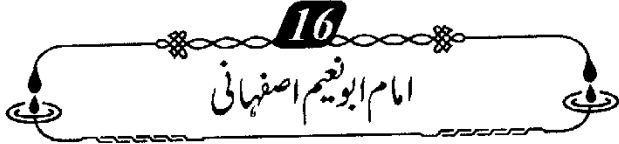
- 650..... نام و نسب، ولادت و وطن ❁
- 650..... اساتذہ، تلامذہ ❁
- 651..... سفر اور حدیث میں درجہ ❁
- 651..... وفات ❁
- 651..... تصنیفات ❁
- 651..... المستخرج علی جامع الصحیح للبخاری ❁
- 651..... تفسیر ابن مردویہ ❁
- 651..... تاریخ اصہبان ❁

15

امام ابو بکر احمد بن محمد برقانی خوارزمی

- 652..... نام و نسب، ولادت و وطن ❁
- 652..... اساتذہ، تلامذہ ❁

- 653..... رحلت و سماع... حدیث کی ابتدا
- 653..... حفظ و ثقاہت
- 653..... فن حدیث میں امتیاز اور اس سے غیر معمولی اشتغال
- 654..... تفسیر و قرآنیات
- 654..... فقہ اور نحو و عربیت
- 654..... شعر و سخن اور ورع و تقویٰ
- 655..... وفات
- 655..... تصنیفات: مسند خوارزمی



- 656..... نام و نسب... ولادت اور خاندان... اساتذہ
- 657..... تلامذہ
- 658..... رحلت و سفر اور حفظ و ضبط اور ثقاہت
- 658..... حدیث میں درجہ و مرتبہ
- 659..... فقہ و تصوف میں اور عقیدہ
- 659..... شہرت و مقبولیت اور مجلس درس کی وسعت
- 660..... ابو نعیم کے خلاف شورش و بیجان
- 661..... وفات... تصنیفات
- 662..... کتاب تاریخ اصفہان... دلائل النبوة
- 663..... حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیاء
- 664..... زوائد مختصرات
- 665..... ابو نعیم پر بعض اعتراضات

## 17

### امام ابو محمد حسن خلال

- 667..... نام و نسب
- 667..... ولادت اور وطن
- 667..... اساتذہ و تلامذہ
- 667..... حفظ و ثقاہت
- 667..... وفات
- 667..... تصنیفات
- 667..... مسند

## 18

### امام ابو عبد اللہ قضاعی

- 669..... نام و نسب
- 669..... وطن و خاندان
- 669..... اساتذہ و شیوخ اور تلامذہ
- 669..... رحلت و سفر
- 670..... حدیث، فقہ
- 670..... تاریخ و تراجم
- 670..... فضل و کمال اور عہدہ قضا
- 670..... امامت و مقبولیت
- 670..... مسلک، وفات
- 671..... تصنیفات: شہاب الاخبار... شروح و مختصرات

☆.....☆.....☆

## ﴿انتساب﴾

﴿دین اسلام کے ہر داعی و مبلغ﴾  
کے نام

- کہ جو اشاعت دین میں سرگرم عمل ہے
- محدثین سے محبت کرتا ہے
- طلب علم حدیث کے لیے سرگرم، سرگرداں اور کوشاں ہے
- دنیا میں ہر سو علم حدیث کے فروغ کی خواہش رکھتا ہے
- اور حدیث رسول، فرمان رسول اور حکم رسول کا بول بالا اس کی زندگی کا محور و مرکز اور مقصد ہے۔

مالک کائنات سے دعا ہے کہ

- قال اللہ اور قال الرسول کے دلنواز ترانوں میں اس کی صحسیں اور  
شامیں گزریں۔ آمین یا رب العالمین

## خطبہ مسنونہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلَّهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ، وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَتَعُوذُ بِاللَّهِ مِنْ  
شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللَّهُ فَلَا مُضِلَّ لَهُ،  
وَمَنْ يَضِلَّ فَلَا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ  
لَا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ  
أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللَّهِ وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ  
وَسَرُّ الْأُمُورِ مُحَدَّثَاتُهَا وَكُلُّ بَدْعَةٍ ضَالَّةٌ وَكُلُّ ضَالَّةٍ فِي النَّارِ  
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا  
وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ○ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ  
مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا  
كَثِيرًا وَنِسَاءً ○ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ  
إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ  
وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ○ يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ  
ذُنُوبَكُمْ ○ وَمَنْ يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا ○

① ((مسئلہ الجمعۃ باب تخفیف العلوۃ والحضۃ حدیث ۸۶۸، ۸۶۷، والسائی ۳۱۷۸))

② ((رواد الاربعۃ واحمد والدارمی وری العوی فی شرح السنۃ مشکوٰۃ مع تعلیقات الابی السکاح باب اعلام  
السکاح... وقال الابیانی حدیث صحیح...))

تعلیقات:

﴿ صحیح مسلم سنن نسائی اور مسند احمد میں ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی حدیث میں خطبہ آغاز ((ان الحمد لله)) سے ہے لہذا  
((الحمد لله)) کی بجائے ((ان الحمد لله)) کہنا چاہیے۔

﴿ یہاں ((ومن به وبتوکل علیہ)) کے الفاظ صحیح احادیث میں موجود نہیں ہیں۔

﴿ یہ خطبہ نکاح بے عا اور عام وعظ وارشاد اور درس و تدریس کے موقع پر پڑھا جاتا ہے۔ اسی خطبہ کا جت کہتے ہیں اسے پڑھ کر آدنی اپنی  
عاجت و ضرورت بیان کر سکتے۔

”بلاشبہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ ہم اسی کی تعریف کرتے، اسی سے مدد مانگتے اور اسی سے بخشش طلب کرتے ہیں۔ اپنے نفس کی شرارتوں اور اپنے برے اعمال سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جسے اللہ راہ دکھائے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ دھتکار دے اسے کوئی راہ راست پر نہیں لاسکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے، وہ اکیلا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔“

”حمد و صلوة کے بعد! یقیناً تمام باتوں سے بہتر بات اللہ کی کتاب اور تمام طریقوں سے بہتر طریقہ محمد ﷺ کا ہے اور تمام امور میں سے برے کام (دین میں) خود ساختہ (بدعت والے) کام ہیں، ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے۔“

”اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں اس حال میں موت آئے کہ تم مسلمان ہو۔ لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، (پھر) اس سے اس کی بیوی کو بنایا اور (پھر) ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں اور انہیں (زمین پر) پھیلا دیا۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔ جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قطع رحمی سے (بچو)۔ یقیناً اللہ تم پر نگران ہے۔ اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو اور سیدھی (سچی اور کھری) بات کہو۔ اللہ تمہارے اعمال سنوار دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی، یقیناً اس نے عظیم کامیابی حاصل کر لی۔“



## ○ حرف تنہا ○

### ہیروں و جواہرات کی دریافت

قارئین محترم! محدثین کرام کی حیات مبارکہ اور ان کے علمی کارناموں پر لکھی گئی ایک محقق کی کتاب ”تذکرۃ المحدثین“ کو ذرا لاجبلاغ کی ٹیم نے مولانا اشرف جاوید صاحب آف فیصل آباد کی معاونت سے تحقیق کے بعد مکمل کیا تھا۔ میں جب میں اسے شائع کر کے منظر عام پر لانے کے لیے تحقیقی نظروں سے دیکھتا، اور جائزہ لیتا تو مجھے اس میں بڑی حد تک تشنگی محسوس ہوتی۔ میں نے اس میں حک و اضافہ کے لیے مولانا اسلم گھلوی اور قاری ذکاء اللہ صاحب آف لاجپت روڈ شاہدرہ لاہور کی خدمات حاصل کرنے کے لیے ان سے رابطہ کیا..... لیکن وہ اپنی گونا گوں مصروفیات کی بنا پر اسے مکمل نہ کر سکے۔ تحقیق و ریسرچ کا کام ابھی جاری تھا کہ مجھے علم ہوا کہ اس موضوع پر محقق دوران مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے بہت عمدہ تحقیقی کام کیا ہے۔ میں اس کی جستجو اور تلاش میں لگ گیا۔

اس تحقیقی کام کو حاصل کرنے کے لیے میں نے بیرون ممالک رابطے کیے۔ جدہ اور ریاض سعودی عرب میں بھی احباب سے اسے حاصل کرنے کے لیے رابطے کیے لیکن ناکامی ہوئی۔ آخر اپنے دو جانے والوں کی ڈیوٹی لگائی جو پندرہ دن کے ٹور پر بیرون ملک جا رہے تھے۔ انہوں نے کافی بھاگ دوڑ اور محنت شاقہ سے تلاش بسیار کے بعد محدثین کی حیات مبارکہ اور ان کی علم حدیث کے لیے خدمات اور عظیم کارناموں پر مشتمل یہ کام مرتب شدہ شکل میں حاصل کر لیا۔ فللہ الحمد۔ میں اسے دیکھ کر اس قدر مسرور و مسخور ہوا کہ مت پوچھئے۔ اس سے پہلے آج تک میں نے ہیروں اور جواہرات کو اس قدر نفاست اور قرینے سے ایک تاج میں جڑے ہوئے جگمگاتے نہ دیکھا تھا۔ میں اسے ترتیب و تہذیب نو کے بعد طباعت کے مراحل سے گزار کر اب آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے اس عظیم تصنیف کی پیشکش پر آپ خوشی سے پھولے نہ سائیں گے۔ اللہ کریم ہمیں ان رجال عظیم کی سیرت کی ضیا پاشیوں سے اپنی زندگیوں کو منور کرنے کی توفیق بخشنے، آمین۔

محمدین کے حالات زندگی اور ان کی پاکیزہ و مثالی سیرت و کردار اور روشن عظیم کارناموں اور تاش علم کی جستجو پر مبنی داستانوں پر مشتمل یہ برصغیر کی مفصل و جامع کتاب ہے۔ اب تک اس موضوع پر شائع ہونے والی اور لکھی جانے والی کتب میں اسے ایک بلند مقام حاصل ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ کتاب مستند مین و متاخرین محدثین کرام کی سیرت کے مہکتے علمی گوشے اور ان کی حیات مبارکہ کی تفصیلات بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ خاص طور پر اس کا تیسرا حصہ پاک و ہند کے محدثین ان کی خدمات، کارناموں اور دعوتی و علمی سرگرمیوں کی تفصیلات پر مبنی ہے، اس سے قبل یہ مفید علمی معلومات ہم تک نہ پہنچ سکی تھیں۔ اس کا مقدمہ برصغیر کے مشہور اسکالر جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے اور اس موضوع کی افادیت کو اجاگر کیا ہے۔

اس کتاب کے تین حصے ہیں:

- ① حصہ اول: ..... اس میں دوسری صدی کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات زندگی، سوانح اور ان کی خدمات حدیث کی ایمان افروز اور روح پرور تفصیل بیان کی گئی ہے۔
- ② حصہ دوم: ..... اس میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات و سوانح اور ان کی علمی و حدیثی خدمات کی دلائل و پرور تفصیل بیان کی گئی ہے۔
- ③ حصہ سوم: ..... اس میں چھٹی صدی ہجری سے خانوادہ شیخ عبدالحق دہلوی تک کے ممتاز اور صاحب تصانیف ہندوستانی محدثین کرام کے حالات و سوانح اور ان کی علمی و حدیثی اور محدثانہ خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے مجاہد اور صوفی دو متضاد شخصیات ہیں یعنی مجاہد کبھی صوفی نہیں ہو سکتا اور صوفی کبھی مجاہد نہیں بن سکتا۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محدث کبھی صوفی نہیں ہو سکتا اور صوفی کبھی محدث نہیں بن سکتا۔ لیکن اس کتاب میں تذکرۃ الحمدین کی تیسری جلد چونکہ ہندوستانی محدثین پر مرتب کی گئی ہے۔ اس لیے اس میں اس خطے کے خاص مزاج کے مطابق ایسے علماء کا تذکرہ بھی کیا گیا جو تصوف کی طرف مائل تھے۔ یوں ان کی زندگی کی



تصویر کو مکمل طور پر قارئین کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ ایسا نہیں کہ ان کی زندگی کے ایک گوشہ کو زیر بحث نہ لاکر قارئین کو کسی بھی پہلو سے لاعلم رکھا گیا ہو۔ البتہ مرتب کرنے والے حضرات چونکہ حنفی المسلمک ہیں اس لیے کہیں کہیں وہ اس کی نشاندہی ہو جاتی ہے، وہ اپنا جھکاؤ اسی کی طرف رکھتے ہوئے اس مسلک کا دفاع کرتے ہیں اور اس مسلک کے مؤقف کو فوقیت دیتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر کتاب کے حصہ سوم میں شیخ علی متقی اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے ابواب میں ایسی جھلک ہمیں نظر آتی ہے۔

یہ کتاب ہر اسلامی لائبریری، ہر مدرسہ و تعلیمی ادارہ کی اولین اور بنیادی ضرورت ثابت ہوگی۔ حدیث رسول مقبول اور علم حدیث سے شغف و دلچسپی رکھنے والے متلاشیان علم کے لیے یہ ایک گرانقدر تحفہ اور بیارہ نور ثابت ہوگی۔ اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ کتاب کی تیاری میں کام کرنے والے تمام حضرات کو دنیا اور آخرت میں دونوں جگہ اعلیٰ و ارفع درجات عطا فرمائے اور اپنے آخری رسول کی شفاعت کا مستحق بنائے۔ آمین

خاص طور پر اس کے مصنف و مرتب جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور ان کے معاون و محرک علماء کی ٹیم کو اللہ کریم اپنی رضا کا سرٹیفکیٹ عطا کر کے ان کی اس کاوش کو قبولیت کا درجہ بخش کر ان کے لیے توشیحہ آخرت بنائے۔ آمین یا رب العالمین

اب آپ آسمان علم کے ان ماہتابوں، آفتابوں، روشن ستاروں ..... اور گلستان حدیث کے مسکتے گلابوں کا روح پرور ایمان افروز تحقیقی تذکرہ پڑھیں اور ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں کہ ہم حدیث پر مزید نشر و اشاعت کا کام کر سکیں۔ یوں اپنے اور آپ کے دامن کو سعادتوں و کامیابیوں کے چمکتے دسکتے موتیوں سے بھر سکیں۔ ان شاء اللہ

خادم کتاب سنڈٹ

مہرِ نوافل شہر

۲۲ فروری ۲۰۲۱ء، لاہور



## گلستان حدیث کے مہکتے گلاب

کیا ہی شاندار اور قابل رشک زندگیاں تھیں ان جلیل القدر اور قسمت کے ذہنی انسانوں کی!..... کہ جنہوں نے اپنی زندگی کا محور و مرکز حدیث رسول مقبول ﷺ کو بنائے رکھا۔ ان کی صحیحیں اور شاہیں قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ کی دنوا صدائوں میں بسر ہوتیں۔ رسول اللہ سے عملی محبت کا ثبوت یہ ہوتا کہ ان کو آپ کے فرامین بمعہ سند سینکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں حفظ ہوتے۔ دنیا ان کے حافظے سے انگشت بدنداں تھی، وہ حدیث رسول کی تلاش و جستجو میں قریہ قریہ بستی بستی چلے پھرتے، جہاں سے حدیث رسول اور فرمان رسول، حکم رسول ملتا تحقیق تفتیش کے بعد اسے محفوظ کر لیتے اور امت محمدیہ تک آپ کے فرامین پہنچانے کا بندوبست کرتے۔ یوں جستجوئے حدیث میں ان کی زندگیاں گزر جاتیں اور وہ امت محمد کے ہاتھوں میں فرامین رسول کا گرانقدر مجموعہ دے کر اگلے جہان جا پہنچتے۔ ان کی زندگیوں کا لمحہ لمحہ اس شعر کا مصداق ہوتا:

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم    إلا حدیث یار را تکرار می کنیم  
گلشن حدیث کے ان مہکتے گلابوں کی خوشبو سے امت محمدیہ کے ہر ہر فرد کی سانسیں مہکی ہوئی ہیں۔ ان رجال عظیم کی زندگیاں کیسے اور کن عظیم کاموں میں گزاریں۔ انہوں نے آقائے دو جہاں سے عملی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے خدمت حدیث کے لیے کیسے کیسے کارہائے نماں انجام دیے۔ محدثین کرام کی زندگیوں کے روشن نگر پردہ اخفا میں سنہرے گوشوں کو آشکار کرنے اور آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، آج ہی اس کا مطالعہ کریں۔ تاکہ حدیث رسول ﷺ فرمان رسول اور حکم رسول کی اہمیت، فضیلت اور محبت آپ کے دل و دماغ میں راسخ ہو، آپ اپنی نسل کو بھی اس روشن شاہراہ حیات پر چلانے کی منصوبہ بندی کر کے اپنی آخرت کی یقینی کامیابی کا سامان کر سکیں۔

فوائد کتاب سنّت

مطالعات شہر

۲۲ فروری ۲۰۱۴ء لاہور

نَضَرَ اللهُ أَمْرًا سَمِعَ مِنَّا حَدِيثًا قَبْلَهُ (حدیث)

## تذکرۃ المحدثین

### حصہ اول

اس میں دوسری صدی کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے  
اوائل کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات  
زندگی، سوانح اور ان کی خدمات حدیث کی روح پرور تفصیل  
بیان کی گئی ہے۔



## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### مقدمہ

کلام مجید اگرچہ ایک واضح اور کھلی ہوئی کتاب ہے، اس میں کوئی غموض و خفا نہیں ہے لیکن اس میں اس کی تعلیمات کی پوری تفصیل اور تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے بہت سے احکام مجمل یا کلیات کی شکل میں ہیں جن کی وضاحت و تشریح اور کلیات سے جزئیات کی تفریع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے فرمائی، آپ کا کام محض کلام الہی کو لوگوں تک پہنچا دینا نہیں تھا، بلکہ اس کی تبیین و تشریح بھی تھی۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ  
لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ  
يَتَفَكَّرُونَ. (نحل: ۶)

اور ہم نے تمہاری طرف نصیحت (قرآن  
مجید) اتاری تاکہ لوگوں کے لیے جو  
اتارا گیا ہے اس کو ان سے کھول کر بیان  
کر و شاید وہ اس پر غور و فکر کریں۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ  
إِلَّا تَبَيِّنَ لَهُمُ السَّبِيحَ اِخْتَلَفُوا  
فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ  
يُؤْمِنُونَ. (نحل: ۸)

اور ہم نے تم پر اس لیے کتاب اتاری  
ہے تاکہ تم ان کے لیے ان چیزوں کی  
وضاحت کرو جس میں انھوں نے  
اختلاف کیا اور اس کو ان لوگوں کے  
لیے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت  
و رحمت بنا کر اتارا۔

یہ تبیین و تشریح آپ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اس فہم یا ملکہ نبوت کی رہنمائی سے کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپ میں ودیعت کیا تھا۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ  
اور ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ  
لِتُخَكِّمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا آرَأَكَ  
کتاب اتاری تاکہ تم لوگوں کے  
اللَّهُ: (نساء: ۱۶)  
درمیان جس طرح تم کو خدا نے سمجھایا  
ہے اس طرح فیصلہ کرو۔

اس ”اراءت“ سے مراد فہم نبوت ہے، اس آیت میں اگرچہ صرف فیصلہ کا ذکر ہے لیکن اس میں آپ کے تمام احکام داخل ہیں، اس لیے کہ آپ جو تعلیم اور جو حکم دیں گے وہ ایک طرح کا فیصلہ ہی ہوگا۔

آپ جو کچھ بھی کہتے تھے، یا جو حکم بھی دیتے تھے، وہ درحقیقت ایک قسم کی وحی ہوتی تھی جس کو اصطلاح میں وحی خفی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ  
رسول اپنی خواہش سے کچھ بھی نہیں  
إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ. (نجم: ۱)  
کہتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی  
جاتی ہے۔

اس لیے آپ کے تمام احکام واجب التعمیل ہیں، اس فہم نبوت اور وحی سے مستنبط احکام کو قرآن مجید نے حکمت سے تعبیر کیا ہے۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ  
اور تم پر کتاب و حکمت اتاری اور تم کو وہ  
وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمْنَا مِمَّا تَكُونُ  
چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے اور یہ تم  
تَعَلَّمُوا وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ  
پر خدا کا بڑا فضل تھا۔  
عَظِيمًا. (نساء: ۱۷)

مسلمانوں پر خدا نے یہ احسان جتایا ہے:

اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم پر کتاب و حکمت اتاری جس کے ذریعہ وہ تم کو نصیحت کرتا ہے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ  
وَمَا أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ  
وَالْحِكْمَةَ يَعِظُكُمْ بِهِ.

(بقرہ: ۲۹۰)

دوسری آیت میں ہے:

وہی اللہ ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور اس سے پہلے وہ گمراہی میں مبتلا تھے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ  
رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ  
وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ  
وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ  
لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ.

(سورہ جمعہ: ۱)

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ صرف آیات قرآنی کی تلاوت و تبلیغ نہیں بلکہ مسلمانوں کی تعلیم و تزکیہ بھی تھا اور آپ ان کو کتاب اللہ کے ساتھ حکمت کی تعلیم بھی دیتے تھے، یہ حکمت اگرچہ قرآن مجید اور وحی خفی سے ماخوذ ہے مگر اس سے الگ چیز ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال ہیں، اس لیے کتاب کے ساتھ وہ بھی مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں، آپ کی ذات اور آپ کا ہر قول و فعل مسلمانوں کے لیے نمونہ عمل تھا۔

لوگو! تمہارے لیے رسول کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ  
أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (احزاب: ۳)

اسی لیے قرآن مجید میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول کی اطاعت کی بھی تاکید ہے اور بہت سی آیات میں اطیعوا اللہ کے ساتھ ساتھ اطیعوا الرسول کا بھی

علم ہے۔

وَاطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ  
تُرْحَمُونَ۔

اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم  
پر رحم کیا جائے۔

(آل عمران: ۱۳)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ  
وَاطِيعُوا الرَّسُولَ۔ (محمد: ۴)

مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول  
کی اطاعت کرو۔

وَاطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا  
الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِن  
تَوَلَّيْتُمْ فَأَعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَيَّ  
رَسُولُنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ۔

اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی  
اطاعت کرو اور ڈرو، پھر اگر تم روگردانی  
کرو گے تو جان لو کہ ہمارے رسول  
کے ذمہ صرف پوری تبلیغ ہے، (یعنی اس

(مائدہ: ۱۴)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ  
وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنهُ وَأَنْتُمْ  
تَسْمَعُونَ۔ (انفال: ۳)

اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی  
اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو،  
حالانکہ تم سنتے ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ اطاعت نام ہے کسی حکم کی تعمیل یا کسی عمل کی تقلید کا، یعنی رسول اللہ  
صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دیں اس کی تعمیل اور جس چیز پر عمل کریں اس پر عمل کیا جائے، اسی  
کا نام حدیث و سنت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت رسول کے اتباع پر موقوف ہے اور اس کا صلہ بندوں سے اللہ کی

محبت اور مغفرت ہے۔

قُلْ إِن كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ  
فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت  
رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے



وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. (آل عمران: ۴)

محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور اللہ بخشنے والا

مہربان ہے۔

رسول کی اطاعت عین خدا کی اطاعت اور رسول کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من أطاعني فقد أطاع الله  
ومن عصاني فقد عصى الله. (۱)

جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی

اطاعت کے ان احکام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ تمام اقوال و افعال داخل ہیں جو آپ نے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ارشاد فرمائے یا ان پر عمل کیا، اس لیے کتاب اللہ کے بعد ان کی حیثیت بھی قانون کی ہے اور وہ مسلمانوں کے لیے کتاب اللہ ہی کی طرح واجب العمل ہیں، کلام مجید میں ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونُوا لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا.

اور کسی مسلمان مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ان کے کسی معاملہ میں فیصلہ کر دے تو اس میں اس کو چون و چرا کا اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں ہے۔ (احزاب: ۵)

”امر“ میں آپ کے تمام احکام داخل ہیں جس کی وضاحت احادیث سے ہوتی

ہے، مسلم میں ہے:

(۱) مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعة الامیر فی غیر المعصیۃ و تحريمها فی المعصیۃ۔

مانہیتکم عنہ فاجتنبوہ میں جس چیز سے تم کو منع کر دوں اس  
وما امرتکم بہ فافعلوہ۔ (۱) سے رک جاؤ اور جس چیز کا حکم دوں  
اس کو اختیار کرو۔

ایک دوسری حدیث میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ہے:

”وہ زمانہ قریب ہے کہ کسی آدمی سے جب وہ اپنے پر تکلف تحت پر  
تکلیف لگائے بیٹھا ہوگا، میری کوئی حدیث بیان کی جائے گی تو وہ کہے گا کہ  
ہمارے درمیان اللہ عزوجل کی کتاب موجود ہے، ہم اس میں جو چیز حلال  
پائیں گے اس کو حلال سمجھیں گے اور جو چیز حرام پائیں گے اس کو حرام سمجھیں  
گے، ایسے لوگوں کو آگاہ ہونا چاہیے کہ جس کو اللہ کے رسول نے حرام کیا ہے وہ  
بھی خدا کی حرام کی ہوئی چیز کی طرح حرام ہے۔“ (سنن ابن ماجہ ص ۳)

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے اقوال و اعمال  
مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں، اور جس طرح قرآن مجید کے اوامر و نواہی کا ماننا ان  
کے لئے ضروری ہے اسی طرح رسول کے اوامر و نواہی کا بھی، اسی کا نام حدیث و سنت  
ہے، قول رسول کا نام حدیث ہے اور عمل متواتر کا سنت اور کلام مجید کے بعد اسی حدیث و سنت  
کا درجہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ  
وسنتی“ میں نے تمہارے لیے دو بھاری چیزیں چھوڑی ہیں کتاب اللہ اور اپنی سنت، بلکہ  
اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت پر بھی عمل کا حکم دیا ہے، ”علیکم بسنتی  
وسنة الخلفاء الراشدين“ جن کی زندگی اتباع سنت کا نمونہ تھی۔

درحقیقت اسلام کی پوری عمارت قرآن مجید اور احادیث نبوی پر قائم ہے، وہ

(۱) مسلم ج ۲ کتاب الفصائل باب توقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

کلام مجید کی تفسیر بھی ہے، اُس کے اجمال کی تفصیل بھی، اس کے کلی احکام سے جزئیات کی تفریح بھی اور اسلام کے قرن اول کی تاریخ بھی، اس کے بغیر اسلام کی تعلیم اور اس کی ابتدائی تاریخ کے بہت سے اوراق سادہ رہ جاتے ہیں، اسلام کے ارکان اربعہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی احکام بھی نہیں معلوم ہو سکتے ہیں اور نہ اس کو حدیث کی مدد کے بغیر ادا کیا جاسکتا ہے، ان کے صرف کلی احکام قرآن مجید میں ہیں، اس کی تفصیل حدیث و سنت سے معلوم ہوتی ہے، یہی حال اکثر اوامر و نواہی اور حلال و حرام کا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، اسلام کا ظہور، اس کی تبلیغ، اس کی راہ کی صعوبتیں، غزوات، اسلام کا غلبہ و اقتدار، حکومت الہیہ کا قیام، اس کا نظام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کی سیرت معلوم کرنے کا ذریعہ صرف حدیث ہے، اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو اسلام کی بہت سی تعلیمات اور تاریخ اسلام کے بہت سے گوشے مخفی رہ جائیں گے اس لیے احادیث نبویؐ اسلام اور اسلامی تاریخ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں اور اس پر ان کی عمارت قائم ہے، اس لیے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی روایت و اشاعت کا حکم دیا ہے اور مبلغ حدیث کے لیے دعا فرمائی ہے:

|                                 |                                           |
|---------------------------------|-------------------------------------------|
| نصر اللہ امرأ سمع منا حدیثاً    | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ |
| فحفظه حتى يبلغه فرب             | خدا اس شخص کو سب سے شاداب رکھے            |
| حامل فقه الی من هو افقه منه     | جس نے ہم سے ایک حدیث سنی، اس              |
| ورب حامل فقه لیس بفقیه۔         | کو محفوظ رکھا اور اس کو دوسروں تک         |
| (ابوداؤد ج ۲ کتاب العلم باب فضل | پہنچایا، کیوں کہ بسا اوقات علم کا حامل    |
| نشر العلم)                      | اس کو ایسے شخص تک پہنچاتا ہے جو اس        |
|                                 | سے زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے اور وہ خود      |
|                                 | سمجھ دار نہیں ہوتا۔                       |

آپ نے حدیثوں کی کتابت کا بھی حکم دیا ہے، بعض لوگوں کے لیے حدیثیں

لکھوائی ہیں، ”حدثوا عنی ولا حرج“۔ ”اكتبوا لابی شاہ“ حجۃ الوداع میں آپ نے جو خطبہ دیا تھا جو اسلام کے بہت سے اساسی احکام پر مشتمل ہے، اس کو دوسروں تک پہنچانے کا عام حکم دیا تھا، چنانچہ حدیث کی اُن تمام کتابوں میں جن میں اس خطبہ کا ذکر ہے آپ کا ارشاد ”فلیبلغ الشاهد الغائب“ (۱) بھی ہے، یعنی جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ اُن لوگوں تک اُن احکام کو پہنچادیں جو موجود نہیں ہیں، اسی کا نام روایت حدیث ہے۔

اس لیے عہد رسالت سے لے کر بعد کے ہر دور میں حدیث نبویؐ کی نقل و روایت کا سلسلہ جاری رہا، یہ حدیثیں پوری دنیائے اسلام میں بکھری ہوئی تھیں، محدثین کرام کا یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب کہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں اور سفر ہم معنی سفر سمجھا جاتا تھا اور نہ نشر و اشاعت کے موجودہ سامان تھے، ہم بھی محدو تھی، دنیائے اسلام کا چپہ چپہ چھان کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال یعنی حدیث و سنت کو تحقیق و صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع و مرتب کیا، ان کے رد و قبول اور صحت و سقم کے جانچنے اور رواۃ کی جرح و تعدیل کے اصول بنائے، اصول حدیث کا مستقل فن ایجاد کیا، ہزاروں راویان حدیث کے حالات نہایت صحت و تحقیق کے ساتھ قلمبند کیے جو مسلمانوں کا بڑا قابل فخر کارنامہ ہے۔

اس لیے صاحب تصنیف محدثین کے حالات میں ایک کتاب کی تالیف عرصہ سے دارالمصنفین کے پیش نظر تھی، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالمصنفین کے قیام سے بھی پہلے امام بخاری اور امام مالک کے حالات الندوہ میں لکھ چکے تھے، امام مالک کے حالات بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیے، مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم نے امام مسلم کے حالات اور راقم نے امام ترمذی کے حالات لکھے تھے، سید صاحب کی خواہش تھی کہ اس سلسلہ کو مکمل کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے، مگر اس وقت یہ کام نہ ہوسکا، اب اس (۱) اس قسم کے اور بھی ارشادات حدیث کی کتابوں میں ہیں، ہم نے صرف مثلاً چند نقل کیے ہیں۔

زمانہ میں جب کہ موجودہ دور کے مجتہدین حدیث سے آزادی کے لیے اس کے پورے ذخیرہ کو مشکوک اور ناقابل اعتبار قرار دینے کی مہم میں لگے ہوئے ہیں، محدثین کرام کے حالات کو شائع کرنے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوئی تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انہوں نے کس جانناہ محنت سے اور کتنی تحقیق و احتیاط کے ساتھ حدیثوں کو جمع و مرتب کیا اور یہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ تحقیق و صحت کے مادی و عقلی معیار کے اعتبار سے بھی دنیا کا کوئی علمی ذخیرہ حدیث کی کتابوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

یہ کتاب دو جلدوں میں ہوگی، پہلی جلد میں امام مالکؒ سے لے کر امام طحاویؒ تک، یعنی دوسری صدی ہجری سے لے کر چوتھی صدی کے شروع تک (جو تودین حدیث کا سب سے اہم دور ہے) کے محدثین اور ان کی تصانیف کے حالات ہیں، دوسری جلد میں اس کے بعد کے محدثین کے حالات ہوں گے۔

اس حصہ میں امام بخاریؒ کے حالات سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قلم کے ہیں، امام مالکؒ کے حالات حیات امام مالکؒ کی تلخیص ہے، امام مسلمؒ کے حالات مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم کے اور امام ترمذی کے راقم کے تحریر کردہ ہیں، باقی محدثین کے حالات مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی نے لکھے ہیں، اس طرح یہ کتاب صاحب تصنیف محدثین کرام کا تذکرہ بھی ہے، تودین حدیث کی تاریخ بھی اور حدیث کی موجودہ کتابوں پر نقد و تبصرہ بھی، اللہ تعالیٰ اس کو نافع بنائے۔

معین الدین احمد ندوی

دارالمصنفین اعظم گڑھ

۱۵ مارچ ۱۹۶۸ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## امام مالکؒ

(التونی ۱۷۹ھ/۷۹۵ء)

نام و نسب و ولادت: مالک نام، ابو عبد اللہ کنیت، امام دارالہجرۃ لقب تھا، سلسلہ نسب یہ ہے: مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن حارث بن عمر بن حارث بن غیمان بن حیثیل بن عمرو بن حارث ذی اصبح۔ (۱)

امام مالکؒ خالص عرب خاندان سے تھے جو جاہلیت اور اسلام دونوں میں معزز تھا، بزرگوں کا وطن یمن تھا مگر اسلام کے بعد مدینہ النبی میں سکونت اختیار کر لی تھی، نسباً یمن کے آخری خاندان شاہی یعنی حمیر کی شاخ ”اصبح“ سے تعلق رکھتے تھے امام کے مورث اعلیٰ حارث اس خاندان کے شیخ تھے اسی لئے ذی اصبح کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ کے خاندان میں سب سے پہلے آپ کے پردادا ابو عامر عہد نبویؐ میں مشرف بہ اسلام ہوئے، امام مالکؒ کے دادا مالک بن ابی عامر جلیل القدر تابعی اور صحاح کے رواۃ میں داخل ہیں، حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کو یک گونہ اختصاص تھا، چنانچہ جن سر بکف جوان مردوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان کی لاش کو دشمنوں کے زرعہ سے اٹھا کر دفن کرنے کی خطرناک خدمت انجام دی تھی ان میں ایک یہ بھی تھے، فن روایت و حدیث

(۱) کتاب الانساب سمعانی، ورق ۴۱۔

تذکرۃ الحمد شین.... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان انفرادی تحقیقی تذکرہ

37

میں ان کو حضرت عمرؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، عقیلؓ بن ابی طالب، ابو ہریرہؓ، ام المومنین حضرت عائشہؓ و دیگر صحابہ کبار رضی اللہ عنہم سے شرف تلمذ حاصل تھا، مدینہ کے مشہور فقیہ سلیمان بن یسار اور خود مالک کے بیٹوں نے اور دوسروں نے مالک سے حدیث روایت کی ہے، موطا میں بھی ان کی روایات ہیں، امام نسائی نے ان کی توثیق کی ہے، ۱۰۴ھ میں وفات پائی۔

مالک بن ابی عامر کے تین بیٹے تھے، انس امام مالک کے والد بزرگوار، ربیع اور ابوسہیل نافع، ابوسہیل نافع ایک بلند پایہ محدث تھے، ثقات تابعین اور ارکان حدیث میں ان کا شمار ہے، امام مالک نے موطا میں ان سے روایت کی ہے۔

امام کے عم محترم ربیع اور والد ماجد انس بھی اپنے خاندان کی علمی وراثت سے محروم نہ تھے تاہم اس فن میں کوئی مخصوص پایہ نہیں رکھتے تھے اور نہ موطا میں انام نے ان سے کوئی روایت کی ہے۔ (۱)

امام مالکؒ کی صحیح تاریخ ولادت (۹۳ھ) ہے، کیونکہ یہ تاریخ امام کے شاگرد خاص یحییٰ ابن کثیر سے سند کے ساتھ مروی ہے، جو مدتوں امام کی صحبت میں رہے ہیں۔ (۲)

تعلیم و ترویج: امام نے ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم کی آغوش میں پایا، خود ان کا گھر اور گھر سے باہر پورا شہر علماء و فضلاء کا مخزن تھا، آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد سینکڑوں صحابہ دور دراز مقامات میں نکل گئے تھے لیکن معدن سونا نکلنے کے بعد بھی معدن ہے، تمام اکابر صحابہ جو علوم شریعت کے امین اور قرآن و سنت کے خزینہ دار تھے، اسی مقدس شہر میں سکونت پذیر تھے، عہد نبویؐ اور اس کے بعد بھی ۲۳، ۲۵ برس تک پوری حکومت اسلامیہ کا یہ مرکز تھا، یہیں سے احکام و فتاویٰ فقہائے صحابہ کی مجلس میں طے ہو کر تمام دنیائے اسلام میں پھیلتے تھے۔

(۱) تزئین الممالک، ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰، اسعاف المطاء برجال المؤمنین ج ۳ تذکرۃ الحفاظ ذہبی

ج ۱ ص ۱۸۸، کتاب الانساب سمعانی ورق ۴۶ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۲۔

مدینہ کے فقہائے صحابہ: حضرت ابو بکر صدیق، عمر فاروق اور حضرت عائشہؓ جو اسراہ شریعت کے رازداں تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ جن سے بڑھ کر آنحضرت ﷺ کے اعمال و سنن کا تتبع اور واقف کار کوئی دوسرا نہ تھا، حضرت ابن عباسؓ جو حبر الامۃ تھے، حضرت ابو ہریرہؓ جن سے بڑھ کر حدیث کا کوئی دوسرا راوی نہیں، حضرت زید بن ثابتؓ جو کاتب وحی تھے، ان سب کی درسگاہیں اسی شہر میں آباد تھیں۔

تابعین مدینہ: تلامذہ صحابہ میں سے جن کو اصطلاح میں تابعین کہتے ہیں، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر ثامع، عبداللہ بن دینار، سالم بن عبداللہ، خاربہ بن زید، سعید بن مسیب، ہشام بن عروہ، محمد بن منکدر، عبید اللہ بن عتبہ بن مسعود، محمد بن مسلم بن شہاب زہری، عامر بن عبداللہ، جعفر صادق، ربیعہ رای، ابوسہیل ثامع بن مالک اور سلیمان بن یسار وغیرہ وہ بزرگان اسلام ہیں جن کے فضل و کمال کے آغوش میں اسلام کے علم دین نے نشوونما پائی ہے، اسی مدینہ النبی کے لعل و گہر تھے۔

فقہائے سبعہ: ان میں سے ابو بکر بن حارث (۹۳ھ) خارجہ بن زید (۹۹ھ) قاسم بن محمد (۱۰۱ھ) سعید بن مسیب (۱۰۱ھ) عبداللہ بن عتبہ (۱۰۲ھ) سالم بن عبداللہ (۱۰۶ھ) سلیمان بن یسار (۱۰۷ھ) مدینہ کے فقہائے سبعہ کہلاتے ہیں، صحابہ کے بعد تمام فتاویٰ، مسائل اور مقدمات و قضایا انہی کے فیصلہ سے طے پاتے تھے، ان کی مجلس اجتماعی اس عہد کی سب سے بڑی عدالت العالیہ تھی، فقہ مدینہ جس کا ذکر آگے آئے گا ان ہی فقہائے سبعہ کی علمی مجلسوں کے نتائج بحث ہیں۔

شیوخ مالک: امام مالک نے جب آنکھ کھولی تو مدینہ باغ و بہار تھا، چند کے سوا تمام بزرگوار درس و افتاء میں مشغول تھے، امام نے ان میں سے اکثر سے استفادہ کیا اور اس طرح مدینہ کا جو علم متفرق سینوں میں پراگندہ تھا وہ ایک سینہ میں مجتمع ہو گیا اسی لئے امام دارالہجرۃ آپ کا لقب ہوا، امام کے شیوخ کی یوں تعداد تو بہت ہے، اسماء الرجال کی کتابوں میں ہے



کہ (روی عن خلق کثیر) یعنی انھوں نے بہت سے لوگوں سے روایتیں کی ہیں۔ امام کے شیوخ اعزہ: خود امام کا گھر علم حدیث کا مرجع تھا، آپ کے دادا، چچا اور والد محدث تھے، امام کے دادا جو شقات رواۃ میں ہیں، امام کے ہوش تک زندہ تھے لیکن ان سے بلا واسطہ امام نے فیض حاصل نہیں کیا، ابو سہیل نافع امام کے ایک چچا روایت و حدیث کے شیخ تھے، امام زہری وغیرہ کے استاذ ہیں، امام نے بھی ان سے حدیثیں سیکھی ہیں، آپ کے والد انس اور دوسرے چچا ربیع دونوں اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں لیکن ان سے کوئی روایت امام نے موطا میں نہیں نقل کی ہے۔

امام نے غالباً لڑکپن سے طلب علم شروع کی، خود ان کی زبانی مروی ہے ”میں نافع کے پاس آتا تھا تو ایک کم سن لڑکا تھا، میرے ساتھ ایک غلام ہوتا تھا، نافع اتر کر آتے تھے تو مجھ سے حدیث بیان کرتے تھے۔“ (۱)

اس وقت تک تعلیم کا نصاب نہایت سادہ تھا یعنی قرآن مجید، حدیث اور فقہ۔ امام مالک نے قرآن مجید کی قرأت و سند مدینہ کے امام القراء ابوردیم نافع بن عبدالرحمن متوفی ۱۶۹ھ سے حاصل کی، (۲) جن کی قرأت پر آج تمام دنیائے اسلام کی قرأت کی بنیاد ہے، قرآن مجید کی تعلیم ہمیشہ مسلمانوں میں لڑکپن میں ہوتی ہے، عجب نہیں کہ اس کا یہی زمانہ ہو۔

علم حدیث: علم حدیث کی تعلیم بھی بچپن ہی سے شروع ہوتی جیسا کہ گذشتہ روایت سے ثابت ہوتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام کے سب سے پہلے شیخ الحدیث حضرت نافع ہیں یا ممکن ہے آپ کے چچا ابو سہیل ہوں لیکن یہ محض قیاس ہے اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔

نافع: نافع حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام اور حدیث و روایت میں ان کے شاگرد

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۸ ترجمہ نافع (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ و جلد ۳ ص ۵۱۔

تھے، حضرت نافع نے کامل تیس سال حضرت ابن عمرؓ کی خدمت کی ہے، ان کے علاوہ اور متعدد صحابہ حضرت عائشہؓ، ام سلمہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ وغیرہ سے بھی روایت کی ہے، امام اوزاعی، امام زہری، ایوب سختیانی، ابن جریج، امام مالک جیسے ائمہ حدیث ان سے شرف تلمذ رکھتے تھے، نافع کی جلالت قدر کا اس سے اندازہ ہوگا کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؓ نے جو خود مجتہد و ناقد فن تھے، نافع کو اہل مصر کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا، ۷۱ھ میں نافع نے وفات پائی۔ (۱)

نافع جب تک زندہ رہے، امام مالک ان کے حلقہٴ درس سے استفادہ کرتے رہے، وہ ان سے پوچھتے تھے کہ ”ان مسائل میں حضرت ابن عمرؓ نے کیا فرمایا ہے“ نافع ان کے اقوال بیان کرتے تھے، شاگرد کو استاد کے علم و فضل پر اتنا غرور تھا کہ فرماتے ہیں کہ ”جب میں ابن عمرؓ کی حدیث نافع کی زبان سے سن لیتا ہوں تو پھر اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ کسی اور سے بھی اس کی تائید سنوں“ شاگرد و استاد کے شرف و قبول کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ روایت مالک عن نافع عن ابن عمرؓ کو دنیا سلسلۃ الذہب یعنی ”طلائی زنجیر“ کہہ کر پکارتی ہے۔ (۲)

نافع کے علاوہ امام نے مدینہ کے دوسرے شیوخ کبار سے بھی حدیث سیکھی، جن میں ممتاز نام یہ ہیں: محمد بن شہاب زہری، جعفر صادق بن محمد، محمد بن منکدر، محمد بن یحییٰ انصاری، ابو حازم، یحییٰ بن سعید۔

شیوخ کی تعداد: امام مالک نے مؤطا میں جن شیوخ سے روایت کی ہے ان کی مجموعی تعداد شاہ ولی اللہ صاحب نے مسوی کے مقدمہ میں پچتر بتائی ہے لیکن اسعاف المہطاء رجال المؤطا سے میری تحقیق کے مطابق شیوخ کی تعداد چورانوے ہے لیکن یہ تعداد مؤطا کی احادیث و آثار کی ہے، ورنہ اصل میں امام مالک کی احادیث صحیحہ وغیر صحیحہ کی تعداد دس

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۷ و ۸۸ (۲) ابن خلیکان ج ۳ ص ۵۰۔

ہزار ہے، اس لحاظ سے اگر شیوخ کی تلاش کی جائے تو موجودہ تعداد سے بہت زیادہ بڑھ جائے گی، امام مسلم نے امام مالک کے شیوخ کے حال میں ایک مستقل کتاب لکھی تھی لیکن اب وہ ناپید ہے۔

غیر مدنی شیوخ: امام مالک کے اساتذہ میں بعض غیر مدنی شیوخ کے نام بھی ملتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک ایسے چھ اشخاص ہیں، جیسا کہ مقدمہ موسیٰ میں لکھا ہے لیکن درحقیقت نو شخص ہیں، ایک شام کے ابراہیم بن ابی عبدلہ مقدسی، دو مکہ معظمہ کے محمد بن مسلم ابوالزبیر مکی اور حمید بن قیس اعرج مکی، دو خراسان کے عطاء بن ابی مسلم خراسانی اور زیادہ بن سعد خراسانی، دو جزیرہ کے عبدالکریم بن مالک جزری اور زید بن انیسہ جزری اور دو بصرہ کے ایوب سختیانی بصری اور حمید بن ابی حمید الطویل بصری، امام نے ان ممالک کا کبھی سفر نہیں کیا اس لیے ان بزرگوں سے اخذ و استفادہ کا موقع مدینہ ہی میں ملا ہوگا، کیوں کہ حج و زیارت کی غرض سے اکثر بزرگان علم کا سال میں ایک بار اور کبھی کبھی کئی بار مدینہ میں آنا ہوتا تھا۔

علم فقہ: امام مالک نے فقہ کی تعلیم گونا گویا وغیرہ شیوخ سے بھی پائی لیکن ابو عثمان ربیعہ الرای سے خاص طور سے اس کی تحصیل کی، ربیعہ مدینہ کے کبار تابعین میں تھے، حضرت انسؓ وغیرہ صحابہ کرام کے دامن تربیت میں تعلیم پائی تھی، امام مالک، یحییٰ انصاری، شعبہ، اوزاعی، حسن بصری، لیث مصری وغیرہم جو اس طبقہ کے اکابر رجال واعیان علم ہیں ان کے شاگرد ہیں، ربیعہ کے ساتھ امام مالک کا اختصاص اس درجہ تھا کہ تاریخ و رجال میں ”شیخ مالک“ ان کے نام کا جزء ہو گیا ہے، ربیعہ اجتہاد و استنباط و تفریع و رائے میں اس قدر معروف تھے کہ ”رائی“ ان کا لقب ہو گیا، امام ابن حنبل ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن شیبہ کا قول ہے کہ وہ ”ثقہ“ ثبت اور مدینہ کے مفتیوں میں سے ایک تھے، خطیب نے لکھا ہے ”وہ فقیہ، عالم اور فقہ حدیث دونوں کے حافظ تھے۔“

ربیعہ رائی خاص مسجد نبویؐ میں درس دیتے تھے، قرن اول کا مدینہ جو سینکڑوں محدثین و فقہا کا مخزن تھا، اس میں فتویٰ دینا ایک خاص لیاقت و قابلیت کا کام تھا، ربیعہ رائے اس وصف سے متصف اور ان کا برفقہائے محدثین میں تھے جن کو مدینہ الرسول کے مفتی ہونے کی سعادت حاصل تھی، دولت عباسیہ کے پہلے فرماں روا اسحاق نے قاضی دار الخلافت کا عہدہ ان کے سپرد کیا، حکومت عباسیہ کا پہلا پایہ تخت انبار تھا یہیں ۱۳۶ھ میں انھوں نے وفات پائی۔

امام مالک کے شیوخ و اساتذہ کی یہ تعداد اس زمانہ کے کثرتِ شیوخ کے مذاق کے لحاظ سے نہایت کم ہے اور عجب نہیں کہ اس پر ان لوگوں کو جو تعداد کو افضلیت کا معیار جانتے ہیں تعجب ہوا، لیکن درحقیقت اس میں بھی امام مالک کے لئے ایک مزیت خاص مضمر ہے۔

امام مالک کا انتخاب شیوخ: صحابہ کے بعد تابعین کا دور شروع ہوا، یہ دور ثانی یا قرن ثانی گو عموماً اور اکثریت کے لحاظ سے خیر و برکت کا عہد اور صدق و طہارت کا دور تھا تاہم زمانہ کا کوئی دور کبھی ایسا نہیں گزرا ہے اور نہ گذر سکتا ہے، جب مجمع انسانی فاسد عنصر سے بالکل خالی ہو زمانہ کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ صرف نسبتاً ہو سکتا ہے، صحابہ کا قرن اول اپنے ماقبل و مابعد کی نسبت سے خیر القرون تھا تاہم وہ ماعز اور زن مخزومیہ وغیرہ کے وجود سے خالی نہ تھا، گو یہ ہستیاں بھی قرون مابعد کے اختیار و ابرار سے شرف صحبت، قوت ایمان، اعتراف قصور و خشیت الہی اور توبہ و ندامت میں بدرجہا بہتر تھیں، عفی اللہ عنہم۔

صحابہ کے بعد تابعین کا زمانہ بھی اپنے مابعد کے لحاظ سے برکات کا مجمع اور کمالات کا منبع تھا، تاہم وہ..... انسانی طبقات کے جو اقسام ہیں اُن سے یکسر پاک بھی نہ تھا، بہتیرے لوگ تصدأ جھوٹ بولتے تھے، بہتیرے اپنے غایت زہد و سادہ دلی سے ہو بولنے والے کو سچا سمجھ کر بلا تامل اس کی بات نقل کرتے تھے، اس طرح نادانستہ کذب

بیانی میں مبتلا ہو جاتے تھے، سینکڑوں غیر فقیہ راوی ایسے تھے جو اپنی روایات کا خود عمل و مفہوم نہیں سمجھتے تھے، کچھ ایسے تھے جو فن کی عدم مہارت کے سبب سے جدید روایات میں تمیز نہیں کر سکتے تھے لیکن چونکہ اس زمانہ کی آب و ہوا میں روایت حدیث اور اشاعت قول نبوی کا مذاق پھیلا ہوا تھا اور یہی عز و شرف کا ذریعہ تھا، اس لیے اہل فضل اور مستحقین علم کے پہلو بہ پہلو نا اہل اور غیر مستحقین بھی اپنی مسند بچھاتے پھرتے تھے، باہر کے ناواقف آفاقی جن میں زیادہ تر عراقی تھے، ہر چمکدار چیز کو سیم خالص سمجھ کر اور ہر ڈھیر سے بلا تمیز ایک خروارہ اٹھاتے پھرتے تھے اور اس بارگراں کے ساتھ جب گھر لوٹتے تھے تو اپنے کو سب سے بڑے ڈھیر کا مالک سمجھ کر خوش ہوتے تھے۔

امام مالک کا مدینہ وطن تھا، بچپن سے علما میں تربیت پائی، ایک ایک صاحب حدیث سے برسوں ملاقاتیں رہیں، ہر ایک سرمایہ دار کی متاع کے ایک ایک زرہ سے واقف تھے اور یہ غیر ممکن ہے کہ نا اہلوں کی نااہلیت خود اپنے ارباب وطن سے مخفی رہے۔

خصوصیات شیوخ مالک: امام مالک نے صرف ان ہی اساتذہ فن سے استفادہ کیا جو اہلیت و استحقاق کے مسند نشین تھے اور صرف ان شیوخ کے حلقہ درس میں بیٹھے جو صدق و طہارت میں معروف اور حفظ و فقہ میں ممتاز تھے، امام ممدوح ہمیشہ تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ میں کبھی کسی غیر فقیہ (سفیہ) کی مجلس میں نہیں بیٹھا، امام ابن فضیل فرماتے ہیں کہ ”یہ مخصوص نعمت تھی جو صرف حضرت امام مالک کے حصہ میں آئی۔“ امام صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ”اس صحن مسجد (نبوی) میں ان ستونوں کے پاس میں نے ستر شیوخ کو پایا جو قال اللہ قال الرسول کہا کرتے تھے لیکن ان میں سے ایک کے پاس بھی میں نہیں بیٹھا۔“ کبھی فرماتے ”مدینہ میں بیسیوں اشخاص تھے جن سے لوگ حدیث سیکھتے تھے لیکن میں نے کبھی ان سے اخذ علم نہیں کیا، یہ چند قسم کے لوگ تھے، بعض نادانستہ جھوٹ بولتے تھے، بعض مغرضانہ سے ناواقف تھے، بعض پورے جاہل تھے، ابن وہب جو امام صاحب کے نامور

شاگرد ہیں نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب نے فرمایا کہ مدینہ میں ایسے لوگ تھے کہ اگر بارش کی دعا مانگی جاتی تو ان کی برکت سے آسمان سے پانی برس پڑتا“ اور بہت سی احادیث اور مسائل کی ان کو سماعت بھی حاصل تھی لیکن میں نے ان سے استفادہ نہیں کیا کیوں کہ وہ صرف متقی اور زاہد تھے اور حدیث و روایت اور فتویٰ کا کام صرف زہد و اتقا اور سادگی سے نہیں چل سکتا، اس کے لیے اتقا و پرہیزگاری کے ساتھ علم و فہم اور پختگی کی حاجت ہے، وہ یہ جانتا ہو کہ اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے اور کل قیامت کے دن یہ معاملہ کہاں تک پہنچے گا، جس زہد کے ساتھ پختگی اور دانائی نہ ہو وہ اس راہ میں مفید نہیں اور نہ وہ حجت ہے اور نہ ایسے لوگوں سے اخذ علم کرنا چاہیے۔“ امام مالک کے بھانجے اسماعیل بن ابی اویس روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں مالک کو کہتے سنا ہے کہ ”یہ علم حدیث دین ہے پہلے دیکھ لو کہ کس سے حاصل کرتے ہو، میں نے ان ستونوں کے پاس ستر آدمیوں کو قال رسول اللہ قال رسول اللہ کہتے سنا لیکن میں نے ان سے ایک حرف نہیں سیکھا، حالانکہ ان میں سے ہر شخص ایسا تھا کہ اگر خزانہ بھی ان کے سپرد کیا جاتا تو ان کی ایمان داری اور دیانت کے شیشہ میں بال نہ آتا لیکن وہ اس فن کے آدمی نہ تھے۔“ مطرف بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے امام کی زبان سے ان کا قول سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ ”میں نے اس شہر میں بہت سے نیک و صالح لوگوں کو پایا لیکن ان سے میں نے حدیث نہیں سنی۔“ لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ ”جو وہ کہتے تھے وہ سمجھتے نہ تھے۔“ (۱)

امام صاحب نے اہل عراق سے کیوں روایت نہیں کی: امام کے شیوخ میں کوئی عراقی نہیں ہے، ابو مصعب جو امام کے شاگرد اور مشہور محدث ہیں، بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اہل عراق سے کیوں روایت نہیں کی؟ جواب میں فرمایا کہ ”کیا میں ایسے لوگوں سے روایت کروں جن کو میں نے دیکھا ہے کہ یہاں آکر ان

لوگوں سے حدیث سیکھتے ہیں جن پر وثوق نہیں کیا جاسکتا“ ابو مصعب کا بیان ہے کہ ”میں نے کہا کہ وہ اپنے شہر میں بھی ایسے ہی لوگوں سے روایت کرتے ہیں“ اسی قسم کا سوال ایک بار امام مالک سے شعیب بن حرب نے کیا کہ آپ لوگ اہل عراق سے کیوں نہیں روایت کرتے، امام صاحب نے کیا معقول جواب دیا، فرمایا کہ ”ہمارے بزرگوں نے ان کے بزرگوں سے روایت نہیں کی اس لیے ہمارے پچھلوں نے بھی ان کے پچھلوں سے روایت نہیں کی۔ (۱)

امام مالک جب کسی غیر مدنی شیخ سے اخذ حدیث کرنا چاہتے تھے تو پہلے اس کو پوری طرح جانچ لیتے تھے، امام کا کوئی شیخ اگر عراقی کہا جاسکتا ہے تو وہ بصرہ کے ایوب سختیانی مشہور تابعی المتوفی ۱۳۱ھ ہیں جن کی نسبت ابن سعد کہتے ہیں ”کان حجة ثقة ثبتا فى الحديث جامعاً کثیر العلم“ اور جن کو شعبہ نے سید الفقہاء کا خطاب دیا ہے اور جن کا نام رجال میں احد الائمة الاعلام کے وصف کے ساتھ لیا جاتا ہے، امام مالک فرماتے ہیں کہ مکہ میں حج کے موقع پر ان کو دو سال میں نے دیکھا لیکن ان سے کوئی حدیث نہیں لکھی، تیسرے سال دیکھا کہ وہ صحن زمزم میں بیٹھے ہیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی لیا جاتا تو وہ اتنا روتے کہ مجھ کو رحم آتا تھا، جب یہ حال دیکھا تو ان کی حدیث لکھی۔ (۲)

اپنے دادا اور بعض فقہائے سبعہ سے کیوں نہیں روایت کی: امام جب سن رشد کو پہنچے اُس وقت آپ کے دادا مالک بن ابی عامر زندہ تھے، ان کی وفات کے وقت امام کی عمر ۱۲، ۱۳ سال کی تھی، فقہائے سبعہ میں سے سالم بن عبد اللہ نے ۱۰۶ھ میں وفات پائی، جب کہ امام کی عمر ۱۶ برس کی تھی، سلیمان بن یسار نے ۱۰۷ھ میں انتقال کیا، اس وقت امام ۷ سال کے تھے تاہم امام صاحب نے ان بزرگوں سے بلا واسطہ کوئی روایت نہیں کی، اس کا سبب خود

(۱) مقدمہ اسعاف ص ۲، (۲) مقدمہ اسعاف ص ۵۲۳۔

انہوں نے بیان فرمادیا ہے کہ ”مدینہ میں بعض ایسے لوگوں کا زمانہ میں نے پایا ہے جو ۱۰۰ اور ۱۰۵ برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے لیکن ایسے بوڑھوں کی روایت نہیں لی جاتی ہے اور اگر کوئی لے تو عیب شمار کیا جائے گا۔“ اور یہ بالکل سچ ہے کیوں کہ عمر کی طوالت کا حفظ و عقل کے ضعف پر جو اثر پڑتا ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔

امام مالک کے اس احتیاط و تمیز و نقد کا یہ اثر تھا کہ امام مالک جس شیخ سے روایت کرتے تھے وہ ثقاہت و عدالت و حفظ میں نشان سمجھا جاتا تھا، یحییٰ بن معین جو بمصرین فن حدیث کے امام ہیں فرماتے ہیں کہ ”ہم لوگ امام کے آگے کیا ہیں؟ ہم لوگ تو ان کے نقش قدم پر چلتے ہیں، جب کسی شیخ کا نام آتا ہے تو دیکھتے ہیں کہ امام مالک نے اس سے لیا ہے یا نہیں، اگر نہیں لیا ہے تو چھوڑ دیتے ہیں۔“ امام احمد بن حنبل سے کسی نے ایک راوی کی نسبت پوچھا انہوں نے فرمایا کہ ”میرے نزدیک وہ اچھا ہے کیوں کہ امام مالک نے اس سے روایت کی ہے۔“ (۱)

اساتذہ آپ کے معترف تھے: امام مالک فطرتاً قوی الحافظ تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ کوئی چیز میرے خزانہ دماغ میں آکر پھر نہ نکلتی (۲) اور خود دوسروں کو بھی اس کا اعتراف تھا، ابو قلابہ کہتے ہیں کان مالک احفظ اهل زمانہ (۳) ایک بار استاذ ربیعہ کی معیت میں امام زہری کی مجلس میں حاضر ہوئے، امام زہری نے اُس دن چالیس سے زیادہ حدیثوں کا املا کرایا۔ دوسرے دن پھر مجلس منعقد ہوئی تو امام مالک اپنے استاذ کے ساتھ پھر حاضر ہوئے، امام زہری نے کہا کتاب لاؤ، میں اس سے حدیث بیان کروں، کل جو میں نے بیان کیا تھا اس سے تم کو کیا فائدہ ہوا، ربیعہ نے کہا اس مجلس میں ایک شخص ہے جو کل کی تمام حدیثیں زبانی سنا دے گا، زہری نے پوچھا وہ کون ہے؟ ربیعہ نے کہا ابن ابی عامر، زہری

(۱) ان تمام اقوال کے لیے دیکھئے مقدمہ اسعاف (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۸، ۱۸۹ (۳) خزین،

الہمالک ص ۹ مصر۔



نے سنانے کا اشارہ کیا، امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس حدیثیں سنا دیں، زہری نے تعجب سے کہا میرا خیال تھا کہ یہ حدیثیں میرے سوا کسی کو یاد نہیں ہیں۔ (۱)

شوقِ علم اور فراغِ قلب بہت کم مجتمع ہوئے ہیں، امام مالک کے فقر کی نوبت۔ یہاں تک پہنچی تھی کہ چھت کی کڑیاں فروخت کر کے ضرورتیں پوری کیں لیکن دست طلب سم کو تہا نہیں کیا۔ (۲) اسی لیے آپ فرماتے تھے کہ ”اس علم میں کسی شخص کو اُس وقت تک کمال حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مبتلائے فقر نہ ہو اور اس پر بھی طلب علم کو ترجیح دے (۳) امام مالک طلب علم کے لیے بجز موسم حج کے مدینہ سے باہر نہیں نکلے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کو طلب علم کے لیے محنت نہیں اٹھانی پڑی، ابن سعد نے امام مالک سے بیک واسطہ روایت کی ہے کہ نافع سے حدیث سیکھنے کا وقت ٹھیک دوپہر کو مقرر تھا، دوپہر کی دھوپ میں بلا سایہ شہر سے باہر بقیع میں جاتا تھا، جہاں ان کا مسکن تھا، مدینہ کے ایک فقیہ ابن ہرمرز تھے، ان کے گھر صبح کو آتا تھا تو رات کو جاتا تھا۔ (۴)

مجلس درس: اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امام صاحب کی لیاقت و استحقاق کا اعتراف عام طور سے کیا جا رہا تھا اور امام کے شیوخ کی موجودگی میں امام کے مستفیدین کا الگ حلقہ قائم ہو چکا تھا (۵) شیخ الفقه ربیعہ متوفی ۱۳۶ھ زندہ تھے کہ امام مالک فقہ و فتویٰ کے مرجع بن گئے، (۶) اور ربیعہ کی وفات کے بعد تو متفقہ طور سے فقہ و رائے و اجتہاد کے امام تسلیم کر لیے گئے، ابن ربیعہ نے جو مصر کے ایک شیخ حدیث ہیں، شیخ مدینہ ابو الاسود نعیم بن عروہ بن زبیر سے پوچھا کہ ”ربیعہ کے بعد مدینہ میں فقہ و اجتہاد کا امام کون ہے؟“ انھوں نے جواب دیا کہ نوجوان اصحی (۷) یعنی مالک بن انس اصحی

(۱) ترمذیین الممالک ص ۹ مصر ص ۱۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۱۸۸ (۳) ترمذیین و نقل عن الحدیث لابی

نعیم ص ۱۵ مصر (۳) طبقات ابن سعد (۵) ترمذیین الممالک ص ۱۰ (۶) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ (۷)

ترمذیین الممالک ص ۹۔

مجلس مالک: فن حدیث میں امام صاحب کے خاص شیخ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے غلام نافع تھے، حضرت ابن عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ساٹھ برس تک حدیث و فقہ و فتویٰ و ارشاد کے مرکز رہے ہیں، حضرت نافع کامل تیس برس تک سفر و حضرت اور خلوت و جلوت میں ہمیشہ حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ رہے اور ان کے بعد ان کی مجلس درس میں ان کے جانشین ہوئے، ۱۱۷ھ میں وفات پائی، امام مالک کم از کم بارہ برس حضرت نافع کے درس میں رہے۔

حضرت نافع کی وفات کے بعد امام مالک ان کے جانشین ہوئے، شعبہ جو کوفہ کے راس الحمد شین تھے، بیان کرتے ہیں کہ ”نافع کی وفات کے ایک سال بعد مدینہ آیا تو دیکھا کہ مالک ایک حلقہ کے صدر نشین ہیں۔“ (۱) اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے ۱۱۷ھ میں اپنی مجلس درس مستقل قائم کی۔

مجلس کی تہذیب: امام صاحب کی مجلس درس ہمیشہ پر تکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ رہتی تھی، وسط مجلس میں شہ نشین تھی، جس پر امام صاحب املائے حدیث کے وقت رونق افروز ہوتے تھے، جا بجا شکر کائے مجلس کے لیے پکھے پڑے رہتے تھے، جب حدیث کا درس ہوتا تو انگلیٹھی میں عود اور لوبان جلائی جاتی، صفائی و زراہت کا یہ عالم تھا کہ فرش پر ایک تنکا بھی بار خاطر ہوتا تھا، جب حدیث نبویؐ کے املا کا وقت آتا، پہلے وضو یا غسل کر کے عمدہ اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے، بالوں میں کنگھی کرتے، خوشبو لگاتے، اس اہتمام کے بعد مجلس علمی کی صدارت کے لیے باہر تشریف لاتے۔ (۲)

سب لوگ سرنگوں خاموش مودب بیٹھتے تھے، یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ بھی جب امام کی مجلس درس میں آ کر شریک ہوئے تو وہ بھی اسی طرح مودب ہو کر بیٹھے، (۳) اس وقت

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۸ (۲) ترمین المماک ص ۱۶۱ و ۱۶۲ و ۱۶۳ (۳) تذکرۃ

امام صاحب کی ہر اداسے شکوہ اور وقار کا اظہار ہوتا تھا، پوری مجلس پر ایک مقدس سکوت طاری رہتا تھا، امام شافعی فرماتے ہیں کہ ”ہم لوگ کتاب کے ورق بھی اس ڈر سے نہیں اٹھتے تھے کہ کھڑکھڑاہٹ کی آواز نہ ہو۔“ (۱) جاہ و جلال اور شان و شکوہ سے کاشانہ امامت پر بارگاہ شاہی کا دھوکہ ہوتا تھا، طلبہ کا ہجوم، مستفتیوں کا ازدحام، امر کا ورد، علما کی تشریف آوری، سیاحوں کا گذر، حاضرین کی مودب نشست، مکان کے پھانگ پر سوار یوں کا انبوہ دیکھنے والوں پر رعب طاری کر دیتا تھا، اسی موقع پر ایک شاعر کا گذر ہوا تو بے اختیار اس کی زبان سے یہ دو شعر نکل گئے۔ (۲)

يدع الجواب فما يراجع هيبه والسائلون نواكس الانقان  
اگر امام جواب نہیں دیتے تو ہیبت سے پھر پوچھا نہیں جاسکتا، پوچھنے  
والے سر نیچے کئے رہتے ہیں۔

ادب الوقار وعز سلطان التقى فهو المهاب وليس ذا سلطان  
وقار کا ادب اور سلطان تقویٰ کا جاہ و جلال ہے، لوگ اس سے ڈرتے  
ہیں حالانکہ یہ صاحب حکومت نہیں ہے۔

امام مالک صاحب حکومت نہ تھے لیکن صاحب حکومت اس آستانہ پر آکر جھکتے تھے، امام شافعی نے اپنی تعلیم کے لئے والی مدینہ کو بہ غرض سفاوش جب در امامت پر لانا چاہا تو اس نے کہا ”میرا کہاں وہاں گذر۔“

حدیث کا الماسجد نبوی یا مجلس درس سے باہر نہیں کرتے تھے، خلیفہ مہدی اور ہارون دونوں نے خیمہ خلافت میں الما کی خواہش کی لیکن امام نے انکار کر دیا، جلدی میں یا کسی کام کی مصروفیت میں یا راہ چلتے ہوئے حدیث نہیں بیان فرماتے تھے کہ خلاف ادب ہے، درحقیقت سماع و فہم حدیث کے لئے اطمینان اور حضور قلب چاہیے جو ان موقعوں پر

(۱) توالی التامیس بمناقب ابن ادریس بن حجر (۲) تزئین ص ۱۷۔

عموماً مفقود ہوتے ہیں، ان کی مجلس میں زور زور سے بولنا بھی خلاف ادب تھا، ایک بار خلیفہ منصور امام سے مسجد میں مناظرہ کر رہا تھا اور اس کی آواز نہایت بلند ہو رہی تھی، امام نے ڈانٹ کر یہ آیت پڑھی۔ (۱)

لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ - (حجرات: ۲)

پیغمبر کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو۔

آپ کا معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک مصلیٰ پر اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے، طلوع کے بعد لوگ آنا شروع ہوتے، امام صاحب ان کی طرف متوجہ ہو کر خیریت پوچھتے، مجلس کی یہ ترتیب تھی کہ قریب تراچھے، مستعد اور صاحب فہم طلبہ کو جگہ دیتے، پھر علی قدر مراتب لوگ آ کر بیٹھتے جاتے، درس شروع کرنے سے پہلے فرمادیتے کہ، مشہور اور صاحب فہم لوگ قریب بیٹھیں، املا آہستہ اور سکون کے ساتھ کرتے، ایک حدیث ختم ہو جاتی تو دوسری حدیث شروع کرتے۔“

طریقہ درس: مختلف شیوخ کی مجلسوں میں درس کا طرز مختلف تھا، اکثر شیوخ کا دستور تھا کہ وہ خود کسی بلند مقام پر بیٹھ جاتے یا کھڑے ہو جاتے، طلبہ ترتیب کے ساتھ آگے پیچھے قلم و ذات لے کر بیٹھ جاتے، شیخ زبانی یا اپنا جزء حدیث ہاتھ میں لے کر اس سے املا کرتا، طلبہ لکھتے جاتے تھے، مجلس درس میں اگر غیر معمولی اجتماع ہوتا تو تھوڑی تھوڑی دور پر مستملیٰ کھڑے ہو کر شیخ کے الفاظ آگے کو پہنچاتے، امام مالک بھی کبھی کبھی اس طریقہ سے درس دیتے تھے، ابن علیہ جو ایک اچھے شاگرد تھے، امام کے مستملیٰ تھے۔

لیکن مدینہ کے اکثر شیوخ کا دستور یہ تھا کہ وہ اپنی احادیث و فتاویٰ و تعلیقات کو پہلے قلم بند کر لیتے، یا کسی مستعد اور صاحب فہم شاگرد کو لکھنے پر مامور کرتے، یہ لکھے ہوئے اجزا کاتب کے ہاتھ میں ہوتے اور وہ مجلس میں اس کو پڑھتا، شیخ جا بجا اس کے مطالب کی

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ و تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۲۲ ص ۷۲۔

تشریح کرتا جاتا، اگر کتاب سے غلطی ہوگئی ہوتی تو اس کی تصحیح کر دیتا، امام صاحب کے کتاب کا نام ابن حبیب تھا، جن کا شمار محدثین کبار میں ہے، کبھی معن بن عیسیٰ یا دوسرے تلامذہ پڑھتے، یہی سبب ہے کہ امام کے بعض تلامذہ مثلاً یحییٰ جن کی روایت بخاری میں ہے بجائے حدثنامالک واخبرنا مالک کے قرآنہ علی مالک کہتے ہیں۔

امام صاحب اس اصول کی شدت سے پابندی کرتے تھے، یحییٰ بن سلام اسی بات پر ناراض ہو کر مجلس سے اٹھ گئے کہ ”خود نہیں پڑھتے، شاگردوں سے پڑھواتے ہیں“ یحییٰ بن سلام تو خیر ایک ادنیٰ شاگرد تھے، خود خلیفہ وقت ہارون نے امین و مامون کے لیے درخواست کی کہ امام پڑھیں اور یہ سنیں تو امام نے شیوخ مدینہ کا نام گنا کر فرمایا کہ ”ہمارے شہر کے شیوخ کا یہی دستور تھا“ (۱) کیا عجیب بات ہے کہ جس بات کے لیے لوگوں کو اس قدر اصرار تھا وہی آج ایک مدت سے تمام مدارس اسلامیہ کا دستور عام ہے۔

اس طریقہ کی خوبی: شیوخ مدینہ کا یہ طریقہ متعدد وجوہ سے زیادہ محتاط اور بہتر ہے، مجمع عام میں جب کوئی شخص بولنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو عجلت، کثرت ازدحام اور کبھی مرعوبیت کے سبب سے اس میں مسامحت ہو سکتی ہے، بخلاف اس کے اگر پہلے سے لکھ لیا جائے تو فراغ خاطر، اطمینان قلب اور فرصت فکر و مراجعت کے سبب سے صحت و حفظ و وثوق کے ذرائع زیادہ ہیں، محدث کا خود قرأت نہ کرنا اس لیے زیادہ مناسب ہے کہ وہ دوبارہ سن کر اپنے مسودہ کی تصحیح کر سکے کیوں کہ خود پڑھنے میں اکثر دیکھا گیا کہ زبان و نظر اپنی یاد کی بنا پر غلط لکھے ہوئے کو بھی صحیح پڑھتی ہے، دوسرا جنسی شخص ہر سطر پر بار بار ٹھہرتا ہے، اس طرح معلم کو ہر مرتبہ غلطی پر تنبیہ ہوتی ہے، لیکن اس سے بھی بڑی مصلحت اس میں یہ ہے کہ اکثر فقہائے محدثین احادیث و آثار کے ساتھ اپنی ذاتی تحقیق و رائے یا کسی لغت کی شرح بھی بیان کرتے جاتے تھے، چنانچہ امام زہری کا یہی طرز تھا لیکن اس طرز میں ایک

(۱) تذکرۃ الخطاط ج ۱ ص ۱۹۰، ۱۹۱۔ www.KitaboSunnat.com

بڑی خرابی یہ ہے کہ اکثر طلبہ اصل اور اضافہ میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور متن حدیث اور شیخ کے کام میں ان کو اشتباہ ہوتا تھا، امام مالک کا طرز نہایت محفوظ تھا کہ اصل تو کاتب پڑھتا تھا اور اضافہ خود اپنی زبان مبارک سے ادا کرتے تھے، اس طرح ہر طالب علم کو اصل و اضافہ و ادراج میں فرق معلوم ہو جاتا تھا۔

مجلس درس کی شہرت: ایک تو مدینہ خود اسلام کا گہوارہ اور نسلًا بعد نسل علم دین کا مرکز تھا، دوسرے امام ہمام کا خاندان ابتدا سے علم کے ساتھ ایک خاص نسبت رکھتا تھا، ان اضافی اوصاف کے ساتھ خود ذاتی جوہر نے وہ پروبال نکالے کہ پوری دنیائے اسلام مشرق سے مغرب تک امام کے آوازہ شہرت سے معمور ہو گئی اور امام کی درس گاہ مزرعہ یوم کے اختلاف و بوقلمونی کا مظہر بن گئی، ایک طرف سیستان دوسری صدی کی مملکت اسلام کا مشرقی گوشہ اور دوسری طرف قرطبہ دنیائے اسلام کا مغربی گوشہ، دونوں کے ڈانڈے مدینہ الرسول میں آکر مل گئے، ممالک عرب، ممالک شام، ممالک عراق، ممالک عجم، ممالک ترکستان، ممالک مصر، ممالک افریقہ، ممالک اندلس، و ایشیائے کوچک، الغرض ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں براعظموں سے طالبان علم کے قافلے مسلسل مدینہ کا رخ کرنے لگے، اس طرح پیغمبر عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب لوگ طلب علم کے لیے اونٹ ہنکائیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ بڑا عالم وہ کسی کو نہ پائیں گے۔

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوشک ان یضرب الناس اکباد الابل فلا یجدون احدا اعلم من عالم المدینۃ۔ (ترمذی ابواب العلم باب ماجاء فی عالم اہل المدینۃ)



## تلامذہ و مستفیدین

محدث ذہبی لکھتے ہیں کہ ”امام مالک سے اتنے لوگوں نے روایت کی ہے جن کا شمار تقریباً ناممکن ہے، (۱) ان کے تلامذہ میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو دوسرے علماء کی مجلس سے فضل و کمال کی سند حاصل کر چکے تھے، بلکہ خود امام کے شیوخ بھی امام کے احسان علمی کے بار سے سبکدوش نہ تھے۔ (۲) خود امام مالک فرماتے تھے کہ ”بہت کم ایسے لوگ ہیں جن سے میں نے سیکھا ہو اور آخر میں ان کو خود مجھ سے پوچھنے کی حاجت نہ پڑی ہو۔“ (۳)

تلامذہ کی خصوصیات: امام کو اپنے تلامذہ و مستفیدین کی حیثیت سے بھی متعدد خصوصیات حاصل ہیں، جس کثرت، جس رتبہ اور جتنے طبقات کے لوگ امام کے حلقہ فیض میں داخل ہیں وہ محدثین و فقہاء میں سے کسی کو بھی نصیب نہیں وَذَلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ۔

۱- کثرت تعداد کے لحاظ سے امام مالک کے تلامذہ کی تعداد ۱۳۰۰ ہے، فربری کی روایت کے مطابق امام بخاری کے شاگردوں کی تعداد ۹۰۰۰۰ ہے لیکن ان کا تیرہ سو ۱۳۰۰ منتخب روزگار تلامذہ سے کوئی مقابلہ نہیں، ان میں سے چند (۳ یا ۵) کے سوا ہر ایک اس فن کا نکتہ دال اور بلند پایہ محدث ہے۔

۲- امام بخاری کے نوے ہزار روایات میں سے ایک مخصوص تعداد کے سوا باقی کے حالات مجہول و مستور اور نام بنام غیر معلوم ہیں لیکن امام مالک کے تمام روایات و تلامذہ نام بنام (۱) تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۱۸۷ حیدرآباد دکن (۲) تہذیب المعجزات ج ۱ ص ۵۵ (ذکر مالک بن انس) (۳) تزکین الممالک نقل عن فضائل مالک لابن محمد الزہرائی ص ۳۰۔

معلوم و مشہور ہیں، ابوبکر خطیب بغدادی، ابن بشکوال اندلسی، قاضی عیاض، شمس الدین دمشقی حافظ سیوطی نے ان کے نام حروفِ تجہجی کی ترتیب سے رسائل میں جمع کر دیئے ہیں۔

۳- دوسرے عام محدثین کے تلامذہ کی دنیا جغرافی حیثیت سے اس قدر وسیع نہیں جس قدر امام مالک کی ہے، ابوحنیفہ کے تلامذہ تمام عجم و عرب میں پھیلے ہوئے تھے لیکن افریقہ و اندلس ان سے بے نیاز ہے، امام اوزاعی کا علم اندلس میں پھیلا لیکن عجمی ممالک ان سے مستفید نہ ہوئے، لیکن امام مالک کے علم و معارف نے دنیاے اسلام کے کسی گوشہ کو بھی اپنی غلامی سے آزاد نہ چھوڑا۔

۴- لیکن محض تلامذہ کی کثرت اور جغرافی وسعت اس قدر مایہ فخر نہیں ہے، جس قدر ان کا علوئے رجبہ رفعت کمال اور کثرت فضل ہے، امام مالک اپنے ہمسروں میں اس حیثیت سے جس قدر ممتاز ہیں، اس کو محض عطیہ الہی سمجھنا چاہیے جو صرف عالم مدینہ کے لئے مقدر تھا، ان کے حلقہ تلامذہ و مستفیدین میں ان کے شیوخ بھی شامل ہیں اور دوسرے ایسے ائمہ کبار و ارباب فن بھی، جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی اقلیم مستقل کا فرماں روا ہے۔

۵- اس سے بھی زیادہ عجیب شے یہ ہے کہ امام کا حلقہ افادہ اتنے مختلف النوع طبقوں پر مشتمل ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ مختلف سمتوں اور جہات کے خطوط کیونکر ایک ہی مرکز کی طرف رجوع ہوئے، مثلاً خلفائے اسلام، امرائے باد، تابعین، ائمہ محدثین، ائمہ مجتہدین، فقہاء، قضاة، زہاد و صوفیائے کرام، ادباء و شعراء، مورخین، مفسرین اور فلاسفہ سب آپ کے حلقہ و مستفیدین میں داخل تھے۔

اس عہد کے بعد کے تمام محدثین کبار بلا استثناء بیک واسطہ یا بدو واسطہ امام مالک کے تلمذ سے مشرف ہیں۔ مسانید و صحاح کے مصنفین میں امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، ابوداؤد و نسائی، صرف ایک واسطہ سے امام کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہیں اور اس پر ان کو ناز و فخر ہے، یہ فخر آٹھویں صدی تک باقی رہا، چنانچہ محدث کبیر شمس الدین



ذہبی فخریہ لکھتے ہیں کہ ”میں سات واسطوں سے امام کا شاگرد ہوں۔ (۱) امام نووی کو بھی ساتویں صدی میں امام سے قرب نسبت پر ناز ہے، مقدمہ شرح مسلم میں اپنے استاد کے حال میں لکھتے ہیں ”ایک کتاب کی سند مجھ کو کتب بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی سب سے بہتر ملی اور وہ امام مالک کی موطا ہے جو ان تمام محدثین کے شیخ تھے۔ (۲)

## فقہ و فتاویٰ

فقہ مالک: امام مالکؒ کے فقہ و فتاویٰ کی بنیاد فقہ مدینہ پر ہے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مصفیٰ کے مقدمہ میں لکھا ہے:

”امام مالک بنائے فقہ بر حدیث آنحضرتؐ نہادہ است کہ مسند باشد یا

مرسل ثقاة، بعد ازاں قضایاے حضرت عمربنؓ او بعد ازاں بر فتاویٰ سائر صحابہ

وفقہائے مدینہ کہ سعید بن مسیب وغیرہ، بن زبیر، قاسم و سالم و سلیمان بن یسار

و ابوسلمہ و ابوبکر بن عبدالرحمن و ابوبکر بن عمر و عمر بن عبدالعزیز (۳)

موطا کے طرز استدلال اور احادیث و آثار کا جس نے بغور مطالعہ کیا ہے، وہ

یقیناً اس کی تائید کرے گا کہ امام مالک کی فقہ و فتاویٰ کی یہی وہ بنیاد و اصول ہیں جن پر امام مالک فقہی فتاویٰ کا جواب دیتے تھے۔

امام مالک کے فضل و کمال کا تمام شیوخ مدینہ کو اعتراف تھا، اس کے باوجود

انہوں نے اس قدر احتیاط کی کہ جب تک سترہ علمائے عظام نے امام صاحب کی قابلیت

و استحقاق کا فتویٰ نہ دیا، انہوں نے اس مرتبہ عالی پر قدم رکھنے کی ہمت نہ کی، آپ کا معمول

تھا کہ جب کسی فتویٰ کا جواب ارشاد فرماتے تو پہلے **مأشأ اللہ لا حول ولا قوۃ**

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸ (۲) مقدمہ صحیح مسلم ص ۶ مصر (۳) مقدمہ مصفیٰ ص ۱۱۔

الا باللہ کہتے۔ (۱)

حکومت کا اعلان: نہ صرف مدینہ و حجاز بلکہ تمام اطراف ملک سے سائلین کا ازدحام رہتا تھا، موسم حج میں جب پوری دنیائے اسلام عرصہ عرفات میں جمع اور سارے علمائے دین کو فد، بصرہ، خراسان وغیرہ سے سمٹ کر حرم مکہ میں جمع ہو جاتے تھے تو حکومت کی طرف سے

اعلان ہوتا تھا کہ "امام مالک اور ابن ابی ذئب کے سوا اور کوئی فتویٰ نہ دے۔" (۲)

حکومت کے مقابلہ میں آزادی فتویٰ، طلاق مکروہ: حکومت کی اس تعظیم و تکریم کا اثر شاید دوسروں پر یہ ہوتا کہ وہ کم از کم مختلف فیہ مسائل میں اپنی رائے کے خلاف حکومت کے منشاء کی تعظیم کرتے لیکن امام صاحب اپنی حریت رائے اور اعلان حق میں اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اگر کسی کو زبردستی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کیا جائے اور وہ ڈر کر محض جبر سے طلاق دیدے تو امام ابوحنیفہ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک طلاق واقع ہو جائے گی لیکن امام مالک اور اکثر اصحاب حدیث اس کے قائل ہیں کہ طلاق واقع نہ ہوگی، والی مدینہ جعفر بن سلیمان عباسی نے جو خلیفہ منصور کا چچا زاد بھائی بھی تھا امام کو حکم دیا کہ وہ یہ فتویٰ نہ دیں لیکن امام صاحب نے علی الاطلاق اپنی رائے کا اظہار کیا اور آخر اس کے لئے کوڑوں کی سزا تک گوارا کی۔

لاادری: اس سے بھی زیادہ شدید موقع اعلان حق کا اپنے نفس کے مقابلہ میں ہوتا ہے، مفتی کے لئے جس قدر پہلی قسم کی حریت کی حاجت ہے اس سے زیادہ دوسری قسم کی حریت کی ضرورت ہے لیکن امام صاحب جس طرح پہلی منزل میں مستقیم تھے، دوسری منزل میں بھی در ماندہ نہ تھے، امام صاحب سے جب کوئی فتویٰ پوچھا جاتا اور اس وقت اس جزیہ پر اطلاع نہ ہوتی تو نہایت کشادہ پیشانی کے ساتھ فرماتے تھے کہ لاادری میں نہیں جانتا، امام کے شاگرد ابن وہب کہتے ہیں کہ اگر میں امام مالک کی لاادری لکھا کرتا تو کتنی تختیاں

(۱) تزکین الہمالک عن ابن نعیم ص ۸ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۱ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰۔

بھر جائیں۔ (۱)

ممالک بعیدہ کے استثناء سے احتراز: چنانچہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دور کے شہروں سے جو مستفتی آتے تھے امام صاحب ان کو بھی ایسا ہی جواب دیتے تھے، ابن عبدالبر کی روایت ہے کہ ایک شخص نہایت دور دراز مسافت سے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے ایک مسئلہ پوچھا، امام صاحب نے فرمایا کہ ”میں اس کو اچھی طرح نہیں جانتا“ سائل نے کہا کہ ”میں چھ مہینے کی راہ طے کر کے صرف اس مسئلہ کی خاطر حاضر ہوا ہوں جن لوگوں نے مجھ کو بھیجا ہے میں ان کو جا کر کیا جواب دوں گا، امام صاحب نے فرمایا کہ کہہ دینا کہ ”مالک نے کہا کہ میں نہیں جواب دے سکتا۔“ (۲)

امام صاحب کی یہ احتیاط درحقیقت شدت تقویٰ اور ایک نہایت دقیق نکتہ پر مبنی تھی، مفتی کی حالت یہ ہے کہ آج وہ ایک مسئلہ کی نسبت ایک رائے رکھتا ہے، دوسرے دن اس سے صحیح تر صورت اس کے خیال میں آتی ہے، ایسے موقع پر شہر اور اس کے قریب و جوار میں مستفتی کو اپنی غلطی کی اطلاع دے سکتا ہے لیکن اس زمانہ میں جب وسائل سفر آسان نہ تھے، دور کے مقامات میں تصحیح و تغلیط کی اطلاع مشکل تھی، امام صاحب کے ایک مصری دوست نے حیرت سے امام صاحب سے پوچھا کہ آپ ان بیماروں کو جو کوسوں سے مصائب سفر و مصارف برداشت کر کے آتے ہیں کیوں واپس کر دیتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا یہ صحیح ہے کہ مصری مصر سے، شامی شام سے، عراقی عراق سے آتے ہیں اور پوچھتے ہیں، مگر میں نے جو جواب آج دیا ہے اس کے بجائے اگر کل مجھ کو کچھ اور جواب معلوم ہو اس وقت کیا ہوگا“ حضرت لیث مصری نے جب امام کا یہ قول سنا تو رو پڑے کہ مالک لیث سے قوی تر ہیں اور لیث ان سے کمزور تر۔ (۳)

(۱) ترمین الہماک ص ۱۴ عن ابی نعیم (۲) جامع بیان العلم ابن عبدالبر ص ۱۲۵ مصر (۳) ترمین الہماک عن ابی نعیم ص ۱۴۔

رائے پوچھنے پر زجر: فتوؤں کے جواب میں اکثر فرماتے تھے کہ قال رسول اللہ کذا، سائل نے کہا آپ کی رائے کیا ہے؟ آپ نے جواب میں یہ آیت پڑھی (۱) فَلْيَخْذِرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ جب کسی مسئلہ قیاسی کو بیان فرماتے تو پہلے یہ آیت پڑھتے اِنْ نَّظُنُّ الْاِطْلَاقَ وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ۔

جواب میں کاوش فکر: مسائل و فتاویٰ کا جواب ہمیشہ نہایت دقت نظر اور کاوش فکر سے دیتے تھے، ابن ابی اویس کہتے ہیں کہ ایک بار امام صاحب نے فرمایا کہ کبھی کبھی ایسا مسئلہ پیش آجاتا ہے، کہ خواب و خور حرام ہو جاتا ہے، ابن ابی اویس نے کہا آپ کی بات تو لوگوں کو نقش فی الحجر کی طرح تسلیم ہوتی ہے، پھر آپ کیوں یہ مشقت برداشت کرتے ہیں، امام کس نکتہ سنجی کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ ”ابن ابی اویس! اس حال میں تو مجھ کو اور بھی کاوش کرنی چاہئے۔“ (۲)

انصاف پسندی: اگر کسی مسئلہ میں غلطی ہو جاتی اور کوئی شخص اس کی اصلاح کرتا تو فوراً تسلیم کر لیتے تھے، ایک شخص نے پوچھا کیا وضو میں پاؤں کی انگلیوں میں تحلیل کرنی چاہئے؟ امام نے فرمایا لیس ذالک علی الناس، ابن وہب امام کے شاگرد بیٹھے تھے، مجلس کے بعد انھوں نے کہا کہ تحلیل کی ایک حدیث میرے پاس ہے، امام نے حدیث سن کر فرمایا کہ حدیث حسن اور اس کے بعد پھر ہمیشہ فتویٰ اس کے موافق دیا۔ (۳)

امام مالک تقریباً ساٹھ برس مستقل فقہ و فتاویٰ میں مصروف رہے، امام کے تلامذہ نے ان کے مسائل فقہیہ کو مدون بھی کیا ہے، سب سے پہلی کتاب اسد بن فرات قاضی افریقہ کی ”اسدیہ“ ہے اور سب سے ضخیم ابن قاسم متونی (۱۹۱ھ) کی المدونہ ہے جو خود امام

(۱) تزئین الممالک عن ابی نعیم ص ۱۴ (۲) مناقب مالک للرواوی ص ۳۹ عن سعید بن مسیب (۳)

الرواوی ص ۲۷۔

کی زندگی میں مدون ہو رہی تھی، مدونہ مصر میں چھپ گئی ہے، تیسری کتاب ابن وہب مصری متوفی (۱۹۷ھ) کی کتاب المجالسات عن مالک ہے، ان کتابوں میں امام کے ہزاروں مسائل و فتاویٰ مدون ہیں، ابن قاسم مصنف مدونہ کے متعلق مشہور ہے کہ ان کو امام کے چالیس ہزار مسائل زبانی یاد تھے۔

## اہل علم کا اعتراف

امام مالک ارباب رائے میں داخل ہیں، محدثین نے ارباب رائے کا کم اعتراف کیا ہے لیکن اس کے باوجود امام صاحب محدثین میں وہی درجہ رکھتے ہیں جو صاحب فن اپنے اتباع اور مقلدین میں رکھتا ہے یحییٰ بن معین جو حدیث و رجال کے ناقد ہیں کہتے ہیں ”مالک اقلیم حدیث کے بادشاہ ہیں“ محدث کبیر سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ ”ہم لوگ مالک کے سامنے کیا چیز ہیں؟ ہم تو ان کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں، اگر امام مالک نے کسی شیخ سے روایت کی ہے تو اس سے کرتے ہیں ورنہ چھوڑ دیتے ہیں“ عبدالرحمن بن مہدی کا قول ہے، کہ ”روئے زمین پر مالک سے بڑھ کر حدیث کا کوئی امانت دار نہیں۔“

امام شافعی فرمایا کرتے تھے ”علماء میں امام مالک ستارہ ہیں“ محدث ابن نہیک کا قول ہے کہ ”صحت حدیث میں میں مالک پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔“ امام ابن ضبیل سے ایک شخص نے پوچھا کہ ”اگر کسی کی حدیث وہ زبانی یاد کرنی چاہے تو کس کی کرے؟“ جواب دیا کہ ”مالک بن انس کی۔“ ابن مہدی سے جو نہایت مشہور محدث ہیں ایک شخص نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ مالک ابو حنیفہ سے زیادہ فقیہ ہیں“ انھوں نے فرمایا ”میں نے یہ تو نہیں کہا، لیکن یہ کہتا ہوں کہ مالک ابو حنیفہ کے استاد (حماد) سے بھی زیادہ فقیہ ہیں۔“ سفیان بن عیینہ با ایں ہمہ علم و فضل، حلال و حرام اور حدیث معمول کا املاء امام مالک کے حلقہ میں بیٹھ کر سنتے اور وہاں سے اٹھ کر اپنے مستفیدین کے حلقہ میں بیٹھتے تھے

سفیان ثوری جو مجتہد مستقل ہیں وہ مناسک حج میں امام کی پیروی کرتے تھے، ابن معین جو نقد حدیث میں امام ہیں، فرماتے ہیں ”مالک خدا کی طرف سے خلق پر ایک حجت تھے۔“ ابن معین کا دوسرا قول ہے کہ ”اصحاب زہری میں مالک سے بڑھ کر کوئی اثبت نہیں“ یحییٰ بن سعید القطان جو امام حدیث ہیں فرماتے ہیں کہ ”مالک اس امت کے لئے رحمت تھے“ ابن ابی حازم نے ناقد حدیث درآوردی سے پوچھا کہ ”اس خدائے کعبہ کی قسم! مالک سے بڑا کوئی عالم تم نے دیکھا؟“ جواب دیا کہ ”خدا یا نہیں۔“

## عام حالات

اب ہم مجلس درس و استفادہ سے اٹھ کر دربار شاہی میں آتے ہیں، امام صاحب ۹۳ھ میں پیدا ہوئے تھے جب کہ ولید سریر آرائے خلافت تھا لیکن بچپن برس کے بعد ۱۱ھ میں جب امام تعلیم سے فارغ ہو کر شہرت عام حاصل کر رہے تھے تو خلافت امویہ کا دم باز واپس تھا (۱۳۳ھ) میں خلافت عباسیہ کے نام سے تاریخ کا نیا باب شروع ہوا۔

خلافت عباسیہ کا پہلا تاج دار ابو العباس سفاہ تھا، اس کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر منصور خلیفہ ہوا، اس انقلاب سے پہلے وہ مدینہ کی درس گاہ کا ایک طالب علم اور امام مالک کے طبقہ کا ایک شریک صحبت تھا۔

خلافت کے بعد منصور نے (۱۴۰ھ میں) پہلا حج کیا اور مکہ معظمہ کے بعد مدینہ منورہ آیا، شہر کے شرفا اور علما اس کے استقبال کے لئے نکلے، سفیان ثوری، سلیمان خواص اور امام مالک بھی اس لئے اس سے ملنے کے لیے آئے کہ کل تک وہ علم حدیث کی مجلسوں میں ان کے ساتھ برابر کا شریک تھا، دیکھیں اب وہ کس حال میں ہے؟ دربار میں حجاز کے تمام علما اور فقہا موجود تھے، منصور نے امام صاحب کی طرف خطاب کر کے کہا ”اے ابو عبد اللہ! میں اختلافات سے گھبرا گیا ہوں عراق میں تو کچھ نہیں ہے، شام میں صرف جہاد کا شوق ہے، کوئی

بڑا علم نہیں، جو کچھ ہے وہ حجاز میں ہے اور حجاز کے علما کے سرخیل آپ ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اس تصنیف مؤطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کر دوں کہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں اور تمام اطراف ملک میں اس کی نقلیں بھیجوں تاکہ اسی کے مطابق لوگ فتویٰ دیں۔“ بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے ایک ایسی کتاب کی تالیف کی خواہش ظاہر کی جو ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور ابن عمرؓ کے اصول فقہ کے بین بین اور معتدل ہو، اس کے بعد امام صاحب نے مؤطا تالیف کی۔

جاہ پسند علما کے لئے یہ طلائی موقع تھا لیکن امام صاحب کے قدم کو اس موقع پر لغزش نہ ہوئی، انھوں نے فرمایا کہ ”صحابہ تمام اطراف ملک میں پھیل گئے تھے، ان کے فتاویٰ اور احکام اپنے اپنے مقام میں وراثتہ ان کے فقہاء و علما تک پہنچے ہیں اور ہر جگہ وہی مقبول ہیں، ایسی حالت میں ایک شخص کی رائے و عقل پر جو صحت و غلطی دونوں کر سکتا ہے، تمام ملک کو مجبور کرنا مناسب نہیں“ منصور نے کہا ”اگر آپ مجھ سے متفق ہوتے تو میں یہی کرتا“ (۱) ایک بار اس نے پوچھا کہ ”اے عبداللہ! تم سے بھی زیادہ کوئی عالم ہے؟ امام نے فرمایا ”ہاں“ پوچھا ”وہ کون ہے؟“ فرمایا ”ان کا نام یاد نہیں“ منصور نے کہا ”میں نبو امیہ کے زمانہ میں طلب علم کر چکا ہوں سب کو جانتا ہوں۔“ (۲)

امام مالک کے فضل و کمال کا اعتراف منصور نے نہ صرف امام کے سامنے کیا بلکہ پیٹھے پیچھے بھی کرتا تھا، ایک بار ان کی عدم موجودگی میں فرمایا کہ ”سفیان ثوری اور امام مالک ابن انس کے سوا کوئی نہیں جس کا ادب کیا جائے۔“

نئے تاج دار امویوں کے استیصال اور بیخ کنی میں لگے ہوئے تھے اور منصور نے احتیاط یا سوہ ظن کی بناء پر فاطمی و علوی سادات کی بیخ کنی شروع کر دی، آخر تک آکر ان ہی

(۱) تذکرۃ الصحا ج ۱ ص ۱۸۹، کتاب الاملاۃ ابن قتیبہ ج ۲ ص ۲۷۱، مناقب مالک للروادوی ص ۲۳ (۲)

سادات میں سے ۱۳۵ھ میں محمد نفس زکیہ نے مدینہ میں علم بغاوت بلند کر دیا، اکثر لوگوں نے ان کا ساتھ دیا لیکن تقدیر ساتھ نہ تھی، بڑی بہادری سے میدان جنگ میں لڑے مگر مارے گئے، ان کے بعد ان کے بھائی ابراہیم اس ساز و سامان سے نکلے کہ منصور بدحواس ہو گیا، چند مہینوں کے بعد ابراہیم کی شہادت پر جنگ کا خاتمہ ہو گیا، منصور نے اپنے عم زاذ بھائی جعفر کو مدینہ کا والی مقرر کیا۔

امام مالک منصور کی نوازشوں کے باوجود ان تمام کوششوں میں حق کے ساتھ تھے، امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ ”خلافت نفس زکیہ کا حق ہے“ لوگوں نے پوچھا کہ ”ہم منصور کی بیعت پر حلف اٹھا چکے ہیں،، امام صاحب نے فرمایا ”منصور نے جبراً بیعت لی ہے (۱) اور جو کام جبراً کرایا جائے شرع میں اس کا اعتبار نہیں، حدیث میں ہے کہ اگر جبراً طلاق کسی سے دلائی جائے تو واقع نہ ہوگی۔“

طلاق مکہ کا فتویٰ: جعفر نے مدینہ پہنچ کر نئے سرے سے لوگوں سے بیعت لی، امام مالک کو کہلا بھیجا کہ آئندہ طلاق جبری کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں کہ لوگوں کو بیعت جبری کی بے اعتباری و عدم صحت کے لئے سند ہاتھ آئے لیکن امام صاحب نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور بدستور جبری معاملہ کے عدم صحت کا فتویٰ دیتے رہے، جعفر نے غضبناک ہو کر غم دیا کہ ان کو ستر ۷۰ کوڑے مارے جائیں، چنانچہ امام دارالہجرۃ حکمہ امارت میں گنہگاروں کی طرح لائے گئے، کپڑے اتارے گئے اور شانہ امارت پر دست ظلم نے ستر ۷۰ کوڑے پورے کئے، تمام پیٹھ لہو لہان ہو گئی، دونوں ہاتھ مونڈھے سے اتر گئے، اس پر بھی جعفر کی تسلی نہ ہوئی تو حکم دیا کہ اونٹ پر بیٹھا کر شہر میں ان کی تشہیر کی جائے، امام صاحب بایں حال زار بازاروں اور گلیوں سے گذر رہے تھے اور زبان صداقت نشان باواز بلند کہہ رہی تھی ”جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا ہے وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں، فتویٰ دیتا

(۱) ان واقعات کے لئے دیکھو کتاب الامت ج ۲ ص ۲۸۲، ابن خلدون ج ۳ ص ۱۹۰۔



ہوں کہ ”طلاق جبری درست نہیں۔“ (۱)

اس کے بعد اسی طرح خون آلودہ کپڑوں میں مسجد نبوی میں تشریف لائے، پشت مبارک سے خون صاف کیا اور دو رکعت نماز پڑھ کر لوگوں سے فرمایا کہ ”سعید بن مسیب کو جب کوڑے مارے گئے تھے تو انھوں نے بھی مسجد میں آکر نماز پڑھی تھی“ (۲) یہ تعزیر گو تحقیر کے لئے تھی لیکن اس نے امام کی عزت و وقار کے پایہ کو اور بلند کر دیا، یہ واقعہ (۱۴۷ھ) کا ہے۔ (۳)

منصور کی لاعلمی اور ندامت: جعفر والی مدینہ کی یہ حرکت منصور کو پسند نہ آئی اور فوراً اس کو معزول کر کے بذلت تمام گدھے پر سوار کر کے بغداد طلب کیا اور امام مالک کو معذرت کا خط لکھا۔

دوسرے سال ۱۵۸ھ میں جب کہ تمام حجاز و عراق میں سکون ہو چکا تو حج کے ارادہ سے منصور حجاز آیا امام مالک طے کو آئے اور بعض روایتوں میں ہے کہ حج سے پہلے خود امام کو بغداد بلا بھیجا اور نہایت تعظیم سے ملا اور بوثوق کہا کہ ”نہ میں نے تعزیر کی اجازت دی اور نہ مجھے اس کا علم ہوا، امام صاحب نے فرمایا کہ ”ہاں آپ کو اطلاع نہ ہوگی“ منصور نے خلعت پیش کیا، قاعدہ تھا کی خلعت کے کپڑے درباری کے کندھے پر رکھ دیئے جاتے تھے، حاجب نے یہی عام طریقہ امام صاحب کے ساتھ برتنا چاہا، امام صاحب پیچھے ہٹ گئے، منصور نے حاجب کو ڈانٹا کہ اس خلعت کو آپ کے فردگاہ میں پہنچا دو۔“

منصور کو ایک بار معلوم ہوا کہ علمائے میری حکومت سے ناراض ہیں تو اس نے خلاف وقت شب کو ابن ابی ذئب و ابن سمان اور امام مالک کو طلب کیا، امام صاحب واقعہ سمجھ گئے، زندگی سے ناامید ہو کر، غسل فرما کر، کفن کے کپڑے پہن کر اور حنوط مل کر دربار میں

(۱) طبقات ابن سعد ترجمہ مالک، مناقب للروادی (۲) تزئین تھلا عن الخطیب روایت عن ابی وہب ص ۱۳

(۳) کتاب الانساب سمعانی ترجمہ ”صحیح“۔

آئے، منصور نے کہا اے گروہ فقہاء! مجھ کو ایک خبر معلوم ہوئی ہے جس کا افسوس ہے، تمہارا فرض تھا کہ پہلے تم لوگ میری اطاعت کرتے اور مجھ کو برا کہنے سے باز رہتے، پھر اگر مجھ میں کچھ عیب تھا تو مجھ کو نصیحت کرتے، امام صاحب نے فرمایا کہ امیر المؤمنین خدا کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ  
فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ  
تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ  
فَتُضِيبُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ  
نَادِمِينَ. (حجرات: ۱)

مسلمانو! اگر کوئی فاسق تم کو کچھ خبر دے  
تو اس کی تحقیق کر لو، ایسا نہ ہو کہ  
نادانستگی میں بے گناہوں کو ستاؤ، پھر  
اپنے کئے پر تم کو ندامت ہو۔

منصور نے کہا، اچھا بتاؤ کہ میں تمہارے نزدیک کیسا ہوں؟ امام نے فرمایا مجھے اس کے جواب دینے سے معاف کرو، منصور نے ابن سمان کی طرف رخ کیا، وہ بولے ”امیر المؤمنین آپ سب سے بہتر ہیں، حج کرتے ہیں، جہاد کرتے ہیں، مظلوموں کی امداد کرتے ہیں، اسلام کی پشت پناہ ہیں، عادل ہیں، اب منصور نے ابن ابی ذئب سے پوچھا کہ تم مجھ کو کیسا سمجھتے ہو، ابن ابی ذئب نے نہایت دلیری سے کہا کہ ”تم بدترین مخلوق ہو، مسلمانوں کی تمام دولت اپنی شان و شوکت میں صرف کرتے ہو، غریبوں کو ہلاک اور امیروں کو پریشان کر ڈالا، بتاؤ کل تم خدا کے سامنے کیا جواب دو گے؟“ منصور نے کہا ”تم دیکھتے ہو کہ تمہارے سامنے یہ کیا چیز ہے“ ابن ابی ذئب نے کہا ”ہاں نیکی تلواریں دیکھتا ہوں لیکن آج کی موت کل کی موت سے بہتر ہے۔“

تھوڑی دیر کے بعد ابن سمان اور ابن لبی ذئب چلے گئے لیکن امام تشریف فرما رہے، منصور نے کہا ”مجھے آپ کے کپڑوں سے حنوط کی بو آتی ہے،“ امام صاحب نے فرمایا اس بے وقت کی طلہی سے میں اپنی زندگی سے مایوس ہو کر آیا تھا، منصور نے کہا ”سبحان

اللہ ابو عبد اللہ کیا میں خود اپنے ہاتھ سے اسلام کا ستون گراؤں گا۔“ (۱)

۱۵۸ھ میں منصور نے انتقال کیا اور محمد المہدی اس کا جانشین ہوا اور ۱۶۰ھ میں حج کے ارادہ سے عازمِ حجاز ہوا، حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ آیا، شہر کے قریب پہنچا تو شرفاً و علمائے شہر نے استقبال کیا جن میں امام مالک بھی تھے، مہدی نے امام کو سلام کر کے سینہ سے لگا لیا، اس سال حجاز میں سخت قحط تھا، موقع پا کر امام نے فرمایا ”امیر المؤمنین اس وقت آپ جس شہر میں جا رہے ہیں وہاں مہاجرین و انصار کی اولاد آباد ہے، وہ روضہ نبوی کے ہمسایہ ہیں“ مہدی امام کا مقصد سمجھ گیا اور ۲۵ لاکھ درہم امام کے پاس بھیج دیئے کہ تقسیم کر دیجیے، امام نے رقم اپنے معتمد تلامذہ کے حوالہ کی کہ حسب حاجت لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ (۲)

ایک مرتبہ تین ہزار دینار اپنے صاحبِ اعظم ربیع کے ہاتھ امام کی خدمت میں بھیجے اور خواہش ظاہر کی کہ آپ بغداد میرے ساتھ چلیں، امام صاحب نے قاصد سے کہا تھیلیاں اب تک سربستہ اسی طرح پڑی ہیں، جی چاہے لے جاؤ لیکن مالک مدینہ نہیں چھوڑ سکتا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے المدینۃ خیر لہم لو کانوا یعلمون۔ (۳)

ایک مرتبہ مہدی نے سواری بھیجی کہ اس پر سوار ہو کر بارگاہِ خلافت میں آئیں، امام نے سواری واپس کر دی کہ میں مدینہ میں سوار ہو کر نہیں نکلتا کیونکہ ان گلیوں میں رسول اللہ چلتے پھرتے تھے، پیادہ آئے بیمار تھے، اس لئے بعض مشاہیر علمائے مدینہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے، مہدی نے کہا سبحان اللہ، اگر میں خود یہ خدمت ان سے لینا چاہتا تو شاید ان میں سے کوئی قبول نہ کرتا، مغیرہ نے کہا ”امیر المؤمنین! مالک جس سے ٹیک لگا کر بیٹھیں وہ اس کے لئے شرف ہے۔“ (۴)

(۱) کتاب الامامہ و السیاسة ج ۲ ص ۲۶ مصر (۲) کتاب الامامة و سیاسة ج ۲ ص ۲۹۰ و مناقب مالک

للرواوی ص ۲۷ (۳) تذکرہ ذہبی ج ۱ ص ۱۸۹ (۴) زواوی عن ابی مصعب ص ۲۸۔

مہدی نے اسی سفر میں موطا کی سماعت کی بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ مہدی ہی کے لیے امام نے موطا لکھی گو یہ صحیح نہیں، مہدی نے موسیٰ و ہارون اپنے دونوں بیٹوں کو حکم دیا کہ امام سے موطا سنیں، شہزادوں نے امام کو بلا بھیجا، امام صاحب نے فرمایا ”علم بیش قیمت شے ہے، اس کے پاس خود شائقین آتے ہیں“ اس جواب پر مہدی کی اجازت سے دونوں شہزادے خود مجلس درس میں حاضر ہوئے، شہزادوں کے اتالیق نے کہا پڑھ کر سنائیے، امام صاحب نے فرمایا کہ ہمارے علما کا دستور یہ ہے کہ طلبہ پڑھیں، شیوخ سنیں، مہدی کو اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے کہا ان علما کی اقتدار اور تم خود پڑھو، چنانچہ شہزادوں نے خود پڑھا اور امام نے سماعت کی۔ (۱)

۷۱۰ھ میں ہارون رشید خلیفہ ہوا، خلافت کے پہلے ہی سال حج و زیارت کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ حاضر ہوا، لوگ پیادہ استقبال و تہنیت کے لئے نکلے، امام صاحب بھی حمل میں سوار ہو کر آئے، ہارون رشید نے ان کو دیکھ کر بڑی مسرت ظاہر کی اور کہا آپ کی تصنیفات پہنچیں، میں نے خاندان کے نوجوانوں کو ان کے مطالعہ تاکید کی ہے لیکن اس کا کیا سبب ہے کہ میں نے ان میں ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ کی روایتیں نہیں پائیں، امام نے فرمایا امیر المومنین! یہ دونوں بزرگوار ہمارے شہر میں نہ تھے۔

۷۱۴ھ میں ہارون رشید اپنے دونوں شہزادوں امین و مامون کو لے کر حج کے لیے آیا اور موطا کے املا کے لیے امام کو سرپردہ خلافت میں طلب کیا، امام صاحب نے انکار کیا اور خود موطا کے بغیر تشریف لائے، ہارون رشید نے شکایت کی، امام صاحب نے فرمایا، ”علم تیرے گھر سے نکلا ہے، خواہ اس کو ذلیل کر، خواہ عزت دے، یہ سن کر ہارون رشید متاثر ہوا، اور امین اور مامون کو لے کر مجلس درس میں حاضر ہوا، وہاں طلبہ کا ہجوم تھا، ہارون رشید نے امام سے کہا اس بھیڑ کو الگ کر دیجئے“ امام نے فرمایا شخص فائدہ کے لیے عام افادہ کا خون

(۱) تزئین الممالک ص ۳۵۔

نہیں کیا جاسکتا؟“ ہارون رشید مسند پر بیٹھ گیا، امام نے فرمایا امیر المؤمنین ”تواضع پسندیدہ ہے۔“ یہ سن کر ہارون نیچے اتر گیا، اور امام سے درخواست کی کہ آپ قرأت کیجئے امام نے فرمایا خلاف عادت ہے،“ اور معن بن عیسیٰ کو جو ایک مستعد طالب علم تھے اور آگے چل کر بڑے بڑے محدثین کے استاد ہوئے اشارہ کیا، انھوں نے قرأت شروع کی، اور ہارون نے مع شہزادوں کے سماعت کی۔

اس سفر میں شام و عراق و حجاز کے کل علما کے ساتھ تھے، قاضی ابو یوسف بھی اس مجمع میں شریک تھے، ہارون رشید نے ان سب علما کی ایک علمی مجلس منعقد کی، امام صاحب مسند تریس پر رونق افروز ہوئے موطا کا املا شروع ہوا، ہر مسئلہ کے اختتام پر فقہا و محدثین سکوت کی زبان سے صحت کا اعتراف کرتے جاتے تھے، فقہی معلومات کا ایک دریا تھا جو زبان امامت سے امنڈ امنڈ کر سواحل قلوب تک پہنچ رہا تھا۔

ہارون رشید کے نام امام مالک کا ایک رسالہ بھی ہے جس میں امام نے ہارون کو نصائح کئے ہیں اور آداب و سنن کی تعلیم دی ہے، رسالہ مصر میں ۱۳۲۲ھ میں چھپ گیا ہے اور لاہور میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

## وفات

آخر عمر میں اتنے ضعیف و ناتواں ہو گئے تھے کہ مسجد نبوی کی حاضری، جماعت میں شرکت اور غم و شادی کی تقریبوں میں آنا جانا بند ہو گیا تھا، لوگ اعتراض کرتے تو فرماتے کہ ”ہر شخص اپنا ہر عذر نہیں بیان کر سکتا“ معن بن عیسیٰ م ۱۹۸ھ جو امام کے عزیز ترین شاگرد تھے امام کے خادم تھے، امام صاحب انہی کے سہارے چلتے تھے لیکن اس ضعف و ناتوانی کے عالم میں بھی درس و افتاء کی خدمت جاری تھی، یحییٰ بن یحییٰ اندلسی مصمودی امام اندلس جب دوسری بار مصر سے لوٹ کر مدونہ کی سند لینے کے لئے آئے تو امام صاحب بستر مرض الموت پر تھے۔

اتوار کے روز بیمار پڑے اور تقریباً تین ہفتہ بیمار رہے، مرض کی شدت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی، لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب وقت آخر ہے، مدینہ کے تمام علما و امرا آخری دیدار کے لئے جمع ہو گئے، یحییٰ اندلسی کا بیان ہے کہ مجھے تو اپنی محرومی کا رونا تھا ہی، وہ لوگ بھی جو مدتوں امام کی ملازمت کا شرف حاصل کر چکے تھے وہ بھی روتے تھے، تلامذہ کے علاوہ حدیث و فقہ کے ایک سوساٹھ علما مؤدب باچشم گریاں آس پاس بیٹھے تھے۔

نبض کی حرکت آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، تعینی جو امام کے انحص تلامذہ میں تھے، وہ اس وقت حاضر ہوئے، اور گریہ کا سبب دریافت کیا، فرمایا کہ تعینی! میں نہ روؤں تو کون روئے، اے کاش! مجھ کو میرے ہر قیاسی فتویٰ کے بدلہ ایک کوڑا مارا جاتا اور میں فتویٰ نہ دیتا۔“ گریہ جاری تھا اور لب متحرک تھے کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

امام صاحب بروایت صحیحہ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱ ربیع الاول ۱۷۹ھ کو انتقال فرمایا، ۸۶ برس کی عمر پائی، ۱۱۷ھ میں مسند درس پر قدم رکھا اور ۶۳ برس تک علم و دین کی خدمت میں مصروف رہے۔

جنازہ میں ایک خلقت کا ہجوم تھا، والی مدینہ عبداللہ بن محمد ہاشمی خود پیادہ شریک تھا، اور نعش اٹھانے والوں میں داخل تھا، جنہ البقیع جس کی خاک میں اسلام کے ارکان عظام و اعلام کرام مدفون ہیں امام مدینہ کا جسد مبارک بھی اسی خاک کو سپرد ہوا۔ (۱)

درد راز شہروں اور ملکوں کے علما کو جب امام کی وفات کی خبر پہنچی تو ہر جگہ ماتم کیا گیا، کوفہ میں سفیان بن عیینہ کو جب معلوم ہوا تو ان پر سکوت طاری ہو گیا اور جب بولے تو یہ بولے کہ ”روئے زمین پر مالک نے اپنی مثال نہیں چھوڑی“ حماد بن زید نے کہا ”خدا ان پر رحم کرے، مذہب میں ان کا بڑا مقام تھا۔“

(۱) ان بیانات کے لئے ملاحظہ ہو ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۱ تزئین المسالک ص ۳۱۔

امام کی تاریخ پیدائش و وفات پر ایک بزرگ نے یہ قطعہ کہا ہے۔

فخر الأئمة مالک نعم الامام لسالك

مالک اماموں کے فخر ہیں۔ پیرو کے لیے بہترین پیشوا ہیں

مولدہ "نجم ہدی" وفاتہ فزاز مالک (۱)

ان کی تاریخ پیدائش ہدایت کا ستارہ ہے۔ اور ان کی تاریخ وفات یہ ہے

کہ مالک کامیاب ہے۔

## اخلاق و عادات اور ذاتی حالات

طاعتِ الہی: امام کا شمار عبادِ زمانہ میں تھا، (۲) درس و افتاء سے جو وقت بچتا وہ زیادہ تر عبادت اور تلاوت میں صرف ہوتا، امام کی خواہر محترمہ سے کسی نے پوچھا کہ امام مالک گھر میں کیا کرتے تھے، جواب دیا ان کے دو کام تھے، "المصحف والتلاوة" (۳) امام صاحب کی صاحبزادی سے منقول ہے کہ امام جمعہ کی شب عبادت و طاعت میں مشغول رہتے تھے، امام صاحب کے بھانجے ابن ابی یونس سے روایت ہے کہ امام مہینہ کی پہلی تاریخ کو شب زندہ دار رہتے تھے۔ (۴)

حب رسول: حضرت سرور کائنات ﷺ کا بے حد ادب کرتے تھے، جب نام مبارک زبان پر آتا چہرہ کارنگ متغیر ہو جاتا، لوگ پوچھتے تو فرماتے کہ ہم نے جن مقدس بزرگوں کی زیارت کی ہے، ان کی حالت مجھ سے بھی بڑھ کر تھی۔ (۵)

مسجد نبوی میں جس کے ایک حجرہ میں روضہ انور ہے، شور و غل ناپسند فرماتے کہ یہ آستانہ نبوت۔ بے گستاخی ہے، کلام نبوی اس وقت تک زبان پر نہیں آتا جب تک وضو یا

(۱) بستان المحدثین ص ۳ (۲) کتاب المہرست ابن ندیم ذکر عباد ص ۲۶۰ (۳) مناقب مالک للروادوی

ص ۳۳ (۴) تزئین الممالک ص ۱۸ (۵) مناقب مالک للروادوی ص ۳۳۔

تذکرۃ الحدیثین.... گلستان حدیث کے ہسکتے گا، یوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

عسل فرما کر بادب بیٹھ نہ لیتے، امام کے اصطلیل میں کثرت سے گھوڑے اور خچر تھے، مگر کبھی مدینہ کی گلیوں میں سوار ہو کر نہ نکلے، لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ ”مجھے شرم آتی ہے کہ جو سر زمین قدوم نبوی سے مشرف ہوئی ہے اس کو میں جانوروں کے سموں سے روندوں (۱) ذات نبوی کی محبت اور حدیث نبوی کے شغل وانہماک کے سبب سے کوئی شب ایسی نہ گذرتی جس میں عالم رویا میں زیارت نبوی کا شرف حاصل نہ ہوتا۔ (۲)

حب مدینہ: امام کو مدینہ سے غایت درجہ محبت تھی، بجز سفر حج کبھی مدینہ سے باہر نہیں نکلے، منصور نے بغداد کی سکونت کے لئے درخواست کی، پذیرا نہ ہوئی، مہدی نے تین ہزار دینار بھیجے اور کہلا بھیجا کہ بغداد کا عزم کیجئے، فرمایا ”اشر فیاں علیٰ ہاہار کھی ہیں، جی چاہے تو لے جاؤ مگر مالک سے مدینہ نہیں چھوٹ سکتا۔ (۳) انتہائے محبت یہ ہے کہ جمہور اسلام کے خلاف امام مکہ معظمہ پر مدینہ منورہ کو فضیلت دیتے ہیں۔ (۴)

فیاضی: امام مالک طبعاً فیاض تھے، ایک بار امام شافعی کو لے کر اصطلیل کا ملاحظہ کر رہے تھے، امام شافعی نے بعض گھوڑوں کی تعریف کی، امام صاحب نے تمام اصطلیل ان کی نذر کر دیا، (۵) ہر سال امام شافعی کو گیارہ ہزار دینار مرحمت فرماتے تھے۔

مہمان نوازی: مہمان نوازی عربوں کا خاصہ اور ایک مؤمن کا فرض ہے لیکن امام صاحب کا اخلاق میزبانی اس سے بھی زیادہ تھا، امام شافعی جو طالب علم کی حیثیت سے ان کے گھر میں ٹھہرتے تھے، امام ان کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے خوان اٹھا کر لاتے تھے، صبح کی نماز کے لیے اپنے ہاتھ سے پانی لا کر رکھتے تھے، باوجود وقار کے رخصت کے وقت خود بازارتک جا کر سواری کر دی اور روپیے کی ایک تھیلی زاوڑاہ کے لئے عنایت کی۔ (۶)

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ و بسن الحدیثین ص ۷ (۲) ترمذی عن ابی نعیم والحطیب ص ۱۲ (۳) تذکرہ ذہبی ج ۱ ص ۱۹۰ (۴) اعلام علماء الاعلام لعبد الکریم بن محب اللہ الحلی ص ۳ قمی کتب خانہ باکی پور (۵) توالی التالیس معالی ابن ادریس لابن حجر (۶) مرآت الادواق ابن حجر ص ۲۰۰



صبر و استقلال: استقلال و ضبط کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ موزہ میں بچھو تھا، امام مالک نے بے خبری میں اس کو پہن لیا، اور مجلس درس میں آکر بیٹھ گئے، بچھو نے مسلسل سترہ بار ڈنگ مارا لیکن آداب مجلس کے خیال سے امام نے پہلو تک نہ بدلا، چہرہ کارنگ بار بار متغیر ہو رہا تھا، اختتام درس کے بعد عبد اللہ بن مبارک نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ موزہ میں بچھو ہے۔ (۱)

حلم و عفو: خودداری و جلالت شان کے ساتھ حلم و عفو جو ایک گراں قدر جوہر ہے، اکثر جمع نہیں ہوتا لیکن امام میں یہ دونوں صفیں مجتمع تھیں، ایک طرف تو منصور ورشید جیسے قہار سلاطین کو ڈانٹ دیتے ہیں، دوسری طرف آپ کے شانہ مبارک پر ذلیل ہاتھوں سے کوڑا مارا جاتا ہے تو آپ انگیز کرتے ہیں اور منصور جب مجرم کی سزا کا ذکر کرتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے معاف کیا۔ (۲)

حق گوئی و آزادی: امام صاحب خلفا کے دربار میں آمد و رفت رکھتے تھے، بعض لوگوں کو اس پر اعتراض تھا، امام صاحب نے فرمایا کہ ”اگر نہ جاؤں تو حق گوئی کا موقع کہاں ملے؟“ (۳) امام مالک کو اس لئے کوڑے مارے گئے کہ حق کے اظہار میں انھوں نے حکومت کی پروا نہ کی، ایک بار منصور نے مسجد نبوی میں زور و شور سے مناظرہ شروع کیا، امام نے فرمایا کہ ادب ملحوظ رہے، لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ، عباسیوں کے مقابلہ میں محمد نفس زکیہ نے جب علم بلند کیا تو آپ نے علی الاعلان فتویٰ دیا کہ خلافت محمد نفس زکیہ کا حق ہے، عباسیوں نے زبردستی بیعت لی ہے۔

خودداری: علم کی شان یہ ہے کہ اس کی جلالت ملحوظ رکھی جائے تاکہ لوگوں میں اہل علم کا وقار قائم رہے اور ان میں اکتساب علم کا ذوق پیدا ہو، امام مالک نے اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، اوپر گزر چکا ہے کہ امام صاحب مجلس درس میں بڑے وقار و متانت اور خودداری کے ساتھ

(۱) بستان المحمدین ص ۶۷ و ۷۰ (۲) کتاب الامامة ابن قتیبة ج ۲ ص ۲۸۶ (۳) مناقب مالک للروادوی

بیٹھے تھے، لوگ اعتراض کرتے تو فرماتے کہ اریدان اجل العلم یعنی ”میں چاہتا ہوں کہ علم کی شان بڑھاؤں“ بڑے بڑے امرا اور حکام آستانہ امامت پر حاضر ہوتے ہوئے کانپتے تھے، رشید نے اپنے خیمہ میں اطلائے حدیث کے لئے بلایا تو فرمایا ”لوگ علم کے پاس آتے ہیں، لوگوں کے پاس علم نہیں جاتا“ رشید خود آیا تو مسند درس پر بیٹھنا چاہا، فرمایا تو اضع محبوب ہے، رشید نے کہا آپ پڑھئے فرمایا اپنی یہ عادت نہیں۔ (۱)

منصور کے دربار کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی دربار میں آتا تو خلیفہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا، امام نے کبھی یہ ذلت گوراندہ کی۔

انصاف پسندی: لیکن اس خودداری اور اس اظہار حق سے زیادہ گراں قیمت اور مشکل الحصول شے انصاف پسندی ہے، وہ بھی اپنے نفس کے مقابلہ میں امام صاحب کا یہ حال تھا کہ جس مسئلہ پر عبور نہ ہوتا تو بھجانت فرمادیتے کہ ”مجھے نہیں معلوم“ آپ کے ایک شاگرد کا قول ہے کہ میں امام کے ”نہیں معلوم“ کو لکھا کرتا تو تختیاں بھر جاتیں۔

ابن القاسم امام کے ایک شاگرد نے کہا کہ مصر کے علماء بیع و شرا کے مسائل میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، امام مالک نے پوچھا، انھوں نے کس سے ان کی تعلیم پائی، ابن القاسم نے کہا کہ آپ سے، فرمایا کہ مجھے تو خود ان میں دخل نہیں۔ (۲)

اہل علم کی عزت: خلیفہ ہارون رشید مجلس درس میں آیا تو اس کو مسند سے نیچے اتر کر بیٹھنا پڑا لیکن ایک بار امام ابوحنیفہ تشریف لائے تو امام نے اس قدر تعظیم کی کہ ان کے لیے اپنی چادر فرش پر بچھائی، وہ اٹھ گئے تو طلبہ سے کہا کہ یہ عراق کے ابوحنیفہ ہیں، جو اس ستون کو سونا ثابت کرنا چاہیں کر سکتے ہیں، اس کے بعد کوفہ کے محدث سفیان آئے تو ان کی بھی تعظیم کی لیکن اس سے کم، ان کے چلے جانے کے بعد فرمایا کہ لوگوں کی علی قدر مراتب عزت کرنی چاہئے۔

(۱) مناقب مالک للروادى ص ۲۹ (۲) مختصر جامع بیان العلم لابن عبدالبر ص ۱۲۵۔

تذکرۃ الحمدین ..... گلستان حدیث کے ہر سکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

73

عبدالرحمن بن قاسم آپ کے شاگرد تھے لیکن جب ان کو خط لکھتے تھے تو ”فقہ مصر“ لکھا کرتے تھے، ایک بار آپ کے نامور شاگرد یعنی محدث مدینہ آرہے تھے، تو امام صاحب اپنے تلامذہ کو لے کر خود بنفس نفیس ان کے استقبال کے لئے شہر سے باہر نکل آئے۔ (۱)

حلیہ: رنگ سرخ و سپید، قد بلند و بالا، بدن بھاری، پیشانی کشادہ، آنکھیں بڑی، ناک اونچی، داڑھی بڑی اور گھنی، سر میں قدرتا بال نہ تھے، مونچھوں کو بہت چھوٹی کرانا پسند کرتے تھے، خضاب کا استعمال کبھی نہیں کیا۔

پوشاک: مزاج میں صفائی اور نزاہت غایت درجہ تھی، ہمیشہ نفیس اور بیش قیمت پوشاک زیب بدن فرماتے تھے، بعض لوگ اس پر نوکتے تو فرماتے کہ میں اس شہر (مدینہ) کے جس عالم سے ملا اس کو خوش پوشاک پایا، امام صاحب کو اپنے کپڑوں کا خاص اہتمام تھا، عدن کے کپڑے اس زمانہ میں مشہور اور بیش قیمت ہوتے تھے، وہاں سے اپنے لئے کپڑے منگواتے تھے، کبھی کبھی مرو کے بنے ہوئے کپڑے بھی استعمال کرتے۔ (۲)

خوشبو کا استعمال ہمیشہ کرتے تھے، عود کی انگلیٹھیاں جلتی رہتی تھیں، کپڑے خوشبو سے بے رہتے تھے، جس گلی سے ایک بار نکل جاتے، دیر تک اس میں خوشبو پھیلی رہتی اور اکثر فرماتے کہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ خدا نے جس کو نعمت دی ہو اس کے آثار اس پر نہ ظاہر ہوں، کبھی کبھی طیلان کا بھی استعمال کرتے جو اس زمانہ میں علما کی نشانی تھی، عمامہ جب زیب سرفرماتے تو شملہ گلے میں لپیٹ کر دائیں یا بائیں شانہ پر ڈال لیتے، ہاتھ میں ایک چاندی کی انگوٹھی تھی، جس کے سیاہ پتھر کے نگینہ پر حسبنا اللہ و نعم الوکیل نقش تھا۔

امام مالک کا یہ شرف کیا کم ہے کہ مدینہ مطہرہ کی خاک پاک جسم مبارک کا عنصر تھی لیکن اس سے بھی زیادہ شرف یہ ہے کہ مسکن وہ تھا جو حضرت عبداللہ بن مسعود کا مکان تھا اور

(۱) تذکرۃ ذہبی ج ۱ ص ۳۵۱ (۲) ابن ندیم مطبوعہ یورپ ص ۲۸۰ و مرآة الجنان ج ۱ ص ۳۷۳ و ۳۷۴

74 رتذکرۃ المحدثین ..... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان انفرز تحقیقی تذکرہ

مجلس و نشست گاہ وہ تھی جو حضرت عمر فاروقؓ کا دولت خانہ تھا، یہیں اکثر ائمائے حدیث کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، اس بنا پر امام مالک نہ صرف علوم و معارف فاروقی کے وارث تھے، بلکہ ان کی مادی جائداد کا بھی خدا نے انھیں وارث بنایا تھا۔

## تصنیفات

اس عہد میمون میں تصنیف و تالیف کی ابتدا ہو چکی تھی، امام کے دست مبارک سے جو کتابیں ترتیب پائی ہیں یا ان کی طرف منسوب ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- مؤطا کی نسبت مفصل بحث آگے آئے گی، مؤطا اور ان کی دوسری تصنیفات میں پہلا امتیاز یہ ہے کہ مؤطا کی روایت امام کے تلامذہ نے کی ہے اور بقیہ رسائل و کتب صرف بعض تلامذہ کی روایت سے ثابت ہیں۔

۲- رسالۃ مالک الی الرشید: یہ خلیفہ ہارون رشید کے نام خط کے طور پر ۲۲ صفحہ کا ایک رسالہ ہے جس میں امام نے خلیفہ کو ہر قسم کے دینی و دنیاوی و اخلاقی نصائح کئے ہیں۔

بعض علماء نے اس بناء پر اس کی نسبت امام صاحب کی طرف کرنے سے انکار کیا کہ اس میں بعض ضعیف و منکر حدیثیں ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ اخلاقیات میں محدثین اس قدر احتیاط نہیں کرتے تھے، ابن ندیم نے الفہرست میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ رسالہ چھپ گیا ہے اور لاہور میں کسی شخص نے اس کا اردو ترجمہ بھی چھاپا ہے۔

۳- احکام القرآن: یہ خود امام کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور ماہر علوم قرآن علامہ ابو محمد سکی بن ابی طالب اندلسی متوفی (۴۳۷ھ) کی تالیف ہے امام مالک سے جو احکام قرآن یعنی آیات احکامیہ کی تفسیریں مروی ہیں ان کو علامہ موصوف نے اس میں یکجا کر دیا ہے، اسی لئے اس کا پورا نام کتاب الماثور عن مالک فی احکام

القرآن ہے۔ (۱)

۳- المدونة الكبرى: فقہ لکھی کی ضخیم کتاب ہے، بعض لوگ اس کو خود امام کی تصنیف بتاتے ہیں حالانکہ عبدالرحمن بن قاسم متوفی ۱۹۱ھ امام کے ایک شاگرد کی تصنیف ہے، البتہ اس لحاظ سے امام کی تصنیف کہنا درست ہے کہ یہ کتاب درحقیقت ان کے ”ملفوظات فقہیہ“ کا مجموعہ ہے، ابن قاسم نے امام کے زمانہ میں مدینہ سے واپس آکر امام کے مجہذات واقوال کو ایک کتاب کی صورت میں مدون کرنا شروع کیا تھا اور شاید اسی زمانہ میں ختم بھی ہو گئی تھی کیونکہ یحییٰ بن یحییٰ مضمودی دوسری بار مصر سے مدونہ ابن قاسم کو خود امام سے سننے کے لئے آئے تھے لیکن افسوس کہ امام اس وقت بستر مرض پر تھے۔ (۲) مصر میں مدونہ چھپ گئی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے۔

۵- رسالة مالك الی ابن مطرف: غسان بن محمد بن مطرف کے نام ”فتویٰ“ کی بحث پر ایک رسالہ ہے۔

۶- رسالة مالك الی ابن وهب. امام کے شاگرد رشید ابن وهب کے نام سے مسئلہ قضا و قدر پر ایک مشہور رسالہ ہے، قاضی عیاض نے اس رسالہ کی تعریف کی اور لکھا ہے، وهو من خيار الكتب في هذا الباب الدال على سعة علمه بهذا الشأن۔

۷- كتاب الاقضية: بعض قاضیوں کے لئے امام نے یہ رسالہ لکھا، غالباً اس میں عہدہ قضا کے متعلق اصول و ہدایات ہوں گے۔

۸- كتاب المناسك: ابو جعفر زہری امام کے ایک دوست کا بیان ہے کہ یہ امام مالک کی سب سے بڑی تصنیف تھی جس میں حج کے احکام و مسائل تھے۔

۹- تفسير غريب القرآن: اس کی روایت خالد بن عبدالرحمن مخزومی نے

(۱) تزکین الممالک ص ۳۰، ۳۱۔ (۲) ابن خلکان ترجمہ ابن قاسم۔

امام سے کی ہے۔

۱۰- کتاب المجالسات عن مالک. ابن وہب امام کے تلمیذ رشید نے امام کی مجالس میں حدیث و آثار و اخلاق کے جو متفرق فوائد و نکات سنے ان کو اس میں جمع کیا ہے، حافظ سیوطی نے یہ رسالہ دیکھا تھا۔

۱۱- تفسیر القرآن: قرآن مجید کی تفسیر بروایت احادیث مسندہ ہے، حافظ سیوطی نے اس کو دیکھا تھا اور اس کی تعریف کی ہے لیکن یہ مشکوک ہے کہ آیا یہ خود امام کی تالیف ہے، یا کسی شاگرد نے امام سے اس کی تعلیق کی ہے۔

۱۲- کتاب المسائل: ان رسائل و کتب کے علاوہ امام کی اور بھی تصنیفات تھیں، محدث خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ ابو العباس سفاح کے سامنے بہت سے منتشر اوراق پڑے تھے جس کی نسبت اس نے کہا کہ یہ امام صاحب کے ستر ہزار مسائل کا مجموعہ ہے۔ (۱)

## مَوْطَا

امام کی اصلی تصنیف ”مَوْطَا“ ہے جو قرآن پاک کے بعد کتب خانہ اسلام کی دوسری کتاب ہے، اول کلام خدا ہے اور ثانی کلام رسول اللہ۔

۱۳۳ھ میں خلافت امویہ مٹ کر خلافت عباسیہ قائم ہوتی ہے اسی کے پس و پیش عہد میں سینکڑوں مجموعہ ہائے حدیث مدون ہوئے، مَوْطَا کی تالیف کا بھی یہی زمانہ ہے۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد اکثر صحابہ تعلیم و ارشاد اور جہاد و غزاکمیت سے بلاد مفتوحہ میں پھیل گئے تھے لیکن صحابہ کا گروہ عظیم جن میں اکابر و اجلہ فقہاء داخل تھے، مدینہ ہی میں رہا، امام مالک کا عہد وہ ہے جب احادیث و روایات تمام بلاد اسلامیہ میں

(۱) ترمذی الممالک ص ۳۰، ۳۱۔

منتشر تھیں، اس لحاظ سے ان کے عصر میں جن ملکوں میں مجموعہ ہائے حدیث کی تدوین ہوئی وہ اپنے اپنے حدود ملکی کے اندر محدود تھے مرکز نبوت اور مہبط وحی مدینہ میں جو علوم نبوی کا سب سے بڑا گنجینہ تھا حدیثوں کی جمع و ترتیب، جس خوش بخت کی قسمت میں تھی وہ امام مالک ہیں۔ (۱)

موطا: موطا علوم مدینہ کا مجموعہ ہے، جہاں زرو جو اہر کی اصلی کان تھی، تمام اکابر صحابہ و اعظم تابعین کا مسکن یہی شہر مبارک تھا، اس لئے یہ صحیفہ مقدس انھی بزرگوں کی روایات و فتاویٰ پر مبنی ہے، اس بنا پر یہ صحیفہ حقیقت میں صحیح ترین، موثق ترین اور کامل ترین احکام اسلامیہ کا مجموعہ ہے۔ (۲)

تالیف موطا: یہ ظاہر ہے کہ امام مالک ہمیشہ مدینہ ہی میں قیام فرما رہے، اس لئے تالیف کا مقام معلوم ہے لیکن صحیح زمانہ متعین نہیں، ۱۳۰ھ سے زوال بنی امیہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے اس سے پہلے تصنیف و تالیف کا شغل عام نہ تھا، ۱۴۴ھ میں منصور نے آخری حج کیا ہے، اس وقت موطا متداول و مشہور ہو چکی تھی۔ (۳) اس لئے اس کا زمانہ تالیف ان دونوں کا درمیانی زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

ایک روایت ہے کہ امام مالک نے منصور ہی کے حکم سے موطا کی تالیف شروع کی تھی، اس کی فرمائش تھی کہ اس مجموعہ احکام میں نہ ابن عمر کی سختیاں ہوں نہ ابن عباس کی رخصتیں اور عباسی مسعود کے شواذ۔ (۴)

امام صاحب جب موطا کی تالیف میں مشغول ہوئے اور اس کی خبر دوسرے لوگوں کو پہنچی تو مدینہ کے علماء بھی اپنی اپنی احادیث کا مجموعہ تیار کرنے لگے، لوگوں نے امام سے جا کر

(۱) ان معلومات کے لئے مقدمہ فتح الباری ملاحظہ ہو (۲) مقدمہ موسیٰ شاہ ولی اللہ صاحب و کشف الظنون ج ۲ ص ۵۷۲ (۳) ایضاً جامع بیان العلم ابن البرص ۶۷ (۴) کتاب الاملۃ و السیاسة ذکر منصور ج ۲ ص ۱۳۰ و ۱۳۱۔

عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ ”صرف حسن نیت کو بقا ہے“ یہ پیشین گوئی کس قدر صحیح ثابت ہوئی، چنانچہ مؤطائے امام مالک کے سوا کوئی مؤطا دنیا میں معلوم و باقی نہیں رہی، بعض لوگوں نے رشک کا انتقام دوسری طرح لیا، محمد بن اسحاق صاحب سیر و مغازی نے کہا ”مالک کی کتابیں میرے پاس لاؤ، میں ان کے عیوب دکھاؤں، مالک کی کتابوں کا ناقد تو میں ہوں۔“ (۱)

امام مالک نے تصنیف سے فارغ ہو کر اس کوشیوخ حدیث کی خدمت میں پیش کیا، سب نے بہ غایت پسند کیا، عام اہل مدینہ کے لئے وہ دن عجیب مسرت کا تھا، جب ان کے مجموعہ فضائل میں ایک اور فضیلت کا اضافہ ہو رہا تھا، سعدون نام کا ایک شاعر مؤطا کی تعریف میں کہتا ہے: (۲)

فبادر مؤطا مالک قبل فوتہ      فما بعده ان فات للحق مطلب

مالک کی مؤطا کو جلد لو، کھونے نہ پائے، اگر یہ کھو گئی تو حق کی جستجو کی پھر جگہ نہیں

ودع للمؤطا کلم علم تریدہ      فان المؤطا الشمس والغیر کوکب

اور مؤطا کے لیے ہر اس علم کو جس کو چاہتے ہو چھوڑ دو کہ مؤطا آفتاب ہے

اور اس کے علاوہ دوسری کتابیں ستارہ ہیں۔

وجہ تسمیہ: مؤطا کے لغوی معنی ”روندا ہوا“ یا ”چلا ہوا“ کے ہیں شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے ”روندے ہوئے یا چلے ہوئے“ حجازی معنی یہ ہیں کہ ”جس پر عام ائمہ اور علما اور اکابر چلے ہوں اور جس کو ان سب کی راہوں نے روند اور پامال کیا ہو یعنی سب نے اس کے متعلق گفتگو کی ہو اور اس سے اتفاق کیا ہو“ اس طرح گویا اس کے معنی ”متفق“ اور ”مطابق“ کے ہیں، چونکہ تمام شیوخ حدیث نے اس سے اتفاق و مطابقت کی، اس لئے اس کا نام مؤطا مشہور ہو گیا۔ (۳) میرے نزدیک اس سے زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ ”مؤطا اس راستہ کو کہتے

(۱) تہذیب الکمال“ مالک بن انس (۲) بستان الحد شین ذکر امام مالک ص ۹ (۳) مقدمہ مسوی شاہ ولی



ہیں جس پر لوگ بکثرت گذرتے ہوں، سنت کے معنی بھی راستہ کے ہیں یہ وہ راستہ ہے جس پر آنحضرت ﷺ گذرے، مؤطا وہ پامال راستہ ہے جس پر آنحضرت ﷺ کے بعد تمام صحابہ گذرے، غرض مؤطا کا لفظ اپنی حقیقت کا آپ مفسر ہے کہ ان مسائل پر مشتمل ہے جن پر صحابہ کا عمل رہا ہے اور جمہور سلف جن پر چلے ہیں۔

تعداد مرویات: ابتداء مؤطا میں دس ہزار حدیثیں تھیں لیکن امام کے خاتمہ صحت پسند نے تقریباً آٹھ ہزار حدیثیں قلم زد کر دیں، باقی ۱۷۲۰ ہیں جن میں سے مسند اور مرفوع ۶۰۰ ہیں، مرسل ۲۳۵، موقوف ۶۱۳، تابعین کے اقوال و فتاویٰ ۲۸۵، بلاغات مالک ۷۵۔ (۱)

موضوع: مؤطا کا موضوع صرف احکام فقہیہ ہیں، اس لئے وہ سینکڑوں ابواب و فصول جو بخاری و مسلم اور ترمذی وغیرہ میں نظر آتے ہیں مؤطا ان سے خالی ہے، کیونکہ فقہیات سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے اس بنا پر محدثین کی اصطلاح کے مطابق اس کو ”کتاب السنن“ کہنا چاہئے۔

مؤطا اور دیگر فقہائے مجتہدین کے مجموعہ ہائے حدیث: چاروں مجتہدین فقہا میں سے ہر ایک کے انتساب سے ایک مجموعہ حدیث موجود ہے لیکن امام مالک کے سوا کسی امام مجتہد کے قلم سے علم حدیث کی کوئی تصنیف ظاہر نہیں ہوئی و ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء مسند ابی حنیفہ کے نام سے متعدد کتابیں موجود ہیں مگر دراصل یہ تمام کتابیں امام ابوحنیفہ کے سینکڑوں برس بعد امام ممدوح کے تلامذہ کی تصنیفات اور غیر معروف مسانید سے لے کر محمد بن یعقوب اور حسین بن محمد بن خسر وغیرہ نے تالیف کی ہیں اور ان کو مسند ابی حنیفہ امام اعظم کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔

مسند امام شافعی کی حقیقت یہ ہے کہ امام شافعی نے اپنی تصنیفات میں برسبیل استدلال جو حدیثیں روایت کی ہیں، ابو جعفر بن محمد بن مطر نیشاپوری اور ابو العباس تام ایک شافعی نے ان کو یکجا کر دیا ہے، مسند احمد بن حنبل کی تالیف یقیناً امام احمد نے شروع کی تھی

(۱) مقدمہ سوی شاہ ولی اللہ صاحب ص ۶۔

لیکن وہ ابھی مسودہ تھا کہ امام موصوف نے وفات پائی، اس کی تمییز و ترتیب بعد کو امام احمد کے صاحبزادہ عبداللہ نے کی، جو افسوس ہے کہ اس میدان کے مرد نہ تھے، اسی لئے اس میں مدنی اور عراقی مسندوں میں تخیط ہے اور صحیح احادیث کا التزام نہیں، گو خود امام ابن ضہب کو اس کا دعویٰ تھا۔

موطا اور اس کی معاصر کتابیں: موطا سے قبل اور خود اس کے زمانہ میں بیسویں مسانید اور موطائیں لوگوں نے لکھیں، جن میں سے بعض اب تک باقی ہیں لیکن اور موطاؤں اور موطائے امام مالک کے موازنہ سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ موطا اور ان کتابوں میں وہی نسبت ہے جو صحیح بخاری کو مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی سے ہے خود ان کتابوں کا فقدان اور عدم شہرت اس کی سب سے بڑی دلیل ہے، تین خاص وجوہ سے موطا کا امتیاز بالکل روشن ہو جاتا ہے۔

۱- موطا سے پہلے جو حدیث کی کتابیں لکھی گئیں ان کا مبنی زیادہ تر صحابہ و تابعین کے آثار و فتاویٰ تھے، امام مالک نے موطا میں احادیث صحاح و مسند یا منقطع و مرسل کو بنائے اول اور آثار و فتاویٰ کو بنائے ثانی قرار دیا۔

۲- دوسرا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ ان میں صحت کا التزام نہیں کیا گیا تھا اور موطا میں صرف اسی حدیث یا فتویٰ نے جگہ پائی ہے جس کو صحت کا شرف حاصل تھا۔

۳- تیسری بات یہ کہ موطا مدینہ میں تالیف ہوئی ہے اور اس کے رواۃ حجازی ہیں اور دیگر مسانید اور موطائیں کوفہ، بصرہ، واسط، شام، یمن، خراسان اور رے وغیرہ میں لکھی گئیں اس لیے ان کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے اور اس پر تمام علمائے حدیث کا اتفاق ہے کہ حجاز کی حدیثیں صحت، قوت اور جودت اسناد میں سب پر فائق ہیں۔

طبقات کتب حدیث میں موطا کا درجہ: علمائے حدیث نے کتب حدیث کو چار مختلف طبقات میں منقسم کیا ہے، طبقہ اولیٰ میں وہ تصانیف ہیں جن کے مصنفین حدیث کے امام

اور فن کے نقاد تھے اور جن کی تصنیفات صحت، جودت، اسناد اور قبول حدیثین کے لحاظ سے سب سے مقدم ہیں اور جن کے رجال حفظ، ثبوت، وثوق، شہرت میں معروف ہیں اس طبقہ میں مؤطا، بخاری اور مسلم داخل ہیں۔

طبقہ اولیٰ میں مؤطا کا درجہ: عام علما تو اس کو مسلم بلکہ ترمذی کے بھی بعد جگہ دیتے ہیں لیکن محققین قدما اور عموماً متاخرین میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز صاحب اس کو بخاری سے بھی مقدم سمجھتے ہیں اور خود میں بھی بدء طلب حدیث سے یہی اعتقاد جازم رکھتا ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ مؤطا میں مرسل، موقوف اور منقطع حدیثیں ہیں، جو صحیح کے لئے قاذح ہیں لیکن ان کا ارسال، وقف اور انقطاع مؤطا کی روایت کے لحاظ سے درست ہے مگر حقیقت کے رو سے یہ تمام مراسیل و موقوفات و منقطعات، متصل، مرفوع و مسند ہیں اور خود ان کا رفع و اتصال و اسناد، امام بخاری و امام مسلم و ترمذی وغیرہ نے کیا ہے۔ اس بنا پر درحقیقت مؤطا میں کوئی مرسل، موقوف یا منقطع حدیث نہیں، اس میں جو حدیث بھی ہے اس پر (الا ماشاء اللہ) بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے، اس سے مؤطا کی صحت کے درجہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۱- مؤطا کو سب سے بڑا شرف یہ بھی حاصل ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں کلام اللہ کے بعد جو کتاب آئی وہ کلام الرسول کا یہی اصح ترین مجموعہ تھا، ظاہر ہوئی، کشف الظنون میں ہے ”سب سے پہلی کتاب جو اسلام میں لکھی گئی ہے وہ مؤطا ہے۔“ (۱) قاضی ابوبکر ابن عربی ۵۴۶ھ مؤطا کی شرح میں لکھتے ہیں یہ ”پہلی کتاب ہے جو شریعت اسلامیہ میں لکھی گئی ہے“ حضرت سفیان کہتے ہیں ”سب سے پہلے مالک نے صحیح تالیف کی۔“

۲- باوجود نقش اول ہونے کے بھی اس کے بعد کی کتابیں اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتیں، جس کے متعلق ائمہ مجتہدین اور علمائے حدیث کی قوی شہادتیں موجود ہیں،

امام شافعی م ۲۰۴ھ فرماتے ہیں ”روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد کوئی کتاب مؤطا امام مالک سے زیادہ صحیح نہیں ہے“ ابو بکر ابن عربی فرماتے ہیں ”یہ اسلام کی سب سے پہلی کتاب ہے اور سب سے پچھلی بھی، کیونکہ پھر اس کے مثل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔“

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کتاب الام میں امام شافعی اور کتاب الآثار میں امام محمد کی جو نقاہت ہے وہ مؤطا ہی کے صدقہ میں ہے۔

۳۔ امام مالک سے مؤطا کی روایت کرنے والے جس پایہ کے لوگ ہیں وہ بخاری اور مسلم کے نہیں ہیں اس لئے خواص و عوام کی نقل و روایت میں جو فرق ہے وہ یقیناً مؤطا اور دیگر کتب کے نقل و روایت میں ہے۔

۴۔ رسول اللہ ﷺ اور مولفین حدیث میں جتنے واسطے کم ہوں گے اسی قدر اس کی تالیفات زیادہ معتبر اور مستند ہوں گی، بخاری و مسلم کی روایتیں عموماً پانچ چھ واسطوں سے مروی ہیں، مؤطا کی حدیثیں تین چار واسطوں سے زیادہ کی نہیں ہیں، امام بخاری کو اپنی بیس ثلاثیات پر ناز ہے اور مؤطا کی بنیاد ہی ثلاثیات پر ہے اس کے علاوہ اس میں چالیس ثلاثیات ہیں۔

مؤطا کے نسخے: مؤطا امام مالک صاحب سے تیس مختلف طریقوں سے مروی ہے جن میں مشہور ۱۶ نسخے ہیں، ان میں سے معتبر اور باوثوق گیارہ اور باوثوق تر چار ہیں، یعنی یحییٰ ابن بکیر، ابو مصعب اور ابن وہب کے نسخے لیکن متداول ترین اور مشہور ترین یحییٰ کی روایت والا نسخہ ہے، کتاب کی مشہور ترتیب یہ ہے: اول کتاب الجنائز، پھر کتاب الصلوٰۃ، پھر کتاب الزکوٰۃ، پھر کتاب الصیام، اس کے بعد تمام نسخے کتاب الحج تک متفق ہیں، کتاب الحج کے بعد سے پھر مختلف ترتیب ہیں (۱) اس قسم کا اختلاف بخاری و مسلم سب میں ہے۔

شروح و تعلیقات: کسی تصنیف کے قبول و ہر دلعزیزی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کو شارحین، معلقین و محشین کی ایک بڑی جماعت ہاتھ آئے اور اس میں کیت سے زیادہ

اصل چیز کیفیت ہو، موطا ان دونوں خصوصیات کے لحاظ سے خوش قسمت ہے، تقریباً پچیس علمائے کبار نے اس کی شرح و تعلیق اور دیگر خدمات انجام دی ہیں، قدمائے ابن حبیب مالکی متوفی ۲۳۹ھ، امام ابوسلیمان خطابی م ۳۸۸ھ، ابن رشیق قیروانی م ۴۵۶ھ، محدث ابن عبدالبر، م ۴۶۳ھ، امام باجی اندلسی متوفی ۴۷۴ھ، قاضی عیاض متوفی ۵۴۴ھ، قاضی ابوبکر بن عربی متوفی ۵۴۶ھ اور متاخرین میں حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ علامہ زرقانی مصری م ۱۱۲۴ھ، شاہ ولی اللہ دہلوی م ۱۱۷۶ھ وغیرہ داخل ہیں۔

امام خطابی، حافظ سیوطی، ابن عبدالبر، ابن حزم، ابوالولید باجی نے بحذف فتاویٰ صرف موطا کی احادیث کی تلخیص کی ہے، حافظ سیوطی نے رجال موطا کو علاحدہ کیا ہے، احمد بن عمران، انحفش بصری اور قاضی عیاض نے موطا کے لغات حل کئے ہیں، باجی اور دارقطنی نے موطا کے اختلاف نسخ پر بحث کی ہے، ابوالحسن علی بن محمد قابسی نے موطا کی صرف متصل الاسناد حدیثیں جمع کی ہیں، ابن یثکوال اور خطیب بغدادی نے صرف ان لوگوں کے حالات لکھے ہیں جنہوں نے امام سے موطا کی روایت کی ہے، غرض موطا کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد سترہ کے قریب ہے۔

موطا کا ایک اور امتیاز: سلاطین اور خلفائے اسلام میں سینکڑوں ایسے گذرے ہیں جو صاحب سیف و قلم تھے جن کے نام سے تخت و منبر دونوں عزت پاتے تھے لیکن کسی کے متعلق یہ ذکر نہیں ہے کہ اس نے طلب علم و اخذ سند کے لیے کوئی سفر کیا ہو کیوں کہ خود ان کا دربار اساتذہ کا مرکز اور علما کا مرجع ہوتا تھا، تنہا امام مالک کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ ان کی کتاب موطا کے لیے مہدی، ہادی، رشید، مامون، اور امین جیسے مشاہیر خلفائے اسلام نے عراق سے حجاز تک کا سفر کیا اور آخر میں چھٹی صدی میں بزرگ ترین سلاطین اسلام صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس نے قاہرہ سے اسکندریہ تک صرف اسی کی خاطر سفر گوارا کیا۔ (۱)

## امام ابوداؤد طیالسی

(متوفی ۲۰۳ھ)

نام و نسب: سلیمان نام، ابوداؤد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: سلیمان بن داؤد بن چارود (۱) ولادت: وہ بائق ۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے، علامہ سمعانی نے ربیع الاول کا مہینہ بھی لکھا ہے۔

خاندان و وطن: آبائی وطن فارس ہے، بصرہ میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی، اصلاً غلام زادہ تھے، ان کے والدین قبیلہ قریش کے موالی تھے، فارسی، بصری، قرشی اور طیالسی کی نسبتوں سے منسوب کئے جاتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور نسبت طیالسی ہے، جو طیالہ کی جانب ہے، طیالہ، طلیسیان کی جمع ہے، یہ ایک قسم کی چادر ہوتی تھی، جس کو اہل عرب عمالوں کے اوپر اوڑھتے تھے، اس نسبت سے جو لوگ منسوب ہیں ان میں ابوداؤد سب سے زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں۔ (۲)

طلیسان فارسی زبان کا لفظ ہے، اصمعی کے نزدیک وہ اصل میں تالشان (تالسان) تھا اور معرب ہو کر طلیسان ہو گیا ہے، (۳) اس نسبت سے منسوب ہونے کا سبب نہیں معلوم ہو سکا۔

(۱) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۴، خلاصۃ تہذیب التہذیب الکمال ص ۱۵۱ تذکرۃ المحققین ج ۱ ص ۲۲۲ (۲) کتاب

الانساب ورق ۳۷۵ (۳) لسان العرب ج ۷ ص ۳۳۱۔

**اساتذہ و شیوخ:** حافظ ابوداؤد طیالسی کو دوسری صدی ہجری کا مبارک زمانہ ملا جو علم و فضل اور خیر و برکت کے لحاظ سے خیر القرون میں شمار کیا جاتا ہے اس لیے ان کو مقدس اور برگزیدہ علمائے اسلام کی صحبت میں سر آئی اور بڑے بڑے محدث علما سے استفادہ کا موقع ملا، ان کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک ہزار شیوخ سے حدیثیں لکھیں، ان میں ابن عون اور ان کے مرتبہ کے متعدد لوگ تھے، بعض مشہور شیوخ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابان بن یزید عطار، ابراہیم بن سعد، ایمن بن نابل، جریر بن جازم، جریر بن عبد الحمید، حبیب بن یزید، حرب بن شداد، حماد بن درہم، حماد بن سلمہ، زائدہ بن قدامہ، زہیر بن معاویہ، سفیان بن سعید ثوری، شعبہ بن ججاج، عبد الرحمن بن ابی الزناد، عبد اللہ بن عون، عبد العزیز بن ماضون، قرۃ بن خالد، ابو عوانہ وضاح بن عبد اللہ، ورقاء، ہشام بن عبد اللہ دستوائی، ہمام بن یحییٰ اور یزید بن ابراہیم وغیرہ۔ (۱)

تلامذہ: جس طرح انھوں نے بیشمار مشائخ سے اکتساب فیض کیا تھا، اسی طرح ان کے دامن سے بھی بکثرت طلبہ اور محدثین وابستہ ہوئے، ان میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:

احمد بن ابراہیم دورقی، احمد بن حنبل، اسحاق بن منصور کوج، ابو بکر بن ابی شیبہ ابو مسعود رازی، ابن فرات، بکار بن قتیبہ ثقفی، ججاج بن یوسف الشاعر، عباس دوری، عبد اللہ بن محمد مسندی، عثمان بن ابی شیبہ، علی بن مدینی، علی بن مسلم طوسی، عمرو بن علی فلاس، محمد بن ابوبکر مقدمی، محمد بن یشار نبدار، محمد بن رافع، محمد بن سعد کاتب واقدی، محمد بن غیلان، ہارون جمال، یعقوب بن ابراہیم دورقی اور یونس بن حبیب اصہبانی وغیرہ۔ (۲)

(۱) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۳، ۲۵، کتاب الانساب ورق ۲۷۵ و تہذیب المعجم ج ۳ ص ۱۸۶ (۲) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۳، ۲۵، کتاب الانساب ورق ۳۷۵ و تہذیب المعجم ج ۳ ص ۱۸۶۔

آپ کے استاذ جریر بن عبد الحمید نے بھی آپ سے روایت کی ہے، (۱) مولفین صحاح اور امام طحاوی کے زمانہ میں کافی تفاوت ہے اس لیے ان میں سے تین نے آپ سے بالواسطہ روایت کی ہے، حافظ ابن حجر نے امام بخاری (۲) اور مولانا عبد الرحمن مبارکپوری نے امام ترمذی کے سلسلہ رواۃ میں ان کا نام گنایا ہے، (۳) شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابو داؤد سجستانی کے متعلق لکھا ہے کہ غالباً وہ ان سے بیک واسطہ روایت کرتے ہیں۔ (۴)

رحلت و سفر: ابو داؤد کے مشائخ کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے حدیث کی طلب و جستجو کے لیے مختلف مقامات کا سفر کیا ہوگا لیکن کتابوں میں صرف بغداد اور اصہبان کے سفر کا ذکر کیا ہے۔

**فضل و کمال:** حدیث کے علاوہ ان کے دوسرے علمی کمالات پردہ خفا میں ہیں اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کن کن علوم و فنون میں جامعیت رکھتے تھے، صرف فن حدیث میں ان کی مہارت و ژرف نگاہی کا حال معلوم ہوتا ہے جس نے ان کو مرتبہ امامت پر فائز کیا۔

**حفظ و ضبط:** ان کا حافظہ غیر معمولی تھا، علمائے فن اور ان کے معاصرین نے اس کا اعتراف کیا ہے، بعض علما کا بیان ہے کہ ”ان کو ۳۰ ہزار اور بعض نے کہا ہے کہ ۴۰ ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں“ یونس بن صیب اصہبانی فرماتے ہیں کہ انھوں نے اصہبان میں ایک لاکھ حدیثیں محض اپنی یادداشت سے الما کرائیں، عمرو بن علی فلاس کہتے ہیں کہ ”محدثین کے زمرہ میں مجھ کو کوئی شخص ابو داؤد سے بڑا حافظ نظر نہیں آیا، میں نے ان کو خود یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں ۳۰ ہزار حدیثیں زبانی بیان کرتا ہوں“ علی بن مدینی کا بیان ہے کہ میری نظر سے کوئی ان سے زیادہ حدیثوں کا حافظ نہیں گذرا، محمد بن بشار کا قول ہے کہ ”جتنی حدیثیں ابو داؤد سے

(۱) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۴۳ و تہذیب العہد ج ۴ ص ۱۸۳ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۲۴۸ (۳)

مقدمہ تہذیب الاحوذی ص ۲۷۲، ۳۲۰ (۴) بستان المحدثین ص ۳۲۔



لکھی گئیں اتنی کسی اور محدث سے نہیں لکھی گئیں، صالح بن احمد عجمی ان کو کثیر الحفظ بتاتے ہیں، ابن عدی کا بیان ہے کہ ”بصرہ میں ابوداؤد طیالسی اپنے زمانے میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے اور اس وصف میں وہ اپنے معاصرین میں فائق و برتر تھے“، شمیم بن خارجہ نے امام احمد سے دریافت کیا کہ ”ابوداؤد اور ابو عبیدہ حداد میں کس کو آپ زیادہ پسند کرتے ہیں“ فرمایا ابوداؤد حافظ کے لحاظ سے فائق ہیں اور ابو عبیدہ زیادہ تر کتابوں سے روایت کرتے ہیں، اس لیے غلطی بہت کم کرتے ہیں“ و کعب کا بیان ہے کہ ”طویل حدیثوں کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں (۱) رہا“، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں ”ابوداؤد طویل حدیثوں کو اچھی طرح محفوظ کرتے تھے اور اس وصف میں اپنے معاصرین سے ممتاز تھے۔“

عدالت و ثقاہت: ثقاہت میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا، علمائے جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، عبدالرحمن بن مہدی فرماتے ہیں ”وہ لوگوں میں سب سے زیادہ سچے تھے“ (۲) ابوالمنذر نعمان کا ارشاد ہے کہ ”وہ ثقہ اور معتبر تھے“ ابن معین سے شعبہ کے تلامذہ کے متعلق دریافت کیا گیا کہ ابوداؤد طیالسی اور حرثی میں آپ کے نزدیک کون زیادہ بہتر ہے تو انھوں نے فرمایا کہ ابوداؤد صدوق ہیں، اس لیے وہ مجھ کو زیادہ پسند ہیں، صالح بن احمد عجمی اور خطیب بغدادی نے ان کو ثقہ و ثابت بتایا ہے، عمرو بن علی نے ان کو ثقہ و معتبر کہا ہے، ابن عدی عمرو کی رائے کی تصدیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ میرے اور دوسروں کے نزدیک متیقظ اور ثابت تھے، ابو حاتم ان کو صدوق محدث قرار دیتے ہیں، ابو مسعود رازی نے امام احمد سے ان کے بارے میں سوال کیا تو ارشاد ہوا کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے، امام نسائی کا

(۱) العمر ج ۱ ص ۳۴ و کتاب الانساب ورق ۳۷۵، تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲۲

و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۴۱۳، تہذیب المعجز ج ۳ ص ۱۸۳ (۲) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۸ و تہذیب

المعجز ج ۳ ص ۱۸۳، کتاب الانساب ورق ۳۷۵ و میزان الاعتدال ج ۹ ص ۴۱۳ و طبقات ابن سعد قسم

ارشاد ہے کہ ”ابوداؤد ثقہ اور لوگوں میں سب سے زیادہ سچے تھے، ابن حبان نے بھی ان کو ثقات میں شامل کیا ہے اور محمد بن سعد صاحب طبقات لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، (۱) شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن معین و ابن المدینی و فلاس و وکیع و دیگر علمائے رجال اور تعدیل و توثیق مفرط نمودہ اند۔ (۲)

معرفت حدیث: وہ حدیثوں کے صرف ناقل و حافظ ہی نہ تھے بلکہ ان کی پرکھ میں بھی مہارت رکھتے تھے، نبدار کا بیان ہے کہ وہ حفظ اور معرفت حدیث کے لحاظ سے نہایت برتر تھے۔

وکیع جیسے نامور محدث حدیث میں ان کی غیر معمولی واقفیت اور تمیز کی بنا پر ان کو جبل العلم کہتے تھے، یحییٰ بن معین ان کو عبدالرحمن بن مہدی سے بھی زیادہ صاحب علم اور حدیثوں کا واقف کار بتاتے ہیں، ان کے استاذ شعبہ کو ان کے علم و تمیز پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنی عدم موجودگی میں ان کو مسند درس پر رونق افروز ہونے کی اجازت دے دیتے تھے، ابو حاتم کا بیان ہے کہ معرفت حدیث میں ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ وہ شعبہ سے مذاکرہ کر سکتے تھے، اس سلسلہ میں ابوداؤد کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ بعض محدثین اور شیوخ کی روایات کا ان سے زیادہ کوئی واقف کار نہ تھا، عثمان بری کے متعلق وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میرے سینہ میں ان کی ۱۲ ہزار حدیثیں محفوظ ہیں، مشہور محدث شعبہ کی روایتوں کے لیے تو وہ سند کی حیثیت رکھتے تھے، احمد بن سعید داری نے امام احمد سے سوال کیا کہ شعبہ کی حدیثیں کس سے قلم بند کی جائیں تو انھوں نے فرمایا کہ جب تک ابوداؤد زندہ ہیں ہمارا خیال ہے کہ ان ہی سے نقل و روایت کی جائے، ابو مسعود رازی کا بیان ہے کہ شعبہ کی روایتوں کے معاملہ میں ابوداؤد سے زیادہ کوئی واقف کار مجھ کو نہیں ملا، (۳) حضرت شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ ”وازمحمد ثمان آنجامش شعبہ و هشام دستوائی و ابن عون و غیر ہم روایات

(۱) طبقات ابن سعد قسم دوم ج ۷ ص ۵۱ (۲) بستان الحدیث ص ۲۱ (۳) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۷، ۲۸، ۲۹

۲۹ و خلاصہ تہذیب الکمال ص ۱۵۱۔

بسیار وارد۔ (۱)

اخلاق و عادات: ابوداؤد طیالسی کے اخلاق و عادات اور اعمال و عبادات وغیرہ کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی، بعض واقعات سے ضمناً ان کے بعض اوصاف کا پتہ چلتا ہے، مثلاً اصہبان میں ایک لاکھ حدیثیں املا کرانے کے بعد جب ان کو اپنی بعض غلطیوں کا پتہ چلا تو انھوں نے ان کو تسلیم کر لیا اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت کی کہ وہ بھی ان کی تصحیح کر لیں۔

امام احمد نے بھی ان کی اس خوبی کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے تھے۔

وقات: مشہور روایت کے مطابق ۷۲ سال کی عمر میں ۲۰۴ھ میں ان کا انتقال ہوا، بعض لوگوں نے صفر اور بعض نے ربیع الاول ۲۰۴ھ کا مہینہ بتایا ہے، ۲۰۳ھ اور ۲۱۳ھ بھی سنہ وفات بتایا جاتا ہے لیکن یہ غلط ہے، اس زمانہ کے حاکم بصرہ یحییٰ بن عبداللہ بن عمر نے نماز جنازہ پڑھائی، (۲)

مسند طیالسی: مسانید کے جو مجموعے مشہور و متداول ہیں، ان میں ایک ابوداؤد طیالسی کی مسند بھی ہے، اس کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ وہ دوسرے مسانید کے مقابلہ میں قدیم ہے، بعض علما نے اس کو سب سے قدیم مسند بتایا ہے (۳) حاکم صاحب مستدرک فرماتے ہیں کہ ”علمائے اسلام میں عبید اللہ موسیٰ اور ابوداؤد طیالسی نے سب سے پہلے تراجم رجال پر مسانید مرتب کئے۔“ (۴) لیکن علمائے محققین کی ایک جماعت کو اس رائے سے اتفاق نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ ”عام مصنفین مسانید کے مقابلہ میں ابوداؤد کا زمانہ قدیم ہے، اس لیے لوگوں نے ان کی مسند کو بھی سب سے قدیم سمجھ لیا، حالانکہ اس کی جمع و ترتیب ان کے بعد بعض متاخرین خراسانی حفاظ نے کی ہے، (۵) بہر حال اس کی قدامت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، گو بعض مشہور کتب حدیث کی طرح ان کی مسند کو زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی

(۱) بستان الحدیثین ص ۳۱۔ (۲) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۹ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۳۱، والرسالہ

المستطرق ص ۵۲ (۴) المدخل فی اصول الحدیث ص ۴۔ (۵) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۳۱۔

لیکن اس کو مسانید میں یک گونہ خصوصیت حاصل ہے شاہ ولی اللہ صاحب نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ (۱)

ترتیب و تبویب: یہ مسند گیارہ اجزا پر مشتمل ہے، اس کی ترتیب میں بڑی حد تک مسانید کے عام اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے، یعنی صحابہ کے شرف و تقدم اور سبقت فی الاسلام کے لحاظ سے روایتیں نقل کی گئی ہیں، پہلے خلفائے راشدین، عشرہ مبشرہ اور کبار صحابہ کی حدیثیں ہیں، چھٹے جز کے آخر سے صحابیات کی روایات کا سلسلہ شروع ہو کر ساتویں جز میں ختم ہوتا ہے، سب سے پہلے حضرت فاطمہؑ اور اس کے بعد حضرت عائشہؑ اور حفصہؑ کی روایات ہیں، بر صحابی کی حدیثیں الگ الگ عنوان سے ہیں، بعض صحابہ کی حدیثیں دو جگہ بھی نقل ہوئی ہیں، بعض مقامات پر ایک صحابی کی روایتوں میں دوسرے صحابی کی روایتیں بھی خلط ملط ہوئی ہیں، مسند کی باقاعدہ جمع و ترتیب کا کام بعض اہل خراسان نے کیا اور زیادہ تر روایتیں یوسف بن حبیب کے واسطے سے مروی ہیں۔ (۲)

خصوصیات: ۱- اس کی سب سے اہم خصوصیت اس کی قدمت ہے۔

۲- مسند کی اکثر روایتیں دوسری مشہور کتب حدیث میں موجود ہیں۔

۳- کہیں کہیں آثار صحابہ بھی نقل کیے گئے ہیں۔

۴- حدیث کی کتابوں کے عام خصوصیات مثلاً رواۃ کے ناموں کے متعلق مختلف

قسم کی وضاحتیں، کثرت طرق، تعدد اسناد، اختلاف الفاظ و معانی یا خاص اضافہ و کمی کا ذکر، روایتوں کے باہمی فرق، رواۃ کے سہو و نسیان، روایات کے درجہ و حیثیت کی تشریح، دو روایتوں کے درمیان ترجیح، روایات کی تصویب و تخطیہ، ان کے یار اوپوں کے متعلق اپنے یا شیوخ کے شک و تردد کا اظہار، مشکل الفاظ، روایات کے ابہام اور مفہوم کی وضاحت اور ان کے بعض خاص پہلوؤں اور نکتوں کی تشریح وغیرہ اس میں بھی موجود ہیں۔

یہ مسند پہلی مرتبہ مطبع دارۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوئی

ہے، صفحات کی تعداد ۳۹۲ ہے، ارکان دائرہ نے حاشیے میں متعدد کتب حدیث خصوصاً مسند احمد، سنن ترمذی اور سنن ابی داؤد سے اس کی حدیثوں کی مطابقت یا اختلاف کو دکھایا ہے اور کہیں کہیں لغات اور بلاد و ماکن وغیرہ کی بھی مختصر تشریح کی ہے، خاتمہ میں مسند کے قدیم نسخہ سے اس نسخہ کے اختلاف کا مقابلہ کیا گیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ ساتویں صدی ہجری سے قبل کا خدا بخش خاں لاہوری میں موجود ہے، شیخ عبدالرحمن بناسا خانی نے مسند احمد کی طرح اس کو بھی فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے، اسی کے ساتھ موصوف نے اس کی.....

”الحمد علی منہ المعبود“ کے نام سے تصحیح و تعلق لکھی ہے، اصل و تعلق دو جلدوں میں مطبع مینہ مصر سے شائع ہوئی ہے۔

بعض اعتراضات اور ان کا جواب: ابوداؤد طیالسی پر سہو و خطا اور تالیس کے اعتراضات بھی ملتے ہیں۔

۱- خطا: ابو حاتم، ابراہیم جوہری، ابن سعد اور علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کی بھول چوک اور خطا و نسیان کا ذکر کیا ہے، مگر ان سے ابوداؤد کے حفظ و ضبط، علم و فضل اور ثقاہت میں فرق نہیں آتا، خطا و نسیان تو بشریت کا خاصہ ہے، جس سے کوئی محدث بھی بری نہیں، چنانچہ ان پر جن لوگوں نے اعتراض کیا ہے وہ بھی ان کو ثقہ اور ضابطہ مانتے ہیں، فلاس کا بیان ہے کہ ”میں جانتا ہوں کہ علامت مناقق والی حدیث میں کسی نے ان کی متابعت نہیں کی ہے تاہم اس کے باوجود وہ ثقہ و ضابطہ ہیں۔“

دوسری چیز یہ ہے کہ محدثین اور علمائے فن کے نزدیک سہو و خطا کرنے والا متروک الحدیث نہیں سمجھا جاتا، ائمہ صحاح کی کتابوں میں بھی ایسے رواۃ کی روایتیں موجود ہیں، اس لیے یہ الزام خواہ صحیح ہو یا غلط، اس سے ابوداؤد کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ابوداؤد طیالسی کے حافظہ میں حدیثوں کا بڑا ذخیرہ محفوظ تھا اور وہ اپنی

یادداشت سے حدیثیں بیان کرتے تھے، اس لیے ان سے بھول چوک کا ہو جانا تعجب انگیز نہیں ہے، ابن عدی کہتے ہیں کہ ”جو شخص محض یادداشت سے ۴۰ ہزار حدیثیں بیان کرے اس سے بعض روایتوں میں اس طرح کے سہو و خطا کا ہو جانا کہ جس روایت کو دوسرے موقوفاً بیان کرتے ہوں وہ اس کو مرفوعاً یا جس کو لوگ مرسلہ بیان کرتے ہوں وہ اس کو موصولاً بیان کر دے، بعید اور تعجب خیز نہیں کیوں کہ اس کا تمام تر دار و مدار حافظہ پر ہوتا ہے، باقی ابوداؤد نہ صرف میرے بلکہ دوسرے لوگوں کے نزدیک بھی متیقظ اور ثابت ہیں، (۱) امام احمد سے ایک مرتبہ کسی نے ان کی غلطیوں کا ذکر کیا تو فرمایا ان کی غلطی کو غلطی نہیں کہنا چاہیے، خطا کا الزام اس وقت ان پر درست ہو سکتا ہے جب ان سے ان کی غلطی کا تذکرہ کیا جائے اور وہ متنبہ نہ ہوں لیکن ان کا یہ حال ہے کہ ان سے جس وقت ان کی غلطی کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ فوراً متنبہ ہو جاتے اور سمجھ لیتے ہیں، (۲) دوسرے مورخین اور ائمہ تعدیل نے بھی اس قسم کی توجیہ بیان کی ہے۔

۲- تالیس: دوسرا اعتراض تالیس کا ہے، یعنی وہ ایک راوی کی روایت کو دوسرے کی طرف منسوب کر دیتے تھے، محمد بن منہال فرماتے ہیں ”ابوداؤد نے ہم سے ابن عون کے واسطے سے ۲۰ سے کچھ زیادہ حدیثیں بیان کیں، مگر ان میں سے ایک کے علاوہ جس کو میں نہیں جانتا تھا باقی حدیثیں یزید بن زریع کی تھیں۔ (۳)

حافظ ابن حجر نے دو اور واقعے نقل کئے ہیں، ان میں سے ایک ان ہی محمد بن منہال کے واسطے سے اور دوسرا امام دارقطنی کی کتاب الجرح والتعدیل سے ماخوذ ہے، ان تینوں واقعات سے خود ظاہر ہے کہ ابوداؤد نے غلطی سے روایت کا انتساب اصل راوی کے بجائے دوسرے کی جانب کر دیا ہے، خود حافظ ابن حجر نے جو ان واقعات کے ناقل ہیں،

(۱) تہذیب المعجم ج ۳ ص ۱۸۶ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۱۳ (۲) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۶ (۳)

ایضاً ص ۲۵ و تہذیب المعجم ج ۳ ص ۱۸۳۔

انھیں تحریف و تدلیس کے بجائے سہو و نسیان پر محمول کرنے کی کوشش کی ہے اور بجز ایک قلیل جماعت کے جمہور کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ تدلیس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ سفیان ثوری جیسے بزرگ جو امیر المؤمنین فی الحدیث کہلاتے ہیں اور بہت سے اہل کوفہ بھی تدلیس کرتے تھے، ابن صلاح لکھتے ہیں:

”صحیح یہ ہے کہ مدلس جس چیز کو لفظ محتمل سے روایت کرے اور سماع و اتصال کی وضاحت نہ کرے تو اس کا حکم مرسل اور اس کی قسموں جیسا ہے لیکن جس روایت کو ایسے الفاظ سے بیان کیا جائے جن سے اتصال کی صراحت ہوتی ہے جیسے سمعت، حدثنا، اخبرنا وغیرہ تو وہ مقبول اور قابل حجت ہے، صحیحین وغیرہ کتب معتبرہ میں بھی اس قسم کی بے شمار روایتیں ہیں، جیسے قتادہ، اعمش، سفیانین اور ہشام بن بشیر وغیرہ کے واسطے سے اور یہ اس بنا پر کہ تدلیس دراصل کذب نہیں بلکہ ایک طرح کا ابہام ہے جو لفظ محتمل کی بنا پر ہوتا ہے۔“ (۱)



## امام عبدالرزاق بن ہمام

(متوفی ۲۱۱ھ)

نام و نسب: عبدالرزاق نام، ابو بکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عبدالرزاق بن ہمام بن نافع۔

ولادت، وطن اور خاندان: یمن کے مشہور شہر اور پایہ تخت صنعاء میں ۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے، قبیلہ حمیر سے ولا کا تعلق تھا، صنعانی حمیری کی نسبتوں سے زیادہ مشہور اور یمنی بھی کہے جاتے تھے۔ (۱)

اساتذہ: بلند پایہ محدثین اور کبار ائمہ فن میں ابن جریج، امام اوزاعی، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن ابی سبرہ، امام مالک، معتمر بن سلیمان، معمر بن راشد ازدی اور یثیم بن بشر واسطی وغیرہ سے اعزہ و متعلقین میں اپنے والد ہمام اور چچا وہب سے اور دوسرے علما و مشائخ میں ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ، اسماعیل بن عیاش، ایمن بن نابل، ثور بن یزید کلاعی، جعفر بن سلیمان، داؤد بن قیس فرار، زکریا بن اسحاق کفی، سعید بن بشر، سعید بن عبدالعزیز، عبدالرحمن بن زید اسلم، عبدالعزیز بن ابی زیاد عبداللہ بن زیاد بن سمعان، عبداللہ بن عمر عمری اور ابو معشر، نجیح سندی وغیرہ سے شرف تلمذ حاصل ہے، معمر ازدی سے خاص تعلق تھا، سات آٹھ سال تک مستقل ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ (۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں خود ان کے بعض شیوخ ابن عیینہ اور معتمر بن سلیمان معاصرین

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۵۲۳، ۵۲۴، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۳، مرآۃ البیان ج ۲ ص ۵۲، تہذیب  
التہذیب ج ۶ ص ۳۱۳، بستان المحدثین ص ۲۸ (۲) تہذیب العہد ج ۶ ص ۳۱۱۔



واقران میں ابواسامہ حماد بن سلمہ اور کعب، ائمہ اسلام اور ناقدین حدیث میں امام احمد، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی، محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن معین اور دوسرے مشہور لوگوں میں ابراہیم بن موسیٰ، ابو مسعود رازی، احمد بن صالح، احمد بن منصور رمادی، احمد بن یوسف سلمی، اسحاق بن ابراہیم دیری، اسحاق بن ابراہیم سعدی، اسحاق بن منصور کوج، حجاج بن شاعر، حسن بن علی خلیل، زہیر بن حرب، سلمہ بن شیب، عبد بن حمید، عبد اللہ بن محمد مسندی، عبدالرحمن بن بشر، عمرو الناقہ، محمد بن رافع، محمد بن مہران حمال، یحییٰ بن جعفر بیکندی اور یحییٰ ابن موسیٰ وغیرہ شامل ہیں۔ (۱)

رحلت و سفر: مورخین نے تجارت کے لیے شام اور حج و زیارت کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے جانے کا ذکر کیا ہے، (۲) مگر حدیث کی طلب و جستجو کے لیے سفر کی تصریح نہیں کی ہے، ان کے مشائخ کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے مشہور اور اہم مراکز کا سفر ضرور کیا ہوگا۔

مقبولیت و مرجعیت: ان کے فضل و کمال اور علمی عظمت نے ان کی ذات کو مزج خلاق بنا دیا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے علاوہ کسی اور شخص کے پاس اس قدر زیادہ لوگ سفر کر کے نہیں آئے، اکثر علمائے اسلام ان کی بارگاہ کمال میں حاضر ہوئے تھے۔ (۳) مورخ یافعی نے ان کو المرحل الیہ من الآفاق یعنی وہ شخص جس کے پاس لوگ مختلف اطراف و اکناف سے آتے تھے، لکھا ہے۔ (۴)

اعتراف کمال: علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے ان کو مخزن علم بتایا ہے، ایک مرتبہ امام احمد سے پوچھا گیا کہ ان سے زیادہ بہتر اور برتر محدث کا آپ کو علم ہے؟ فرمایا نہیں ان کے معاصر ہشام کو اعتراف تھا کہ ”ہم لوگوں میں سب سے زیادہ صاحب علم عبدالرزاق ہیں۔ (۵)

(۱) تہذیب العبد ج ۶ ص ۳۱۱ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۳ (۳) تاریخ ابن خلکان ج ۱

ص ۵۳۳ و کتاب الانساب ورق ۳۵۵، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۳ (۴) مرآة الجنان ج ۲ ص ۵۲ (۵)

مرآة الجنان ج ۲ ص ۵۳ و ۱۱۲

حفظ وضبط: ابراہیم بن عباد ویری کا بیان ہے کہ عبدالرزاق کو بے اہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں، ہشام بن یوسف فرماتے ہیں ”ہم لوگوں میں سب سے بہتر حافظ ان کا تھا۔“

ثقافت: ان کی ثقافت پر علما کا اتفاق ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ بے شمار اہل حدیث نے ان کو ثقہ اور متقن کہا ہے، ابو حاتم فرماتے ہیں کہ ”عبدالرزاق کی حدیثیں لکھے جانے اور احتجاج کے لائق ہیں“ ابو زرعد فرماتے ہیں کہ ان کی حدیثیں ثابت اور معتبر ہیں، ابن جان یعقوب بن شیبہ آجری، عیسیٰ اور بزار وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، اور ذہلی وغیرہ نے ان کو احادیث کے معاملہ میں بڑا معتقد قرار دیا ہے، امام احمد سے ابن جریج کے شاگردوں میں ان کے اور برسانی کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا عبدالرزاق زیادہ ثقہ اور معتبر ہیں، مشہور محدث معمر کی حدیثوں کے سب سے بڑے حافظ اور سب سے زیادہ مستند راوی یہی تھے، یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ معمر کی حدیثوں کے لئے عبدالرزاق سے زیادہ بہتر اور معتبر کوئی نہیں، امام احمد کے نزدیک معمر کی عبدالرزاق کے واسطے سے مروی حدیثیں بصریوں کے توسط سے مروی روایات سے زیادہ بہتر ہیں اور جب ان کی کسی حدیث کے متعلق ان کے تلامذہ مختلف الرائے ہوتے تھے تو عبدالرزاق کی روایت کو قبول کرتے تھے۔ (۱)

پیشہ: عبدالرزاق تجارت پیشہ تھے، اور بسلسلہ تجارت شام جایا کرتے تھے۔  
شعر و سخن: شعر و سخن کا ذوق تھا، اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

فذاك زمان لعنابه      وهذا زمان بسنايلعب

ترجمہ: ایک وہ زمانہ تھا جس سے ہم کھیتے تھے اور اب یہ زمانہ ہے جو ہم سے کھیل

کر رہا ہے۔

وفات: ۸۵ سال کی عمر میں جبکہ ہوش و حواس بجا نہیں رہتے تھے ۲۱۱ھ میں وفات پائی، ابن

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۴، تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۶ بسن المحدثین

سعد کے بیان کے مطابق سوال کا مہینہ تھا۔

## تصنیفات

حافظ عبدالرزاق متعدد کتابوں کے جامع و مصنف بھی تھے، مگر ان میں سے اکثر معدوم و نایاب ہیں، بعض کے نام یہ ہیں: ۱- جامع یاسنن عبدالرزاق، اس کی اکثر حدیثوں کی صحاح میں تخریج کی گئی ہے، ۲- کتاب السنن فی الفقہ، ۳- کتاب المغازی، ۴- تفسیر میں بھی ایک کتاب لکھی تھی، ۵- مصنف، عبدالرزاق کی سب سے زیادہ اہم اور مشہور کتاب ہے، اس کو فقہی ابواب پر مرتب کیا گیا ہے، اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ مصنف کے جو مجموعے موجود ہیں ان میں مصنف ابن ابی شیبہ کے بعد سب سے مشہور یہی ہے اور قدامت کے لحاظ سے یہ اس پر بھی فوقیت رکھتی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اکثر روایتیں ثلاثی ہیں، مصنف عبدالرزاق ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، جرمنی اور حجاز کے کتب خانوں میں اس کے مکمل اور ناقص نسخے موجود ہیں۔

عبدالرزاق پر نقد و جرح: بعض علمائے جرح و تعدیل نے عبدالرزاق پر نقد و جرح بھی کی ہے:

۱- شیعیت: ان کی جانب شیعیت کی نسبت کی جاتی ہے لیکن اس کے متعلق ان کا خود بیان ہے کہ ”مجھے اس بات پر کبھی شرح صدر نہیں ہوا کہ جناب امیر کوشینین سے افضل قرار دوں“ سلمہ بن شیبہ ان کا قول نقل کرتے ہیں کہ ”حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ پر خدا کی رحمت ہو، جس شخص کے دل میں ان بزرگوں کی محبت نہ ہو وہ مومن نہیں، مجھ کو اپنے اعمال میں سب سے زیادہ بھروسہ ان حضرات کی محبت ہی پر ہے“ ابوالاثر ہر فرماتے ہیں کہ

”عبدالرزاق نے بتایا کہ وہ شیخین کی تفضیل کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ خود حضرت علیؑ سے بھی یہی ثابت ہے، وہ اپنے کو شیخین سے افضل اور بہتر کہنے سے منع کرتے تھے، جناب امیر کی شان میں اس سے بڑی اور کیا گستاخی ہوگی کہ ان سے محبت رکھنے کے باوجود ان کے عقیدہ و مسلک کی مخالفت کی جائے، جس چیز کو ان کی شیعیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ بعض اکابر کی طرح وہ بھی حضرت علیؑ اور اہل بیت کے بڑے گرویدہ تھے لیکن دوسرے صحابہؓ کے مراتب و درجات کو اہل سنت ہی کی طرح مانتے تھے، اس لیے ان کے معاصرین اور تلامذہ تک کو ان کی شیعیت کا علم نہ تھا، امام احمد سے ان کے صاحبزادہ عبداللہ نے اس کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میرے کانوں نے ان سے اس طرح کی کوئی بات نہیں سنی ہے، ان کے بارے میں مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ احادیث سے بڑا شغف رکھتے تھے“ حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان پر شیعیت کا اعتراض کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کی حقیقت صرف اس قدر تھی کہ وہ حضرت علیؑ سے بڑی محبت اور ان کے قاتل سے سخت نفرت کرتے تھے، علمائے جرح و تعدیل نے متفقہ طور پر ان کی توثیق کی ہے اور ان کی روایات کو تسلیم کیا ہے، کتب صحاح میں ان کی روایات اس کا ثبوت ہیں۔

۲- سوء حفظ و فتور عقل: دوسری جرح یہ ہے کہ ضعیفی میں ان کی بصارت زائل ہوگئی تھی اور سوء حفظ اور فتور عقل میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن یہ علت محض آخری دور کی حدیثوں کے لیے قاذح اور مانع ہو سکتی ہے اس کے پہلے کی روایات کے ثبوت و اعتبار میں اس سے فرق نہیں آتا بلکہ بعض علما نے بڑھاپے کی صرف ان ہی روایتوں کو کمزور کہا ہے جن کو وہ یادداشت سے بیان کرتے تھے۔

بعض اور بھی اعتراضات کیے گئے ہیں لیکن حافظ ابن حجر اور علامہ ذہبی نے ان کو سراسر مہمل اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔



## امام اسد بن موسیٰ

(متوفی ۲۱۲ھ)

نام و نسب: اسد نام اور اسد النبی لقب تھا، شجرہ نسب یہ ہے: اسد بن موسیٰ بن ابراہیم بن ولید بن عبد الملک بن مروان بن حکم۔ (۱)

ولادت، وطن، خاندان: ۱۳۲ھ میں اموی حکومت کے زوال و انقراض کے سال مصر میں پیدا ہوئے، خاندان بنو امیہ سے نسبی تعلق تھا، اس لیے اموی اور مصری کہلاتے ہیں۔ (۲)  
اساتذہ و شیوخ: ان کو جن نامور محدثین اور اکار فضلاء سے شرف تلمذ حاصل ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:

ابن ابی ذئب، حماد بن سلمہ، روح، شعبہ، شیبان، عبد العزیز بن ماجشون، لیث بن سعد، محمد بن طلحہ، مسعودی، معاویہ بن صالح اور یونس بن ابی اسحاق وغیرہ۔  
تلامذہ: بعض نامور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن صالح مصری، رحیم، ربیع بن سلمان مرادی، عبد الملک بن حبیب، محمد بن عبد الرحیم برقی، مقدام بن داؤد یحییٰ، ابو یزید یوسف قرطبیسی۔ (۳)

طلب حدیث کے لیے سفر: طلب حدیث کے لیے ان کے رحلت و سفر کا ذکر بھی ملتا ہے، علامہ ذہبی و ابن حماد جنبلی لکھتے ہیں، رحلت فی طلب الحدیث، انھوں نے حدیث کی طلب کے

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۶۸ (۲) ایضاً حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۳۵ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۶۸

تہذیب العبد ج ۱ ص ۲۶۰۔

لیے سفر کیا۔ (العمر ج ۱ ص ۳۶۱)

**حفظ وثقاہت:** اپنے زمانہ صاحب کمال محدثین اور ثقہ و ضابطہ حفاظ میں شمار کیے جاتے ہیں، علمائے رجال نے الحافظ کے لقب سے ان کا تذکرہ کیا ہے، امام بخاری نے ان کو مشہور الحدیث کہا ہے اور ان کی روایتوں سے استشہاد کیا ہے، اسی طرح امام ابوداؤد اور امام نسائی نے بھی استدلال کیا ہے، امام نسائی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، ابن یونس، ابن قانع، عجمی اور بزار وغیرہ نے بھی ان کی توثیق کی ہے، ابن حبان نے ثقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے، خطیب لکھتے ہیں ”مصری صالح“، یعنی اسد ابن موسیٰ مصری حدیثوں کے لیے صالح و معتبر تھے، (۱) ابن حماد نے لکھا ہے کہ ”احد الثقات الا کیاس، یعنی وہ ثقہ اور دانشمند لوگوں میں سے ایک تھے۔ (۲)

**اتباع سنت:** سنت سے خاص شغف تھا، عجمی نے صاحب سنہ کہا ہے، (۳) اسی لیے اسد السنہ کہلاتے تھے۔

**وفات:** ۸۰ سال کی عمر میں اپنے وطن مصر میں ۲۱۲ھ میں انتقال کیا۔ (۴)  
**اولاد:** حافظ ابن حجر نے سعید نام ایک فرزند کا ذکر کیا ہے، تابعین کے فضائل و مناقب میں ان کی ایک کتاب دو جلدوں میں تھی اس میں انھوں نے اپنے والد اور اس طبقہ کے دوسرے محدثین سے بکثرت روایات کی ہیں۔ (۵)

**تصنیفات:** اسد السنہ صاحب تصنیفات تھے، (۶) لیکن ان کی تصانیف میں صرف مسند اور کتاب الزہد کا ذکر ملتا ہے، بعض علمائے اسلام نے اس کو سب سے قدیم مسند بتایا ہے، یہ رائے درست ہو یا نہ ہو اتنا مسلم ہے کہ مصر میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی،

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۰ (۲) شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۷ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱

ص ۲۶۰ (۴) خلاصہ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۰ (۵) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۰ (۶) تذکرۃ الحفاظ ج ۱

علامہ ابن عدی کا بیان ہے کہ مصر میں سب سے پہلے اسد اللہ نے مسند مرتب کی جو یحییٰ بن عبد الحمید حمانی اور مسد ابن مسرہد بصری سے قدیم العہد تھے، (۱) اس لیے یہ قدیم ترین مسانید میں ہے اور اس کی اہمیت کا سبب اس کی قدامت ہی ہے۔

ایک اعتراض کا جواب: اسد اللہ پر بعض اعتراضات بھی کئے گئے ہیں، مثلاً علامہ ابن حزم نے ان کو منکر الحدیث اور ضعیف قرار دیا ہے، ابن یونس نے لکھا ہے کہ وہ منکر حدیثیں بیان کرتے تھے لیکن ان اقوال کی حیثیت شواذ و نوادر کی ہے جو علمائے فن اور ائمہ جرح و تعدیل کی عام توثیق کے مقابلہ میں قابل اعتنا نہیں، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ مجھے ان کے کسی عیب کا حال معلوم نہیں سوائے اس کے کہ ابن حزم نے ان کو ضعیف بتایا ہے لیکن یہ تضعیف مردود اور ناقابل تسلیم ہے، (۲) وہ اور حافظ ابن حجر دونوں لکھتے ہیں۔ و احسب الآفة من غیرہ (۳) یعنی ان کی روایتوں میں جو ضعف و سقم نظر آتا ہے وہ بعد کے دوسرے روات کی وجہ سے ہے۔



(۱) الرسالة المسطر ذمہ ص ۵۳، (۲) میزان الاعتدال ج ۱ ص ۹۷، (۳) ایضاً و تہذیب العہدیب

# امام عبید اللہ بن موسیٰ عبسی

(متوفی ۲۱۳ھ)

نام و نسب: عبید اللہ نام، ابو محمد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، عبید اللہ بن موسیٰ بن ابی المختار بازام (۱)

ولادت و خاندان و وطن: ۱۲۸ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے، قبیلہ عبس کے مولیٰ تھے، (۲) اس لئے کوفی اور عبسی کہلاتے ہیں لیکن علامہ معانی کا بیان ہے:

العبسی ..... الی عبس بن  
بغیض بن ریث بن غطفان  
..... عدنان وھی القبیلہ  
المشہورہ الیٰی نسب الیہا  
العبسیون بالكوفۃ۔ (۳)

سید مرتضیٰ زبیدی فرماتے ہیں:

عبس محلۃ بالكوفۃ قد نزلہا  
بنو عبس ومنها العبسیون  
المحدثون ومن الضوابط ان  
من کان من اهل الکوفۃ فہو

عبس کوفہ میں ایک محلہ ہے جہاں  
بنو عبس آکر اترے تھے اور ان ہی میں  
سے عبسی محدثین ہیں اور یہ قاعدہ کلیہ  
میں سے ہے کہ جو راوی اہل کوفہ میں

(۱) تقریب الجذب ص ۱۷۱ و تہذیب الجذب ج ۷ ص ۵۰ (۲) خلاصہ تہذیب ص ۲۵۳ و تہذیب

ج ۷ ص ۵۰ (۳) کتاب الانساب ورق ۳۸۲۔



بالموحدة منسوب الى هذه سے ہوتا ہے، وہ بائے موحده کے  
المحلة. (۱) ساتھ اسی محلہ کی طرف منسوب ہے۔

ان بیانات سے عبید اللہ بن موسیٰ کا عرب نژاد ہونا اور قبیلہ عبس سے ولا کے  
بجائے نسبی تعلق ظاہر ہوتا ہے،  
اساتذہ: ان کے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابن ادم محاربلی، ابن جریج، اسرائیل بن یونس، اسماعیل بن ابی خالد، الاعمش،  
امام اوزاعی، ایمن بن نائل، حسن بن صالح، حنظلہ بن ابی سفیان، زکریا بن ابی زائدہ،  
سفیان ثوری، شیبان، عبدالعزیز بن سیاہ، عثمان بن اسود، محمد بن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ،  
معروف بن خربوذ، موسیٰ بن عبیدہ ربذی، ہارون بن سلیمان فرا، ہشام بن عروہ، یونس بن  
ابی اسحاق وغیرہ (۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ اور مشتبہین کی تعداد بے شمار ہے چند نام یہ ہیں:

ابراہیم بن دینار بغدادی، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابو حاتم، ابوسعید اشج، احمد بن ابراہیم  
دورقی، احمد بن ابی سرح رازی، احمد بن حنبل، اسحاق بن منصور، اسحاق بن راہویہ، حجاج بن  
شاعر، حسین علی بن اسود، دارمی، سفیان بن عیینہ، عباس بن عبد العظیم منذری، عباس دوری  
عبد اللہ بن صباح عطار، عبد اللہ بن محمد مسندی، عثمان بن ابی شیبہ، قاسم بن زکریا، محمد بن حسین  
بن اشکاب، محمد بن سعد کاتب واقدی، محمد بن سلیمان باغندی کبیر، محمد بن عبد اللہ بن نمیر، محمد  
بن یحییٰ ذہلی، محمود بن غیلان، وکیع بن جراح، یحییٰ بن معین، یعقوب سفیان وغیرہ۔ (۳)  
خالد بن حمید مہری عمر میں عبید اللہ بن موسیٰ سے بڑے تھے، اس کے باوجود انھوں نے ان  
سے احادیث روایت کی ہیں، ائمہ صحاح نے بالواسطہ ان سے حدیثیں بیان کی ہیں، (۴)

(۱) تاج العروس ج ۳ ص ۱۸۳ (۲) اجزیب ج ۷ ص ۵۱ (۳) ایضاً ص ۵۱ (۴) تہذیب

اجزیب ج ۵ ص ۵۱۔

**حفظ و ثقاہت:** علمائے فن نے ان کا ”الحافظ“ کہہ کر تعارف کرایا ہے، ابن معین، ابن عدی اور عجل وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، ابن حبان و ابن شاہین نے ثقاہت میں تذکرہ کیا ہے، ابو حاتم اور ابن سعد ثقہ، صدوق اور حسن الحدیث بتاتے ہیں، ابوداؤد نے ان کو جائز الحدیث اور ابن قانع نے صالح الحدیث کہا ہے، اسرائیل کے مرویات کے سب سے زیادہ معتبر راوی یہی سمجھے جاتے تھے۔ (۱)

حدیث میں درجہ: علم حدیث میں ان کا مقام نہایت بلند تھا، علمائے فن کو ان کی اس خصوصیت کا اعتراف ہے، ان کے پاس احادیث کا نہایت وافر ذخیرہ تھا، علامہ ابن سعد نے انہیں کثیر الحدیث لکھا ہے۔

**قرأت و تفسیر اور فقہ:** وہ حدیث کے علاوہ فن قرأت، تفسیر اور فقہ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے، حمزہ، علی بن صالح اور عیسیٰ بن عمر سے علم قرأت کی تحصیل کی تھی اور لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے، علوم قرآنی میں مہارت کی وجہ سے صاحب قرآن کہلاتے تھے۔ عجل کا بیان ہے کہ ”عالم بالقرآن رأسافیہ (قرآنی علوم کے ماہر ممتاز عالم تھے) اور فقہ میں بھی یک گونہ امتیاز رکھتے تھے، صاحب مرآة الجنان کا بیان ہے:

كان اماماً في الفقه والحديث والقرآن: یعنی عبید اللہ فقہ، حدیث اور قرآن سے متعلقہ علوم کے امام تھے۔

زہد و عبادت: علم و فضل کی طرح زہد و تقویٰ اور تدین میں بھی ممتاز تھے یا فعی لکھتے ہیں، موصوفاً بالعبادة والصلاح (۲) (یعنی وہ عبادت و صلاح سے متصف تھے) علامہ ذہبی کا بیان ہے، كان ذا زهد و عبادة و اتقان (۳) (یعنی وہ زہد، عبادت گزار اور صاحب دیانت تھے)

(۱) تہذیب الجذب ج ۵ ص ۵۱، ۵۲، طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۷۹، میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۷۰

(۲) مرآة الجنان ج ۲ ص ۵۷، تہذیب الجذب ج ۷ ص ۵۳، ۵۲، (۳) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۷۰۔

وقار: مورخین نے لکھا ہے کہ وہ شرم و حیا کی وجہ سے ہمیشہ نگاہیں نیچی رکھے اور سر جھکائے رہتے تھے، ان کو کبھی ہنسی مذاق کی بات کرتے نہیں دیکھا گیا، نہایت باوقار طریقہ پر رہتے تھے۔ (۱)

عقیدہ و مسلک: بعض لوگوں نے ان کو شیعہ لکھا ہے مگر شیعیت اس زمانہ میں تفضیلت سمجھی جاتی تھی۔

وفات: نامون کے عہد خلافت میں شوال کے آخر یا شروع ذیقعدہ ۲۱۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ (۲)

تصنیفات: عبید اللہ کی تصنیفات میں صرف مسند کا پتہ چلتا ہے، اس کی اہمیت کا سبب بھی قدامت ہے، بعض علمائے اسلام نے سب سے قدیم مسند اسی کو قرار دیا ہے لیکن عام لوگوں کا خیال ہے کہ کوفہ میں سب سے پہلے یہی مسند لکھی گئی (۳) علمائے محدثین نے اس کی قدامت کی وجہ سے اس کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ایک شبہ کا جواب: بعض ائمہ جرح و تعدیل نے شیعیت کی وجہ سے ان کی تضعیف کی ہے، امام احمد اور بعض دوسرے علماء نے ان کو صاحب تخیلیط اور منکر الحدیث قرار دیا ہے، عثمان بن ابی شیبہ ان کی ثقاہت و صداقت کے معترف ہونے کے باوجود کہتے ہیں کہ وہ سفیان ثوری کی حدیثوں میں قبیح قسم کا اضطراب کرتے تھے لیکن مجموعی طور پر ان کی توثیق کی گئی ہے، علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ ”وہ امام بخاری کے شیوخ میں ہیں اور بذات خود نہایت ثقہ بزرگ تھے، البتہ شیعیت سے متہم کئے جاتے تھے“ ائمہ صحاح کا ان سے روایت کرنا ان کے ضبط و ثقاہت کا بڑا ثبوت ہے۔

(۱) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۷۰ و تہذیب العبد ج ۷ ص ۵۲ و طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۶۹ (۲)

ایضاً (۳) الرسالة المستطرفة ص ۵۳۔

## امام عبداللہ بن زبیر حمیدی

(متوفی ۲۱۹ھ)

نام و نسب: عبداللہ نام، ابو بکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ بن زبیر بن عیسیٰ ابن عبید اللہ۔

خاندان و وطن: ان کا خاندان عربی النسل اور وطن مکہ معظمہ تھا، وہ حمیدی، اسدی، زبیری، قریشی، اور کئی کی نسبتوں سے مشہور ہیں، سب سے مشہور نسبت قریش کے مشہور قبیلہ اسد کے ایک معزز فرد حمید کی جانب ہے۔ (۱) سن ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔

اساتذہ: حمیدی کے بعض مشہور شیوخ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن سعد، بشر بن بکر تینسی، سفیان بن عیینہ، عبدالعزیز بن حازم، فضیل ابن عیاض، محمد بن ادریس شافعی، مروان بن معاویہ، مسلم بن خالد کعب اور ولید بن مسلم وغیرہ۔ ان بزرگوں میں سفیان بن عیینہ اور امام شافعیؒ سے ان کو بڑا خاص تعلق تھا، ۱۹، ۲۰ سال تک سفیان کی خدمت میں رہنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا، ان کی دس ہزار حدیثیں حمیدی کو زبانی یاد تھیں، ان کے مرویات کے سب سے زیادہ معتبر اور قابل وثوق راوی سمجھے جاتے تھے، امام شافعیؒ کی صحبت میں بھی ایک عرصہ تک رہے، ان کے ہمراہ مصر تشریف لے گئے اور فقہ کی تکمیل و تخریج کی۔

تلامذہ: حمیدی کے اکثر تلامذہ فن حدیث کے ممتاز ماہرین تھے، بعض کے نام یہ ہیں:

احمد بن ازہر نیشاپوری، اسماعیل بن عبداللہ سمویہ، بشر بن موسیٰ، سلمہ بن شیبہ،

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۲۔

ابوزرعہ عبید اللہ بن عبد الکریم رازی، عبید اللہ بن فضالہ نسائی، محمد بن احمد قرشی، ابوبکر محمد بن ادریس، ابو حاتم محمد بن ادریس، محمد بن اسماعیل بخاری، محمد بن سجر، محمد بن عبد اللہ بن عبد الرحیم برقی، محمد بن یحییٰ ذہلی، ابو العباس محمد بن یونس کدی، محمد بن یونس نسائی، ہارون حمال، یعقوب بن شبیبہ، یعقوب بن سفیان اور یوسف بن موسیٰ قطان، امام بخاری ان کے خاص فیض یافتہ لوگوں میں تھے، اپنی صحیح میں ۵۷ حدیثیں ان کے واسطے سے روایت کی ہیں۔ (۱)

**فضل و کمال:** ان کے علم و فضل اور امامت پر محدثین اور ارباب فن کا اتفاق ہے، امام احمد اور امام بخاری نے ان کو امام کہا ہے، اسحاق بن راہویہ کا بیان ہے کہ ”ابو عبیدہ، شافعی اور حمیدی ہمارے زمانہ میں امام ہیں، صاحب شذرات لکھتے ہیں کہ وہ مکہ کے مشہور عالم و محدث اور امام حجت تھے، ذہبی فرماتے ہیں کہ ”حمیدی مشہور اور کبار ائمہ دین میں تھے، ان کا خود بیان ہے کہ عراق میں احمد، خراسان میں اسحاق اور حجاز میں مجھ سے سبقت لے جانے والا کوئی دوسرا نہیں۔“

**ضبط و ثقاہت:** ان کی قوت حافظہ اور ثقاہت بہت مسلم ہے، امام شافعی کو ان کے غیر معمولی حافظہ کا اعتراف تھا، مورخین نے ان کو کثیر الحدیث لکھا ہے یعنی ان کے علم و حفظ میں احادیث کا دافز ذخیرہ اور وسیع سرمایہ محفوظ تھا، ابن سعد، حبان، حاکم اور ابو حاتم وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، (۲) امام بخاری کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ ان کی روایت ملنے کے بعد وہ دوسروں کی مرویات کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

**فقہ و اجتہاد:** فقہ و افتاء میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا، امام شافعی سے اس کی تحصیل کی تھی اور امام بخاری حدیث کی طرح فقہ میں بھی ان کے شاگرد تھے اور ان سے اس کی تحصیل کی تھی، مکہ کے فقیہ و مفتی کی حیثیت سے حمیدی کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، مصر سے واپسی کے

(۱) فتح الباری ص ۱۱ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۶۳، ۲۶۴ و تہذیب المعجم ج ۵ ص ۲۱۶ تذکرۃ

تذکرۃ المحمدین.... گلستان حدیث کے مسکے کلاموں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

بعد وہ یہاں فقہ وافتا کا کام عمر بھر انجام دیتے رہے، صاحب مستدرک لکھتے ہیں وہ مکہ کے مشہور عالم و محدث اور مفتی تھے، حدیث و فقہ میں ان کا وہی درجہ اور مرتبہ تھا جو امام احمد کا عراق میں تھا۔

زہد و ورع: ورع و تقویٰ اور دیانت و پاکبازی میں بھی ممتاز تھے، ابن عدی نے ان کی نیکی اور پاکبازی کا ذکر کیا ہے، ابن حبان نے ان کو صاحب دین و فضیلت لکھا ہے۔

اتباع سنت: اتباع سنت میں بڑا اہتمام تھا، ابن حبان نے ان کو صاحب سنت بتایا ہے۔ (۱) احادیث و آثار سے شدت تمسک کی بناء پر وہ اہل رائے کو ناپسند کرتے تھے، اس کا اندازہ ان کے رسالہ اصول السنہ سے ہوتا ہے۔

عقیدہ و مسلک: عقیدہ و عمل کے لحاظ سے وہ محدثین اور سلف کے مسلک پر عامل تھے، رسالہ اصول السنہ سے ان کے بعض عقائد و اعمال کے متعلق ان کا نقطہ نظر معلوم ہوتا ہے۔

ایمان: قول و عمل دونوں کا نام ہے، اس میں کمی و بیشی ہوتی ہے، سفیان بن عیینہ کے سامنے ان کے بھائی ابراہیم نے کہا کہ ”ایمان کم نہیں ہوتا“ تو وہ غضبناک ہو گئے اور فرمایا کہ تم سچے ہو، ان مسائل کے بارے میں لب کشائی نہ کرو، ایمان کم بھی ہوتا ہے اور سلب بھی ہو جاتا ہے، ایمان و عمل کا اعتبار نیت پر موقوف ہے۔

تقدیر: تقدیر کے خیر و شر ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ جو کچھ ہوا ہے اس کا ہونا ضروری تھا اور نہ ہونا ناممکن تھا اور جو کچھ نہیں ہوا ہے اس کا نہ ہونا ممکن نہیں تھا۔

قرآن اللہ کا کلام ہے جو لوگ اس کو مخلوق کہتے وہ مبتدع اور سلف صالحین کے مسلک سے منحرف ہیں۔

روایت: موت کے بعد مومنین دیدار الہی سے مشرف ہوں گے۔

صفات الہی: قرآن کی وہ آیتیں جن میں اللہ کے ید و یمن اور استواء ممکن وغیرہ کا ذکر ہے،

(۱) تہذیب اہل بیت ج ۵ ص ۲۱۶ و حسن المحاضرة ج ۱ ص ۱۳۶۔

یا اس قسم کی جو حدیثیں ہیں ان کے مجرد بیان پر اکتفا اور توقف کرنا چاہیے، نہ ان میں کسی اضافہ کا ہم کو حق ہے اور نہ تشریح و تفسیر کا، اس قسم کی آیات و احادیث میں بحث و کلام کرنے والے اہل باطل اور فرقہ جمیہ و معطلہ میں شامل ہیں۔

مرکبین کبار: کبار کے مرکبین کو کافر سمجھنا خوارج کا عقیدہ ہے، گناہ کرنے سے انسان کافر نہیں ہوتا۔

احترام صحابہ: مسلمانوں کو صحابہ کرام کے لیے دعا و استغفار کرنا چاہیے، قرآن مجید میں ہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِأَخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا  
اے رب بخش دے ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے داخل ہوئے ایمان میں اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں پیر ایمان والوں کا۔ (الحشر: ۱۷)

اگر کوئی شخص ایک صحابی کو بھی برا بھلا کہے تو وہ جادہ سنت سے منحرف ہے، (۱)

وفات: اپنے وطن مکہ میں ربیع الاول ۲۱۹ھ میں وفات پائی، ۲۲۰ھ بھی سنہ وفات بتایا جاتا ہے۔

تصنیفات: رسالہ اصول السنۃ کے علاوہ حمیدی کی دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱- کتاب الرد علی العثمان، ۲- کتاب التفسیر۔ (۲)

۳- مسند: حمیدی کی یہ سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے جو گیارہ اجزا اور ۱۲۹۳

حدیثوں پر مشتمل ہے۔ (۳) اس کے رواۃ میں بشر بن موسیٰ اسدی بڑے ثقہ اور نامور محدث تھے، بعض صحابہ کے مرویات اس میں شامل نہیں ہو سکے، اس کی اہم خصوصیات

(۱) اصول السنۃ بر خاتمہ مسند حمیدی مرتبہ مولانا حبیب الرحمن الاعظمی ج ۲ ص ۵۴۶ تا ۵۴۸ (۲) مقدمہ

مسند ج ۱ ص ۱۰۰ بحوالہ جرح و تعدیل ج ۱ ص ۳۰ (۳) الرسالۃ المسطر ذم ۵۷۔

تذکرۃ المحمّدین ..... گلستان حدیث کے مہکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

حسب ذیل ہیں۔

- ۱- اس کا شمار قدیم ترین کتب مسانید میں شامل ہوتا ہے اور اغلب یہ ہے کہ مکہ میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی تھی۔
- ۲- اکثر روایات مرفوع ہیں، موقوف روایتیں کم ہیں۔
- ۳- صحابہ و تابعین کے آثار کا حصہ بھی اس میں شامل ہے۔
- ۴- احادیث کے نقل و روایت ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک ماہر فن کی طرح ان کے متعلق مختلف النوع معلومات بھی درج ہیں۔

مسند کے مخطوطے دارالعلوم دیوبند، حیدرآباد کے مکتبہ سعیدیہ و جامعہ عثمانیہ اور دمشق کے دارالکتب الظاہریہ میں موجود تھے، مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے ان نسخوں کی مدد سے مسند کو پہلی مرتبہ ۱۹۶۳ء میں تصحیح و تخریج کے بعد دو جلدوں میں شائع کیا ہے، خاتمہ پر رسالہ اصول السنہ بھی دیدیا ہے، حواشی میں مشکل الفاظ کی تشریح، اختلاف نسخ اور مختلف کتب حدیث سے اس کی حدیثوں کے باہمی اختلاف و مطابقت وغیرہ کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے مطالب عالیہ میں مسند کے زوائد بیان کئے ہیں۔ (۱)





## امام سعید بن منصور

(متوفی ۲۲۷ھ)

نام و نسب: سعید نام اور ابو عثمان کنیت تھی، سلسلہ نسب یہ ہے: سعید بن منصور ابن شعبہ۔ وطن: سعید کا سنہ ولادت نہیں معلوم ہو سکا اور وطن کے متعلق بھی اختلاف ہے، ایک روایت کے مطابق وہ جوزجان میں پیدا ہوئے اور بلخ میں نشوونما پائی، زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ ان کا وطن مرو تھا اور بلخ میں بود و باش اختیار کر لی تھی، طالقان کو بھی ان کا مولد بتایا جاتا ہے، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ مرو، طالقان اور جوزجان سب بلخ ہی کے قرب و نواح میں تھوڑے سے فاصلہ پر واقع تھے، بلخ جو بعد میں ان کی مستقل قیام گاہ بن گیا تھا خراسان کا مشہور مردم خیز شہر اور ایک عرصہ تک اس کا پایہ تخت رہا ہے، ان مقامات کی نسبت سے وہ مروزی، طالقانی، بلخی اور خراسانی مشہور ہیں۔ (۱)

اساتذہ: سعد بن منصور نے نہایت مقدس علمائے اسلام اور برگزیدہ محدثین سے کسب فیض کیا تھا، مشہور محدث اسماعیل بن علیہ کے مرویات کے سب سے بڑے ناقل ہونے کی وجہ سے ان کے راویہ کہلاتے تھے، امام مالک سے انھوں نے موطا کے علاوہ بہت سی حدیثوں کا سماع کیا تھا، لیث بن سعد اور سفیان بن عیینہ سے بھی ان کو روایت کرنے کا شرف حاصل ہے، دوسرے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵، تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۸۹ خلاصہ تہذیب التہذیب الکمال ص ۱۳۳ کتاب الانساب ورق ۸۹، بستان الحمدین ص ۳۸۔

ابوقدامہ حارث بن عبیدہ، حماد بن زید، داؤد بن عبدالرحمن بن ابی الزناد، ابولواحس سلام بن سلیم، شریک بن عبداللہ، ابوشہاب عبد ربہ بن قانع، عبدالعزیز بن ابی حازم، مسلمہ بن دینار، عبید اللہ بن ایاد، فلح بن سلیمان، مہدی بن میمون، ابو معشر نجیح بن عبدالرحمن، ہشیم بن بشیر اور ابو عوانہ وضاح بن عبداللہ بزار وغیرہ۔

تلامذہ: اساتذہ کی طرح ان کے تلامذہ میں بھی نامور علماء و محدثین شامل ہیں، امام احمد، امام مسلم اور ابوداؤد ان کے حلقہ فیض میں داخل تھے، صحاح کی دوسری کتابوں میں بھی سعید کے مرویات بالواسطہ شامل کئے گئے ہیں، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوثورابراہیم بن خالد کلبی، ابوبکر اثرم، ابوشعیب حرانی احمد بن خلید حللی، بشر بن موسیٰ، حرب بن اسماعیل کرمانی، حسن بن محمد زعفرانی، عباس بن عبداللہ سندی، عبداللہ بن عبدالرحمن داری، ابوزرعہ عبدالرحمن بن عمرو دمشقی، ابوزرعہ عبید اللہ بن کریم رازی، عمر بن منصور نسائی، ابوحاتم محمد بن ادریس، محمد بن علی بن میمون رقی، ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن موسیٰ وغیرہ۔ (۱)

رحلت و سفر: حدیث کی طلب و جستجو میں ان کے کثرت سفر کو مزنی نے وکان حافظا جو آلا اور علامہ ابن حجر نے طواف البلاد کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔ (۲)

عظمت: سعید بن منصور کی علمی عظمت کا اندازہ ان کے اساتذہ اور تلامذہ کے ناموں سے ظاہر ہے، امام احمد ان کے بڑے قدرداں اور مداح تھے اور ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ ان کا ذکر کرتے تھے، محمد بن عبدالرحیم جب ان کی روایت بیان کرتے تو تعریف کرتے اور کہتے حد ثنا سعید وکان ثبتا۔ (۳)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵ تہذیب المعجم ج ۳ ص ۸۹، خلاصہ تہذیب المعجم ج ۳ ص ۱۳۳  
کتاب الانساب ورق ۸۹، بسن المحدثین ص ۳۸ (۲) خلاصہ تہذیب المعجم ج ۳ ص ۱۳۳ و تہذیب المعجم ج ۳ ص ۸۹ (۳) تہذیب المعجم ج ۳ ص ۸۹۔

**حفظ وثقاہت:** علمائے فن ان کے حفظ وثقاہت کے بھی معترف تھے، یحییٰ بن حسان دوسرے محدثین کے مقابلہ میں ان کی فضیلت اور حفظ و ضبط کے بڑے قائل تھے، حرب کرمانی کا بیان ہے کہ ”سعید نے ہم کو دس ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں، امام احمد ان کو سچا اور صاحب فضل و کمال بتاتے ہیں، ابو حاتم، ابن حبان، ابن نمیر، ابن خراش، ابن قانع اور مسلمہ بن قاسم وغیرہ نے ان کی توثیق و تعدیل کی ہے، غلیلی کہتے ہیں کہ ان کی ثقاہت پر اتفاق ہے، حافظ ذہبی نے ان کو الحافظ الثقة اور الحافظ الامام الحجة لکھا ہے، ابن عماد کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور مشہور محدثین میں تھے۔ (۱)

**وفات:** آخر عمر میں انھوں نے مکہ معظمہ میں مستقل قیام کر لیا تھا اور یہیں تقریباً ۸۹ سال کی عمر میں مشہور اور صحیح روایت کے مطابق ۲۲۷ھ میں وفات پائی۔ (۲)

**تصنیفات:** سعید بن منصور صاحب تصانیف تھے (۳) مگر ان کی کتابیں معدوم ہیں، صرف ایک کتاب سنن کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ بھی طبع نہیں ہوئی ہے، سنن کو انھوں نے آخر عمر میں مکہ معظمہ کے زمانہ قیام میں مرتب کیا تھا (۴) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بڑی چھان بین محنت و احتیاط اور حذف و ترمیم کے بعد مرتب کی گئی تھی، اس لئے نہایت مستند اور معتبر ہوگی، احمد بن محمد اور محمد بن علی بن صالح نے اس کی روایت کی ہے، اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اکثر روایتیں ثلاثی ہیں (۵) اور اہمیت کا حال یہ ہے کہ (جمع فیہ ما جمع غیرہ) سنن ابی سعید میں جو کچھ اکٹھا کیا گیا، دوسرے مجموعہ احادیث ان سے خالی ہیں، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵، تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۸۹، ۹۰، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۹۱ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۲ (۲) طبقات ابن سعد قسم اول ج ۵ ص ۳۶۷، العمر فی خبر من غم ج ۱ ص ۳۹۹ (۳) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۹۰ (۴) الرسالة المستطرفة ص ۳۱ (۵) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۸۹، بستان المحمّدین ص ۴۷۔

صاحب السنن المشہورۃ التی  
لایشارکہ فیہا الا القیل (۱)  
وہ اس مشہور سنن کے مصنف ہیں جو  
بے نظیر اور عدیم المثال ہے۔

نقد و جرح: سعید بن منصور کے متعلق علامہ ذہبی نے یعقوب فسوی سے روایت کی ہے کہ  
”وہ اپنی غلطی جان لینے کے بعد بھی اس سے رجوع نہیں کرتے تھے لیکن ان کی عام مدح  
و توصیف کے متعلق اتنے کثرت سے اقوال منقول ہیں کہ ان کے مقابلہ میں اگر فسوی کا قول  
صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں اور اس سے سعید کے مرتبہ و عظمت میں کوئی  
فرق نہیں آتا، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ”ایسا وہ اس لیے کرتے تھے کہ ان کو اپنی کتاب کی  
صداقت و صحت پر پورا اعتماد اور وثوق تھا۔“ (۲)



(۱) خلاصہ تہذیب تہذیب الکمال ص ۱۴۳ والہدایہ والتہایہ ج ۱۰ ص ۲۹۹ (۲) میزان الاعتدال ج ۱  
ص ۳۹۱ و تقریب التہذیب ص ۹۴۔

## امام محمد بن صباح دُولابی

(متوفی ۲۲۷ھ)

نام و نسب: نام محمد، ابو جعفر کنیت، بزاز لقب اور والد کا نام صباح ہے، اس سے زیادہ نسب نامہ کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی۔

ولادت: مورخین اور علمائے طبقات و رجال نے ان کے سنہ ولادت کی تصریح نہیں کی ہے لیکن ان کی وفات ۲۲۷ھ میں ہوئی اور خطیب نے لکھا ہے کہ اس وقت سترہ ۷۰ سال سے زیادہ عمر تھی، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ وفات کے وقت ۷۷ سال کے تھے، (۱) اس اعتبار سے وہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

خاندان: ان کے خاندان کا قبیلہ مزنیہ سے ولاء کا تعلق تھا، (۲) اسی بنا پر مزنی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

وطن: ان کی نسبت دُولابی کے متعلق اختلاف ہے، بعض لوگوں کے نزدیک دُولاب رے کے ایک گاؤں کا نام ہے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے (۳) علامہ سمعانی کا خیال ہے کہ دُولاب رہٹ اور چرخ کو کہتے ہیں جو شخص اس کا پیشہ کرتا ہو یا جس کے پاس چرخ ہو اسے دُولابی کہا جاتا ہے، ابو جعفر محمد بن صباح کو بھی اسی بنا پر دُولابی کہا جاتا ہے، (۴) یا قوت حموی کے نزدیک دُولاب نام کے متعدد مقامات تھے، ابو جعفر دُولابی کا تعلق دُولاب مہارک سے تھا جو بغداد کے مشرقی جانب واقع ہے، (۵) آخر میں انھوں نے بغداد میں سکونت اختیار

(۱) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۷ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۷۴ و تہذیب المعجم ج ۹ ص ۲۳۱

(۲) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۵ و تہذیب المعجم ج ۹ ص ۲۲۹ میزان ج ۳ ص ۷۴ و تہذیب المعجم ج ۹ ص ۲۳۰

(۳) کتاب الانساب ورق ۲۳۳ (۵) معجم البلدان ج ۳ ص ۱۰۳۔

کر لی تھی۔ (۱)

اساتذہ: ابو جعفر دلابی نے نہایت برگزیدہ اور جلیل القدر محدثین سے احادیث کی روایت کی ہے، بعض شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن سعد، ابن ابی عبیدہ حداد، اسماعیل بن جعفر، اسماعیل بن زکریا خلقاتی، اسماعیل بن علیہ، حفص بن غیاث، خالد بن عبد اللہ واسطی، سعید بن محمد وراق، سفیان بن عیینہ، قاضی شریک بن عبد اللہ، عبد الرحمن بن ابی الزناد، عبد اللہ بن مبارک، عمر بن یونس یرامی، ابوقطن عمرو بن ہشیم، فضل بن موسیٰ سینانی، ہشیم بن بشیر، ولید بن ابی ثور، ولید بن مسلم، یزید بن ہارون، یوسف بن یعقوب، ماشون وغیرہ۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں بھی ممتاز محدثین شامل ہیں، چند کے نام یہ ہیں:

ابراہیم حربی، ابراہیم بن ہانی، ابراہیم بن یعقوب جوزجانی، ابن ابی خثیمہ، ابن ابی الدنیا، ابو حاتم رازی، ابوزرعہ دمشقی، ابوزرعہ رازی، ابوقدامہ سرحسی، احمد بن حنبل، ابویعلیٰ احمد بن علی موصلی، احمد بن محمد بن صباح، احمد بن منصور رمادی، احمد بن یحییٰ حلوانی، اسماعیل سمویہ، حسن بن علی خلال، حسن بن محمد صباح زعفرانی، داؤد بن سلیمان دقاق، عبد اللہ بن حنبل عبد الملک بن عبد الحمید میمون، عثمان بن سعید دارمی، عیسیٰ بن عبد اللہ طرابلسی، فضل بن سہل اعرج، ابوالعلاء محمد بن احمد جعفر، محمد بن بشیر بن مطر، محمد بن غالب تمتمام، محمد بن یحییٰ حرانی، محمد بن یحییٰ ذہلی، یحییٰ بن معین وغیرہ۔ (۲)

ائمہ صحاح اور اصحاب سنن میں، امام بخاری، امام مسلم اور ابوداؤد نے راہ راست اور دوسرے ائمہ نے امام بخاری کے واسطے سے ان سے روایت کی ہے، صحیح بخاری میں ۱۲ اور صحیح مسلم میں ۲۰ حدیثیں ان کے واسطے سے مروی ہیں۔ (۳)

(۱) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۵، ص ۳۶۶ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۲۹ و ۲۳۰ (۲) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۵، ۳۶۶ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۲۹، ۲۳۰ (۳) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۳۱، ۲۳۰۔

**حفظ وثقاہت:** علمائے فن نے باتفاق ان کو ثقہ و ضابط قرار دیا ہے، امام احمد فرماتے تھے کہ وہ ہمارے شیخ اور نہایت ثقہ بزرگ ہیں، ابن معین کا بیان ہے کہ دولا بی ثقہ و مامون تھے، احمد بجلی نے ان کو ثقہ، ابو حاتم نے ثقہ، قابل حجت اور مستند کہا ہے اور ابن حبان نے ثقات میں شامل کیا ہے، تھمام جب ان کے واسطے سے حدیث بیان کرتے تو کہتے، ہم سے محمد بن صباح دولا بی نے جو ثقہ و مامون تھے، روایت کی ہے، یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ، صاحب حدیث اور ہشیم کے مرویات کے سب سے زیادہ ممتاز عالم تھے، سلمہ نے ان کو ثقہ اور مشہور محدث اور ذہبی نے ثقہ و حجت قرار دیا ہے۔ (۱)

**زہد و تقویٰ:** تدرین و تقویٰ اور زہد و صلاح میں بھی نہایت ممتاز تھے، علامہ ابن عدی فرماتے ہیں کہ وہ بڑے صالح اور نیک بزرگ تھے۔ (۲)

**عزت و احترام:** علمی و دینی حیثیت سے ان کی شخصیت اتنی ممتاز تھی کہ علماء و صلحا ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھے، امام احمد ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ (۳)

**وفات:** تقریباً ۷۷ سال کی عمر میں بغداد میں محرم ۲۲۷ھ میں انتقال کیا۔ (۴)

**اولاد:** مورخین نے ان کے ایک صاحبزادے احمد کا ضمناً تذکرہ کیا ہے، جو بڑے صاحب کمال محدث تھے۔ (۵)

**تصنیفات:** ان کی تصنیفات میں ایک مجموعہ سنن کا مورخین اور علمائے طبقات درجال نے ذکر کیا ہے (۶)، ذہبی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنن و احکام سے متعلقہ روایات کا یہ ایک (۷) مختصر مگر منتخب اور مستند مجموعہ تھا۔

(۱) ایضاً و تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۶، میزان الاعتدال ج ۳ ص ۷۴ (۲) تہذیب ج ۹ ص ۲۳۱ (۳)

ایضاً ص ۲۳۰ (۴) تہذیب ص ۲۳۱، میزان ج ۳ ص ۷۴ و تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۶، ۳۶۷ (۵)

کتاب الانساب ورق ۲۳۳..... و تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۶ (۶) البدایہ و النہایہ ج ۱ ص ۲۹۹

(۷) العمر ج ۱ ص ۳۹۹۔

## امام یحییٰ بن عبد الحمید حمانی

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام و نسب: یحییٰ نام ابو زکریا کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: یحییٰ بن عبد الحمید بن عبد الرحمن ابن میمون بن عبد الحمید۔ (۱)

حافظ ابن حجر نے عبد الرحمن اور آخری عبد الحمید کے بجائے عبد اللہ اور عبد الرحمن لکھا ہے (۲) یحییٰ کے والد بھی اکابر محمدین میں شمار کئے جاتے ہیں، اور ان کے پردادا میمون کا لقب کشمیں تھا۔ (۳)

خاندان و وطن: قبیلہ حمان سے نسبی تعلق رکھتے تھے، یہ قبیلہ کوفہ میں آباد ہو گیا تھا جو یحییٰ کا وطن ہے اسی لئے وہ کوفی اور حمانی کی نسبتوں سے مشہور ہیں۔

پیدائش: ان کے سنہ ولادت کی تعیین و تصریح کتابوں میں نہیں ہے، قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۵ھ اور ۱۶۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔

اساتذہ: اپنے والد ماجد عبد الحمید کے علاوہ انھوں نے جن نامور محدثین سے اکتساب فیض کیا تھا ان کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن سعد، ابو اسرائیل ملائی، ابو بکر بن عیاش، ابو خالد الامر، ابو عوانہ، ابو معاویہ

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۶۷ (۲) تہذیب المعجم ج ۱۱ ص ۲۳۳ (۳) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۶۷

و مقدمہ فتح الباری ص ۳۱۵۔



ضریر جریر بن عبد الحمید، جعفر بن سلیمان، حکیم بن ظہیر، حماد بن زید، خالد بن عبد اللہ، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن بلال، شریک بن عبد اللہ، عبد الرحمن بن زید، عبد الرحمن بن غسیل، عبد اللہ بن مبارک، عبد الواحد بن زیاد، قیس بن رزح، ہشام، کعب اور یحییٰ بن یمان وغیرہ۔  
 تلامذہ: ان کے حلقہ فیض سے جو، اہم اور طویل القدر محدثین وابستہ تھے، ان کے نام یہ ہیں:  
 ابوبکر بن ابی الدنیا، ابو حاتم، ابو قلابہ قاشی، ابو یعلیٰ موصلی، احمد بن یحییٰ حلوانی، حمدان بن علی وراق، عبد اللہ بن احمد دورتی، عبد اللہ بن محمد بغوی، عثمان بن خرزاذ، علی بن عبد العزیز بغوی، قسیم ابن عباد ترمذی، محمد بن ابراہیم بوشنجی، محمد بن ایوب، محمد بن حسین وداعی، محمد بن عبید بن ابی الاسد، موسیٰ بن اسحاق انصاری اور موسیٰ بن ہارون وغیرہ۔ (۱)  
 سفر: طلب حدیث کے لئے ان کے سفر و سیاحت کا بھی ذکر ملتا ہے، خطیب نے بغداد جانے کی تصریح کی ہے۔

حدیث میں درجہ: وہ بلند پایہ اور نامور محدث تھے، ان کے اساتذہ میں سفیان بن عیینہ وغیرہ ان کے علم و فضل اور حدیث میں کمال کے معترف تھے، علامہ ذہبی اور خطیب نے احد ارکان الحدیث اور احد المحدثین کے الفاظ سے ان کا تعارف کرایا ہے۔ (۲)  
 حافظہ: ان کی قوت حفظ غیر معمولی تھی، ائمہ فن نے الحافظ، الحافظ الکبیر وکان من اعیالی الحفاظ (۳) وغیرہ الفاظ سے انھیں موسوم کیا ہے، ابن معین کا بیان ہے کہ کوفہ میں ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں تھا، شریک کے مرویات خاص طور پر انھیں حفظ تھے، ایک روایت کے مطابق ان کی سات ہزار حدیثوں کا ذخیرہ یحییٰ حمانی کے پاس تھا۔

ثقافت: اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، ابن عدی فرماتے ہیں لا بأس به یعنی ان  
 (۱) کتاب الانساب ص ۱۷۵ و تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۶۷، ۱۶۸ و تہذیب المعجم ج ۱۱ ص ۲۳۳ (۲)  
 تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۶۸ و العصر ج ۱ ص ۳۰۳، (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱ و خلاصہ تہذیب تہذیب الکمال ص ۳۲۵۔

کی روایات میں کوئی مضائقہ نہیں، ابن معین نے ان کی ثقاہت کا اعتراف کیا ہے ایک دفعہ فرمایا کہ وہ صدوق تھے، محض حسد کی وجہ سے ان میں کلام کیا گیا ہے لیکن امام نسائی نے انھیں ضعیف اور امام احمد ابن مدینی، ذہلی اور علامہ ابن سعد وغیرہ ائمہ نے ان پر جرح بھی کی ہے (۱) لیکن ان کی اکثریت ان کو ثقہ اور حجت مانتی ہے، امام بخاری تک نے اپنی صحیح میں فضائل قرآن کے ابواب میں ان کے واسطے سے ایک روایت نقل کی ہے (۲)

وفات: مشہور روایت کے مطابق ان کا انتقال رمضان ۲۲۸ھ میں ہوا (۳) لیکن ابن سعد کا بیان ہے کہ ۲۳۰ھ میں وفات پائی۔ (۴)

تصنیفات: ان کی ایک تصنیف مسند کا پتہ چلتا ہے، جو بہت ضخیم تھی (۵) ابن عدی لکھتے ہیں:

وله مسند صالح ولم ار شيئاً مسند حماني نہایت عمدہ اور بہتر ہے  
منكر آفي مسنده (۶) مجھے اس کے اندر کوئی منکر حدیث نظر

نہیں آئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کوفہ میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی، جو صحیح نہیں معلوم ہوتا، عبید اللہ ابن موسیٰ بھی صاحب مسند ہیں، ان کے اور حمانی کے سنہ وفات میں کم از کم پندرہ سال کا تفاوت ہے، اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ انھوں نے حمانی سے پہلے مسند مرتب کی ہوگی لیکن مسند حمانی کی قدمت بھی مسلم ہے۔

☆☆☆

(۱) تہذیب احمدیہ ج ۱۱ ص ۲۳۳ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۹۶ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۱۵ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱ و خلاصہ تہذیب ص ۴۲۵، تہذیب ج ۱۱ ص ۲۴۸ (۴) طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۸۷ (۵) کتاب الانساب ورق ۱۷۵ (۶) خلاصہ تہذیب ص ۴۲۵ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۹۶۔

## امام مسدد بن مسرہد

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام و نسب: ابو الحسن کنیت، مسدد لقب اور عبدالملک نام تھا، نسب نامہ یہ ہے، مسدد بن مسرہد ابن مسریل بن ماسک بن حرو بن یزید بن عثیب بن صلیب بن مالک بن اسد بن شریک۔  
 دوسرا نسب نامہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے: مسدد بن مسرہد بن مسریل بن مغریل بن مرعیل ابن مطریل بن اردل بن سرندل بن عزندل بن ماسک بن مستورد۔ (۱)  
 علامہ سمعانی نے دونوں نسب نامے نقل کر کے پہلے کو صحیح بتایا ہے۔ (۲)  
 ولادت و خاندان: نسبی تعلق عرب کے مشہور قبیلہ بنو اسد سے اور وطن بصرہ ہے، اسی لئے اسدی اور بصری کہلاتے ہیں، (۳) سنہ ولادت کی مورخین اور علمائے طبقات نے کوئی تصریح نہیں کی ہے، اس لئے اس کی تعیین دشوار ہے، قیاس ہے کہ ۱۵۵ھ یا اس سے کچھ پہلے یا بعد میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

اساتذہ و شیوخ: ان کے بعض اکابر شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوالاحوص، ابو عوانہ اسمعیل بن علیہ، بازام بن عمرو، جراح بن ملیح، جعفر بن سلیمان، بشر بن مفضل، جویریہ بن اسماء، حماد بن زید، حمید بن اسود، خالد بن حارث، خالد بن عبداللہ واسطی، عبداللہ بن یحییٰ بن ابی کثیر عبدالواحد بن زیاد، عبدالوارث بن سعید، عیسیٰ بن یونس، فضیل بن عیاض، قطان، محمد بن جابر کھمی، معتمر بن سلیمان، مہدی بن میمون

(۱) شذرات الذهب ج ۲ ص ۶۶ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۲ (۳) تہذیب لہجہ ذیج ۱۰ ص ۱۰۷

وکعب، ہشیم، یزید بن زریع اور یوسف بن ماشون وغیرہ۔ (۱)

تلامذہ: بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن یعقوب جوزجانی، ابو حاتم رازی، ابو خلیفہ جعفی، ابو زرعد رازی، احمد بن محمد بن مدریہ، قاضی اسلمعیل بن الخنق، حسن بن احمد کرہانی، حماد بن الخنق، محمد بن سعید وندانی، معاذ بن ثنی، یعقوب بن شیبہ، قاضی یوسف بن یعقوب وغیرہ۔

ائمہ صحاح میں امام بخاری نے بلا واسطہ اور امام ترمذی نے بالواسطہ اور امام

ابوداؤد نے دونوں طریقوں پر ان سے روایت کی ہے۔ (۲)

حدیث میں امتیاز: مسدد بن مسدد کے اساتذہ و تلامذہ کی عظمت سے خود ان کے مقام و مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے، ان کا اپنے زمانہ کے اکابر فضلًا، اور بصرہ کے نہایت مشہور اور جلیل القدر محدثین میں شمار ہوتا ہے۔ (۳)

حافظہ: ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، محدثین میں وہ ”الحافظ“ کے لقب سے مشہور تھے، عجمی کا بیان ہے کہ ان کی یادداشت اتنی اچھی تھی کہ جب وہ املا کرانے لگتے تو اتنی زیادہ حدیثیں بیان کرتے کہ ہم لوگ لکھتے لکھتے گھبرا جاتے تھے، (۴) ذہبی نے الحافظ الحجّة اور ابن عماد نے احد الحفاظ الثقات لکھا ہے۔ (۵)

ثقافت: ان کی عدالت و ثقافت پر علمائے فن کا اتفاق ہے یحییٰ بن معین روایت کرتے ہیں کہ یحییٰ بن سعید قطان فرماتے تھے کہ ”اگر میں مسدد سے ملتا تو ضرور ان سے حدیثیں نقل و روایت کرتا، بلاشبہ وہ اس کے اہل تھے، ان کا پایہ نہایت بلند اور وہ بڑے ثقہ تھے، ابو حاتم فرماتے ہیں کہ ان کی وہ حدیثیں جو قطان عبد اللہ بن عمر کے واسطے سے روایت کرتے ہیں، دنیا نیر کے مانند ہیں، گویا تم رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے ان کو سن رہے ہو۔ (۶)

(۱) تہذیب الجہد ج ۱۰ ص ۱۰۷، (۲) ایضاً ص ۱۰۷، ۱۰۸، (۳) کتاب الانساب ورق ۳۲ (۴)

تہذیب الجہد ج ۱۰ ص ۱۰۸، (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۶ (۶)

تہذیب الجہد ج ۱۰ ص ۱۰۸، ۱۰۹۔

امام احمد جیسے بزرگ ان کی عظمت و ثقاہت کے مداح و معترف تھے، ان کے شاگرد رشید میمون بن کا بیان ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ مسدود کی اللہ مغفرت کرے کیا ہی عمدہ اور بہتر شیخ تھے، ابو زر ع فرماتے ہیں کہ امام احمد نے مجھ سے کہا کہ مسدود سے جو حدیثیں میں بیان کرتا ہوں وہ صحیح اور درست ہیں، اس لئے تم کو ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے، ابن معین، ابو حاتم ابن قلعجی اور امام نسائی وغیرہ ائمہ جرح نے ان کی توثیق کی ہے اور ابن حبان نے ثقات میں تذکرہ کیا ہے، جعفر بن عثمان نے یحییٰ بن معین سے دریافت کیا کہ بصرہ کے کس شخص کی حدیثیں لکھی جائیں تو فرمایا مسدود سے، لا ریب وہ ثقہ اور مستند تھے۔ (۱)

وقات: رمضان المبارک ۲۲۸ھ میں جب کہ بوڑھے ہو چکے تھے انتقال کیا۔ (۲)

تصانیف: ان کی تصنیفات میں صرف مسند کا ذکر ملتا ہے، علامہ ذہبی نے اس کے بعض حصوں کا سماع کیا تھا، (۳) یہ مقطوع و موقوف ہر قسم کی روایتوں کا مجموعہ تھا، امام دارقطنی نے سب سے پہلی مسند اسی کو قرار دیا ہے اور ابن عدی کا بیان ہے کہ بصرہ میں مسند لکھنے کا شرف سب سے پہلے مسدود ہی کو حاصل ہوا، (۴) اس مسند کی اہمیت اس کی قدامت کی وجہ سے ہے، تمام اصحاب تراجم و فہرست نے اس کا ذکر کیا ہے اس سے بھی اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔



(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۹ و طبقات ابن سعد قسم دوم جز ہفتم ص ۵۷، (۲) العمر ج ۱ ص ۳۰۴ و تذکرہ ج ۲ ص ۹ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۶ (۳) العمر ج ۱ ص ۳۰۴ اور الرسالة السطر ذم ص ۵۳۔ (۴) تقریب الجہد ص ۲۳۳ و تہذیب الجہد ص ۱۰۹۔

## امام نعیم بن حماد خزاعی

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام و نسب: نعیم نام ابو عبد اللہ کنیت، اور نسب نامہ یہ ہے: نعیم بن حماد بن معاویہ بن حارث بن ہام بن سلمہ بن مالک۔ (۱)

خاندان و وطن: ان کا قبیلہ خزاعہ سے خاندانی اور خراسان کے مشہور شہر مرو سے وطنی تعلق تھا لیکن مصر میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی اس لئے خزاعی، مروزی اور مصری کی نسبتوں سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

اساتذہ و شیوخ: انھوں نے جن نامور علمائے اسلام سے استفادہ کیا تھا، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن سعد، ابراہیم بن ظہمان، ابوبکر عیاش، ابوجزہ عسکری، ابو داؤد طیالسی، بقیہ بن ولید، جریر بن عبد الحمید، حفص بن غیاث، خارجہ بن مصعب، زبید بن سعد، سفیان بن عیینہ، عبد اللہ بن مبارک، عبد الوہاب ثقفی، عیسیٰ بن عبید کندی، فضل بن موسیٰ سنہانی، فضل بن عیاض، نوح ابن ابی مریم، معتمر بن سلیمان اور ہشیم وغیرہ، روح بن عبادہ سے ۵۰ ہزار حدیثوں کا سماع کیا تھا۔ (۲)

تلامذہ: ان کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن جوز جانی، ابوالاحوص عسکری، ابوبکر صنعانی، ابوحاتم رازی، ابواسامعیل ترمذی، احمد بن منصور رماوی، احمد بن یوسف سلمی، اسماعیل سمویہ، بکر بن ہبل، میاطی، جزہ بن محمد بن عیسیٰ بغدادی، علی بن داؤد قنطری، عصام بن رواد بن جراح، عبد اللہ بن عبد الرحمن

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۲۰۰ و تہذیب ج ۱۰ ص ۲۵۸ (۲) تہذیب الجہد ج ۱۰ ص ۲۵۸۔

دارمی، محمد بن عوف طائی، محمد بن یحییٰ ذہبی اور یحییٰ بن معین وغیرہ۔

صاح ستہ کے مصنفین کے متعلق حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

امام بخاری نے صرف ایک دو موقع پر ان سے روایت کی ہے لیکن اکثر مواقع پر تعلق کی ہے، امام مسلم نے مقدمہ میں ایک جگہ ان کی روایت لی ہے، بقیہ ائمہ سنن میں امام نسائی کے علاوہ سب نے ان سے بالواسطہ روایتیں کی ہیں۔ (۱)

طلب حدیث کے لئے سفر: مورخین لکھتے ہیں کہ طلب الحدیث طلبا کثیرا بالعراق والحجاز یعنی عراق وحجاز میں نہایت دلچسپی اور انہماک سے حدیث کی تحصیل و تکمیل کی، عراق وحجاز میں ایک عرصہ تک قیام کرنے کے بعد مصر تشریف لائے اور ۴۰ سال کے لگ بھگ وہاں رہے۔ (۲)

حفظ وثقاہت: حفظ وضبط اور ثقاہت و اتقان کے لئے مشہور و ممتاز تھے، یحییٰ بن معین، امام احمد، عجل، ابن عدی، اور ابو حاتم وغیرہ متعدد اکابر محدثین اور ائمہ جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، بعض ائمہ فن نے ان کے وہم و خطا کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اس سے ان کی عدالت و ثقاہت میں فرق نہیں آتا، ابن معین وغیرہ کا بھی یہی خیال ہے۔ (۳)

فقہ: حدیث کی طرح ان کو فقہ سے بھی بڑی مناسبت تھی اور علم فرائض کے ماہر تھے اسی لئے فرائضی بھی کہلاتے تھے، مورخین نے فقیہ عارف بالفرائض اور من اعلم الناس بالفرائض کہہ کر اس کا اعتراف کیا ہے۔

علم و فضل: ان کے علم و فضل کے بھی تمام علماء معترف تھے، علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کے متعلق احد علماء العصر (یکتائے روزگار) اور کان من اوعیة العلم (خزانہ) علم لکھا ہے۔ (۴)

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۵۸ (۲) ایضاً ص ۳۶۲، تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۱۳ و میزان الاعتدال

ج ۳ ص ۲۳۸ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۶۳، ۳۶۴ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۳۰، ۲۳۱

(۴) تہذیب ج ۱۰ ص ۳۶۳ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۳۰، ۲۳۱۔

دینی حمیت: نعیم بن حماد بڑے متبع سنت اور دیندار بزرگ تھے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ وہ ان لوگوں میں تھے جو سنتوں کے معاملہ میں نہایت متشدد و محصل تھے اور اہل بدعت و اہوا سے سخت متنفر اور بیزار رہتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے وہ خود بھی جمیہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن ابو عاصمہ کے فیض صحبت سے جن کے یہ کاتب تھے اور جو حمیت سے سخت متنفر تھے ان کو بھی جمیہ اور اہل اہوا سے سخت متنفر ہو گیا تھا۔ (۱)

قید و بند: امام نعیم کی دینی حمیت اور غیرت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان سے خلق قرآن کا عقیدہ جبراً قبول کرنے کے لئے کہا گیا لیکن انھوں نے اصحاب دعوت و عزیمت کی طرح اس کو ماننے سے انکار کر دیا، اس کے نتیجہ میں ان کو قید و بند کی مشقت سے دوچار ہونا پڑا اور وہ مصر سے قید کر کے عراق لائے گئے اور بغداد یا سامرا میں قید خانہ میں انتقال کیا۔ (۲)

وفات: ۱۳ جمادی الاولیٰ ۲۲۸ھ کو انتقال کیا، ۲۲۷ھ کی بھی روایت کی گئی ہے۔ (۳)  
تصنیفات: وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں ولہ المصنفات فی السنن وغیرہا، (۴) ان کی تصنیفات میں دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔  
۱- الفتن والمہم: یہ بڑی اہم، مشہور اور اپنے موضوع پر نہایت قدیم کتاب ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ (۵)

۲- مسند: اس کو قدامت کی بنا پر بڑی اہمیت حاصل ہے، ایک عرصہ تک یہ اہل علم میں متداول رہ چکی ہے، بعض علماء سب سے قدیم مسند اسی کو بتاتے ہیں، امام احمد فرماتے ہیں ہمارے علم کے مطابق کتب مسند میں سب سے پہلی تصنیف نعیم کی ہے، خطیب نے لکھا ہے کہ مسند کے سب سے پہلے جامع و مرتب یہی تھے۔ (۶)

(۱) تہذیب ج ۱۰ ص ۳۶۳ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۳۰ و ۲۳۱ (۲) ایضاً و طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۷  
ص ۲۰۶ (۳) ایضاً (۴) الہدایہ ج ۱ ص ۳۰۲ (۵) ضحیٰ الاسلام ج ۲ ص ۱۲۶ (۶) تہذیب ج ۱ ص ۳۵۹  
و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۔



## امام عبداللہ بن محمد جعفی

(متوفی ۲۲۶ھ)

نام و نسب: عبداللہ نام، ابو جعفر کنیت اور مسندی لقب تھا، سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن جعفر بن یمان بن اخص بن حمیس۔ (۱)

خاندان و وطن: ماوراء النہر کا مشہور شہر بخارا جو امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری اور دوسرے اکابر محدثین کا مولد و مسکن ہے، ابو جعفر جعفی بھی اسی خاک کے نامور محدث تھے، جعفی بن سعد ندجی کے مولیٰ تھے اسی نسبت سے جعفی کہلائے، (۲) مسندی اس لئے کہلاتے تھے کہ فرسل اور منقطع حدیثوں کے بجائے ان کو مسند اور متصل حدیثوں کی تلاش رہتی تھی۔ (۳)

اساتذہ: ابو جعفر مسندی کے بعض اساتذہ و شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوداؤد، ابو عامر عقدی، اسحاق بن ازرق، حری بن عمارہ، خلیل بن احمد مزنی، سفیان بن عیینہ، عبدالرزاق، فضیل بن عیاض، مروان بن معاویہ، معتمر بن سلیمان، یحییٰ بن آدم وغیرہ۔

تلامذہ: چند مشہور تلامذہ یہ ہیں:

(۱) کتاب الانساب ورق ۵۳۱ تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۷۵ و جامعہ العمر ج ۱ ص ۳۰۵ بحوالہ انساب (۳) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۹-۱۰ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۷۵ و کتاب الانساب ورق ۵۳۱۔

ابو حاتم رازی، ابو زرعہ رازی، احمد بن سيار، حمدون بن عمارہ بزار، عبداللہ بن عبد الرحمن دارمی، عبید اللہ بن واصل، محمد بن احمد بن ہارون مصیصی، محمد بن نصر مروزی محمد بن یحییٰ ذہلی وغیرہ۔

ان کی محدثانہ عظمت اس سے ظاہر ہے کہ امام بخاری اور ان کے واسطے سے امام ترمذی نے ان سے روایتیں نقل کی ہیں، امام بخاری کی صحیح میں ان کے واسطے سے ۴۴ حدیثیں درج ہیں۔ (۱)

رحلت و سفر: مورخین اور علمائے طبقات نے احادیث کی طلب و جستجو کے لئے ان کے سفر و سیاحت کا بھی ذکر کیا ہے، حافظ ذہبی نے یمن جانے کی تصریح کی ہے۔

حفظ و ثقاہت: محدثین اور علمائے فن نے ان کو ثقہ اور معتبر حافظ و محدث قرار دیا ہے، ابن عماد نے الثبت، حافظ ذہبی نے الحافظ الحجة اور علامہ ابن حجر نے ثقہ و حافظ کہہ کر ان کا تعارف کرایا ہے (۲) احمد بن سيار فرماتے ہیں کہ وہ صاحب سنت اور ضبط و اتقان اور صدق و عدالت کے لئے مشہور تھے، ابو حاتم نے صدوق اور ابن حبان نے ثقہ و متقن کہا ہے اور علامہ خلیلی کا خیال ہے کہ ان کی ثقاہت و اعتبار پر اتفاق ہے۔ (۳)

اعتراف: اہل علم اور محدثین نے ان کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے، علامہ سمعانی نے عالم بخاری اور دوسرے علماء نے امام حدیث لکھا ہے حاکم کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں بخاری کے استاد اور ماوراء النہر کے امام تھے، حسن بن شجاع نے ایک بار امام بخاری کی ایک حدیث سے ناواقفیت دیکھ کر حیرت سے فرمایا کہ آپ خزانہ حدیث یعنی ابو جعفر مسندی کے پاس جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس حدیث سے ناواقف ہیں۔ (۴)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۷۵ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۷ (۲) شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۷

و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۷۵ و تقریب العذب ص ۱۳۱ (۳) تہذیب ج ۶ ص ۹-۱۰ و تذکرہ ج ۲ ص ۷۶

(۴) تذکرہ ج ۲ ص ۷۶ کتاب الانساب ورق ۱۳۱۔

وفات: ان کی وفات ان کے وطن بخارا میں ذیقعدہ ۲۲۹ھ میں ہوئی۔ (۱)  
 حلیہ: خوش قامت اور موزوں اندام تھے، بڑھاپے کی وجہ سے سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے۔ (۲)

تصنیفات: ان کی تصنیفات میں ایک مسند کا ذکر ملتا ہے ماوراء النہر میں سب سے پہلے ان ہی کو مسند کی جمع و تدوین کی سعادت حاصل ہوئی، حاکم کا بیان ہے کہ انھیں مسندی کہے جانے کا سبب یہ ہے کہ ماوراء النہر میں صحابہ کے ناموں کی ترتیب پر سب سے پہلے انہی نے احادیث جمع کی تھیں، (۳) یہ مسند بھی اپنی صحت و قدامت کی وجہ سے مشہور اور اہم سمجھی جاتی ہے۔



(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۶ و تہذیب الحدیث ج ۶ ص ۹ (۲) تہذیب الحدیث ج ۶ ص ۹ (۳) ایضاً ص ۱۰۔

## امام ابو بکر بن ابی شیبہ

(متوفی ۲۳۵ھ)

نام و نسب: عبداللہ نام، ابو بکر کنیت، اور نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ محمد بن ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان بن خواستی۔

ولادت، خاندان اور وطن: ابن ابی شیبہ ۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے ان کا وطن واسط ہے اور وہ قبیلہ بنو عیس کے مولی تھے، ان کا خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، ان کے دادا ابو شیبہ جن کے نام کی نسبت سے وہ مشہور ہوئے، ایک صاحب علم بزرگ تھے اور ۲۳ سال تک منصور کے زمانہ میں واسط میں منصب قضا پر فائز رہے، ابو شیبہ کے فرزند محمد کو بھی علم و فن سے اشتغال تھا، وہ فارس کے قاضی تھے، ان کے تین صاحبزادے عبداللہ عثمان، اور قاسم اکابر محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں، ابو بکر کا خاندان بعد میں کوفہ میں آباد ہو گیا تھا، اس لیے بعض لوگوں نے ان کو یہیں کا باشندہ بتایا ہے، کوئی، واسطی اور عیسی ان کی مشہور نسبتیں ہیں۔ (۱)

اساتذہ اور شیوخ: ابو بکر نے جن نامور محدثین سے اکتساب فیض کیا تھا، ان میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں:

ابن ابی زائدہ، ابن شریح، ابو بکر بن عیاش، اسمعیل بن علیہ، اسمعیل بن عیاش،

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۶۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰، تہذیب ج ۶ ص ۶۲ و کتاب الانساب ورق ۳۸۲

وستان المحدثین ص ۳۹۔

تذکرۃ ائمہ محدثین.... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

131

جریر بن عبدالمحید، حفص ابن غیاث، ابواسامہ حماد بن سلمہ، خلف بن خلیفہ، سفیان بن عیینہ، ابوالاحوص سلام بن سلیم، ابو خالد الاحمر سلیمان بن حیاء، شریک بن عبد اللہ نخعی، عباد بن عوام، عبد الاعلیٰ ابن عبد الاعلیٰ، عبد اللہ بن ادریس، عبد الرحمن بن محمد محارب، عبد الرحمن بن مہدی، عبد اللہ بن مبارک، عبد اللہ بن نمیر، عمر بن عبید، ابو نعیم فضل بن وکیع، محمد بن بشر عبیدی، محمد بن حازم، محمد بن فضیل، ابو معاویہ، مروان بن معاویہ، معتمر بن سلیمان، وکیع بن جراح، ہشیم بن بشیر، یحییٰ بن سعید قطان، یزید بن مقدم، یزید بن ہارون وغیرہ۔

تلاذہ: نامور فقہا و محدثین میں امام احمد بن حنبل، ابو زرعہ، ابو حاتم اور قحی بن مخلد کے علاوہ صحاح ستہ کے مصنفین میں امام بخاری، مسلم اور ابن ماجہ کو براہ راست اور امام نسائی کو بالواسطہ روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، دوسرے مشہور علما میں ابراہیم بن اسحاق حربی، ابوبکر احمد بن ابی عاصم انبیل، جعفر فریابی، حسن بن علی معمری، زکریا نسائی، عباس بن محمد دوری، عبد اللہ بن احمد بن حنبل، عبد اللہ بن احمد ہوازی، ابوالقاسم عبد اللہ بن محمد بخوی، عثمان بن خرزاذ، محمد بن ابراہیم مربع، محمد بن اسحاق صاعانی، محمد بن سعد، محمد بن عبدوس بن کامل، محمد بن عبید اللہ مناوی، محمد بن عثمان بن ابی شیبہ، محمد بن محمد باغندی، موسیٰ بن اسحاق انصاری، ہشیم بن خلف دوری، یعقوب بن شیبہ اور یوسف بن یعقوب نیشاپوری وغیرہ۔

رحلت و سفر: ان کے بعض مشائخ کے علاوہ اکثر کا وطن کوفہ اور واسط ہے لیکن دوسرے مراکز حدیث کے محدثین سے بھی انھوں نے استفادہ کیا ہے، چنانچہ بغداد میں ان کے قیام اور درس و تدریس کی تصریح بہت سے مورخین نے کی ہے۔ (۱)

اعتراف کمال: ابن ابی شیبہ کے معاصر علما اور نامور محدثین کو ان کے علم و فضل اور فن حدیث میں تبحر اور جامعیت کا اعتراف ہے، ابو عبید قاسم بن سلام فرماتے ہیں کہ علم حدیث چار آدمیوں پر تمام ہو گیا، ابوبکر بن ابی شیبہ، حسن ادا، خوش سلیقگی اور حفظ و مذاکرہ میں امام

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۶۶ و تہذیب الہدیب ج ۶ ص ۳۰۲۔

تذکرۃ المحمّدین..... گستان حدیث کے ہستے گلابوں کا ایمان افروز حقیقی تذکرہ

132

احمد، فقہ و معرفت حدیث میں یحییٰ بن معین جامعیت اور کثرت روایت میں اور علی بن مدینی حدیث کے مخارج و علل سے واقفیت میں یکتائے روزگار تھے، امام احمد کا ارشاد ہے کہ ابو بکر بن ابی شیبہ میرے نزدیک اپنے بھائی عثمان سے افضل و برتر ہیں، آپ کے صاحبزادہ عبداللہ نے عرض کیا کہ ابن معین عثمان کو فائق سمجھتے ہیں فرمایا لیکن میں ابو بکر ہی کو زیادہ پسند کرتا ہوں، (۱) علامہ ذہبی نے عدیم النظر، الامام، احد الاعلام، اور حافظ ابن کثیر نے احد الاعلام وائمة الاسلام وغیرہ القاب سے ان کا ذکر کیا ہے، (۲) شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ”وہ حدیث کے امام تھے۔“ (۳)

حفظ و ضبط: ان کے حفظ و ضبط کا علما نے اعتراف کیا ہے، عمرو بن علی فلاس فرماتے ہیں کہ ”میں نے ان سے بڑا حافظ حدیث نہیں دیکھا، صالح محمد جزرہ کا بیان ہے کہ ”مذاکرے کے وقت ابن ابی شیبہ سے بہتر یادداشت کسی کی نہیں تھی، حافظ ابو زرعہ کہتے ہیں کہ ”ان سے بڑا حافظ حدیث میں نے نہیں پایا، احمد بن حمید سے کوفہ کے سب سے بڑے حافظ حدیث کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انھوں نے جواب دیا کہ ابو بکر بن ابی شیبہ، ابن حبان لکھتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں منقطع روایتوں کے سب سے بڑے حافظ یہی تھے۔“

ثقافت: امام احمد ان کو صدوق، علی، ابو حاتم، ابن خراش اور ابن قانع ثقہ و ثابت، اور خطیب و ابن حبان نے متقن کہا ہے، علامہ ابن ناصر الدین اور حافظ ذہبی نے ثقہ التحریر لکھا ہے، ابن معین سے دریافت کیا گیا کہ کوفہ کے کس آدمی سے حدیث بیان کی جائے، فرمایا ابو شیبہ کے دونوں بیٹوں ابو بکر اور عثمان سے ایک مرتبہ ابن معین سے ان کے شریک سے سماع کا حال دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ ہمارے نزدیک سچے ہیں، اگر وہ شریک کے بجائے کسی اور متقدم سے بھی سماع کا دعویٰ کرتے تو ہم اس کو بھی مان لیتے، میں نے خود ان سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا، کہ آپ نے شریک سے کب سماع کیا ہے؟ فرمایا کہ چودہ سال کی

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۰۳، ۲۰۴۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰ (۳) بستان المحمّدین ص ۴۹۔

عمر میں جب میرا حافظہ اس وقت سے زیادہ اچھا اور بہتر تھا۔ (۱)  
 وفات: ابن ابی شیبہ نے تقریباً چوبیس سال کی عمر میں ۸ محرم الحرام ۲۳۵ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ (۲)  
 تصنیفات: تصنیفی حیثیت سے ابن ابی شیبہ باکمال مصنف تھے، ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ  
 ”احسنہم وضعاً للكتاب ابن ابی شیبہ (۳) مصنفین اور تذکرہ نگاروں کے  
 بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی متعدد تصنیفات تھیں لیکن وہ سب معدوم اور نایاب ہیں،  
 ابن ندیم نے ان کی حسب ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے:

۱- کتاب السنن فی الفقہ، ۲- کتاب التفسیر، ۳- کتاب التاريخ، ۴- کتاب  
 الفتن، ۵- کتاب صفین، ۶- کتاب الجمل، ۷- کتاب الفتوح، ۸- کتاب المسند۔ (۴)  
 لیکن عام مؤرخین ان کی چار کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، مسند تفسیر، کتاب الاحکام  
 اور مصنف، آخری دونوں کتابوں کا ابن ندیم نے ذکر نہیں کیا ہے، اس طرح ابن ابی شیبہ کی  
 معلوم کتابوں کی تعداد دس ہو جاتی ہے، مسند کے متعلق ملاحظہ فرمائیے کہ وہ ایک بڑی  
 اور ضخیم کتاب ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ: ابو بکر بن ابی شیبہ کی سب سے مشہور کتاب مصنف ہے، اس کی  
 بدولت ان کو لازوال شہرت نصیب ہوئی، یہ حدیث کی اہم اور بلند پایہ کتابوں میں شمار کی  
 جاتی ہے، اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور، اہم، جامع  
 اور مبسوط یہی کتاب ہے، مصنف عبدالرزاق اس کے مقابلہ میں قدیم ضرور ہے لیکن یہ اس  
 سے زیادہ ضخیم اور جامع ہے۔ (۵)

ترجمہ: محدثین کے طریقہ کے مطابق اس کو سندوں کے ساتھ فقہی کتابوں کی طرح ابواب

(۱) بستان الحدیثین ص ۲۹ (۲) تاریخ بغداد ج ۱ ص ۸۱ والعمد ج ۱ ص ۴۲۱ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲

ص ۲۰ (۴) والفہرست ص ۳۸ (۵) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۰، ۴۵۱۔

وکتب پر مرتب کیا گیا ہے، اس کی ابتدا کتاب الطہارۃ سے ہوتی ہے، یہ کئی اجزا پر مشتمل ہے۔  
اہمیت: حافظ ابن کثیر نے اس کے متعلق تحریر فرمایا کہ ”ابو بکر بن ابی شیبہ لا جواب اور عدیم  
المثال مصنف کے مرتب ہیں، ان سے پہلے اور بعد کسی زمانہ میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی،  
شاہ ولی اللہ دہلوی نے حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں اس کا شمار کیا ہے، حافظ ابن  
حزم اندلسی نے اس کو مؤطا سے بھی بالاتر بتایا ہے۔ (۱)

یہ رائے مبالغہ سے خالی نہیں لیکن اس سے مصنف کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔  
خصوصیات: اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اکثر مرویات صحاح ستہ کی کتابوں میں  
موجود ہیں، امام بخاری نے تیس اور امام مسلم نے ۱۵۴۰ روایات کی تخریج کی ہے سنن ابی  
داؤد میں بکثرت اور سنن ابن ماجہ میں غالباً سب سے زیادہ اسی سے حدیثیں لی گئی  
ہیں۔ (۲)

۲- احکام و مسائل کا اس سے زیادہ جامع اور مستند کوئی مجموعہ نہیں ہے، (۳) اس  
میں وہی روایتیں شامل کی گئی ہیں جن سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔  
۳- نقل احادیث غیر جانبدارانہ ہے، اہل حجاز اور اہل عراق سب کے مرویات  
بلا ترجیح و تنقید ذکر کئے گئے ہیں۔

۴- اس میں مرفوع و متصل روایات کے ساتھ مرسل، منقطع اور موقوف حدیثیں  
بھی ہیں اور صحابہ کے آثار، تابعین کے فتاویٰ اور فقہاء وغیرہ کے آراء و اقوال بھی بیان کئے  
گئے ہیں، اس سے ہر حدیث کے متعلق سلف کے تعامل اور ائمہ کے اتفاق و اختلاف کا پتہ  
چل جاتا ہے۔

مصنف کا ایک باب ہذا ما خالف بہ ابو حنیفۃ الاثر الذی جاء عن

(۱) البدایہ والنہایہ، ج ۱۰ ص ۳۱۵ و حجتہ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۵ و تذکرہ ج ۳ ص ۳۷۷ (۲) تہذیب

ج ۶ ص ۴ و امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۴۵ (۳) النکت البریفہ ص ۳۔



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے امام ابو حنیفہؒ کے رد میں بھی ہے، اس کے جواب میں زہد الکوثری نے النکت الطریفة فی التحدث عن ردہ ابن ابی شیبہ علی ابی حنیفہ کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جو قاہرہ کے مطبع انوار سے ۱۳۶۵ھ میں شائع ہوا ہے اور دو سو ستر صفحے پر مشتمل ہے لیکن علامہ کوثری نے اعتراف کیا ہے کہ اس رد کے باوجود مصنف ابن ابی شیبہ کا اہل عراق پر بڑا احسان ہے کیوں کہ ان کے فقہی دلائل کے لیے سب سے زیادہ جامع اور مستند ماخذ یہی ہے۔“

مصنف کے قلمی نسخے، جرمنی، مدینہ منورہ کے مکتبہ محمودیہ اور خدیویہ مصر وغیرہ میں موجود ہیں، (۱) ہندوستان میں مکتبہ سندھ، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ مولانا عبدالحی لکھنوی اور بعض دیگر کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، (۲) اس کے بعض اجزا ملتان سے شائع ہوئے ہیں، چوتھا جز ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں کتاب الزکوٰۃ، کتاب الجنائز، کتاب الایمان والنذور والکفارات شامل ہیں۔

☆☆☆

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵ والرسالۃ المستطرفہ ص ۳۶، فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۱ ص ۴۲۴

(۲) تذکرۃ النوادر ص ۳۶ بحوالہ مکتوبات شاد احسان اللہ سندھی، فہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۱ ص ۶۲۲۔

## امام اسحاق بن راہویہ

(متوفی ۲۳۸ھ)

نام و نسب: اسحاق نام، ابو یعقوب کنیت اور ابن راہویہ لقب تھا، شجرہ نسب یہ ہے: اسحاق بن ابراہیم بن محمد بن ابراہیم بن مطر بن عبید اللہ بن غالب بن عبد الوارث بن عبید اللہ بن عطیہ بن مرہ بن کعب ابن ہمام بن اسد بن مرہ بن حنظلہ بن مالک بن زید بن منات بن تمیم۔

اسحاق کے والد ابراہیم بطن مادر ہی میں تھے کہ ان کی والدہ نے مکہ معظمہ کا سفر کیا، اسی سفر میں کسی مقام پر ان کی ولادت ہوئی، اس لئے اہل مرو انہیں راہوی یا راہویہ یعنی راستہ والا کہتے تھے، اسحاق کا بیان ہے کہ میرے والد کو جب لوگ راہویہ کہتے تھے تو ان کو ناگوار ہوتا تھا لیکن مجھے ابن راہویہ کہا جاتا ہے تو کوئی ناگواری نہیں ہوتی۔ (۱)

ولادت: ابن راہویہ بروایت صحیح ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے، ۱۶۶ھ اور ۱۶۳ھ کی روایتیں بھی کی گئی ہیں۔ (۲)

خاندان و وطن: ان کا وطن خراسان کا مشہور شہر مرو تھا لیکن انہوں نے نیشاپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، (۳) اس لئے مروزی اور نیشاپوری کہلاتے تھے، تمیمی اور حنظلی کی نسبتوں سے ان کا عربی النسل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۳۷، ۳۳۸، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۰۹، ۳۱۰، طبقات الشافعیہ ج ۱

ص ۲۳۳، تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۳، تنبیہ ج ۱ ص ۲۱۶ (۲) ایضاً، (۳) الانشاء لابن عبد البر ص ۱۰۸۔

اساتذہ: ان کے مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابو اسامہ، ابو بکر، بن عیاش، ابو معاویہ، اسباط بن محمد، اسماعیل بن علیہ، بشر بن  
مفضل، بقیہ بن ولید، جریر بن عبد الحمید رازی، حاتم بن اسماعیل، حفص بن غیاث، سفیان بن  
عیینہ، سلیمان بن نافع عبدی، سوید بن عبد العزیز، شعیب بن الخثعم، عبد الرحمن بن مہدی،  
عبدالرزاق بن ہمام، عبدالعزیز دراورودی، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن وہب، عبدہ بن  
سلیمان، عبد الوہاب ثقفی، عتاب بن بشیر جزری، عمر بن ہارون، عیسیٰ بن یونس، غنڈر، فضیل  
بن عیاض، محمد بن بکر برسانی، محمد بن سلمہ حرانی، معاذ بن ہشام، معتمر بن سلیمان نصر بن  
شمیل، کعب بن جراح، ولید بن مسلم اور یحییٰ بن قاضح وغیرہ۔

تلامذہ: ابن راہویہ کے تلامذہ کے مختلف طبقے ہیں، ۱- ان کے بعض اساتذہ بقیہ بن ولید،  
محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن آدم وغیرہ، ۲- اور معاصرین میں احمد بن حنبل، اسحاق بن منصور  
کوچ، محمد بن رافع اور یحییٰ بن معین، ۳- اور عزیزوں میں فرزند محمد نے بھی استفادہ کیا ہے  
اور صحاح ستہ کے مصنفین میں امام ابن ماجہ کے علاوہ سب کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے،  
بعض اور ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن ابی طالب، احمد بن سلمہ، اسحاق بن ابراہیم نیشاپوری، جعفر فریابی،  
حسن بن سفیان، زکریا سجری، ابو العباس سراج، عبداللہ بن عبد الرحمن داری، عبداللہ بن محمد  
بن شیریہ، محمد بن الفتح، محمد بن نصر مروزی اور موسیٰ بن ہارون وغیرہ۔ (۱)

طلب حدیث کے لیے سفر: علامہ ابن عساکر اور حافظ ابن حجر نے آپ کے کثرت سفر  
(فطاف البلاد طبع الحدیث) (حدیث کی طلب و تحصیل کے لیے مختلف شہروں میں  
پھرے) کہہ کر ذکر کیا ہے اور خطیب نے لکھا ہے کہ جاز، عراق، یمن اور شام وغیرہ مراکز حدیث

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۳۵ تا ۲۳۷، ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۰ و طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۲ و ۲۳۳،

تہذیب ج ۱ ص ۲۱۷۔

کاسفر کیا اور بغداد کئی بار تشریف لائے، عراق کا سفر ۲۳ سال کی عمر میں ۱۸۳ھ میں کیا تھا۔ (۱)  
**علم و فضل کا اعتراف:** اسحاق بن راہویہ بلند پایہ علمائے اسلام میں تھے، معاصرین علما اور اساطین فن نے ان کے فضل و کمال اور علمی عظمت و بلند پایگی کا اعتراف کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل جو ان کے بڑے مداح اور قدرداں تھے، فرماتے ہیں، خراسان و عراق میں ان کا کوئی ہمسر نہیں، بغداد کے اس پل کو ان سے زیادہ عظیم و برتر کسی آدمی نے عبور نہیں کیا، گو بعض مسائل میں ہمارا اور ان کا اختلاف ہے اور اہل علم کے درمیان تو اختلافات ہو ہی کرتے ہیں، ایک مرتبہ اسحاق کے صاحبزادے محمد ان کی خدمت میں حصول علم کے لئے حاضر ہوئے تو ارشاد ہوا کہ تمہارا اپنے والد سے وابستہ رہنا زیادہ مفید اور بہتر ہے ان سے زیادہ پر عظمت آدمی تمہاری آنکھوں نے نہ دیکھا ہوگا، امام احمد ان کی عظمت کے اس حد تک قائل تھے کہ اگر ان کے سامنے کوئی انھیں ابن راہویہ کہتا تو ناگواری کا اظہار کرتے اور فرماتے کہ اسحاق بن ابراہیم حنظلی کہا کرو۔

محمد اسلم کہتے ہیں کہ اگر امام ثوری زندہ ہوتے تو اسحاق کے علم و فضل سے بے نیاز نہیں رہتے، احمد بن سعید رباعی کا قول ہے کہ اور ابن عیینہ اور حماد بھی ان کے محتاج ہوتے، محمد بن یحییٰ صفار نے سنا تو کہا کہ اگر حسن بصری زندہ ہوتے تو اکثر چیزوں میں ان کو اسحاق کی جانب رجوع کرنا پڑتا، ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ اگر وہ تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو وہ لوگ بھی ان کے علم و فضل کے معترف ہوتے، نعیم بن حماد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی خراسانی اسحاق بن راہویہ کے علم و کمال میں کلام یا نکتہ چینی کرے تو اسے متہم فی الدین سمجھو، سعید بن ذویب فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر اسحاق کے مانند میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا، ابویحییٰ شمرانی کا بیان ہے کہ علمی مذاکرہ کے وقت وہ یکتا اور یگانہ معلوم ہوتے تھے۔

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۰۹ و تہذیب ج ۱ ص ۲۱۷ و تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۳۵ تا ۳۳۷ و طبقات

یحییٰ بن یحییٰ کا بیان ہے کہ خراسان میں علم کے دو خزانے تھے، ایک محمد بن سلام بیکندی کے پاس، دوسرا اسحاق بن راہویہ کے پاس ہے، حسین بن منصور بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں یحییٰ اور اسحاق کے ہمراہ ایک شخص کی عیادت کرنے گیا، جب ہم لوگ اس کے گھر گئے پاس پہنچے تو اسحاق پیچھے ہو گئے اور یحییٰ سے کہا پہلے آپ داخل ہوں کیونکہ آپ ہم سے عمر میں بڑے ہیں، انھوں نے کہا بیشک میں عمر میں بڑا ہوں لیکن علم و فضل میں آپ فائق ہیں اس لئے پہلے آپ ہی چلیں، حافظ ابن عبد البر لکھتے ہیں ”وہ جلیل القدر علمائے اسلام اور نامور محدثین و حفاظ عالم میں تھے۔ (۱)

شرف امامت: اسحاق بن راہویہ کا شمار ان ائمہ میں ہوتا ہے جو صاحب مذہب، فقیہ و مجتہد تھے مگر اب ان کا فقہی اور اجتہادی مذہب مٹ چکا ہے لیکن ایک زمانہ میں یہ بھی مسلمانوں کا معمول بہ مسلک رہا ہے، امام احمد اور امام نسائی ان کے متعلق فرماتے ہیں، امام من ائمة المسلمين یعنی مسلمانوں کے ایک امام یہ بھی ہیں، ایک مرتبہ امام احمد سے ان کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ مسلمانوں کے امام ہیں، ہمارے نزدیک شافعی، حنبلی اور اسحاق تینوں امام ہیں، محمد بن یحییٰ ذہلی کا بیان ہے کہ ایک دن بغداد کے مقام رصافہ میں ائمہ محدثین امام احمد اور یحییٰ بن معین وغیرہ جمع تھے لیکن مجلس صدارت پر اسحاق بن راہویہ رونق افروز تھے اور وہی اس مجلس کے خطیب بھی تھے، محمد بن نصر فرماتے ہیں وہ ہمارے اور ہمارے مشائخ کے شیخ و بزرگ تھے، فضل شعرانی کہتے ہیں وہ بلا شک و شبہ خراسان کے امام تھے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں احد الاعلام و علماء الاسلام، علامہ ابن سبکی تحریر فرماتے ہیں احد ائمة الدين و اعلام المسلمين و هداة المومنين دوسرے مورخین نے بھی ان کو احد ائمة الاسلام احد ائمة المسلمين و علماء من اعلام

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۳۹، ۵۰، ۵۱، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۱۲۱، ۱۲۱، تہذیب الحدیث ج ۱

ص ۲۱۸، ۲۱۹، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۳۳۳، ۳۳۵، انتقام ص ۱۰۸۔

الدین امام شرق اور عالم نیشاپور وغیرہ لکھا ہے۔ (۱)

علم حدیث میں کمال و امتیاز: علم حدیث سے ان کو خاص تعلق تھا اور وہ اکابر محدثین اور نامور حفاظ میں شمار کئے جاتے ہیں، خلیلی کا بیان ہے کہ وہ ”شہنشاہ حدیث تھے“ حدیثوں کے نشر و اشاعت، درس و مذاکرہ، حفظ و ضبط اور حزم و احتیاط کے لئے ان کی ذات بڑی اہمیت اور شہرت رکھتی ہے، ذیل میں ان کی ان خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حفظ و ضبط: اسحاق بن راہویہ کا حافظہ غیر معمولی اور یادداشت حیرت انگیز تھی، ابن حبان، خطیب بغدادی اور ابن عساکر وغیرہ نے حافظہ میں ان کی جامعیت کا اعتراف کیا ہے، علامہ ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اگر اسحاق تابعین کے عہد میں ہوتے تو وہ لوگ بھی ان کے حافظہ کے معترف ہوتے، قتیبہ بن سعید کا بیان ہے کہ خراسان کے نامور حفاظ میں اسحاق بن راہویہ اور ان کے بعد امام داری اور امام بخاری تھے، ابو یحییٰ شعمرانی کہتے ہیں کہ میں نے ان کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی، وہ ہمیشہ یادداشت سے حدیثیں بیان کرتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ میں نے کبھی کوئی چیز قلمبند نہیں کی جب بھی مجھ سے کوئی حدیث بیان کی گئی میں نے اسے یاد کر لیا، میں نے کسی محدث سے کوئی حدیث کبھی دوبارہ بیان کرنے کے لئے نہیں کہا، یہ کہنے کے بعد انھوں نے پوچھا کیا تم لوگوں کو اس پر تعجب ہے؟ لوگوں نے کہا جی ہاں؟ یہ حیرت کی بات ہی ہے، انھوں نے کہا جس چیز کو میں ایک مرتبہ سن لیتا ہوں وہ مجھے یاد ہو جاتی ہے، ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں ہر وقت میری نگاہ کے سامنے رہتی ہیں اور میں ان کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ وہ کتاب میں کس جگہ ہیں؟ ابوداؤد خفاف کی روایت کے مطابق انھوں نے ایک لاکھ حدیثوں کے متعلق کہا کہ وہ میری نظر کے سامنے ہیں، میں ان کا تذکرہ کر سکتا ہوں ایک دفعہ انھوں نے گیارہ ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں اور پھر جب

(۱) حوالہ مذکورہ اختلاف صفحات و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۲ والابدایہ ج ۱ ص ۱۰۷ میزان الاعتدال

ج ۱ ص ۸۶، العصر ج ۱ ص ۳۳۶ و مرآة البیان ج ۲ ص ۱۲۱ و شذرات الذهب ج ۲ ص ۸۹۔

دوبارہ کتاب سے ان کی قرأت کی تو ایک لفظ کی بھی کمی یا بیشی نہیں نکلی، احمد بن سلمہ کہتے ہیں کہ انھوں نے پوری مسند کا زبانی املا کرایا، ابو حاتم رازی نے ابو زرہ سے اسحاق بن راہویہ کے حفظ اسانید و متون کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں دیکھا گیا، احمد بن سلمہ نے ابو حاتم کو بتایا کہ انھوں نے یادداشت سے اپنی تفسیر کا املا کرایا ہے تو ابو حاتم نے کہا یہ اور زیادہ حیرت انگیز بات ہے کیوں کہ مسند حدیثوں کا ضبط تفسیر کے اسناد والفاظ کے ضبط کے مقابلہ میں آسان ہے، امیر خراسان عبداللہ بن طاہر نے ایک مرتبہ ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، انھوں نے فرمایا کہ اس کے متعلق سنت یہ ہے اور یہی اہل سنت کا قول ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کی رائے اس سے مختلف ہے، ابراہیم بن ابی صالح وہاں موجود تھے بولے امیر المؤمنین اسحاق غلط کہتے ہیں، امام ابو حنیفہ کا مسلک اس سے مختلف نہیں ہے، انھوں نے جواب دیا کہ مجھ کو یہ مسئلہ یاد ہے، فلاں کتاب کا فلاں جز لایے، کتاب لائی گئی اور ابن طاہر نے اس کو الٹا شروع کیا تو اسحاق نے کہا امیر المؤمنین گیارہویں ورق کی نویں سطر میں ملاحظہ فرمائیے، چنانچہ اس کے اندر وہ مسئلہ اسحاق کے بیان کے عین مطابق نکلا، امیر نے کہا ہم کو معلوم تھا کہ آپ کو مسائل از بر ہیں لیکن حافظ کا یہ مشاہدہ ہمارے لیے یقیناً حیرت انگیز ہے۔ (۱)

**صدق و ثقاہت:** اس غیر معمولی حفظ کے ساتھ اسی درجہ کا صدق اور ثقاہت بھی تھی، ابو حاتم فرماتے ہیں کہ کثیر الحفظ ہونے کے باوجود اسحاق کا ضبط و اتقان اور غلطیوں سے محفوظ و مصون رہنا حیرت انگیز ہے، خطیب بغدادی وغیرہ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ و ثقاہت دونوں کے جامع تھے، ذہبی نے ان کو ثقہ و حجت بتایا ہے اور ابن حبان نے ان کا ثقاہت میں ذکر کیا ہے، امام نسائی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ و مامون تھے، امام داری کا بیان ہے کہ اسحاق

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۲۵۲، ۲۵۳، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۱۳، ۲۱۴، طبقات الشافعیہ ج ۱

ص ۲۳۳، ۲۳۴، تہذیب المعجم ج ۱ ص ۲۱۴، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۸۷، ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۳۔

اپنے صدق کی وجہ سے اہل مغرب و مشرق کے سردار بن گئے تھے، امام احمد کو ان کے صدق و ثقاہت پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک دفعہ انھوں نے ان سے کوئی حدیث پوچھی، جب اسحاق نے اسے بیان کیا تو ایک شخص نے اعتراضاً کہا کہ کعب نے یہی روایت اس سے مختلف طریقہ پر بیان کی ہے، امام احمد نے برا فروختہ ہو کر کہا خاموش رہو، جب ابو یعقوب جو امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں کوئی روایت بیان کریں تو اسے بلا تامل قبول کر لینا چاہیے۔ (۱)

حزم و احتیاط: اس حفظ کے ساتھ اتنے محتاط تھے کہ بچپن میں انھوں نے عبداللہ بن مبارک سے حدیثیں سنی تھیں مگر ان کو روایت نہیں کرتے تھے کہ احتیاط کے خلاف ہے۔ (۲)

حفاظت و اشاعت حدیث: ان کی ذات سے حدیث نبوی کی بڑی اشاعت اور سنت نبوی کا بڑا احیاء ہوا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ”اسحاق بن راہویہ نے سنتوں کا دفاع اور مخالفین حدیث کا قلع قمع کیا“ وہب بن جریر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ اسحاق، صدقہ اور یحییٰ کو ان کے اسلامی خدمات کا صلہ عطا فرمائے، ان لوگوں نے مشرق کی سر زمین میں حدیثوں کی اشاعت اور سنت نبوی کا احیاء کیا۔

فقہ و اجتہاد: حدیث کی طرح فقہ و اجتہاد کے بھی ماہر تھے، ابو اسحاق شیرازی، حاکم صاحب مستدرک اور خطیب نے ان کو فقہ و اجتہاد میں جامع اور اکابر فقہاء میں شمار کیا ہے، حافظ ابن کثیر نے احداً المجدین من الانام اور ابن حبان نے نامور و ممتاز فقہاء میں ان کا شمار کیا ہے، ایک مرتبہ امام احمد ابن حنبل سے ان کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ اسحاق کے مانند کون ہو سکتا ہے، ایسے ہی لوگوں سے مسائل دریافت کرنا چاہیے، ہم لوگ بھی ان سے فتوے پوچھتے ہیں۔ (۳)

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۵۰-۳۵۲، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۲، ۴۱۳، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۲

وتبذیب ج ۱ ص ۲۱۷ (۲) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۳۵، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۰ (۳) تاریخ بغداد

ج ۶ ص ۳۲۹، ۳۵۰، ۳۵۱، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۱، ۴۱۲، البدایہ والتہایہ ج ۱ ص ۳۱۷۔



غرض فقہی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا اور وہ مسلمہ امام اور صاحب مذہب فقہا میں ہیں اور متحدہ علمائے ان کا محدث کے بجائے فقہ و مجتہد ہی کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، کتب خلاف میں ان کے اقوال و فتاویٰ اور فقہی و اجتہادی تخریجات موجود ہیں، ابن رشد مالکی نے اپنی کتاب بدلیۃ الجہد میں اکثر امام احمد کے ساتھ اسحاق کے اقوال بھی نقل کیے ہیں، ایک زمانہ تک مسلمانوں میں اسحاق کا مذہب رائج رہا۔

ابن راہویہ کے فقہی اصول اور بنیادیں: فقہ و حدیث میں امام احمد بن حنبل اور اسحاق کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، دونوں بزرگوں کی فقہ و اجتہاد کا دار و مدار حدیث پر ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے رسالہ الانصاف میں لکھا ہے کہ ان کے مسائل کی بنیاد احادیث اور اقوال صحابہؓ پر زیادہ ہے، ابو حاتم سے پوچھا گیا کہ آپ کا میلان ان دونوں کی جانب زیادہ ہے، فرمایا مجھے ان سے زیادہ پر عظمت شخص نظر نہیں آتا، ان دونوں نے احادیث قلمبند کیں، ان کا مذاکرہ کیا اور ان پر تعنیفات کیں، علامہ ابن حجر لکھتے ہیں و فرغ علی السنن یعنی ان کی فقہی تفریعات سنن و احادیث پر مبنی ہوتی ہیں لیکن امام احمد کے برخلاف ان کا میلان امام مالک کی طرف زیادہ ہے جن کا اصل ماخذ اہل مدینہ کے اقوال ہوتے ہیں اور امام احمد زیادہ تر آثار و روایات پر اعتماد کرتے ہیں۔

فقہ و اجتہاد میں ان کے کمال کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے امام شافعی جیسے عظیم المرتبت امام و مجتہد سے دو مرتبہ مناظرہ کیا اور صالح بن احمد روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مناظرہ کے موقع پر میرے والد بھی موجود تھے، ان کا بیان ہے کہ اسحاق امام شافعی کے مقابلہ میں غالب نظر آ رہے تھے۔ (۱)

پہلا مناظرہ: پہلی مرتبہ جب وہ امام احمد کے اصرار پر امام شافعی سے ملے تو انھوں نے مکہ کے مکانات کو کرایہ پر دیے جانے کے متعلق ان سے مناظرہ کیا اور اسحاق کرایہ پر دینا جائز

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۱، ۴۱۲ و جہدیب لہجدیب ج ۱ ص ۲۱۹، تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۵۱۔

نہیں سمجھتے تھے اور امام شافعی جائز سمجھتے تھے، ان کا استدلال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ  
أَخْرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ  
وَاسْطَىٰ ان مظلوس، وطن چھوڑنے  
والوں کے جو نکالے ہوئے آئے ہیں  
اپنے گھروں سے۔ (حشر، ع ۱)

من دیار کی نسبت مالکوں کی طرف کی گئی ہے یا غیر مالکوں کی طرف، فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من أغلق بابہ فهو آمن ومن  
دخل دار ابی سفیان فهو  
جس نے اپنا دروازہ بند کر لیا اور  
جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو گیا  
آمن۔ اس کو امان ہے۔

یہاں دار و باب کی نسبت جس کی جانب کی گئی ہے کیا وہ اس کا مالک تھا یا نہیں؟ حضرت عمرؓ نے قید خانہ کے لیے جو مکان خریدا تھا، وہ اس کے مالک یا غیر مالک سے خریدا تھا؟ اسی طرح رسول کریمؐ نے فرمایا:

وهل ترك لنا عقيل من دار  
یعنی کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی گھر  
چھوڑا ہے۔

اسحاق کی دلیل یہ تھی کہ ان کی رائے کی تائید بعض تابعین سے منقول ہے، امام شافعی کا جواب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کسی شخص کی رائے حجت نہیں ہو سکتی، اسحاق کی دوسری دلیل یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "سَوَّآءٌ لَّكُمْ الْعَاكِفِيُّ فِيهِ وَالْبَسَادُ" یعنی مسجد حرام میں مکہ کے باشندوں اور باہر کے لوگوں دونوں کا برابر حق ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک یہ حکم مسجد حرام کے ساتھ خاص تھا، امام شافعیؒ کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مکہ کی زمین لوگوں کے لئے مباح ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، لم يتسرك - لنا عقيل مسكنا کے بجائے یہ فرماتے کہ جو جگہ ہم کو مل جائے یا جس شخص کے گھر میں بھی

ہم لوگ اتر پڑیں وہ گھر اور جگہ ہمارے لے مباح ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ کی زمین لوگوں کی ملکیت بن سکتی ہے، اس لیے اس کو کرایہ پر بھی دیا جاسکتا ہے، آخر میں اسحاق کو امام شافعیؒ کی اصابتِ رائے کا اعتراف کرنا پڑا اور وہ شافعیؒ کی عظمت اور علم و فضل کے معترف ہو گئے اور جب کبھی ان کا ذکر کرتے تو تعریف و توصیف کرتے اور اپنی بات پر نادم بھی ہوتے۔

دوسرا مناظرہ: دوسرے مناظرہ میں امام احمد بھی شریک تھے اور غالباً اسی کے متعلق ان سے روایت ہے کہ اس میں امام شافعیؒ کے مقابلہ میں اسحاق کی رائے وزنی معلوم ہوتی تھی، چنانچہ وہ اس مسئلہ میں اسحاق کے ہم نوا بھی ہو گئے تھے، اس مناظرہ کا موضوع بحث مردار کی کھال تھی، امام کے نزدیک وہ دباغت کے بعد پاک ہو جاتی ہے، اسحاق نے دلیل طلب کی تو انھوں نے حضرت میمونہ کی یہ حدیث بیان کی ان النسبیٰ مرّ بشاة میتة فقال ہلا انتفعتم بجلدھا (آپ نے ایک مردہ بکری دیکھ کر فرمایا کہ کیوں نہیں تم لوگوں نے اس کی کھال سے فائدہ اٹھایا) اسحاق نے اس کے جواب میں ابن حکیم کی یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہ لکھایا کہ لا تنتفعوا من الميتة باھاب ولا عصب (یعنی مردار کے غیر مدبوغ اور مدبوغ کسی قسم کے چمڑے سے انتفاع نہ کرو) اور یہ تحریر آپ کی وفات سے صرف ایک ماہ پہلے کی ہے، اس لیے میمونہ کی روایت اس سے منسوخ ہو جاتی ہے، امام شافعیؒ نے فرمایا کہ میں تو سماعی حدیث بیان کرتا ہوں اور آپ تحریر کا تذکرہ کرتے ہیں، اسحاق نے جواب دیا کہ رسول اللہ نے قیصر و کسریٰ کے نام جو خطوط لکھے تھے وہ تحریری تھے اور اللہ کے یہاں ان کے خلاف حجت ہوں گے، اس جواب پر امام شافعیؒ خاموش ہو گئے۔

مذہب و مسلک: اسحاق بن راویہ خود صاحب مذہب مجتہد تھے، اس لیے چاروں مشہور اجتہادی مذاہب میں وہ کسی مذہب سے وابستہ نہ تھے، البتہ امام دارقطنی نے ان کو امام شافعی

نتیجہ: الحمد للہ... گستان حدیث کے ہستے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

146

کے راویوں میں اور امام بیہقی نے ان کے اصحاب میں ذکر کیا ہے، اسی طرح ابن خلکان نے لکھا ہے کہ مناظرہ کے بعد جب ان کو امام شافعی کے علم و فضل کا اندازہ ہوا تو وہ ان کے اصحاب میں داخل ہو گئے اور ان کی کتابوں کو مہیا کر کے نقل کیا، (۱) لیکن ان آراء و اقوال سے ان کا شافعی المذہب ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ صرف امام شافعی سے تلمذ اور تعلق ظاہر ہوتا ہے، علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں ”امام شافعی سے ان کا صرف اس حد تک تعلق ثابت ہے کہ اسحاق نے ان کی کتابیں لکھیں اور ان کی صحبت میں رہے لیکن امام ابو ثور کی طرح ان کے بھی مختارات و اجتہادات ہیں، البتہ ان کا رجحان امام احمد کی طرح حدیث و اتباع سلف کی جانب زیادہ تھا۔“ (۲)

عقیدہ و کلام: اسحاق بن راہویہ اتباع سنت اور طریقہ سلف کی پیروی میں نہایت تشدد تھے، اس لیے کلام و عقائد کے غیر ضروری مسائل میں بحث و تدریس اور غور و خوض ناپسند کرتے تھے، ان کے زمانہ میں خلق قرآن کا معرکہ الہام مسئلہ پیش آیا، گوانھوں نے امام احمد کی طرح اس میں الوالعزمی اور ثابت قدمی نہیں دکھائی مگر وہ بھی قرآن کو خدا کا کلام اور غیر مخلوق سمجھتے تھے، احمد بن سعید باطنی کا شعر ہے۔

لم يجعل القرآن خلقا كما قد قاله زنديق ناق (۳)

ترجمہ: اسحاق بن راہویہ نے فاسق اور زندقہ شخص کی طرح قرآن کو خدا کی مخلوق قرار نہیں دیا۔

زہد و اتقا: امام ابن راہویہ کے زہد و اتقا کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ وہ حدیث و فقہ اور حفظ و صدق کی طرح ورع و تقویٰ کے بھی جامع تھے، محمد بن اسلم طوسی نے ان کی وفات کے وقت فرمایا ”میں نے ان سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۲ (۲) الانتقاء ص ۱۰۸ (۳) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۱۲، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۲۵۔

تذکرۃ المحدثین..... گلستان حدیث کے ہر سکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

147

(انَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ) یعنی اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔ (۱)

وفات: مشہور روایت کے مطابق انھوں نے ۷۷ سال کی عمر میں بروز یکشنبہ ۱۴ یا ۱۵ شعبان ۲۳۸ھ کو انتقال کیا، ۲۳۷ھ بھی روایت کی گئی ہے، ایک شاعر کے مرثیہ کا شعر ہے:

يا هاهنا ما هددنا ليلة الاحد في نصف شعبان لاننسى مدى الابد

ترجمہ: جس سانحہ عظیم سے ہم لوگ اتوار کی رات میں ۱۵ شعبان کو دوچار ہوئے،

اس کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

آپ کی قبر زیارت گاہ خلاق ہے، بعض بزرگوں نے آپ کی بخشش و مغفرت کے خواب بھی دیکھے (۲)

اولاد: آپ کی اولاد میں تین صاحبزادوں کا نام ضمناً ملتا ہے، ۱- ابوالحسن علی، ۲- محمد، ۳- یعقوب۔ (۳)

تصنیفات: علمائے طبقات و تراجم نے ان کو صاحب تصانیف کثیرہ لکھا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب ضائع ہو گئیں جن تصنیفات کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

۱- کتاب السنن فی الفقه: (۴) اس کے نام سے موضوع ظاہر ہے۔

۲- کتاب التفسیر: علامہ سیوطی نے عہد تابعین کے بعد کی جن تفسیروں کو اہم اور

اقوال صحابہ و تابعین کی جامع قرار دیا ہے ان میں سفیان بن عیینہ اور وکیع بن جراح وغیرہ کی تفسیروں کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے (۵) اس کو وہ خود باقاعدہ مرتب و مکمل بھی کر چکے تھے اور اس کا املا بھی کرایا تھا۔

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۵ تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۲ (۲) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۵۵ تاریخ

ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۲ (۳) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۷ تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۰ و طبقات الشافعیہ

ج ۱ ص ۲۳۳ (۴) المہرست ص ۳۲۱ (۵) الاقنان ج ۲ ص ۱۹۰۔

۳- مند: یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف اور ۶ جلدوں پر مشتمل ہے، (۱) حاکم نیشاپوری نے دوسرے دور کی مسانید میں امام احمد کی مسند کے ساتھ اس کا نام بھی گننا یا گیا ہے۔ (۲) اس کی ترتیب و تکمیل سے بھی وہ اپنی زندگی میں فارغ ہو چکے تھے اور اپنے شاگردوں کو زبانی اور پڑھ کر اس کا املا بھی کرایا تھا، علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

واسحاق یخرج امثل ماورد ابو زرعة رازی کا بیان ہے کہ اسحاق ان  
عن ذالك الصحابي فيما ذكره ہی روایتوں کی تخریج کرتے تھے جو اس  
الرازی۔ (۳) صحابی کی سب سے بہتر اور اچھی  
روایت ہوتی تھی۔

اس مسند کا ایک قلمی نسخہ علامہ سیوطی کے قلم کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے، علامہ ذہبی نے اس کے رجال کے نقد میں ایک مستقل کتاب لکھی تھی، اس کو بھی سیوطی نے اس نسخہ کے حاشیے میں درج کیا ہے۔ (۴)

☆☆☆

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۳ (۲) المدخل فی اصول الحدیث ص ۴ (۳) تدریب الراوی ص ۵۷ (۴)

مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵۔

## امام احمد بن حنبلؒ

(متوفی ۲۴۱ھ)

نام و نسب: احمد نام، ابو عبد اللہ کنیت، شیخ الاسلام اور امام السنۃ القاب، شیبانی، ذہلی، بصری، مروزی اور بغدادی نسبتیں ہیں، سلسلہ نسب یہ ہے: احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال بن اسد بن ادریس بن عبد اللہ بن حیان بن عبد اللہ بن انس بن عوف بن قاسط بن مازن بن شیبان۔

خاندان: امام احمد خالص عربی النسل تھے، ان کا خاندانی سلسلہ بنی شیبان سے جو قبیلہ عدنان کی شاخ سے ملتا ہے، یہ خاندان اپنی شجاعت، دلیری اور غیرت و حمیت کے لیے ہمیشہ سے مشہور تھا، آپ کے دادا حنبل امویوں کے عہد میں سرخس کے گورنر اور والد محمد ایک بہادر سپاہی تھے جن کا ۳۰ سال کی عمر ہی میں جب کہ امام احمد صرف ۳ سال کے تھے انتقال ہو گیا، آپ کی والدہ ماجدہ نے پرورش و پرداخت کی۔

دنیوی وجاہت کی طرح علمی حیثیت سے بھی یہ خاندان بہت ممتاز تھا اور اس میں

متعدد علماء و فضلا، مقررین، شعرا اور ماہرین انساب گذرے ہیں۔ (۱)

ولادت: امام احمد ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے بعض مورخین نے تصریح کی ہے کہ ربیع الاول

کا مہینہ تھا۔ (۲)

مقام پیدائش: امام صاحب شکم مادر ہی میں تھے کہ ان کی والدہ مرو سے بغداد تشریف

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۸، ۲۹، تاریخ بغداد ج ۳ ص ۴۱۲ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸۔

لے آئیں، یہیں امام صاحب کی ولادت ہوئی، ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ مرو میں پیدا ہوئے تھے اور شیرخوارگی کے زمانہ میں بغداد آئے۔ (۱)

وطن: آپ کا خاندان ایک عرصہ تک بصرہ میں آباد رہا، آپ کے دادا خراسان تشریف لائے یہاں روز اور مرو شاہجہاں نام کے دو شہر قریب ہی قریب آباد تھے، امام صاحب کا تعلق دوسرے مرو سے تھا جو ہرزمانہ میں اکابر علما و فضلا کا گہوارہ رہا ہے (۲) لیکن امام صاحب کی نشوونما بغداد میں ہوئی اور یہیں آپ کی عمر کا اکثر حصہ بسر ہوا، اس لیے اسی کو آپ کا اصلی وطن سمجھا جاتا ہے۔

ابتدائی تعلیم: امام صاحب کی تعلیم کا سلسلہ بچپن ہی میں شروع ہو گیا تھا، ۴ سال کی عمر میں انھوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، سات سال کی عمر میں حدیث پڑھنا شروع کر دی اور ۱۵، ۱۶ سال کے سن میں اس کی باقاعدہ طلب و تکمیل میں مصروف ہو گئے۔

رحلت و سفر: امام صاحب عرصہ تک بغداد ہی میں رہ کر وہاں کے مشائخ سے سماع کرتے رہے اس کے بعد انھوں نے دوسرے مشہور مراکز حدیث کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ وغیرہ کا رخ کیا۔ (۳)

شیوخ و اساتذہ: امام احمد نے آنکھیں کھولیں تو بغداد علما و فضلا کا مرکز اور دینی علوم کا گہوارہ بنا ہوا تھا، اس لیے شروع میں وہ یہیں کے مشائخ اکابر کے دامن فیض سے وابستہ رہے، بغداد میں ان کی نظر سب سے پہلے مشہور محدث حافظ ہشیم بن بشیر واسطی (م ۱۸۳ھ) پر پڑی جو حضرت عبداللہ ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ عنہما کی مرویات کے تبحر عالم تھے چار سال تک اسی خزن علم کی خوشہ چینی کرتے رہے، جب یہ آفتاب غروب ہو گیا تو دوسرے اساتذہ فن کی جانب متوجہ ہوئے، بچپن میں امام ابو یوسف کے درس میں بھی شریک ہوئے

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸ (۲) معجم البلدان ج ۸ ص ۳۵ (۳) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۲ و تہذیب

الاسانوی ج ۱ ص ۱۱۔



تھے، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن داؤد طیالسی، عبدالرحمن بن مہدی، عبداللہ بن نمیر، وکیع بن جراح اور یحییٰ بن سعید وغیرہ جیسے اکابر محدثین اور ائمہ وقت سے بھی ان کو استفادہ کا موقع ملا، (۱) امام احمد کے اساتذہ میں سب سے زیادہ ممتاز اور باکمال شخصیت امام شافعیؒ کی ہے، ان سے ان کے بڑے مراسم اور گونا گوں تعلقات تھے، فقہ کے علاوہ حدیث و انساب کا علم بھی ان سے حاصل کیا تھا، امام شافعیؒ جب تک بغداد میں رہے وہ ان کے حلقہ درس سے وابستہ رہے، جب مصر تشریف لے گئے تو امام احمد نے بھی وہاں جانا چاہا مگر عسرت و ناداری کی بنا پر اس کا موقع نہیں ملا، امام احمد کو امام شافعیؒ کی ذات سے بڑی عقیدت اور شیفنگی تھی، اور وہ ان کا ہمیشہ بڑا احترام کرتے تھے، امام شافعیؒ سوار ہوتے تو یہ ان کے پیچھے پیچھے پیدل ان سے سوال کرتے جاتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ میں نے تیس سال سے کوئی ایسی نماز نہیں پڑھی جس میں امام شافعیؒ کے لیے دعائے کی ہو، (۲) شفیق استاذ کو بھی اپنے لائق شاگرد سے بڑی محبت اور ان کے علم و فضل اور دیانت و تقویٰ پر بڑا اعتماد تھا، ان سے روایت بھی کرتے تھے، امام احمد کا خود بیان ہے کہ امام شافعیؒ نے جتنا استفادہ ہم سے کیا اتنا ہم ان سے نہیں کر سکے، عبداللہ بن احمد کا بیان ہے کہ امام شافعیؒ کی کتاب میں حدیثی الثقبہ یا اخبرنی الثقبہ سے میرے والد ہی مراد ہیں، امام شافعیؒ فتویٰ دیتے تو ان سے بھی مشورہ لیتے تھے، فرط تعلق کی بنا پر اکثر ان کے گھر بھی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ (۳)

تلامذہ: امام احمد کے تلامذہ کے مختلف طبقے ہیں، آپ کے اساتذہ میں حسن بن موسیٰ اشیب، زیاد بن ایوب، عبدالرحمن بن مہدی، عبدالرزاق بن ہمام، محمد بن ادریس شافعی، وکیع بن جراح، ہشام بن عبدالملک طیالسی، یحییٰ بن آدم اور یزید بن ہارون وغیرہ نے آپ سے استفادہ کیا ہے، خلف (۴) ابن ہشام داؤد بن عمرو ضعی اور قتیبہ بن سعید ثقفی نے عمر میں

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۳۲۶ (۲) ایضاً (۳) احمد بن حنبل ص ۲۹۔ (۴) حافظ ابن حجر نے ان کو بھی

امام احمد کا استاذ بتایا ہے، تہذیب ج ۳ ص ۱۵۶۔

بڑے ہونے کے باوجود آپ سے روایت کی ہے، ہم عمروں میں احمد بن ابی الحواری، حسین بن منصور، عبدالرحمن بن ابراہیم، عبید اللہ بن سعید سرحسی، علی بن عبداللہ مدینی، محمد بن رافع قشیری، محمد بن یحییٰ بن ابی سمینہ اور یحییٰ بن معین وغیرہ کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے، اعزہ میں آپ کے چچیرے بھائی جنبل بن اسحاق اور صاحبزادگان صالح اور عبداللہ کو آپ سے روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، صحاح ستہ کے مصنفین میں امام بخاری، (۱) مسلم اور ابو داؤد بلا واسطہ اور امام ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ بالواسطہ آپ کے شاگرد ہیں، عام تلامذہ کی تعداد جن میں سے اکثر امام وقت سمجھے جاتے تھے بے شمار ہے۔

اہل علم کا اعتراف اور شہادتیں: امام احمد کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے متعلق ان کے اساتذہ، معاصرین اور تلامذہ کے بکثرت اقوال طبقات و تراجم کی کتابوں میں موجود ہیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ”بغداد کو جب میں نے چھوڑا تو وہاں امام احمد سے زیادہ صاحب علم و فضل اور متدین و متورع کوئی شخص نہیں تھا“ امام ابو ثور فرماتے ہیں کہ ”وہ سفیان ثوری سے بڑے عالم و فقیہ اور ہمارے شیخ و امام ہیں“ یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ ”میں نے ان سے بہتر آدمی نہیں دیکھا، ان کی توصیف و تعریف میں مبالغہ برائیں۔“ علی بن مدینی سے جب کہا گیا کہ ”امام احمد کا اس زمانہ میں وہی حال ہے جو سعید بن مسیب کا ان کے زمانہ میں تھا۔“ تو انھوں نے فرمایا کہ ”نہیں سعید بن مسیب کے زمانہ میں ان کی طرح کے لوگ موجود تھے مگر موجودہ دور میں امام احمد کی کوئی مثال نہیں، ابو عبید فرماتے

(۱) محمد بن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے امام احمد سے کتاب المغازی کے آخر میں مسند بریدہ کے اندر امام احمد بن حسن ترمذی کے واسطہ سے ایک حدیث کی روایت کی ہے، کتاب الصدقات میں محمد بن عبداللہ انصاری سے روایت کرنے کے بعد لکھا ہے کہ و زانی احمد بن جنبل عن محمد بن عبداللہ انصاری اور کتاب الزکاح میں حدیثا و خبرنا کے بجائے قال لنا احمد بن جنبل تحریر کیا ہے (کتاب الجمع فی رجال

الصحيحین ص ۵)

ہیں کہ حدیث و سنت میں نہ امام احمد سے بڑا کوئی عالم ہے اور نہ علمائے اسلام میں ان کا کوئی مقابل۔ (۱)

امام صاحب کے مشہور شاگرد ابراہیم حربی فرماتے ہیں کہ ”ان کو اللہ نے سلف و خلف کے علوم کا مخزن بنایا تھا، علی بن مدینی کا ارشاد ہے کہ ”وہ ہمارے اور اللہ کے درمیان حجت ہیں، جب کسی مسئلہ میں مجھ کو ان کا فتویٰ مل جاتا ہے تو میں بے تکلف اس پر عمل کرتا ہوں، ابونصر بن ماکولا کہتے ہیں کہ ”ان کو صحابہ و تابعین کے مذاہب سے سب سے زیادہ واقفیت تھی۔“

امام احمد کی عظمت اس سے بھی ظاہر ہے کہ علمائے امت نے ان کی مدح و توصیف کو فتویٰ و دیانت کا ثبوت اور ذمہ و تنقیص کو ایمان کے منافی اور نفاق کی علامت قرار دیا ہے، سفیان بن کعب فرماتے ہیں کہ ”امام احمد کی عیب جوئی کرنے والا فاسق و فاجر ہے،“ احمد دورقی کا بیان ہے کہ ”امام احمد کی مذمت کرنے والے کو بے دین سمجھنا چاہیے“ ابو حاتم اور قتیبہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ”امام سے محبت و عقیدت رکھنے والا تابع سنت اور غیر مبتدع ہے ابن اعمین نے ان دو شعروں میں یہی حقیقت بیان کی ہے:

اضحیٰ ابن حنبل محنة مامونة      وبحب احمد يعرف المتنسك

واذا رأيت لاحمد متنقصا      فاعلم بان ستوره ستهتك (۲)

ترجمہ: احمد کی ذات ایک بہترین کسوٹی ہے، ان کی محبت و بنداری کی علامت

ہے، اگر کوئی شخص ان کی مذمت کرتا ہے تو یقین مانو اس کی قلبی کھل کر رہے گی۔

**فضل و کمال:** امام احمد بڑے بلند پایہ محدث اور ان تمام اوصاف و کمالات سے متصف تھے

(۱) طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۰۰ و طبقات الفقہاء شیرازی ص ۷۵، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۳۹

تاریخ بغداد ج ۳ ص ۴۱۳ والبدایہ ج ۱ ص ۳۳۶ (۲) صفحہ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۱ و تہذیب الاسان ج

ص ۱۱۲، ۱۱۱ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۳۲ والبدایہ ج ۱ ص ۳۳۲ و تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۲۰۔

جو ایک امام حدیث میں ہونے چاہئیں۔

حافظہ: ان کی قوت حافظہ کا کمال اس سے ظاہر ہے کہ انہوں نے چار سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ ان کے پاس بارہ گٹھروں کے بقدر کتابیں تھیں اور وہ سب ان کو زبانی یاد تھیں، علی بن مدینی فرماتے تھے کہ ”ان سے بہتر کسی کا حافظہ نہیں تھا، احمد بن سعید دارمی کہتے ہیں ”امام احمد کی طرح باوجودے کہ وہ کسن تھے کسی کو حدیثیں یاد نہیں تھیں، ابو زر ع فرماتے تھے کہ ”ہمارے مشائخ میں ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں تھا، ان کو لاکھوں حدیثیں یاد تھیں۔“

عدالت وثقاہت: ان کی توثیق پر ائمہ فن کا اتفاق ہے، عجلی کا بیان ہے کہ ”وہ حدیث میں ثقہ وضابط تھے“ ابن سعد لکھتے ہیں کہ ”وہ ثقہ وثابت اور صدوق تھے“ امام نسائی ان کو ثقہ ومعتمد قرار دیتے ہیں، حافظ ابن حجر نے ان کو متقن کہا ہے، ابن حبان نے ان کا ثقاہت میں ذکر کیا ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ ”بغداد کی عجیب چیزوں میں ایک یہ نوجوان بھی تھا کسنی کی وجہ سے جس کے بال بھی سیاہ نہیں ہوئے تھے مگر جب وہ حدیثا کہتا تھا تو ہر طرف سے صدوق کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ (۱)

نقد و تمیز: وہ حدیثوں کے معتبر ناقل و حافظ ہی نہ تھے بلکہ روایتوں میں امتیاز میں بھی پورا ملکہ رکھتے تھے، ابو حاتم فرماتے ہیں کہ امام احمد کو صحیح اور سقیم روایتوں کی معرفت میں بڑا کمال اور خاص امتیاز حاصل تھا“ ابو عبید کا بیان ہے کہ ”وہ حدیث درجال میں سب سے بہتر مہارت اور اچھی پرکھ رکھتے تھے، امام شافعی کو ان کی بصیرت پر اس درجہ اعتماد تھا کہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ”جب کوئی روایت تمہارے معیار پر صحیح وثابت اتر جائے تو مجھے بھی بتلا دو میں

(۱) صفۃ الصفوة ج ۲ ص ۱۹۱، تہذیب الاسامی ۱۱۱، طبقات نسکی ج ۱ ص ۲۰۰، تاریخ جابن عساکر ج ۲

ص ۳۲، ۳۰، ۳۱، تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۱۹، ۳۱۵، تہذیب المعجم ج ۱ ص ۷۲، ۷۵، طبقات ابن سعد

اس کو بے تکلف قبول کر لوں گا، عمر بن احمد ناقد کا بیان ہے کہ ”حدیث میں احمد کی موافقت کے بعد مجھ کو دوسروں کی مخالفت کی پروا نہیں ہوتی۔“ (۱)

مستند درس: چالیس سال کی عمر میں درس و تدریس کی مسند پر رونق افروز ہوئے، آپ کی مجلس درس بڑی باوقار، سنجیدہ اور شائستہ ہوتی تھی، لوگ ہمدن گوش رہتے اور مذاق و مزاح کا ایک کلمہ بھی زبان پر نہ لاتے، ابو عبید بیان کرتے ہیں کہ ”میں امام ابو یوسف، محمد بن حسن شیبانی، یحییٰ بن سعید اور عبد الرحمن بن مہدی وغیرہ با کمال محدثین و فقہاء کے درس میں شریک رہا ہوں لیکن امام احمد کی طرح مجھ پر کسی کی ہیبت و دہشت طاری نہیں ہوئی، ان کی مجلس نہایت بارعب اور پروقار ہوتی تھی“ درس میں حاضرین اور شرکاء کا جم غفیر ہوتا تھا، علمائے سیر کا بیان ہے کہ پانچ پانچ ہزار کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے۔ (۲)

مرجعیت و مقبولیت: شہرت و ناموری اور امامت و سیادت سے کنارہ کش رہنے کے باوجود عالم اسلام کا کوئی گوشہ بھی آپ کے آوازہ شہرت سے خالی نہ تھا، حافظ بن کثیر لکھتے ہیں کہ عنفوان شباب ہی میں ان کو پوری شہرت حاصل ہو گئی تھی اور بڑھاپے میں تو ہر جگہ ان کا نام روشن ہو گیا تھا۔ (۳) آپ کے دروازے پر طلبہ کا ہجوم رہتا تھا، جب قید کئے گئے تو عالم اسلام میں کہرام مچ گیا، بیمار ہوئے تو مزاج پرسی کے لیے لوگوں کا ایک جم غفیر ہر وقت موجود رہتا، جنازہ میں شرکت کرنے والے بے شمار تھے، وہ عوام و خواص ہر طبقہ میں یکساں مقبول اور ہر دل عزیز تھے، ادریس بن عبدالکریم مقرئ فرماتے ہیں کہ اکابر علماء و فقہاء اور نامور محدثین بھی ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور سلام کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے، عوامی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص کے سوال پر اس کو کوئی چیز دی تو دوسرے شخص نے اسے تقسیم خریدنا چاہا، مگر پہلے شخص نے یہ کہہ کر دینے سے انکار کر دیا کہ ”مجھ کو بھی

(۱) تہذیب الاسماء واللغات ج ۱، قسم اول ص ۱۱۱ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۴۳ البدایہ والنہایہ ج ۱۰

ص ۳۲۷ (۲) حصۃ الصفوہ ج ۲ ص ۱۹۲ (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۷

تمہاری طرح اس سے برکت کی امید ہے“ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ”امامت و سیادت آپ کے نام کا جز ہو گئی تھی۔“ (۱)

## عبادات و اعمال

نماز: نماز باجماعت ادا کرتے تھے، آپ کا ارشاد ہے کہ اذان سے پہلے ہی نماز کے لئے تیار ہو جانا چاہئے، جماعت کا اس قدر اہتمام تھا کہ جب غلق قرآن کے انکار کے جرم میں آپ کو کوڑے لگائے گئے اور بدن لہولہان ہو گیا اس وقت بھی ابن سماء کی اقتدا میں نماز ادا کی، انھوں نے اعتراض کیا کہ خون سے لت پت ہونے کے باوجود آپ نے نماز پڑھی؟ جواب دیا کہ (قد صلی عمرًا وجرحہ یثب دماً) یعنی قاتلانہ جملہ میں حضرت عمرؓ کا جسم بھی لہولہان ہو گیا تھا مگر انھوں نے اسی حالت میں نماز ادا کی تھی، نمازوں میں استغراق و مجویت اور خشوع و خضوع کا یہ حال تھا کہ بقول عبدالرزاق ان کی نمازوں سے سلف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

نوافل: آپ کے صاحبزادہ عبداللہ کا بیان ہے کہ میرے والد روز و شب میں تین سو رکعتیں نفل پڑھتے تھے، ابتداء کے بعد ضعف کی وجہ سے ۵۰ رکعتیں کر دی تھیں۔

تہجد: عشاء کے بعد تھوڑی دیر تک آرام فرماتے پھر ساری رات نماز اور یاد الہی میں گزارتے بچپن ہی سے یہ معمول بن گیا تھا اور کبھی اس میں فرق نہ آنے دیتے، ابو بکر مروزی فرماتے ہیں کہ چار مہینے میں نے ان کے ساتھ قیام کیا، اس عرصہ میں کبھی انھوں نے تہجد ترک نہیں کیا۔ (۲)

تلاوت: تلاوت قرآن سے بڑا شغف تھا، شب میں قیام اور دن کا اکثر حصہ تلاوت قرآن

(۱) مجموعۃ الرسائل ص ۵ (۲) صفحہ ۱۹۲، ۱۹۶، ۱۹۷، و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۱، ۳۶،

میں بسر ہوتا، ہر ساتویں دن اور ایک روایت کے مطابق ہر روز ایک قرآن ختم کرتے تھے۔  
 دعا واستغفار: خدا سے دعا واستغفار اور تضرع و گریہ زاری بھی معمولات میں داخل تھے،  
 بڑے مستجاب الدعوات تھے، آپ کی دعاؤں میں برکت و تاثیر دیکھ کر اکثر لوگ آپ سے  
 دعا کی فرمائش کرتے تھے، ایک دفعہ آپ کے ایک پڑوسی نے اپنی اپاہج ماں کے لئے دعا کی  
 درخواست کی تو امام صاحب سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ ہم تو خود تم لوگوں کی دعاؤں کے  
 زیادہ محتاج ہیں، وہ آدمی اپنے گھر واپس لوٹ رہا تھا تو امام صاحب کی خادمہ نے راستہ میں  
 آکر اس کو بتایا کہ تمہاری واپسی کے بعد سے وہ برابر تمہاری ماں کے لئے دعا کر رہے ہیں،  
 اس نے آکر اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو خود اس کی ماں نے دروازہ کھولا اور بتایا کہ اب  
 میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی ہوں۔ (۱)

صدقہ و خیرات: غربت و ناداری کے باوجود طبیعت میں بڑی فیاضی تھی، جہاں تک ہو سکتا  
 غریبوں کی امداد فرماتے، امرا و سلاطین کے تحائف قبول نہ فرماتے، اگر کبھی مجبوراً قبول بھی  
 کرنا پڑتا تو اس کو محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے۔

روزہ: روزوں کے اہتمام کا یہ حال تھا کہ قید خانہ میں سحری اور افطار کا انتظام نہ ہونے کے  
 باوجود پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھتے، ایک دن جب معتمم باللہ کے جلا دو کوڑے  
 لگا رہے تھے تو کچھ ستولائے اور کہا کہ اس ضعف و نقاہت کی حالت میں روزہ رکھنا ٹھیک نہیں  
 ہے مگر آپ نے ان کی درخواست قبول نہ کی، فرض کے علاوہ مسنون اور مستحب روزے بھی  
 اکثر رکھتے تھے، متوکل نے امام صاحب کے علاج کے لئے ابن ماسویہ طبیب کو بھیجا تو اس  
 نے بتایا کہ امیر المؤمنین انھیں کوئی بیماری نہیں، ان کی کمزوری اور بیماری کی وجہ کم خوری اور  
 نمازوں کی زیادتی ہے۔

حج: پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، تین دفعہ ناداری کی وجہ سے پایادہ تشریف

(۱) لہفۃ الصلوٰۃ ج ۲ ص ۱۹۲، ۱۹۷، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۶، ۳۵۔

لے گئے، تیسری اور چوتھی مرتبہ مجاورت بھی کی۔ (۱)

آخرت کا استحصار: آخرت کے تصور اور مواخذہ الہی سے ان کا دل ہر وقت لرزہ بر اندام رہتا تھا، ان کی مجلسوں کا موضوع گفتگو یہی تھا، علی بن مدینی کو تاکید کی کہ ”ہمیشہ آخرت کو پیش نظر رکھو۔“

دنیا سے بے رغبتی: امام صاحب کی مجلس میں دنیا اور اس کے مزخرفات کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا، اگر کوئی اس قسم کا تذکرہ کرتا تو آپ خاموش رہتے، مامون، معتصم، داہق اور متوکل ہر ایک نے مال و دولت کا انبار آپ کے قدموں پر نچھاور کرنا چاہا مگر آپ نے دنیا کے چند خرف ریزوں کی خاطر دین کا سودا نہیں کیا، آپ کے سامنے ابن ابی شیبہ، عبدالاعلیٰ اور دوسرے محدثین کے عیش و عشرت کا ذکر کیا جاتا تو فرماتے کہ دنیا چند روزہ ہے، اس سے کوئی بڑی مراد حاصل نہیں ہو سکتی، کل آخرت میں جو کامیاب ہوگا کامیابی اسی کی ہے، ایک مرتبہ مامون نے محدثین میں زرو جو ہر تقسیم کرنے کے لئے بھیجا تو آپ کے علاوہ کسی نے لینے سے انکار نہیں کیا، فرماتے تھے کہ مجھے سب سے زیادہ اس دن آرام ملتا ہے جس دن میرے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی۔ (۲)

اجتباع سنت اور محبت رسول: امام کی زندگی کا مشن ہی سنت کی تائید و حمایت اور بدعات کا ابطال تھا، خلاف سنت کاموں کو دیکھ کر سخت برہم ہوتے تھے، اور سنت کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ نشست و برخاست کو ناپسند کرتے تھے، خود کبھی قصد سنت ترک نہیں کی اور جب اپنے کسی عمل کے خلاف سنت ہونے کا علم ہو جاتا تو فوراً اس سے باز آجاتے تھے، مرض الموت میں شدت الم کے باوجود کہہ نہیں کیا کہ وہ خلاف

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵، ۳۳۹، ۳۴۹، ۳۵۰ و ص ۳۵۱ ص ۳۵۲ و ص ۳۵۳ و ص ۳۵۴ و ص ۳۵۵

و تہذیب الائمہ ج ۱ ص ۱۱۲ (۲) صفحہ الصفوٰۃ ج ۲ ص ۱۹۲ و ۲۱۱ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۸، ۳۹،

البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۳۲۸، ۳۲۹۔



سنت ہے، اکثر دعا فرماتے تھے امتناع علی الاسلام والسنة (اے اللہ اسلام اور سنت پر ہمارا خاتمہ کر)

رسول کی ظاہری عقیدت و محبت سے بھی آپ کا دل معمور تھا، قید خانہ میں آپ کو تین بال دیے گئے اور بتایا گیا کہ یہ موئے مبارک ہیں، آپ نے ان کو حرز جان بنائے رکھا اور انتقال کے وقت وصیت کی کہ قبر میں ان کو میری دونوں آنکھوں اور زبان پر رکھ دیا جاے۔ (۱)

جاہ و منصب سے گریز: آپ کی استغنا و بے نیازی نے کبھی کسی منصب و اعزاز کو قبول کرنا گوارا نہیں کیا، خلفا و سلاطین نے مقرب بارگاہ بنانا اور انعام و اکرام سے نوازنا چاہا مگر آپ نے ہمیشہ رد فرما دیا، امام شافعیؒ نے خلیفہ ہارون سے یمن کی بد نظمی کا ذکر کر کے ایک مناسب اور بہتر قاضی کے تقرر کی فرمائش کی، خلیفہ نے کہا آپ کے حلقہ میں جو موزوں شخص ہو اس کا انتخاب کر کے مجھے مطلع کیجئے، امام شافعیؒ کی نگاہ انتخاب امام احمد پر پڑی، جب ان سے اس کا ذکر کیا تو امام احمد نے جواب دیا کہ میں تو آپ کے پاس طلب علم کے لئے حاضر ہوتا ہوں اور آپ مجھ کو عہدہٴ قضا قبول کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں، اگر آپ کے پاس علم کی دولت نہ ہوتی تو اب میں آپ سے رسم و راہ ترک کر دیتا، امام شافعیؒ یہ سن کر نہایت نادم اور پشیمان ہوئے۔ (۲)

امرا و سلاطین سے بے تعلقی: امرا و سلاطین سے ہمیشہ بے تعلق رہے، خلفا نے آپ کے سامنے مختلف قسم کی پیشکشیں کیں مگر انھوں نے ان کو ٹھکرادیا، امیر المومنین عبد اللہ ابن طاہر نے اپنے حاجب سے سلام کہلایا اور ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا امام صاحب نے فرمایا کہ یہ مجھے پسند نہیں ہے اور امیر سے مجھ کو توقع ہے کہ وہ ایک ناگوار کام کی مجھ کو زحمت نہ دیں گے، ابن

(۱) مکفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۲، ۲۰۱، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۸، ۳۹، والبدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۳۲۸،

۳۲۹ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۱ والبدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۳۲۸۔

ظاہر کا خود بیان ہے کہ ”میں دو آدمیوں (یحییٰ اور احمد) کو نہایت عزیز رکھتا ہوں لیکن دونوں نے کبھی میرے یہاں آئے اور نہ دوسرے امرا کے قریب پھلکے ہیں“ آپ کے چچا اسحاق نے آپ سے کہا کہ وہ امرا بالعرف اور نہی عن المنکر ہی کے لیے امرا کے یہاں جایا کریں اور اسحاق بن راہویہ کو مثال میں پیش کیا آپ نے جواب دیا کہ عم محترم! آپ اسحاق کے طرز عمل کو پیش کرتے ہیں، اگر میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں ان کو بھی ضرور منع کروں گا، سلاطین و امرا کی صحبت فتنہ ہے، جب ہم ان سے دور اپنے کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو قریب ہونے کے بعد کیا حال ہوگا، متوکل اپنے پیش روؤں کی غلطیوں کی تلافی کے لیے ہر وقت آپ کی دلجوئی کی فکر میں رہتا، روزانہ قاصد بھیج کر خیریت دریافت کرتا، معاملات سلطنت اور مہمات امور میں مشورے طلب کرتا، مال و دولت اور انعام و اکرام سے مالا مال کرنا چاہتا مگر اس کا یہ التفات امام صاحب پر سخت بار ہوتا، آپ رو کر فرماتے سلامت من ہؤ لاء حتی اذا کان فی آخر عمری بلیت بهم (۱) (زندگی بھر میں ان لوگوں کی آزمائشوں سے محفوظ رہا لیکن آخر عمر میں ان کے فتنوں سے دوچار ہو رہا ہوں) کبھی ارشاد فرماتے هذا امر اشد علی من ذلک (یہ نوازشات کا معاملہ تو میرے لیے اس اتلا و آزمائش سے بھی زیادہ سخت اور شاق ہے) ان کے ہدایا و تحائف سے بھی سخت پرہیز تھا، ایک مرتبہ خلیفہ نے امیر بغداد عبداللہ بن اسحاق کو خط لکھا کہ امام صاحب کو کسی طرح دربار میں لائے، امام صاحب نے ضعف و نقاہت کا عذر کیا، متوکل کو معلوم ہوا تو اس نے لکھا کہ میں آپ کی دید اور قربت کا مشتاق اور دعا و برکت کا خواستگار ہوں، اس لیے امام صاحب کو مجبوراً اس کے لشکر گاہ میں قیام کرنا پڑا، خلیفہ روزانہ آپ کے لیے پرتکلف کھانے اور انواع و اقسام کے میوہ جات بھجواتا مگر آپ نے کبھی ان کو تناول نہیں فرمایا، ۸ روز تک مسلسل

(۱) صفۃ الصغوة ج ۲ ص ۲۰۱ و طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۰۳ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۶ و ۳۷

والبدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۳۲۸، ۳۳۹ و احمد بن حنبل والحدیث ص ۱۳۶۔

روزے رکھتے رہے، سولہ دنوں تک وہاں قیام رہا اس مدت میں صرف ستو پر اکتفا فرماتے رہے، خلیفہ نے خلعت اور اپنی خاص سواری بھیج کر بلا بھیجا، آپ نے اس خیال سے کہ واپسی کی اجازت مل جائے گی، جانا منظور کر لیا لیکن ایک ٹٹو پر سوار ہو کر تشریف لے گئے، خادم نے ایک بیش قیمت جوڑا پہنایا، چند دنوں کے بعد واپسی کی اجازت ملی تو شاہی خلعت وہیں چھوڑ دی اور فرمایا کہ اس کو بیچ کر اس کی قیمت غرباد مساکین میں تقسیم کر دی جائے، اس کے باوجود عرصہ تک اس واقعہ سے متاثر اور اس کی اذیت محسوس کرتے رہے، اپنے اعزہ و متعلقین کو بھی امرا کے یہاں آمد و رفت اور ان کے ہدیے قبول کرنے سے منع فرماتے تھے، بعض اعزہ کے یہاں آمد و رفت بھی اس لیے ترک کر دی تھی کہ وہ سلاطین کے یہاں نشست و برخاست رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ خلیفہ نے آپ کے اہل و عیال کے لیے چار ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے انکار کرنا چاہا تو خلیفہ نے کہلایا کہ یہ تو اہل و عیال کے لیے ہے، امام صاحب سن کر خاموش ہو گئے لیکن متعلقین کو ملامت اور ان کے سامنے دنیوی زندگی کی بے ثباتی اور آخرت کی حیاتِ سرمدی کا ذکر فرماتے رہے، ان لوگوں نے عرض کیا کہ حدیث میں ہے کہ اس مال کو لینے میں کوئی قباحت نہیں جو بلا طلب مل جائے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ بھی امرا کے تحائف قبول فرماتے تھے، آپ نے فرمایا کہ اس میں اور ان بزرگوں کے معاملہ میں بڑا فرق ہے اگر مجھ کو بھی معلوم ہو جائے کہ یہ مال ظلم و جور سے حاصل نہیں کیا گیا ہے تو لینے میں تامل نہ ہوگا۔

ایک دفعہ تین روز کا فاقہ تھا، اپنے کسی شاگرد سے آنا قرض لیا، گھر والوں نے بھوک کی شدت کا خیال کر کے فوراً روٹی پکا کر حاضر کر دی، دریافت فرمایا کہ اس قدر جلد کس طرح روٹی پک گئی بتایا گیا کہ صالح کے یہاں آگ جل رہی تھی وہیں پکائی گئی، صالح امرا و سلاطین کے تحفے قبول کرتے تھے، اس لیے آپ نے ان کے چولھے پر پکی ہوئی روٹیاں

کھانے سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ صالح کے گھر میں جانے کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ متوکل نے امام صاحب کے اخراجات کے لیے یعقوب بن قوسرہ کے ہاتھ دس ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے لینے میں لیت و عمل کیا، یعقوب نے کہا کہ اگر آپ اسے قبول نہیں فرماتے تو خلیفہ کو آپ سے بدگمانی ہوگی اور روپیے رکھ کر چلے گئے، رات کے آخری پہر میں امام صاحب نے اپنے بیوی، بچوں اور دوسرے متعلقین کو اکٹھا کر کے فرمایا کہ ان روپیوں کی وجہ سے مجھے رات بھر نیند نہیں آئی، اس لیے ان کو ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے، چنانچہ ان لوگوں نے اسی وقت بصرہ و بغداد کے محتاج اور ضرورت مند محمد شین کی ایک فہرست تیار کی اور صبح ہوتے ہی ساری رقم تقسیم کر دی گئی۔ (۱)

خودداری: احباب اور مخلصین سے بھی کسی قسم کا انتفاع خودداری کے منافی سمجھتے تھے، حسن بن عبدالعزیز نے ایک مرتبہ ایک ہزار دینار کی تین تھیلیاں بھیجیں اور کہلایا کہ ”یہ حلال و طیب مال ہے اس کو قبول فرمائیے اور اہل و عیال کو اس سے فائدہ اٹھانے دیجئے، امام صاحب نے واپس کر دیا اور کہلایا کہ ”ہم کو اس کی ضرورت نہیں، بجز اللہ ہم آرام و راحت سے ہیں، عبدالرزاق کے سامنے امام احمد کا ذکر کیا گیا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا کہ ایک دفعہ وہ میرے پاس آئے مجھے معلوم تھا کہ ان کے پاس خرچ نہیں ہے، اس لیے میں نے خلوت میں لے جا کر دس دینار نذر پیش کی، مسکرا کر فرمایا، میں نہایت آرام سے ہوں، آپ نے ناحق زحمت گوارا کی، اگر میں اور لوگوں سے اس قسم کی رقمیں لیتا ہوتا تو اس کے قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا۔ (۲)

اکسار و تواضع: طبعاً بڑے متواضع اور منکسر المزاج تھے، خاندانی نجابت، علمی برتری، مذہبی عظمت اور غیر معمولی شہرت و مقبولیت کے باوجود ان میں کبر و غرور کا شائبہ بھی نہ تھا،

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۶ و البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۲

ص ۳۶ و البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ایضاً باختلاف صفحات و صفحہ الصلوة ج ۲ ص ۱۹۳۔

ترذکرۃ الحمد شین..... گلستان حدیث کے ہستے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

163

یحییٰ ابن معین فرماتے ہیں کہ میرا اور ان کا پچاس سال سے سابقہ ہے مگر انھوں نے اپنے خیر و صلاح اور خاندانی وجاہت پر فخر و برتری کا اظہار نہیں کیا، ایک شخص نے کہا آپ عربی النسل ہیں، ارشاد ہوا کہ ”ہم مسکین اور فقیر لوگ ہیں، محمد بن حسن فرماتے ہیں کہ جب وہ راستہ چلتے تو کوئی آگے پیچھے نہ ہوتا، اس کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے، ابو عوانہ کے درس میں شریک ہونے کے لیے گئے تو لوگوں نے ممتاز جگہ پر بیٹھانے کی کوشش کی، آپ نے کہا میں شیخ کے سامنے بیٹھوں گا، ہم کو معلمین کے سامنے تواضع سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے، اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، صالح کا بیان ہے کہ میرے والد کبھی دوسروں سے وضو کا پانی تک نہیں لانے کے لیے کہتے تھے بلکہ خود ہی کنویں سے پانی نکال کر وضو کرتے تھے۔ فوران وفات سے دو دن پہلے عیادت کے لیے حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ کے غلام نے آپ کو پٹکھا جھلٹا چاہا آپ نے روک دیا، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام احمد پر خدا کی رحمت ہو، نہایت متواضع اور خلیق بزرگ تھے۔ (۱)

**شرافت و حسن خلق:** امام احمد شرافت اور حسن خلق کا پیکر تھے، کبھی کسی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی، اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تو آپ اس کا اور بہتر بدلہ چکانے کی فکر کرتے، کوئی ناگوار خاطر بات کہتا تو خندہ پیشانی سے اس کو انگیز کر لیتے، زبان پر شکایت یا ملامت کا لفظ نہیں آنے دیتے، طالب علمی کے زمانہ میں مکہ تشریف لے گئے اور ابن سماعہ کے مکان میں قیام کیا، اتفاقاً ایک دن ان کے کپڑے اور جملہ سامان چوری ہو گیا، قیام گاہ پر واپس آئے تو ابن سماعہ کی والدہ نے اس کی خبر کی، آپ خاموش رہے اور صرف اس قدر فرمایا کہ میری تختیاں کیا ہوئیں جن پر میں حدیثیں لکھتا تھا۔ (۲)

**وقار و متانت:** طبیعت میں وقار تھا اس لیے عام لوگوں سے ملنا جلنا، خواص کے یہاں

(۱) ایضاً باختلاف صفحات و تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۲ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۷۔

تذکرۃ الحمد شین.... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان کا افزودہ تحقیقی تذکرہ

آمد و رفت، بازاروں میں چلنا پھرنا ناپسند تھا، لطف و تفریح کے کاموں سے اس لیے پرہیز کرتے تھے کہ اس سے علم کی عظمت ختم ہو جاتی ہے، اگر کبھی متوکل کے دربار میں حاضر ہوتا پڑا تو علم کی آن بان اور شان و شکوہ میں فرق نہ آنے دیا۔ (۱)

آپ کی متانت پر مزاج بھی بار ہوتا تھا اس لئے آپ کے اساتذہ بھی اس کا لحاظ کرتے تھے، ایک دن یزید بن ہارون نے اپنے شاگردوں کے سامنے مزاج کی کوئی بات کہی، بعد میں ان کو معلوم ہوا کہ امام احمد بھی موجود تھے تو سخت شرمندہ ہوئے اور سر پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اگر تم لوگوں نے بتا دیا ہوتا کہ وہ موجود ہیں تو میں مذاق نہ کرتا، ایک روز اسماعیل بن علیہ کے شاگرد کسی بات پر ہنسے تو وہ سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ امام احمد کی موجودگی میں تم لوگ ہنسی مذاق اور بے شرمی کی باتیں کرتے ہو۔

خلوت پسندی: خلوت پسند تھے اژدہام اور ہنگامہ آرائی کو سخت ناپسند کرتے تھے، جنازہ، جماعت اور عیادت کے علاوہ گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے مگر ان کے فضل و کمال نے ان کی ذات کو مرجع خلاق بنا دیا تھا، اس لیے ہر وقت طلبہ اور شائقین علم کا ہجوم رہتا تھا۔

نظافت و پاکیزگی: طبیعت نظافت پسند تھی، گندگی سے سخت نفرت تھی، اکثر با وضو رہتے، ہمیشہ صاف ستھرے کپڑوں میں نظر آتے رہے۔ (۲)

ذریعہ معاش: امام صاحب کی آمدنی کا اصل ذریعہ صرف ایک آبائی جائیداد تھی جس سے کل سترہ درہم ماہوار کرایہ ملتا تھا، اسی میں تنگی ترشی سے بسر کرتے اور خدا کا شکر بجالاتے، اتنی حقیر آمدنی اہل و عیال کے خرچ کے لیے بالکل ناکافی تھی، اس لیے اکثر گھر میں فاقہ ہوتا تھا، کئی کئی دن تک چولھا جلنے کی نوبت نہ آتی، مگر فقر و فاقہ کا اثر کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے اور کسی کا تحفہ اور ہدیہ قبول کرتے، ایک مرتبہ آپ کی والدہ کے پاس کپڑا نہ تھا، ایک صاحب نے

(۱) المعراج ص ۲۳۵ (۲) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۱۱۶ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۰، ۳۵، صفحہ العلوۃ

ہدیہ کرنا چاہا تو منظور نہیں کیا، آپ کے احباب آپ کی حالت دیکھ کر آپ کی خدمت کرنا چاہتے، مگر انکار کر دیتے، آپ کے صاحبزادہ صالح کا بیان ہے کہ وہ اکثر لوگوں کی پیش کش مسترد کر دیتے اور ہمیشہ یہی فرماتے کہ الحمد للہ ہم لوگ آرام و عافیت سے ہیں، حالانکہ گھر میں ایک جبہ بھی نہیں ہوتا تھا، محنت و مزدوری کر لینا پسند تھا مگر کسی کے سامنے دست طلب دراز کرنا گوارا نہ تھا، ایک مرتبہ یمن میں تھے تو کپڑے چوری ہو گئے، کئی دن گھر سے نہ نکلے، جب لوگوں کو تلاش ہوئی اور حال معلوم ہوا تو کچھ روپیوں کا انتظام کیا گیا مگر آپ نے صرف ایک دینار قبول کیا اور اس کے معاوضہ میں ایک تحریر لکھی، بعض اوقات ازار بند بن کر فروخت کر کے اخراجات پورے کرتے تھے، گھر میں پھنپھاننا بوریاتھا اسی پر بیٹھتے تھے، انتقال کے وقت گھر میں چند چیتھڑوں کے علاوہ کچھ نہیں نکلا۔

غذا: غذا بہت سادہ اور معمولی تھی، خشک روٹی کا ٹکڑا پانی سے تر کر کے نمک سے کھایا کرتے، پھلوں میں خربوزے سے شوق تھا، اکثر سرکہ کا استعمال کرتے، ایک درہم کی چربی مہینہ بھر کے لیے کافی ہوتی، آخر میں چربی کھانا بھی چھوڑ دیا تھا، بیماری کے دنوں میں بھی نمک، سرکہ، اچار اور روٹی آپ کی خوراک تھی، ایک مرتبہ روزہ سے تھے، شام کو گھر سے افطار آیا، امیر بغداد نے کہا ذرا میں بھی دیکھوں، دیکھا تو چند روٹیاں اور کھیر انکلا، اس نے کہا یہی سادگی اور قناعت تو آپ کو ہماری دعوتیں قبول کرنے نہیں دیتی، متوکل کے یہاں سے پر تکلف کھانا آتا مگر آپ ستوپر قناعت کرتے، اس نے ایک دفعہ دس ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے سب صدقہ کر دیا، علی بن جہم نے کہا امیر المومنین ان کو مال و دولت سے کیا سروکار، ان کے لیے تو ایک نان جویں کافی ہے، خلیفہ نے کہا تم صحیح کہتے ہو۔ (۱)

لباس: آپ کا عام لباس قمیص اور ازار تھا، سر پر عمامہ بھی باندھتے تھے، موٹا جھوٹا مگر سفید اور صاف ستھرا کپڑا زیب تن فرماتے تھے۔

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۸، ۳۹ و صفحہ ۱۹۰ ج ۲ ص ۱۹۰۔

حلیہ: رنگ ملیح مائل بہ سپیدی تھا، مگر چہرہ نہایت خوبصورت اور بارونق تھا، قد ایک روایت کے مطابق لانا اور دوسری روایت کے مطابق میانہ اور درمیانی تھا، آخر میں داڑھی کے چند بال سفید ہو گئے اس لیے حنا کا خضاب لگاتے تھے۔ (۱)

## ابتلاء اور آزمائش

عباسی خلفا کے دور میں عجمی روح کی کارفرمائی اور یونانی منطق و فلسفہ کے اثرات نے عربوں کے سادہ مذاق طبیعت کو بدل دیا اور وہ سادہ اور سہل دین حنیف پر عقیدہ رکھنے کے بجائے لایعنی موشگافیوں اور فلسفہ و کلام کے غیر ضروری مباحث میں الجھ کو مختلف گروہوں میں بٹ گئے، ان میں فرقہ معزلہ زیادہ مشہور اور ممتاز ہے، اس نے دین کی حفاظت و خدمت کا کام بھی انجام دیا لیکن اس کی بدولت مذہب میں نئے نئے اور بے بنیاد مسائل بھی پیدا ہو گئے، اس لئے محدثین جن کا مقصد زندگی احيائے سنت اور رد بدعت تھا، معزلہ کے عقائد و افکار کے خلاف صف آرا ہو گئے، معزلہ کے ان مسائل میں خلق قرآن کا مسئلہ بھی تھا۔

ہارون رشید کے زمانہ تک اس عقیدہ کو ماننے والے بہت تھوڑے لوگ تھے اور وہ بھی اپنے عقیدہ کا اعلان نہیں کرتے تھے، بشرماریسی کے متعلق جب خلیفہ کو معلوم ہوا کہ وہ اس عقیدہ کا قائل ہے تو اس نے قسم کھائی کہ اگر یہ شخص مجھ کو مل گیا تو میں اسے نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالوں گا۔ (۲)

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۰، ۳۱، تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸ (۲) احمد ابن حنبل والحدیث



اس کے بعد مامون خلیفہ ہوا، وہ بڑا علم و ادب نواز اور علما و شعرا کا قدردان تھا، بچپن ہی میں اس کو براکہ کی صحبت میسر آئی، فلسفہ کے مطالعہ اور مختلف زبانوں کی تعلیم اور غیر قوموں کے علما کی صحبت و معاشرت کے اثر سے وہ عقل پرست اور آزاد خیال ہو گیا، اس لیے ہارون رشید کے زمانہ میں جو معتزلہ گوشہ گیر تھے وہ اس کے زمانہ میں کھل کر میدان میں آگئے اور رفتہ رفتہ اس کے دربار سے وابستہ ہو گئے، مامون کی تائید و سرپرستی نے معتزلہ کے اثر و رسوخ کو بہت بڑھا دیا اور انھوں نے بزور شمشیر لوگوں سے خلق قرآن کا اقرار کرانا چاہا، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے محدثین و فقہا کی ایک جماعت جس کے سربراہ امام احمد ابن حنبل تھے، آگے بڑھی، معتزلہ کی قیادت احمد بن ابی داؤد (م ۲۴۰ھ) کے ہاتھ میں تھی جو نہایت فاضل و لائق شخص تھا، شروع میں مامون کو اس مسلک کی جبری تبلیغ و اشاعت میں تامل تھا (۱) بلکہ باقاعدہ اس کے اظہار میں بھی پس و پیش تھا، (۲) لیکن احمد بن ابی داؤد کی حکمت و فراست نے اس کو اس پر آمادہ کر لیا اور ۲۱۸ھ میں اس نے اعلان کیا کہ جو لوگ خلق قرآن کا اقرار نہ کریں گے انھیں سخت سزا دی جائے گی۔

اس مسئلہ میں اس کو اتنی ضد پیدا ہو گئی کہ اسی زمانہ میں اس کو رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے طرسوس جانا پڑا تو وہاں سے والی بغداد اسحاق بن ابراہیم کو تاکیدی خطوط لکھے کہ لوگوں سے زبردستی اس عقیدہ کا اقرار کرایا جائے اور ممالک اسلامیہ کے تمام علما و فقہا اور مذہبی رہنماؤں سے اس مسئلہ میں ان کی رائیں دریافت کر کے مجھ کو مطلع کیا جائے، اس حکم کی تکمیل میں امام صاحب بھی طلب کئے گئے اور ان سے خلق قرآن کے متعلق سوال کیا گیا، آپ اسحاق کے رد و کد کے باوجود صرف یہی فرماتے رہے کہ ”قرآن خدا کا کلام ہے، میں اس کو مخلوق نہیں کہہ سکتا۔“

اسحاق نے امام احمد اور دوسرے علما کے بیانات قلمبند کر کے مامون کے پاس بھیج

(۱) خطبۃ الخوارج میری ج ۱ ص ۱۵ (۲) احمد بن حنبل، والحدیث ص ۵۳، ۵۴۔

دیے، مامون نے اس کے جواب پر یہ عقارت آمیز تنقید کی تھی اور امام احمد کے بارے میں لکھا تھا کہ ”ان کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا امیر المومنین نے اسے پڑھا، احمد کو بتادو کہ امیر المومنین اس کے مفہوم و منشا سے پورے طور پر واقف ہیں، اس مسئلہ میں ان کے جاہلانہ عقیدہ سے مطلع ہوئے اس کا خمیازہ بہر حال ان کو بھگتنا پڑے گا۔“

خط کے آخر میں یہ حکم بھی تھا کہ ”بشر بن ولید اور ابراہیم بن مہدی کو تو قتل کر دو اور باقی لوگوں میں جن کو اپنی رائے پر اصرار ہو یا بہ زنجیر میرے پاس بھیج دو، میں خود ان لوگوں کی موت و حیات کا فیصلہ کر دوں گا“ یہ فرمان جب مجمع عام میں پڑھا کر سنایا گیا تو اس کی ہیبت نے بڑے بڑے لوگوں کے عزم کو متزلزل کر دیا اور وہ مامون کے ہم زبان ہو گئے، علامہ قواریری اور سجادہ نے کسی قدر استقلال دکھایا مگر جب پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں تو دوسرے دن سجادہ اور تیسرے دن قواریری نے بھی اپنی رائے سے رجوع کر لیا اور صرف امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح آخر وقت تک ثابت قدم رہے، اس لیے ان کو مامون کے پاس پابجولاں بھیج دیا گیا مگر ابھی یہ لوگ رقتہ ہی میں تھے کہ مامون کے انتقال کی خبر آگئی۔ (۱)

مامون مرتے وقت ہونے والے خلیفہ کو وصیت کر گیا تھا کہ وہ عقیدہ بخلق قرآن کا لوگوں سے اقرار کرائے اور قاضی احمد بن ابی ذؤاد کو اپنے دربار سے وابستہ رکھے اور جملہ معاملات میں ان کے رائے و مشورہ پر عمل کرے، معتصم باللہ نے اس وصیت پر پورا پورا عمل کیا اور اس معاملہ میں اپنے پیشرو سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوا۔

امام احمد مامون کی وفات کے بعد طرسوس سے قید و بند کی حالت میں بغداد لائے گئے، راستہ میں ان کے رفیق محمد بن نوح کا انتقال ہو گیا امام صاحب نے ان کی تجہیز و تکفین کی اور نماز جنازہ پڑھائی (۲) اور وہ اکیلے رمضان کے مہینہ میں بغداد پہنچے اور پیروی

(۱) مخلص از تاریخ طبری ج ۱۱ ص ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴ (۲) طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۰۹ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰

میں کئی بھاری بیڑیاں پہنا کر داخل زنداں کیے گئے اور پھر سزا کے لیے معتمم باللہ کے سامنے پیش کیے گئے، اس موقع پر لوگوں نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا آپ کے ساتھیوں میں سے تو کسی شخص نے عزیمت کی یہ راہ اختیار نہیں کی، آخر آپ کیوں اس قدر جوش و ہمت سے کام لے رہے ہیں؟ تو آپ نے جواب میں صرف اس قدر فرمایا کہ لِّلّٰہِ اس قسم کی باتیں کرنے کے بجائے کتاب اللہ اور سنت نبوی سے کوئی ثبوت پیش کرو، ان دو چیزوں کے علاوہ میں کسی اور بات کا قائل نہیں، بعض لوگوں نے رخصت اور تقیہ کی حدیثیں پیش کیں، فرمایا لیکن حدیث خباب کے بارے میں کیا کہتے ہو، جس میں ہے کہ ”تم سے پہلے لوگوں کو آروں سے چیر دیا جاتا تھا مگر وہ لوگ اپنے دین سے روگردانی کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے“ آپ کے چچا اسحاق بھی آپ کی رہائی کے لیے کوشاں تھے، انھوں نے امام احمد سے کہا ”تمہارے ساتھی تو اقرار کر کے چھوٹ گئے اور تم قید و بند کی مشقت جھیل رہے ہو، آپ نے فرمایا چچا جان ”جامل لوگ تو خیر ناواقف ہی ہیں لیکن جب علما تقیہ کا سہارا لیں تو آخر حق کس طرح واضح ہوگا“ اسحاق کا بیان ہے کہ انھوں نے مجھ کو بالکل لاجواب کر دیا۔ (۱)

معتمم باللہ کو اس مسئلہ سے اتنی دلچسپی اس لئے تھی کہ اول تو مامون کی وصیت تھی، دوسرے احمد بن ابی ذؤاد برابر اس کو سختی کرنے پر ابھارتے رہتے تھے، ورنہ وہ امام صاحب کے معاملہ میں نرم تھا، اس نے بار بار آپ کو سمجھانے کی کوشش کی اور یہاں تک کہا کہ احمد میں تم پر اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ شفیق اور مہربان ہوں، اگر تم ذرا بھی اقرار پر آمادہ ہو جاؤ تو تمہیں رہا کر دوں گا اور خود اپنے ہاتھوں سے تمہاری ان بیڑیوں کو کھول دوں گا (۲) ایک مرتبہ وہ امام صاحب کی گفتگو سے متاثر ہو گیا اور اس کی سختی میں بہت کمی آگئی، مگر ابوداؤد نے یہ کہہ کر پھر درغلا یا کہ اگر آپ نے ان کو سزا نہ دی تو لوگ کہیں گے کہ مامون کے مسلک سے

(۱) احمد بن حنبل والحدیث ص ۸۹ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۱۲ و ۲۱۳۔

دستبردار ہو گئے اور ..... نے آپ کو زیر کر لیا، یہ سن کر پھر امام صاحب سے بگڑ گیا، امام صاحب کی سزا کی تفصیل خود ان کی زبان سے سننے کے قابل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جب میں معصم کے قریب گیا تو سلام کرنے کے بعد کچھ دیر خاموش رہا، پھر عرض کیا، امیر المؤمنین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس چیز کی تعلیم دی ہے، اس نے کہا لا الہ الا اللہ کے اقرار و شہادت کی، میں نے عرض کیا کہ ”میں تو اس کی شہادت دیتا ہوں“ پھر حضرت عبد اللہ بن عباس کی روایت بیان کی جس میں وفد عبد القیس کا ایمان کے متعلق سوال اور رسول اللہ کا جواب مذکور ہے، میری گفتگو کے بعد اس نے ابن ابی دود سے کچھ باتیں کیں اور مجھ سے کہا اگر تمہارا معاملہ میرے پیش رو خلیفہ کے زمانہ سے نہ چلا آتا تو میں تم سے تعرض نہ کرتا، اس کے بعد عبد الرحمن کو مجھ سے بحث و مناظرہ کرنے کا حکم دیا، جس کا سلسلہ تین دن تک جاری رہا، میرے دلائل اور براہین کے سامنے سب کو عاجز اور خاموش ہو جانا پڑا، مگر وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آتے، بغداد کے گورنر اسحاق بن ابراہیم نے کہا، امیر المؤمنین یہ گمراہ اور کافر ہے، اس کو رہا کرنا دانشمندی کے خلاف ہے، خلیفہ نے غضبناک ہو کر کہا تم پر خدا کی لعنت ہو، مجھ کو امید تھی کہ تم میری بات مان لو گے، اب اس نے میرے جسم کے کپڑے اتارنے اور مجھ کو گھسیٹنے کا حکم دیا اور جلا دوں کو طلب کیا، میں نے عرض کیا، امیر المؤمنین خدا سے ڈریے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا یحل دم امرء مسلم یشہد ان  
لا الہ الا اللہ الاباحدی  
بجز تین صورتوں کے کسی حال میں بھی  
کسی مسلمان کا جولا الہ الا اللہ کا اقرار  
کرتا ہو خون بہانا جائز نہیں۔  
الثلاث۔

دوسری حدیث میں نے یہ پڑھی:

امرت ان اقاتل الناس حتی  
یقولوا لا الہ الا اللہ فاذا  
مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا  
ہے تا آنکہ وہ لا الہ نہ کہہ دیں، جب

قالوہا عصموا منی دمائہم  
انہوں نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا تو ان کی  
جان و مال محفوظ ہو گیا۔  
واموالہم۔

اس لیے آپ میرے خون کو کیسے حلال سمجھ رہے ہیں، میں نے تو حلال کرنے والے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے، امیر المؤمنین جس طرح اس وقت میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں، اسی طرح آپ کو بھی خدا کے سامنے کھڑا ہونا ہے، میرا خیال تھا کہ اب وہ باز آجائیں گے لیکن لوگ برابر ان کو اکساتے اور مجھ کو کافر اور گمراہ بتاتے رہے، معظم نے ان کی باتوں سے متاثر ہو کر جلادوں کو مجھے کوڑے مارنے کا حکم دیا، اس حکم پر ہر جلاد دو کوڑے پوری قوت سے لگاتا، اس طرح مجھ کو بہت سے کوڑے لگائے گئے، ہر کوڑے پر مجھے غشی طاری ہو جاتی تھی، جب کوڑے لگانا بند کر دیا جاتا تو ہوش میں آ جاتا اور دیکھتا کہ معظم میرے پاس موجود ہے اور کہہ رہا ہے، احمد کیوں نہیں لوگوں کی بات مان لیتے، دوسرے حاضرین کہتے کہ خلیفہ تم سے درخواست کر رہے ہیں اور تم ان کی بات بھی ٹھکرارہے ہو مگر میں کسی بات پر دھیان نہ دیتا، میرا اصرار صرف اس قدر تھا کہ:

اعطونی شیئا من کتاب اللہ  
میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے  
او سنة رسولہ حتی اقول بہ۔  
رسول کی سنت سے کوئی دلیل لا دو تب  
ہی میں تمہاری بات مان سکتا ہوں۔

اس پر مجھ کو زرد کو ب کیا جاتا، آخر میں مار کی شدت سے میرے ہوش دھواں بجانہ رہے اور تکلیف کا احساس تک ختم ہو گیا، اس سے خلیفہ خوفزدہ ہو گیا اور اس نے رہائی کا فرمان جاری کر دیا اور پورے آنٹی کوڑے زور و قوت سے لگائے جانے کے بعد میں ۲۵ رمضان کو رہا کر دیا گیا۔ (۱)

حافظ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ امام صاحب کو جب سزا دینے کے لیے لایا گیا

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۲ و طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۱۱ ۲۱۲۔

توبخداد میں ایک کھرام مچ گیا تھا اور جب پہلا کوڑا لگایا گیا تو آپ نے بسم اللہ کہا، دوسری مرتبہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہا، تیسری بار فرمایا القرآن کلام اللہ غیر مخلوق اور چوتھی مرتبہ یہ آیت تلاوت کی، لَنْ يُصِيبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا، محمد بن اسماعیل روایت کرتے ہیں کہ ایک نوجوان کو میں نے یہ کہتے سنا کہ احمد کو ۸ کوڑے جتنے زور سے لگائے گئے تھے اگر کسی ہاتھی کو بھی اتنے زور سے مارا جاتا تو وہ چیخ اٹھتا۔ (۱)

ربائی کے وقت بھی ابن ابی دواد نے مزاحمت کی مگر اس کا بس نہ چلا معصم باللہ نے ایک بہترین خلعت اور سواری دے کر روانہ کیا، آپ کے ہمراہ جم غفیر تھا، گھر آنے کے بعد آپ نے خلعت فروخت کر کے اس کی قیمت غربا و مساکین میں تقسیم کر دی۔ (۲)

ربائی کے بعد معصم باللہ کو امام صاحب کے ساتھ اتنی سختی برتنے پر ندامت ہوئی، اسحاق کو تاکید کی کہ امام صاحب کی خیریت سے برابر مطلع کرتا رہے، وہ ہر روز آپ کے گھر جا کر مزاج پرسی کرتا تھا، خلیفہ کی طرف سے طبی امداد بھی بہم پہنچائی گئی، جب امام صاحب صحت یاب ہو گئے تو وہ بہت خوش ہوا اور سارے مسلمانوں میں بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ (۳)

ابتلا کے بعد امام صاحب بہت کمزور ہو گئے، پشت پر ضرب کے جوشانات پڑ گئے تھے، وہ ہمیشہ باقی رہے، کلائی میں ایسا کاری زخم لگا تھا کہ عمر بھر اس کی تکلیف محسوس کرتے رہے، آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ”اللہ ابوالہیثم کی مغفرت کرے“ آپ کے فرزند عبداللہ نے دریافت کیا یہ کون شخص ہے؟ فرمایا جب مجھ کو کوڑے لگانے کے لئے جلا دوں گے درمیان کھڑا کیا گیا تو ایک نوجوان نے پیچھے سے میرا دامن کھینچا اور کہا مجھ کو جانتے ہو؟ میں نے کہا نہیں، اس نے بتایا کہ میں مشہور عمار و شاطر ڈاکو ابوالہیثم ہوں، مجھے دنیا کے چند معمولی خزف ریزوں کے لئے مختلف وقتوں میں اٹھارہ ہزار کوڑے لگائے گئے مگر

(۱) مکفۃ الصلوٰۃ ج ۲ ص ۱۹۸ (۲) احمد والجمیز ص ۱۳ (۳) ایضاً۔

سبکدوش محمد شین..... مگستان حدیث کے مہکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ 173

میں اپنے شیطانی اعمال سے باز نہیں آیا، تم کو خدا کی راہ میں مارا جائے گا اس لئے تمہارے دل میں راہ حق سے انحراف کا خیال بھی نہیں آنا چاہئے مجھ پر اس بات کا بڑا اثر ہوا اور اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی اب بھی جب ضرب کی شدت محسوس ہوتی ہے تو اس شخص کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ (۱)

امام احمد نے سوائے ابن ابی دواد کے ان تمام لوگوں کو جنہوں نے آپ کے ساتھ یہ ظالمانہ برتاؤ کیا تھا، معاف کر دیا، ابن ابی دواد کے بارے میں فرماتے تھے کہ اگر وہ اس فتنہ کا داعی و محرک نہ ہوتا اور اپنی بدعتوں سے باز آجاتا تو اسے بھی معاف کر دیتا، واثق باللہ نے عفو خواہی کی تو ارشاد فرمایا کہ رسول اللہ کے خاندان سے تمہاری قرابت و تعلق کی بنا پر میں نے اول روز ہی تمہیں معاف کر دیا تھا۔ (۲)

معتصم باللہ کے بعد واثق باللہ خلیفہ ہوا، یہ بھی اس مسئلہ میں بڑا سخت تھا، اس نے بہت سے محدثین اور علمائے حق کو قید و بند اور قتل کی سزائیں دیں، مشہور صاحب عزیمت بزرگ احمد بن نصر خزاعی کو تختہ دار پر چڑھایا لیکن امام احمد کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی، البتہ ان کو جلا وطن کر دیا، امام صاحب اس کے زمانہ خلافت بھر روپوش رہے، جمعہ و جماعت کے لئے بھی باہر نہیں نکلتے تھے۔ (۳)

اس کے بعد متوکل خلیفہ ہوا، اس نے ان تمام عقائد و خیالات کو جو کتاب و سنت کے خلاف تھے بالکل روک دیا، امام صاحب کو ابتلا سے نجات دلوائی اور ان کے اعزاز و اکرام کا فرمان جاری کیا اور یہ اعلان بھی کر دیا کہ قرآن مخلوق نہیں ہے، اس کی خلافت سے معتزلہ کے زور و قوت کا خاتمہ اور ان کا اثر کم ہو گیا۔ (۴)

یہ فتنہ ۲۱۸ھ سے ۲۳۴ھ تک یعنی سولہ سال رہا اور امام احمد نے ۲۸ یا ۳۰ مہینے قید

(۱) ص ۲۲ صفحہ ۱۹۸ (۲) ایضاً (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵ (۴) البدایہ والنہایہ ج ۱۰

ص ۳۳۵، طبقات الکبریٰ شعرانی ج ۱ ص ۴۷۔

و بند اور مشقت و محن میں گزارے۔ (۱)

اس عظیم ابتلا سے جو امام احمد کی ہمت و عزیمت کا غیر معمولی نمونہ ہے، ان کی شہرت و مقبولیت میں بڑا اضافہ ہو گیا، امام صاحب کے دوسرے اوصاف و کمالات میں تو اور لوگ بھی شریک و سہم تھے لیکن راہ حق میں یہ ثابت قدمی اور اولوالعزمی انھیں کا طفرائے امتیاز ہے، علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں ”امام احمد کی ذات گرامی صبر و ابتلا اور استقامت علی الحق کے لیے ضرب اللشل ہے، تین جابر و قاہر بادشاہوں کے ظلم و استبداد اور غیر معمولی مشکلات سے شہر اند کے باوجود ان کی استقامت و عزیمت میں فرق نہ آیا، اور نہ وہ کتمان حق اور اخفائے علم کے مرتکب ہوئے اور نہ رخصتوں اور لقیہ کا سہارا لیا بلکہ ہر حال میں انھوں نے اپنے کو سنت نبوی اور آثار صحابہ سے وابستہ رکھا اور دین کی اشاعت اور بدعات کا استیصال کرتے رہے، یہ وہ مخصوص فضل و کمال ہے جس میں امام صاحب کا کوئی معاصر صاحب علم ان کا شریک نہیں“ (۲)

اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں ”کہ اللہ نے اسلام کو دو آدمیوں کے ذریعہ اعزاز و غلبہ عطا کیا، امت میں ان دونوں کی کوئی مثال نہیں، یعنی حضرت ابو بکر صدیق جنھوں نے فتنہ ارتداد کے موقع پر اس کا مقابلہ اور اسلام کی مدافعت کی، دوسرے امام احمد جو فتنہ خلق قرآن کے زمانہ میں پیش پیش رہے۔

بعض بزرگوں نے آپ کی وفات کے بعد خواب دیکھا کہ آپ اس حق گوئی اور صبر و استقلال کی بنا پر خدا کے خاص فضل و انعام سے نوازے گئے۔ (۳)

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۶ (۲) مجموعۃ الرسائل ص ۵ (۳) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۴۱۷ و ۴۱۸

۴۲۳، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۲، ۳۳۳ و طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۰، ۲۰۱ و ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸

و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۲ و تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۵۔



## علالت و وفات

۲ ربیع الاول بروز چار شنبہ کو شدید بخار میں مبتلا ہوئے، ۹ دن تک علالت کا سلسلہ جاری رہا، بیماری کے زمانہ میں عیادت کرنے والوں کا بڑا ہجوم رہتا تھا، مسجدیں بھر جاتیں تھیں، سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کا اتنا مجمع ہوتا تھا کہ آمد و رفت کے راستے بند اور خرید و فروخت دشوار ہو گئی تھی، لوگوں کو جب موقع ملتا تو جوق در جوق حاضر ہو کر سلام عرض کرتے، خلیفہ کو اس اثر دہام کی خبر ہوئی تو اس نے گلیوں کے صدر دروازوں پر وقائع نگار متعین کر دیے جو لوگوں کو امام صاحب کے حال سے مطلع کرتے تھے، راستہ بند ہو جانے کی وجہ سے زائرین چھپ کر دیواریں پھاند کر امام صاحب کی زیارت کرتے، آخری روز ایک بزرگ داخل ہوئے اور فرمایا احمد خدا کے حضور حاضر ہونے کو یاد کرو تو بے اختیار چیخ نکلی اور آنسو خسار پر ٹپک پڑے، بھرائی ہوئی آواز میں بچوں کو بلوایا اور ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور انگلیوں میں خلال کرانے کے لیے کہا، وضو کرتے وقت برابر اللہ کو یاد کرتے رہے، وضو کرنے کے بعد روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، اس سے پہلے ایک موثر وصیت بھی کی تھی۔

تاریخ وفات ۱۲ ربیع الاول ۲۳۱ھ ہے، اس وقت ۷۷ سال کی عمر تھی، ابن خلکان نے ۷ ربیع الاول اور مورخین نے رجب اور ربیع الآخر کا مہینہ بھی لکھا ہے، وفات کی خبر مشہور ہوتے ہی صف ماتم بچھ گئی، گلیوں اور سڑکوں پر صرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے جو درد و غم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

محمد بن طاہر امیر بغداد نے اپنے بچوں اور حاجب کے ہمراہ کفن بھجوایا مگر امام صاحب کے متعلقین نے اس کو لینے سے انکار کیا اور کہا کہ امیر نے جب زندگی میں ان کو ناگوار کاموں سے معاف رکھا تو موت کے بعد بھی معاف رکھیں۔

جنازہ میں اتنا بڑا مجمع تھا کہ صحرائے ابلی قیراط سے جہاں جنازہ رکھا گیا تھا سوق رقیق اور قطیعہ کے پل تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے، محمد بن طاہر نے نماز کے بعد شکر کا کا تخمینہ لگایا تو تقریباً آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں، ان کے علاوہ بے شمار آدمی سڑکوں، راستوں اور چھتوں وغیرہ پر تھے، عبدالوہاب وراق کا بیان ہے،..... کہ جاہلیت اور اسلام کسی زمانہ میں اتنے زیادہ آدمی کسی کے جنازہ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ (۱)

امام کے فرزند عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا تھا کہ اہل بدعت اور ہمارے درمیان وجہ امتیاز جنازہ ہے، اللہ نے ان کی بات صحیح کر دی، بلاشبہ وہ امام سنت تھے، آپ کے سب سے بڑے حریف احمد بن ابی دواد کی جو قاضی القضاة بھی تھے، موت کی ایک شخص کو بھی پرواہ نہیں ہوئی، صرف حکومت کے ارکان اور وابستگان کی ایک محدود جماعت جنازہ میں شریک ہوئی۔

تجہیز و تکفین کے دن مسجد رصافہ میں جن لوگوں نے عصر کی نماز ادا کی تھی، ان کی تعداد بھی ۲۰ ہزار سے زیادہ تھی حاضرین کی زیادتی کی وجہ سے جنازہ کی نماز کئی بار ہوئی، اور عصر سے پہلے جسد مبارک کو قبر میں نہ رکھا جاسکا، تدفین کے بعد بھی نماز جنازہ کا سلسلہ جاری رہا، امیر بغداد محمد بن عبداللہ بن طاہر نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

باب حرب کے مقبرہ میں امام صاحب کو دفن کیا گیا، وفات کے بعد بھی ایک عرصہ تک لوگ قبر پر آتے اور کئی دنوں تک نماز جنازہ پڑھتے رہے، مزار مبارک اب تک زیارت گاہ خلّاق ہے۔

امام صاحب کی وفات اور مغفرت کے متعلق بعض کرامتیں اور خواب بیان کیے جاتے ہیں، متعدد لوگوں نے آپ کی مغفرت اور عالم آخرت میں آپ کے اعزاز و اکرام کے خواب دیکھے۔

(۱) حنفیہ الصلوٰۃ ج ۲ ص ۲۰۰ و ۲۰۱ تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۲۲ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۵ و ۳۶۔

## ازواج و اولاد

امام احمد نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں، پہلی بیوی عباسہ بنت فضل کے بطن سے بڑے صاحبزادہ صالح تولد ہوئے، ان کی وفات کے بعد ریحانہ سے شادی کی، ان کے بطن سے عبد اللہ پیدا ہوئے، جب ریحانہ کا بھی انتقال ہو گیا تو ایک لونڈی کو خرید کر عقد میں داخل کیا، ان سے ۴ لڑکے حسن، حسین، محمد اور سعید اور ایک لڑکی زینب پیدا ہوئیں۔ ابو الفضل صالح: یہ امام صاحب کے سب سے بڑے فرزند اور ۲۰۳ھ میں پیدا ہوئے، کم سنی میں گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی وجہ سے ان کو امام صاحب سے نقل و روایت کا زیادہ موقع نہیں ملا، تاہم ان کے واسطے سے امام صاحب کی حدیثوں کا بڑا حصہ مروی ہے اور وہ فقہ حنبلی کے ناقلین میں بھی شمار کیے جاتے ہیں، آخر عمر میں اصہبان کے قاضی مقرر کیے گئے، جب عہدہ قضا پر مامور کیے گئے تو روپڑے اور فرمایا کہ مجھے میرے والد یاد آ گئے، اس لیے روپڑا، وہ مجھ کو اس حالت میں دیکھنا پسند نہیں کرتے لیکن خدا شاہد ہے کہ میں نے قرضوں کی زیادتی اور اپنے والد کے اہل و عیال کی کفالت ہی کے خیال سے یہ منصب قبول کیا، رمضان ۲۶۶ھ میں وفات پائی۔ (۱)

ابو عبد الرحمن عبد اللہ: یہ نہایت ثقہ و ضابط اور بڑے بلند پایہ محدث تھے، (۲) ان کو امام احمد کے علاوہ بھی متعدد کبار محدثین سے روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، امام احمد صاحب کی روایتیں سب سے زیادہ انھیں کے واسطے سے مروی ہیں، انھوں نے امام کی اکثر کتابوں کی بھی روایت کی ہے یکشنبہ ۲۲ جمادی الاولیٰ ۲۹۰ھ کو انتقال کیا، آپ کے بھتیجے زہیر بن صالح نے جنازہ کی نماز پڑھائی، میت میں ایک بڑے مجمع نے شرکت کی، وفات سے پہلے

(۱) مقدمہ ثلاثیات مسند احمد ص ۱۴، ۱۵، تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹ (۲) الطہرست ابن ندیم ص ۳۳۲۔

دریافت کیا گیا کہ آپ کس جگہ دفن ہونا پسند کریں گے، فرمایا مجھے معتبر طریقے سے معلوم ہوا ہے کہ قطیعہ میں کوئی پیغمبر مدفون ہیں اس لیے اپنے والد کے مقابلہ میں پیغمبر کے قرب و جوار میں دفن ہونا مجھ کو زیادہ پسند ہے۔ (۱)

سعید امام صاحب کی وفات سے ۵۰ روز قبل پیدا ہوئے تھے، بعد میں کوفہ کے گورنر بھی مقرر ہوئے، محمد امام کی بیماری کے زمانہ میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ (۲)

## کلام و عقائد

امام احمد فقیہ و مجتہد ہونے کے باوجود عملی اور اعتقادی مسائل میں فقہاء اور متکلمین کی طرح زیادہ تحقیق و تدقیق نہیں کرتے تھے بلکہ محدثین کے مسلک کے مطابق جو کچھ ظواہر حدیث سے ثابت ہوتا تھا اسی پر عمل کرتے اور اعتقاد رکھتے تھے، اس لیے جب ان سے اس قسم کے سوالات کیے جاتے تو وہ خاموش رہتے اور ان میں غور و تفتیش کو بدعت بتاتے، ایک شخص نے کراہیسی سے قرآن کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا وہ اللہ کا کلام اور غیر مخلوق ہے، اس نے پوچھا متکلم اور قاری قرآن کے جن الفاظ کو پڑھتا اور ادا کرتا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کراہیسی نے کہا قاری کی قرأت اور متکلم کا قول مخلوق ہے، امام احمد سے اس کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے کہا اس طرح غیر ضروری سوالات اور مباحث میں غور و خوض اور ان کی بحث و تفتیش بدعت اور سکوت افضل ہے، (۳) ایک دفعہ الفاظ قرآن کے بارے میں آپ سے تین بار سوال کیا گیا آپ دو مرتبہ خاموش رہے تیسری مرتبہ امام بخاری نے جواب دیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں، البتہ بندوں کے افعال مخلوق ہیں

(۱) مقدمہ ملاحیثات، مسند احمد ص ۱۵ تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲۹ (۲) مقدمہ ملاحیثات، مسند احمد

ص ۱۵، البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۳۳۱ (۳) احمد بن حنبل والحدیث ص ۳۳

لیکن اس طرح کے مسائل میں پڑنا بدعت اور خلاف سنت ہے۔ (۱)

گو امام احمد اس قسم کے مسائل عام مسلمانوں کے سامنے بیان کرنا پسند نہیں کرتے تھے تاہم اقتضاء ضرورت کی بنا پر ان سے اس طرح کے مسائل میں جو آرا منقول ہیں، ان میں بھی احتیاط پوری طرح ملحوظ ہے مثلاً:

صفات الہی اور قرآن: قرآن کے بارے میں امام صاحب کی رائے گزر چکی ہے ایک مرتبہ متوکل کو اس مسئلہ کے متعلق جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا ”سلف صالحین قرآن کو کلام اللہ اور غیر مخلوق مانتے تھے اور یہی ہمارا بھی مسلک ہے، میں صاحب کلام نہیں اور نہ اس معاملہ میں کسی قسم کی بحث و تفتیش کو پسند کرتا ہوں، کتاب اللہ سنت نبوی اور صحابہ کرام و تابعین عظام سے جو کچھ ثابت و منقول ہے اس سے زیادہ کدو کاوش کو میں معیوب سمجھتا ہوں۔ (۲)

وہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ان صفاتوں سے جو قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہیں متصف مانتے ہیں لیکن ان کی ماہیت وحقیقت پر بحث و گفتگو کو ناپسند اور ان کی دوراز کار تاویل کو بدعت سمجھتے تھے، ان کے نزدیک جس طرح اللہ قدیم ہے، اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں اور کلام بھی خدا کی ایک صفت ہے اس لیے وہ قدیم ہے۔

تشبیہ اور جسمیت: وہ اللہ کی تشبیہ اور جسمیت کے قائل نہیں ہیں اسی لیے (وَجَاءَ رَبُّكَ) سے وَجَاءَ قَوَابُ رَبِّكَ مراد لیتے ہیں۔ (۳)

روایت باری: عام اہل سنت واجماعت کی طرح امام احمد بھی عالم آخرت میں مومنین کے لیے اللہ کی روایت اور دیدار کے قائل ہیں، اس کے ثبوت میں متعدد قرآنی آیات واحادیث موجود ہیں، امام صاحب صہیب رومی کی ایک روایت سے بھی استدلال کرتے تھے جس میں بَلِّدِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةَ الْآيَةِ میں وَزِيَادَةَ کی تفسیر روایت

(۱) احمد بن حنبل والحدیث ص ۳۵ (۲) ایضاً ص ۱۵۹ (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۷۔

سے کی گئی ہے۔ (۱)

ایمان و اسلام: امام احمد کے نزدیک ایمان قول و عمل دونوں سے عبارت ہے اور اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے (۲) ان کا قول ہے کہ کار خیر سے ایمان میں اضافہ اور معاصی سے اس میں کمی ہو جاتی ہے، برے کاموں کے ارتکاب سے ایمان سلب ہو جاتا ہے لیکن اسلام باقی رہتا ہے، اسلام اس وقت ختم ہوتا ہے جب آدمی خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرے یا فرائض میں کسی فرض کو تردی وجہ سے ترک کر دیتا ہے، غفلت اور کوتاہی سے اگر کوئی شخص فرض بجا نہ لائے تو یہ خدا کی مرضی پر موقوف ہے کہ اسے عذاب دے یا معاف کر دے۔ (۳)

مرگبین کبار: مرگب کبار کو کافر نہیں سمجھتے تھے، آپ کا قول ہے کہ ”اہل توحید میں سے کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا خواہ وہ کبار کا مرگب ہی کیوں نہ ہو۔“ (۴)

لیکن وہ تارک صلوٰۃ کو کافر سمجھتے تھے، اس بارے میں ان کا امام شافعی سے ایک مناظرہ بھی ہوا تھا۔

مسئلہ خلافت: حضرت علیؓ کی ذات سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے تھے لیکن عام صحابہ کی عظمت و برتری کے بھی قائل تھے، خلفائے ثلاثہ اور حضرت امیر معاویہؓ وغیرہ کسی صحابی کو سب و شتم کرنا ان کے نزدیک معصیت ہے، خلافت کے معاملہ میں ان کا وہی نقطہ نظر ہے جو عام اہل سنت والجماعت کا ہے، امام صاحب اس کی تائید میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت پیش کرتے تھے:

|                         |                                      |
|-------------------------|--------------------------------------|
| مراہ المسلمون حسنا فهو  | جس چیز کو جملہ مسلمان بہتر خیال کریں |
| عند اللہ حسن ومارأوه    | وہ اللہ کے نزدیک بہتر ہے اور جس کو   |
| سیناً فهو عند اللہ سیئہ | سب برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی   |

برا ہے۔

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۷ (۲) ایضاً (۳) المناقب ابن جوزی ص ۲۱۷ (۴) ایضاً۔

فرماتے تھے کہ تمام صحابہؓ نے حضرت ابو بکرؓ کو رسول اللہ کا خلیفہ منتخب کیا اس سے ان کی فضیلت و بزرگی خود ہی ثابت ہو جاتی ہے، عمر بن عثمان حمصی نے خلافت کے متعلق آپ کی رائے دریافت کی تو فرمایا، پہلے خلیفہ حضرت ابو بکرؓ ہیں، اس کے بعد حضرت عمرؓ پھر حضرت عثمانؓ اور سب سے آخری خلیفہ حضرت علیؓ ہیں، جو لوگ حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر ترجیح دیتے ہیں وہ درحقیقت ان اجلہ صحابہ اور اہل شوریٰ پر نکتہ چینی کرتے ہیں جنہوں نے حضرت عثمانؓ کو مقدم قرار دیا تھا۔ (۱)

## فقہ واجتہاد (۲)

کیا امام احمد فقیہ اور صاحب مذہب نہیں تھے: امام احمد کا شمار ان چار مشہور ائمہ اسلام اور فقہاء مجتہدین میں ہوتا ہے جن کے اجتہادی مذاہب پر چوتھی صدی سے اب تک مسلمان عمل کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن بعض متقدمین علما کو ان کے فقیہ اور صاحب مذہب ہونے میں کلام ہے، علامہ ابن جریر فرماتے ہیں:

انما هو رجل حدیث لا رجل وہ صرف محدث ہیں، فقیہ نہیں۔

فقہ۔ (۳)

علامہ ابن عبدالبر نے الانقبا میں محض ائمہ ثلاثہ کا تذکرہ کیا ہے، ابن قتیبہ نے ان کو فقہاء کے زمرہ میں شامل نہیں کیا ہے، بشاری مقدسی نے ان کو فقہاء کے بجائے اصحاب (۱) البردایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸ (۲) امام احمد کے حالات اور کارناموں پر موجودہ زمانہ کے مشہور مصری عالم ڈاکٹر ابوزہرہ نے نہایت عمدہ کتاب تالیف کی ہے اور اردو میں اس کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں اس کتاب کا یہ حصہ بڑا اہم اور نہایت بیش قیمت ہے، ہم نے بھی یہاں اس سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ (۳) ضعی الاسلام ج ۲ ص ۲۳۵۔

حدیث میں شامل کیا ہے (۱) مگر ان کے سوا اکثر علماء حنفیہ نے ان کو بلند پایہ فقیہ و مجتہد بھی مانا ہے اور امام فقہ و صاحب مذہب بھی تسلیم کیا ہے، امام شافعی تک نے ان کو فقہ و اجتہاد میں امام بتایا ہے، (۲) اور متاخرین تو امام احمد کو محدث کے بجائے فقیہ ہی کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں، ساتویں صدی کے مشہور عالم دمیری نے اصحاب المذہب المتبوعہ میں ان کے مذہب کا ذکر کیا ہے (۳) اور اسی صدی کے مشہور مورخ علامہ ابن خلدون کا بیان ہے۔

وقد صار اهل الاسلام اليوم  
على تقليد هؤلاء الأئمة  
الاربعة. (۴)

علامہ شہرستانی نے مسلمانوں کے اجتہادی مذاہب میں اس مذہب کو بھی شامل کیا ہے (۵)، صاحب مفتاح السعادة لکھتے ہیں ”امام احمد ان مجتہدین میں ہیں جن کے اقوال و آراء پر عمل کیا جاتا ہے اور جن کا مذہب اکثر شہروں میں مروج ہے“ (۶) صاحب کشف الظنون تحریر فرماتے ہیں ”مشہور مذاہب جن کی صحت مسلم ہے چار ہیں اور وہ امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد کی جانب منسوب ہیں“ (۷) شاہ ولی اللہ صاحب رسالۃ الانصاف میں محدثین فقہاء کے متعلق تحریر فرماتے ہیں ”ان لوگوں نے گذشتہ ائمہ فقہ کی تقلید پر اکتفاء کرنے کے بجائے خود اصول و قوانین متعین کئے..... ان لوگوں میں بھی غیر معمولی فضل و کمال، فقہی بصیرت اور حدیث اور اس کے مراتب و درجات سے واقفیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ نمایاں امام احمد ہیں“ (۸) اور عقد الجدید میں فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ میں اس مسلک کو بھی شامل کیا ہے۔

(۱) احسن التقاسیم ص ۳۷ (۲) مختصر صفحۃ المصنوعہ ص ۲۲۱ (۳) حیاة الجوانح ص ۸۱ (۴) مقدمہ ابن خلدون ص ۳۹۱ (۵) السبل والخلل شہرستانی بر حاشیہ السبل ابن حزم ج ۲ ص ۳۵ (۶) مفتاح السعادة ج ۲ ص ۹۸ (۷) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۲ (۸) الانصاف فی بیان سبب الخلاف ص ۱۳۔



علامہ شبلیؒ عہد مامون کے اہل کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اور خصوصاً امام شافعیؒ اور امام احمد کا تو وہ پایہ ہے کہ اسلامی دنیا کے بڑے بڑے حصوں میں انھیں کے اجتہادی مسائل پر گیارہ سو برس سے آج تک مذہبی قانون بنے ہوئے ہیں۔“ (۱)

غرض ساتویں صدی بلکہ اس کے پہلے سے اسلامی فقہ و قانون اور اس کی تاریخ و تدوین کے سلسلہ میں امام احمد کا ایک اہم فقہ اور صاحب مذہب کی حیثیت سے ذکر ہوتا چلا آ رہا ہے، اس لیے جس طرح ان کا فقیہ و مجتہد ہونا مسلم ہے اسی طرح صاحب مذہب اور امام فقہ ہونا بھی بلا ریب ثابت ہے۔

محققین کا امام صاحب کو فقیہ و صاحب مذہب کی حیثیت سے تذکرہ نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ آپ کے تفقہ و اجتہاد کے قائل نہیں تھے، بلکہ اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ امام صاحب پر حدیث کا اثر زیادہ غالب تھا، اس لیے ان بزرگوں نے ان کے نمایاں وصف و امتیاز کے اعتبار سے ان کو فقیہ کے بجائے صرف محدث ہی کہا اور لکھا۔

افتا کے شرائط: امام احمد کے نزدیک علوم قرآن، اسانید صحیحہ، سنن نبوی اور متقدم علما کے اقوال سے پوری واقفیت کے علاوہ مفتی کے اندر مندرجہ ذیل اوصاف پائے جانے ضروری ہیں:

- ۱- اس کی نیت خالص ہو، ۲- علم، حلم، وقار اور سکینت سے متصف ہو، ۳- علم میں کامل اور صاحب غلبہ و اختیار ہو تا کہ جرأت کے ساتھ اپنے فیصلوں کو نافذ کر سکے،
- ۴- بذات خود ملنگی اور مستغنی ہو یعنی دوسروں کا محتاج و دست نگر نہ ہو، ۵- لوگوں کے حالات اور ذہنی کیفیات سے باخبر ہو (۲)

فقہ حنبلی کے اصول: حافظ ابن قیم نے امام احمد کے تفقہ و اجتہاد کے حسب ذیل اصول بیان کئے ہیں۔

۱- نصوص: فقہ حنبلی میں سب سے اہم اور مقدم چیز یہی ہے، اس میں کتاب و

(۱) المامون ج ۲ ص ۱۸ (۲) اعلام الموقعین ج ۳ ص ۴۳۸، ۴۳۹۔

سنت دونوں شامل ہیں اس اصل کے ہوتے ہوئے کسی اور چیز کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ فتاویٰ صحابہ: امام احمد کے نزدیک نصوص کے بعد اسلامی قانون کا دوسرا

ماخذ صحابہ کے اقوال و فتاویٰ ہیں اور وہ ان کو کتاب و سنت کے بعد ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہیں، اگر کسی مسئلہ میں صحابہ سے مختلف اقوال منقول ہوں تو اس قول کو ترجیح دی جائے گی جو کتاب و سنت سے قریب تر ہو، اگر اس کا اندازہ نہ ہو سکے تو صرف اختلاف صحابہ کو ذکر کر کے خاموشی اختیار کر لی جائے گی اور کسی کو ترجیح نہ دیا جائے گا (۱) دوسرا اصول یہ ہے کہ افضل صحابی کا قول مرجح سمجھا جائے گا، مثلاً:

صحابہ میں اختلاف کی صورت میں خلفا کا قول مرجح مانا جائے گا، یا ایک جانب شیخین ہوں اور دوسری طرف دوسرے خلفا تو شیخین کے قول کو اختیار کیا جائے گا، اسی طرح حضرت ابو بکر و عمرؓ میں اختلاف کے موقع پر حضرت ابو بکرؓ کی رائے پر عمل کیا جائے گا، ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر ایک ہی درجہ اور مرتبہ کے صحابہ کے درمیان اختلاف ہو تو ایک کا قول دوسرے کے لیے حجت نہ ہوگا، امام صاحب سے اس کی بھی روایت کی گئی ہے کہ وہ اختلاف صحابہ کی صورت میں ان سب کے اقوال پر عمل کرنے کو بہتر سمجھتے تھے اور اپنی رائے سے کسی صحابی کے قول کو مرجح قرار دینا پسند نہیں کرتے۔ (۲)

بعض لوگ امام صاحب پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ فتاویٰ صحابہ کے مقابلہ میں نصوص کی بھی پروا نہیں کرتے، علامہ ابن قیم ان لوگوں کے جواب میں لکھتے ہیں:

امام احمد نص کی موجودگی میں اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور اس کے مخالف ہر چیز کو رد فرما دیتے تھے مثلاً حضرت عمرؓ کے برخلاف انھوں نے منیوتہ کے متعلق فاطمہ بنت قیس کی حدیث اور جنسی کے تیمم کے بارے میں عمار بن یاسرؓ کی حدیث کو صحیح قرار دیا اور حضرت ابن عباسؓ اور ایک روایت کے مطابق حضرت علیؓ کے ایک فتویٰ کو جو سبیحہ اسلمی

(۱) اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۳ (۲) ایضاً ج ۳ ص ۳۷۸۔

کی حدیث صحیح کے خلاف تھارو فرمایا۔ (۱)

۳- ضعیف ومرسل روایات: تیسرا ماخذ ضعیف ومرسل روایات کو بتاتے ہیں، اسحاق بن ابراہیم ہانی نے ان سے چند مسائل دریافت کئے جن کے متعلق بعض مرسل روایتیں موجود تھیں لیکن صحابہ و تابعین سے بروایت صحیح و با اتصال ان کے خلاف فتویٰ موجود تھا تو فرمایا کہ ”صحابہ سے جو کچھ با اتصال ثابت ہے وہ مجھ کو زیادہ پسند ہے اور قیاس و رائے پر ان کو ترجیح دی جائے گی، آپ کے صاحبزادے عبداللہ نے دریافت فرمایا کہ صحیح و صالح اور ضعیف و ستیم روایتوں میں امتیاز نہ کرنے والے محدث اور فقیہ و صاحب رائے میں کس کے فتویٰ پر عمل کیا جائے گا، فرمایا ”میرے نزدیک رائے کے مقابلہ میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے“۔

یہ واضح رہے کہ ضعیف سے منکر، باطل اور ایسی حدیثیں مراد نہیں ہیں جن کے راوی متہم ہوں، دوسرے فقہانے بھی اس اصول کو ایک حد تک اختیار کیا ہے، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے علاوہ امام اعظمؒ نے بھی قبقبہ اور بنیذ تمر سے وضو کئے جانے کے متعلق ضعیف حدیثوں کو قیاس پر ترجیح دیا ہے۔

۴- قیاس: سب سے آخری چیز قیاس ہے، اور امام صاحب محض ضرورت کے وقت اس کی اجازت اور ممکن حد تک اس سے پرہیز کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، اپنے ایک شاگرد کو تاکید کی کہ

ایسا ان تتکلم فی مسئلة جس مسئلہ میں اثر موجود نہ ہو اس میں

لیس لك فیہا اثر (۲) بحث و کلام نہ کرو۔

لیکن ظاہر یہ کی طرح وہ قیاس کے منکر نہیں ہیں، ان کا قول ہے کہ ”کوئی شخص قیاس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا“ البتہ وہ اہل عراق کی طرح قیاس میں زیادہ توسع کے قائل نہ تھے۔

(۱) اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۲ (۲) ایضاً ج ۱ ص ۳۲ و ۳۱۔

ان اصول اربعہ کے علاوہ بھی بعض چیزوں کا امام احمد لحاظ کرتے تھے مثلاً اقوال تابعین، اصحاب، مصالح، سد ذرائع اور اجماع وغیرہ، ان کی تفصیل حنابلہ کی کتابوں میں موجود ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اجماع کے منکر تھے لیکن علمائے حنابلہ نے اس کی جو تشریح کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بعض شرطوں کے ساتھ اجماع کے قائل تھے۔

فقہ حنبلی کی خصوصیات: ۱- فقہ حنبلی کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس کا دار و مدار تمام تر حدیث و روایت اور نقل و اثر پر ہے، امام صاحب مقدور بھر احادیث سے انحراف اور بے تعلقی پسند نہیں کرتے تھے اور احادیث و آثار پر وسعت نظر کی بنا پر ان کو رائے و قیاس سے بہت کم کام بھی لینا پڑتا تھا، عبدالوہاب و راق کا بیان ہے کہ امام احمدؒ نے ستر ہزار مسائل کا اخبارنا وحد ثنا کہہ کر جواب دیا (۱) اس خصوصیت کی وجہ سے اول تو امام صاحب غیر قوی پذیر مسائل کے بارہ میں فتویٰ دینے سے احتراز فرماتے تھے، دوسرے فقہی تفریعات و تخریجات پر ان کے فتوے مبنی نہیں ہوتے تھے، اس لئے اس فقہ کو تمام تر احکام شرعی پر مبنی کہا جاسکتا ہے۔

۲- حیل و مخارج کا جو دراصل مذہبی قیود اور بندشوں سے بچنے کے ذرائع ہیں حنبلی فقہ میں وجود نہیں ہے۔

۳- بعض حیثیتوں سے فقہ حنبلی میں بڑی وسعت اور لچک بھی پائی جاتی ہے کیونکہ امام صاحب کے نزدیک عبادات اور ان مسائل و معاملات کو چھوڑ کر جن کی حلت و حرمت کی تصریح موجود ہے، اشیاء کی اصل اباحت ہے، اس اصل کو تسلیم کر لینے کے نتیجے میں حنبلی فقہ کے اندر بڑی لچک اور کشادگی پیدا ہو گئی ہے، اس لئے اگر ایک جانب نصوص شرعیہ سے شدت و تمسک کی بنا پر اس مذہب میں فقہی استنباط کا دائرہ محدود ہو گیا ہے تو دوسری جانب حرام کرنے والی متعدد پابندیوں کو ختم کر کے اس نے بڑی سہولت بھی پیدا کر دی ہے۔

(۱) ترجمہ احمد بن حنبل از ابو زہرہ ص ۲۳۰

۳- حنبلی مذہب نے اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہونے دیا اور ہر دور میں حنابلہ

کے اندر ائمہ و مجتہدین موجود رہے۔

فقہ حنبلی کے رواۃ و ناقلین: امام احمد نے اپنے اقوال و فتاویٰ خود منضبط نہیں کئے بلکہ وہ دوسروں کو بھی ان کے جمع و تدوین سے منع کرتے تھے، مگر بعض ضرورتوں کی بنا پر اس کی اجازت بھی ان سے ثابت ہے اس لئے آپ کی زندگی میں آپ کے مذہب کا چرچا تو ہو گیا تھا مگر وہ آپ کے انتقال کے بعد مرتب و مدون کیا گیا، آپ سے براہ راست علوم کی تحصیل و تکمیل کرنے والے حسب ذیل حضرات ہیں۔

ابوبکر احمد بن اثر، احمد بن محمد بن ججاج مروزی، عبدالملک بن عبدالحمید، صالح بن

احمد، عبداللہ بن احمد، حرب بن اسماعیل اور ابراہیم بن اسحاق حربی۔

لیکن فقہ حنبلی کے اصل جامع خلال ہیں۔ (۱)

خلال: امام احمد کے اقوال و فتاویٰ کے اصل جامع و مرتب ابوبکر احمد بن محمد بن خلال (م ۳۱۱ھ) ہیں، انھوں نے ۲۰ سے زائد جلدوں میں امام احمد کے فتوے جمع کئے ان کو امام صاحب سے براہ راست کسب فیض کا موقع نہیں ملا لیکن مذہب میں ان کا درجہ بلند ہے، یہ فقہ حنبلی کے جامع و ناقل ہی نہ تھے بلکہ اس کے ناشر بھی ہیں۔

ابوالقاسم خرقی: عمر بن حسین خرقی (م ۳۳۴ھ) بھی کبار حنابلہ میں ہیں، انھوں نے خلال کی کتابوں کی تخیص اور ان میں اضافہ کیا، ان کی کتاب ”المختصر“ حنبلی مذہب کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہے اس کی متعدد شرحوں میں موفق الدین مقدسی کی شرح المغنی زیادہ مشہور اور اہم ہے۔

غلام الخلال: ابوبکر عبدالعزیز بن جعفر (م ۳۶۳ھ) خلال کے مشہور شاگردوں میں تھے، اس لئے ان کو غلام الخلال کہا جاتا تھا، (۲) انھوں نے بھی خلال کی کتابوں کی تخیص اور ان

(۱) اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۱ (۲) شذرات الذہب ج ۳ ص ۴۵۔

میں اضافہ کا کام انجام دیا۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد حافظ ابن قیم بھی اس مذہب کے بڑے اہم رکن اور شارح سمجھے جاتے ہیں۔

اسلامی ملکوں میں اس مذہب کی اشاعت: اس مذہب کی اشاعت بغداد سے ہوئی، شروع میں اس کو دہاں غلبہ بھی حاصل تھا، پھر بصرہ اور عراق میں پہنچا، ساتویں صدی میں مصر کے حدود میں داخل ہوا اور قاضی عبداللہ بن محمد جدادی نے جو ۳۸۷ھ میں عہدہ قضا پر متمکن تھے اس کی مصر میں عام نشر و اشاعت کی، انڈس میں تیسری صدی ہی میں یہ حنبلی مذہب داخل ہو چکا تھا، قحی بن مخلد (۲۰۱، ۲۷۶) وہاں سے بغداد آئے اور امام صاحب سے براہ راست اس کی تحصیل کی اور انڈس واپس جا کر جامع قرطبہ میں اس مذہب کا درس دینا شروع کیا، بشاری مقدسی نے اقلیم اتور، جرجان، رحاب، مادراء، انہر اور سوس وغیرہ میں بھی اس کے (۱) وجود کا ذکر کیا ہے۔

اس زمانہ میں آل سعود کا جو مملکت عربیہ کے سربراہ ہیں یہی مذہب ہے اور سارے بلاد نجد و حجاز میں یہ سرکاری مذہب کی حیثیت سے مروج ہے۔

مذہب حنبلی کے متعلق بعض شکوک و اعتراضات: امام احمد کے مذہب و مسلک پر جو شکوک عائد کیے جاتے ہیں ان کی مختصر وضاحت ذیل میں درج کی جاتی ہے:

اجتاع سنت: حنبلی مذہب کے تبعین ہر زمانہ میں کم رہے اور مذاہب ثلاثہ کے مقابلہ میں اس کو زیادہ فروغ نہیں نصیب ہو سکا خود حنابلہ کو بھی اس کا اعتراف ہے، ان کا ایک شاعر معترضین کے جواب میں کہتا ہے:

يقولون لى قد قل تبعه احمد وكل قليل فى الانام ضئيل

(۱) احسن التقاسيم ص ۱۲۶ الديباج المذہب ص ۱۳ و مقدمہ ابن خلدون ص ۳۹۱ و حسن المحاضرہ ج ۱

فقلت لهم مهلا غلظتم بزعكم الم تعلموا ان الكرام قليل

وما ضرنا انا قليل وجارنا عزيز وجار الاكثرين ذليل (۱)

”لوگ کہتے ہیں کہ امام احمد کے تبعین کی تعداد کم ہے اور جو گروہ کم ہوتا ہے اس کو حقیر سمجھا جاتا ہے، میں نے ان لوگوں کو جواب دیا کہ تم توقف سے کام لو، تمہاری رائے صحیح نہیں ہے کیوں کہ شرفا کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے، ہمیں اپنی قلت تعداد کا غم نہیں اور نہ اس سے ہم کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اس لیے کہ ہمارے پڑوسی غالب اور مقتدر لوگ ہیں جب کہ ان لوگوں کے جن کی تعداد زیادہ ہے، پڑوسی ذلیل و خوار ہیں۔“

اس جواب میں شاعرانہ تعلی اور مبالغہ زیادہ ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ تعداد کی قلت و کثرت فیصلہ کن نہیں ہوا کرتی یہاں تک کہ میدان کارزار میں بھی صرف کثرت تعداد موثر نہیں ثابت ہوتی اس لیے نہ تو اس کو حق و انصاف کا معیار بنایا جاسکتا ہے اور نہ وہ فی نفسہ فخر و مباہات کی کوئی چیز ہے، علامہ ابن خلدون نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ ”اس مذہب کو فقہی بصیرت اور اجتہادی شان سے کم سروکار ہے“، مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے کیوں کہ عام لوگ نہ تو کسی چیز کو اس کی صحت یا خوبیوں کی بنا پر قبول کرتے ہیں اور نہ غور و فکر کے بعد اس کو اختیار کرتے ہیں، ان کا رد و قبول عموماً پروپیگنڈہ، وقتی سیاست اور بعض اجتماعی عوامل و اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے، ذیل میں اس کے چند وجوہ درج کیے جاتے ہیں:

۱- حقیقت یہ ہے کہ یہ مذہب شاہانہ سرپرستی سے اکثر محروم رہا کیوں کہ امام احمد اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر کبھی دنیوی اعزاز و وجاہت کے طالب نہیں ہوتے بلکہ وہ ہمیشہ امرا و سلاطین کے درباروں سے کنارہ کش رہے، ان کے پیرو بھی ان کی تقلید میں جاہ و منصب اور سلاطین کے دربار سے بے تعلق رہے، یہ چیز حنبلی مذہب کے ارتقا و اشتہار میں بڑی حد تک مانع ثابت ہوئی۔

(۱) اتمام البلاغ ص ۱۸۴ بحوالہ ریحلۃ الاولیاء، خفاجی۔

۲- مذاہب اربعہ میں یہ سب سے متاخر ہے اس کی داغ بیل پڑنے سے پہلے ہی دوسرے مذاہب عوام میں مشہور و مقبول اور مختلف ملکوں میں پھیل چکے تھے، ان کی شہرت کے سامنے اس وقت کے دوسرے اجتہادی مذاہب کا جو بعد میں بالکل معدوم ہو گئے چراغ ٹمٹمانے لگا تھا، ان حالات میں کسی نئے مذہب کا لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لینا حیرت انگیز ہے، اس حیثیت سے حنبلی مذہب کا یہ بڑا کمال ہے کہ اس نے مذاہب ثلاثہ کی شہرت و ہمہ گیری کے باوجود نہ صرف اپنے کو باقی رکھا بلکہ ایک حد تک خود بھی عوامی اور ہمہ گیری مذہب بن گیا۔

۳- امام احمد اپنی فقہ و افتا کی نقل و تحریر کو پسند نہیں کرتے تھے اور انھوں نے شروع میں بڑی سختی کے ساتھ لوگوں کو اس کی ممانعت کر دی تھی، اس بنا پر بھی ان کے مذہب کی ترقی و اشاعت میں رکاوٹ پیش آئی۔

گو حنبلی مذہب کے تبعین کی تعداد ہمیشہ کم رہی تاہم وہ خواص کا مرکز توجہ رہا ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں:

”چند اہل مجتہدین کہ در طریقہ او برخاستند در ہیج مذہب معلوم نیست

و اگر ہیج کسے نباشد مگر ابن تیمیہ و ابن قیم او برائے موازنہ با تمام علمائے زماں و اہل

سلوک جہاں کفایت است۔“ (۱)

شیخ ابو زہرہ بھی اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”بیشک خواص کا جہاں تک تعلق ہے ان کی کثرت یہیں ملے گی اور اس مذہب کے لیے صرف ابن تیمیہ اور ابن قیم کا وجود کافی ہے۔“ (۲)

کثرت و تعدد اقوال: فقہ حنبلی پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس میں اختلاف روایات اور کثرت اقوال بہت ہیں بلکہ بعض مسائل میں متضاد اقوال تک منقول ہیں حالانکہ کثرت

(۱) تقصیر جود الاحرار ص ۹۳ (۲) احمد بن حنبل ترمذی ترجمہ اردو ص ۳۷۳۔



وتعدواقوال سے کوئی مذہب بھی خالی نہیں اور اس کو ائمہ کی حق پرستی اور اخلاص کا ثبوت سمجھا جاتا ہے، امام صاحب سے ایک ہی مسئلہ میں کثرت اقوال کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے زہد و اتقا کی وجہ سے کوئی بات علم و ثبوت کے بغیر نہیں فرماتے تھے لیکن لوگوں کے اصرار اور کثرت سوال سے مجبور ہو کر بعض اوقات تردد کی حالت میں ان کو فتویٰ دینا پڑ جاتا تھا، اس لیے جب اس کے خلاف صحیح قول معلوم ہو جاتا تو وہ فوراً اپنے قول سے رجوع کر لیتے تھے، اسی طرح صحیح حدیث اور مستند اثر صحابی نہ پا کر وہ ضعیف و مرسل روایت کے مطابق بھی فتویٰ دیتے تھے مگر بعد میں جب صحیح روایت اور قول صحابی سامنے آتا تو اپنے پہلے فتویٰ سے رجوع فرما لیتے، اس رجوع کی جن لوگوں کو اطلاع ہو جاتی تھی وہ اس کے اور جن کو اطلاع نہیں ہوتی وہ پہلے ہی قول کے مطابق امام صاحب کا مسلک بیان کرتے تھے۔

۲۔ بعض مسائل میں خود روایات اور اقوال صحابہ بھی مختلف ہوتے ہیں جو اگر قوت و صحت کے لحاظ سے یکساں ہوتے اور ان میں ترجیح کی کوئی خاص وجہ نہ معلوم ہوتی تو عام فقہاء کے برخلاف امام صاحب خود بھی مسئلہ کو دو قولوں پر چھوڑ دیتے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے روادار نہ ہوتے۔

قیاس سے عدم تعلق: بعض لوگوں کے نزدیک اس مذہب کو قیاس سے بہت کم سروکار ہے، اس غلط فہمی کی اصل وجہ تو یہی ہے کہ امام صاحب نصوص، آثار، اخبار، آحاد، مراسیل اور ضعیف روایات بلکہ تابعین اور ائمہ عظام کے اقوال کی موجودگی میں بھی قیاس کرنے کے شدید مخالف تھے اور وہ شدت احتیاط و تورع کی بنا پر فرضی اور تقدیری مسائل میں بھی بلا ضرورت قیاس کرنے کو ناپسند اور احتیاط و تقویٰ کے منافی سمجھتے تھے، اس لیے عام مذاہب فقہ کے مقابلہ میں اس حیثیت سے اس کو واقعی قیاس سے زیادہ سروکار نہیں ہے، کیوں کہ امام احمد کے نزدیک کسی حدیث کو چاہے وہ خبر واحد ہی کیوں نہ ہو قیاس سے رد نہیں کیا جاسکتا، ان کا اور ان کے تابعین کا خیال ہے کہ قیاس صحیح، حدیث کے معارض نہیں ہو سکتا ہے، علامہ ابن

تیمیہ نے رسالہ القیاس فی الشرع الاسلامی میں متعدد ایسے مسائل پر جنہیں خلاف قیاس کہا جاتا ہے حالانکہ وہ احادیث سے ثابت ہیں، بحث کر کے دکھایا ہے کہ وہ عین قیاس کے مطابق ہیں، حافظ ابن قیم کی کتابوں میں بھی اس پر مفصل بحثیں موجود ہیں۔

تشدد اور مذہب جنابی: بعض مسائل میں جنابی مذہب کی سخت گیری اور تشدد کو بھی موردِ وطن بنایا جاتا ہے لیکن اصل میں اس کا سبب یہ ہے کہ امام صاحب اتباع سنت کے جذبہ سے سرشار تھے اس لیے نہ تو وہ دین و شریعت کے خلاف کوئی بات کہنے سننے کے روادار ہوتے تھے اور نہ کسی حال میں احادیث و آثار صحابہ سے دستبردار ہونے کو پسند کرتے تھے، جن چیزوں کو معمولی سمجھا جاتا ہے، ان میں بھی وہ بڑی سختی اور پوری احتیاط برتتے تھے، عام حنابلہ نے بھی آپ کے اتباع میں اس سختی اور شدت کو روارکھا، بلکہ بعض لوگ تو زہد و تقشف میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے عوام پر بھی سختی کا دروازہ کھول دیا جس کے نتیجہ میں ایک زمانہ میں بڑی شورش اور ہجوان برپا ہو گیا تھا، علامہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں ۳۲۳ھ کے واقعات میں اس کا تذکرہ کیا ہے لیکن حنابلہ کی اس سختی اور شدت کا امام صاحب سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے کیوں کہ وہ زیادہ تر اپنی ہی ذات تک سختی کو روارکھتے تھے اہل کمال زہد کی وجہ سے عبادت اور مشروعات میں اپنی طرح دوسروں کے لیے بھی پسند فرماتے تھے کہ وہ احتیاط اور تورع کو اپنا شعار بنائیں، ظاہر ہے ان امور میں اعتدال کے ساتھ شدت و تصلب اختیار کرنا مذموم نہیں ہے، البتہ عام لوگ اعتدال و توازن کو برقرار نہ رکھنے کی وجہ سے افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔

لیکن عبادت اور محظورات سے قطع نظر عقود و شروط اور غیر منصوص امور کی حلت و اباحت میں امام صاحب بڑے روادار اور توسع پسند تھے اور دوسرے فقہاء کی طرح ان کے یہاں ان چیزوں میں زیادہ شدت اور تنگی نہیں پائی جاتی۔

## تصنیفات

امام صاحب کی جانب کئی تصنیفات منسوب ہیں جن میں چند کے علاوہ سب ناپید ہیں۔

۱- کتاب الصلوٰۃ: یہ مختصر رسالہ پہلی مرتبہ ہندوستان سے ۴۲۲ صفحات میں ۱۳۱۱ھ میں امام احمد کے ایک مکتوب کے ساتھ جو مسدود بن مسریل کے نام ہے شائع ہوا تھا، دوسری مرتبہ ۱۳۲۷ھ میں علامہ ابن قیم کے رسالہ کتاب الصلوٰۃ و احکام تارکیہا کے ساتھ مطبع محمد علی صبح مصر میں چھپا، اس میں مسنون اور صحیح طریقہ نماز کی وضاحت کی گئی ہے اور متابعت امام کی اہمیت بیان کی گئی ہے رکوع و سجود اور دوسرے ارکان میں امام پر مقتدی کے سبقت کرنے کے متعلق جو ممانعت اور وعیدیں حدیثوں میں مذکور ہیں ان کو جمع کر کے ان کی تشریح کی گئی ہے۔

۲- کتاب الزہد: مسند کے بعد امام صاحب کی یہ دوسری اہم کتاب ہے، علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں ”جن لوگوں نے زہد و رقاق کے متعلق حدیثیں جمع کی ہیں ان میں عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد بڑی اہم ہے لیکن اس میں کمزور اور دہائی روایتیں بھی ہیں سب سے عمدہ امام احمد کی کتاب ہے، جس کی ترتیب ناموں پر ہے“ حافظ ابن کثیر بیان کرتے ہیں ”اس موضوع پر متقدمین اور متاخرین علما میں سے کسی کی کتاب بھی اس کے ہم پایہ نہیں ہے“ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ”یہ مسند کے ثلث کے بقدر ہے اور اس کی متعدد حدیثیں اور آثار مسند احمد میں نہیں ہیں“ اس کا ایک قلمی نسخہ برلین میں ہے، امام احمد کی کتاب الزہد کا ایک حصہ مختصر کتاب الزہد کے نام سے حجاز سے شائع ہو گیا ہے“ آپ کے صاحبزادے عبداللہ نے اس کے زوائد تحریر کئے تھے۔ (۱)

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۹، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۹ و جیل المسفقہ ص ۸ و الرسالہ لسطر ذم ۱۸

## ۳- کتاب التفسیر:

- ۴- کتاب السنۃ: اس کا مخطوطہ برلین میں موجود ہے (۱) اور غالباً طبع بھی ہو چکی ہے دوسری کتابوں اور رسائل کے نام یہ ہیں، ۵- کتاب طاعة الرسول، ۶- کتاب الایمان، ۷- کتاب الاعتقاد، ۸- کتاب النسخ والمنسوخ، ۹- المقدم والمؤخر فی کتاب اللہ، ۱۰- کتاب الفرائض، ۱۱- کتاب الفعائل، ۱۲- فضائل الصحابہ، ۱۳- فضائل ابوبکر، ۱۴- فضائل حسنین، ۱۵- مناقب علی، ۱۶- کتاب المسائل، ۱۷- کتاب المناسک، ۱۸- کتاب العلل، ۱۹- کتاب التاريخ، ۲۰- کتاب الاثریہ، ۲۱- کتاب الرد علی الجمیہ، ۲۲- کتاب الرد علی من ادعی تناقض القرآن، ۲۳- کتاب الرد علی الزنادقہ۔ (۲)

ان مستقل تصنیفات کے علاوہ امام صاحب کے فتاویٰ اور مسائل کو بھی خلال نے

جامع کبیر میں جمع کیا ہے۔

مسند احمد بن حنبل: امام صاحب کی سب سے مشہور اور حدیث کی اہم ترین کتاب ہے، امام صاحب سے پہلے بھی اس طرح کی کتابیں لکھی گئیں اور بعد میں بھی لیکن کسی مجموعہ مسانید کو اس قدر شہرت و مقبولیت اور اعتبار و استناد نصیب نہیں ہوا، اس میں عام کتب مسانید کی طرح صحابہ کی ترتیب پر حدیثیں مرتب کی گئی ہیں، ترتیب میں زیادہ تر سبقت فی الاسلام کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن اس اصول کا ہر جگہ التزام نہیں کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ترتیب میں بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں مثلاً مدنیوں کی روایت شامیوں میں اور شامیوں کی مدنیوں میں شامل کر دی گئی ہیں۔ (۳)

مسند کے اجزا اور حدیثوں کی تعداد: مسند احمد تقریباً ۲۷ اجزا پر مشتمل اور سات سو صحابہ کی حدیثوں کا مجموعہ ہے جن کی تعداد عام طور سے تیس اور چالیس ہزار بتائی جاتی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ مسند کی اصل روایات تو تیس ہزار ہیں باقی دس ہزار

(۱) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ ص ۲۳۱ (۲) العہد ص ۳ (۳) بستان الحمدین ص ۳۰۔

کے قریب زوائد عبداللہ ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ مکررات کے ساتھ چالیس ہزار اور حذف مکررات کے بعد میں ہزار حدیثیں ہیں۔ (۱)

مسند کے مرویات کی قسمیں: مسند کی حدیثوں کی چھ قسمیں ہیں:

۱- وہ حدیثیں جن کو امام صاحب کے فرزند عبداللہ ان کے حوالے سے بیان

کرتے ہیں یہی اصل مسند احمد ہے، اس قسم کی روایتیں ۳-۴ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔

۲- وہ روایتیں جو عبداللہ نے آپ سے اور آپ کے علاوہ دوسرے محدثین سے

روایت کی ہیں، اس طرح کی روایات بہت کم ہیں۔

۳- وہ حدیثیں جن کو عبداللہ نے آپ کے بجائے دوسرے شیوخ سے نقل کیا

ہے، اس طرح کی حدیثوں کو زوائد عبداللہ کہتے ہیں، ان کی تعداد پہلی قسم سے کم مگر اور قسموں

سے زیادہ ہے۔

۴- وہ روایتیں جن کو عبداللہ نے امام صاحب سے تو سنا لیکن آپ کے سامنے

ان کی قرأت نہیں کی تھی، اس قسم کی روایتیں بھی بہت کم ہیں۔

۵- ایسی حدیثیں جن کو انھوں نے نہ تو امام صاحب سے سنا اور نہ آپ کے سامنے

پڑھا بلکہ آپ کی کتاب یا کسی تحریر سے ان کو نقل کیا ہے، اس قسم کی حدیثیں بھی کم ہیں۔

۶- ابو بکر قطیبی کے زیادات جن کو انھوں نے عبداللہ اور امام احمد کے بجائے کسی

اور محدث سے روایت کیا ہے، اس طرح کی روایتیں بہت کم ہیں۔ (۲)

امام صاحب کے مسند اور زوائد کا فرق بیان کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہ فرماتے

ہیں کہ ”زوائد میں ضعیف اور موضوع روایتیں بھی شامل ہو گئی ہیں جن کو ناواقف لوگ امام

احمد ہی کی جانب منسوب کرتے ہیں“۔

مسند کی تالیف میں احتیاط: امام صاحب نے مسند کی ترتیب و تالیف میں غیر معمولی احتیاط

(۱) بستان المحمدین ص ۲۹، ۳۰ (۲) فتح الربانی ص ۸۔

سے کام لیا ہے ان کا خود بیان ہے کہ انھوں نے اس کو ساڑھے سات لاکھ سے زائد حدیثوں سے منتخب و مرتب کیا تھا، علماء فن کا بیان ہے کہ انھوں نے مسند کی تدوین میں صحیح احادیث کی تخریج اپنے اوپر لازم کر لی تھی، ابو موسیٰ مدینی کا بیان ہے کہ امام احمد نے مسند میں ان ہی لوگوں سے روایتیں نقل کی ہیں جن کی صداقت و دیانت مسلم تھی مطعون لوگوں کی روایات نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے، امام احمد صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو لوگوں کے لئے امام و حجت بنایا ہے تاکہ اختلاف کے وقت وہ اس کی جانب رجوع کر سکیں، اگر اس میں ان کو کوئی حدیث مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ کسی ایسی حدیث کو صحیح نہ تسلیم کریں جو اس میں موجود نہ ہو۔ (۱)

امام صاحب کی احتیاط کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ مسند کے مسودہ میں کانٹ چھانٹ اور حذف و ترمیم کرتے رہتے تھے اور اپنے بے نظیر حافظہ کے باوجود وہ محض اپنی یادداشت سے کوئی حدیث بیان کرنا احتیاط کے خلاف سمجھتے تھے، علی بن مدینی کا بیان ہے کہ ”ہمارے رفقا میں امام احمد سے بڑا کوئی حافظ نہ تھا لیکن وہ کتاب سے حدیثیں بیان کرتے تھے اور ہم کو بھی تاکید کرتے تھے کہ جب حدیثیں بیان کریں تو کتاب کو پیش نظر رکھیں“ ابراہیم بن خالد بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ امام احمد کی مجلسوں میں حدیثیں یاد کرتے اور ان پر بحث و مذاکرہ کرتے لیکن ان کو قلمبند کرنا چاہتے تو وہ جھپٹ کر کتاب لاتے اور فرماتے کہ کتاب بہترین یادداشت ہے۔“

فرط احتیاط کی بنا پر کوئی ایسی حدیث نہیں بیان کرتے جو صرف ایک ہی سند سے مذکور ہوتا آنگہ اس کی نظیر نہ مل جائے، احادیث فضائل وغیرہ میں کچھ نرمی گوارا بھی کر لیتے تھے لیکن احکام و حدود کی روایتوں میں ذرا بھی تسامح گوارا نہیں تھا، فرماتے ہیں ”فضائل

(۱) طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۱۸، معجم المصنفین ج ۲ ص ۳۳۲، ۳۳۵، وکشف الظنون ج ۲ ص ۳۳۱

اعمال اور ان کی ترغیب و جزا وغیرہ سے متعلق اگر کوئی حدیث ہم کو معلوم ہوتی ہے تو اس میں زیادہ شدت سے کام نہیں لیتے لیکن حدود، کفارات اور فرائض وغیرہ سے متعلق روایتوں میں بڑی چھان بین اور پوری سختی اور احتیاط برتتے ہیں۔“ (۱)

مسند کی اہمیت اور کتب حدیث میں اس کا درجہ: گو محدثین کے نزدیک مسانید کا درجہ سنن سے کم تر ہے لیکن مسند احمد کی حیثیت عام مسانید سے مختلف ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو دوسرے درجے کی کتابوں یعنی سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور صحیح النسائی کے لگ بھگ اور تیسرے درجے کی کتابوں سے جس میں عام جوامع و مسانید شامل ہیں، اس کو اہم اور ممتاز قرار دیا ہے“ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ”مسند احمد کی حدیثوں کی نوعیت عام کتب مسانید سے مختلف ہے، ابوالحسن علی بن احمد بیہقی لکھتے ہیں کہ ”وہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح اور بہتر ہے۔“ (۲)

مسند احمد کا شمار ان اہم اور اہمات کتب میں ہوتا ہے جن پر ملت اسلامیہ کا ہمیشہ اعتماد و اعتبار رہا ہے اور جن سے محدثین نے ہر زمانہ میں اخذ و استفادہ کیا ہے، علامہ سبکی فرماتے ہیں ”وہ اس امت کی اساسی اور بنیادی کتابوں میں ہے“ ابو موسیٰ مدینی کا بیان ہے کہ ”مسند ایک اہم اصل اور محدثین کے لیے قابل وثوق مرجع ہے“ مسند کے بارہ میں عام فیصلہ یہ ہے کہ ”کتب صحاح ستہ بشمول مؤطا امام مالک اور مسند احمد اصل دار و مدار اور اعتماد کی چیزیں اور روز روشن کی طرح نمایاں اور مشہور ہیں“

صحت و وجودت کے لحاظ سے بھی مسند کی اہمیت کم نہیں ہے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں ”مسند کے زوائد صحیحین، ترمذی اور ابوداؤد کے زوائد صحیحین کے مقابلہ میں کم ضعیف ہیں، اس کی ہر روایت مقبول اور ضعیف روایتیں بھی حسن سے قریب تر ہیں“ احمد عبدالرحمن

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۲ و تہذیب الاسماء واللغات ج ۱ ص ۱۱۱، الطبقات الکبریٰ شعرائی

ج ۱ ص ۳۶ شذرات الذہب ج ۱ ص ۹۸ (۲) التلخیص فی اصول الحدیث ص ۴۰، حجۃ اللہ بالقرآن ج ۱ ص ۱۰۷،

تذریب الراوی ص ۵۷۔

بناساعاتی نے لکھا ہے کہ ”امام احمد کا قابلِ تعریف کارنامہ اور امت پر زبردست احسان یہ ہے کہ انھوں نے لوگوں کے لیے مسند جیسی مشہور کتاب کی تخریج کی جس کی اہمیت کا ہر زمانہ کے محدثین نے اعتراف کیا اور کہا ہے کہ وہ صحیحین کے بعد تمام کتب احادیث میں سب سے زیادہ صحیح حدیثوں کی جامع ہے۔“ (۱)

خصوصیات: ۱- مسند احمد کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت تو یہی ہے کہ وہ حدیث کی اہم معتبر اور صحیح کتابوں میں ہے۔

۲- مسند سے بڑا اور ضخیم کوئی مجموعہ حدیث نہیں، حافظ ابن کثیر، ابوبکر بیہمی اور علامہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اس سے زیادہ حدیثیں کسی کتاب میں نہیں ہیں۔

۳- احادیث کے دوسرے مجموعوں میں جو روایات متفرق طور پر پائی جاتی ہیں، ان کا اکثر حصہ اس میں موجود ہے، اس لحاظ سے وہ حدیث کی سب سے زیادہ جامع کتاب ہے، ایک مرتبہ ابوالحسن یونینی سے دریافت کیا گیا کہ ان کو صحاح ستہ زبانی یاد ہیں، انھوں نے کہا یاد بھی ہیں اور نہیں بھی، لوگوں نے پوچھا یہ کیسے؟ فرمایا کہ مجھ کو مسند احمد بن ضبل یاد ہے جس میں چند کے علاوہ صحاح کی تمام حدیثوں کی اصل موجود ہے اس اعتبار سے گویا میں ان کا بھی حافظ ہوں، بعض علما کا بیان ہے کہ ”اگر کسی کو تمام کتابوں کی جامع کوئی ایسی کتاب مطلوب ہو جس کا مصنف بھی عظیم و برتر ہو تو اسے مسند احمد کا مطالعہ کرنا چاہیے۔“ (۲)

۴- مسند کا تصنیفی حسن، اخبار و روایات کا تناسب اور بہتر انتخاب بھی اس کی ایک خصوصیت ہے، اہل نظر اور بصرین کا خیال ہے کہ وضع و تالیف کے لحاظ سے وہ بے مثال کتاب ہے، علامہ ابن حجر نے علامہ ابن صلاح کا جواب دیتے ہوئے مسند کی اس خصوصیت کا تذکرہ کیا ہے اور ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حسن بیان و سیاق کے لحاظ سے کوئی کتاب اس کے برابر نہیں۔

(۱) الطبع البانی ص ۸۱۷ (۲) حواشی سہدی ص ۱۵ مقدمہ تحفہ الاحوزی ص ۹۰۔



۵- مسند میں تین سو ثلاثی حدیثیں ہیں۔

۶- عام کتابوں کی جملہ خصوصیات بھی اس میں موجود ہیں۔

زمانہ تصنیف: امام صاحب مسند کی جمع و تدوین میں اسی وقت سے مصروف ہو گئے تھے، جب انھوں نے علم حدیث کی طلب و تکمیل شروع کی تھی اور عمر بھر اس میں مشغول اور حذوف و اضافہ کرتے رہے، صاحب المنہج نے لکھا ہے کہ ۱۸۰ھ میں مسند کی تالیف شروع کر دی تھی اور شمس الدین جزری فرماتے ہیں کہ باقاعدہ تکمیل سے پہلے ہی انتقال فرما گئے تھے۔“ (۱)

تہذیب و تنقیح: مسند کو امام صاحب نے مسودہ کی صورت میں چھوڑا تھا اس لیے آپ کے بعد آپ کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ نے اس میں بعض اضافے کر کے اس کی باقاعدہ تہذیب و تنقیح کی، علامہ شمس الدین جزری کا بیان ہے ”امام احمد نے مسند کو جمع کرنا شروع کیا اور اس کو الگ الگ ورقوں میں لکھ کر جدا جدا اجز میں تقسیم کیا مگر اس کی تکمیل سے پہلے ہی انتقال فرما گئے۔ البتہ آخر عمر میں انھوں نے اپنی اولاد اور گھر والوں کو جمع کر کے اس کو سنایا تھا، آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے نے اس کو مرتب کیا اور مسند کی روایات کے مشابہہ و مماثل مسوعات بھی اس میں شامل کر دیے“ مسند کا موجودہ متداول نسخہ عبداللہ ہی کا مرتب کیا ہوا ہے لیکن اس کی فرو گذاشتوں کی بنا پر بعض لوگوں نے اس کو از سر نو مرتب کیا، اصفہان کے بعض محدثین نے اس کو ابواب پر ترتیب دیا تھا مگر یہ نسخہ معدوم ہے، حافظ ناصر الدین نے بھی ابواب پر مرتب کیا تھا مگر دمشق میں حادثہ تیور کے وقت ان کا نسخہ ضائع ہو گیا، ابو بکر محمد بن عبد اللہ بن محی الدین صامت نے حروف معجم پر مرتب کیا تھا۔ (۲) حال میں مصر کے ایک فاضل احمد عبدالرحمن البنا ساعاتی نے الفتح الربانی کے نام سے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے حاشیہ پر ان ہی کے قلم سے بلوغ الامانی کے نام سے اس کی شرح بھی ہے،

(۱) احمد بن حنبل لابن زہرہ بحوالہ المنہج جز اول (۲) بستان الحدیثین ص ۲۹، و بلوغ الامانی ص ۲۰ و ابن ماجہ

اور علم حدیث ص ۲۱۰ بحوالہ المسند الاحمد۔

اس کی ۵ جلدیں ۱۳۵۵ھ میں شائع ہوئی تھیں اس میں مکررات کو حذف کر دیا گیا ہے، ربوہ سے بھی ابھی حال ہی میں ایک جلد شرح و تعلق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

شروع و حواشی: مسند کے شروع، تعلیقات اور مختصرات کے نام یہ ہیں:

۱- شرح مسند: یہ علامہ ابوالحسن بن عبدالہادی سندی (م ۱۱۳۸ھ) کی ضخیم شرح ہے۔

۲- الدر المنثور: یہ مسند کا مختصر اور شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن (م ۸۰۵ھ) اور شیخ زین الدین عمر بن احمد شام جلسی کی تالیف ہے۔

۳- عقود الزبرجد: یہ تعلق علامہ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے حروف معجم پر مرتب کی ہے۔

۴- غرائب مسند: ابو عمر محمد بن عبدالواحد (م ۳۳۵ھ) کی تالیف ہے۔

مجمع الزوائد و منبع الفوائد: ابوالحسن علی بن ابوبکر بیہقی (م ۸۰۷ھ) نے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے جو ۶ جلدوں پر مشتمل اور امام احمد، بزار، ابویعلیٰ موصلی کے مسانید اور طبرانی کے معاجم ثلاثہ کی ان حدیثوں کا مجموعہ ہے جو صحاح میں شامل نہیں ہیں، اس کے بعض اجزاء کے قلمی نسخے دارالکتب المصریہ میں موجود ہیں، نواب صدیق حسن خاں صاحب نے ایک جز ۱۳۰۸ھ میں ۲۸۸ صفحات میں ایک مقدمہ کے ساتھ دہلی سے شائع کیا تھا۔

۶- جامع المسانید: اس کو علامہ ابن کثیر نے ۸ جلدوں میں مرتب کیا ہے اور اس میں مسند احمد، مسند بزار، مسند ابویعلیٰ، طبرانی کی معجم کبیر اور صحاح کی حدیثیں شامل کی ہیں، اس کے دو قلمی نسخے دارالکتب المصریہ اور کوبرلی وغیرہ میں ہیں۔

۷- جامع المسانید واللقاب بالخص الالسانید: اس میں علامہ ابن جوزی نے صحیحین، ترمذی اور مسند احمد کی حدیثیں ۷ جلدوں میں مسانید پر مرتب کی ہیں۔

۸- اطراف المسند المعتلیٰ باطراف المسند الحنبلی: یہ حافظ ابن حجر کی تالیف اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

۹- جمع الفوائد من جامع الاصول و مجمع الزوائد: صحاح کے علاوہ احمد، دارمی، ابویعلیٰ،

بزار کے مسانید اور طبرانی کے معجم ثلاثیہ کی روایتوں پر مشتمل ہے اور ابو عبد اللہ محمد بن سلیمان مغربی متوفی ۱۰۹۴ھ کی تالیف ہے۔

۱۰- منتهی الاخبار فی الاحکام: شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے کتب صحاح اور مسند احمد کی حدیثوں کا اس میں انتخاب کیا ہے، علامہ شوکانی نے نیل الاوطار کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے۔ (۱)

۱۱- ثلاثیات مسند: محب الدین وضیاء الدین مقدسی نے اس میں مسند کی ثلاثی روایتوں کی تخریج کی ہے، شمس الدین سفاریؒ نے اس کی شرح لکھی ہے، اصل اور شرح پہلی مرتبہ مکتب اسلامی دمشق سے ۱۳۸۰ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

۱۲- فہرست رجال مسند: مولانا نجم الدین اور مولانا نور الحق نے رجال مسند کی ایک مفصل اور جامع فہرست اردو میں مرتب کی ہے جو رسالہ اور نیٹل کالج لاہور میں چھپ چکی ہے۔  
مسند پر بعض اعتراضات: مسند پر اعتراضات بھی کئے گئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- مسند میں کمرات ہیں لیکن درحقیقت یہ کوئی عیب نہیں بلکہ ایک طرح کی خوبی ہے کیونکہ تکرار کا مقصد کثرت اسناد، تعدد طرق، اختلاف متن اور متابعات وغیرہ کو ظاہر کرنا ہے، محدثین ایک ہی حدیث کو ایک صحابی سے متعدد طرق اور مختلف الفاظ کے ساتھ صرف اس لئے روایت کرتے ہیں کہ احادیث کا استقصا و احاطہ بھی ہو جائے اور وہ محفوظ و مدون بھی ہو جائیں اسی لئے صحیحین اور جملہ کتب معتبرہ میں بھی بکثرت کمرات پاتے جاتے ہیں اور مسانید میں صحابہ کے ناموں کی ترتیب پر حدیثیں نقل کئے جانے کی وجہ سے تکرار ناگزیر بھی ہے۔

(۱) کشف القلوب ج دوم صفحات ۳۳۱، ۳۳۲، ۱۲۶، ۱۵۶، ۳۸۵، حصہ اول ص ۳۸۵ و بلوغ الامانی ص ۳۰

دستان الحدیث ص ۲۲، الرسالۃ المسطرہ ص ۱۱۳، ۱۲۹، ۱۳۳، مقدمہ تحفہ الاحوذی ص ۳۰، مفتاح السنۃ ص ۱۱۱

۱۱۳ و معجم المطبوعات ج ۲۲ کالم ۱۹۰۳، فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۲۳۔

۲۔ بعض صحیح روایتیں مسند میں نہیں ہیں، یعنی ایسی متعدد حدیثیں جو صحیحین اور کتب معتبرہ میں پائی جاتی ہیں مسند میں نہیں ہیں، حالانکہ امام صاحب کا دعویٰ ہے کہ اس میں جملہ صحیح احادیث درج ہیں، اگر اس دعویٰ کی نسبت امام صاحب کی جانب صحیح ہے تو غالباً اس زمانہ میں وضع حدیث کے عام فتنہ کے پیش نظر آپ نے ایسا فرمایا ہوگا تاکہ لوگ غلط روایتوں اور وضعی حدیثوں سے محتاط رہیں، دوسرے امام صاحب نے اپنے مقصد اور بھر مسند میں صحت کا پورا اہتمام ملحوظ رکھا تھا، اس لیے ان کے علم و یقین میں ان کا یہ دعویٰ بالکل صحیح تھا لیکن اس سے یہ ضروری نہیں ہے کہ مسند حقیقتاً تمام صحیح حدیثوں کی جامع ہو، تیسرے اکثر صحیح حدیثوں کی اصل فی الواقع اس میں موجود ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ ”امام صاحب کا ارشاد غالب احوال کے لحاظ سے ہے ورنہ صحیحین، سنن اور اجزا وغیرہ میں بہت سی قوی حدیثیں ایسی ہیں جو مسند میں نہیں ہیں، شمس الدین جزری کا بیان ہے کہ اس سے مقصود، حدیثوں کی اصل ہے اور یہ بالکل درست ہے اس لیے کہ غالباً کوئی حدیث ایسی نہیں ملے گی جس کی اصل مسند میں موجود نہ ہو، شاہ عبدالعزیز صاحب ”لکھتے ہیں کہ ”امام صاحب کی مراد ان حدیثوں سے ہے جو شہرت و تواتر کے درجہ تک نہیں پہنچی ہیں ورنہ بہت سی مشہور اور صحیح حدیثیں ان کی مسند میں نہیں ہیں۔ (۱)

۳۔ ضعیف حدیثیں: ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ مسند میں ضعیف روایات بھی ہیں، محققین علما نے اس کو تسلیم کیا ہے اس لیے جو لوگ مطلقاً مسند کی صحت کے مدعی ہیں ان کا خیال درست نہیں، اس کا بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ امام صاحب عمر بھر مسند کے مسودہ میں ترمیم فرماتے رہے، وہ ضعیف و غریب روایتیں متابعت، تعدد طرق اور دوسری روایتوں کی تائید کے لیے نقل کرتے تھے، اس لیے مسند ضعیف روایتوں سے خالی نہیں لیکن اتنے ضخیم مجموعہ میں اگر کچھ ضعیف حدیثیں شامل بھی ہوں تو ان سے اس کی صحت و شہرت

(۱) ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۱۰۹ بحوالہ المصعد الاحمد ص ۲۱، بسنن الحمدین ص ۲۰۔

میں فرق نہیں آتا، مجموعی طور پر وہ ایک مستند اور اہم کتاب ہے، ضعیف و غریب روایتوں سے حدیث کی کون کتاب خالی ہے، ابن تیمیہ جیسے شخص کو یہ تسلیم ہے کہ ”صحیحین کی بعض حدیثوں میں اس قسم کے الفاظ آگئے ہیں جو ضعف سے خالی نہیں۔“ (۱)

۳۔ موضوع حدیثیں: مسند میں بعض موضوع حدیثیں بھی بتائی جاتی ہیں لیکن عام علمائے فن نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے، ابن حجر نے القول المسند میں اور سیوطی نے الذیل المہمد میں ان تمام روایتوں کا جن کو موضوع بتایا جاتا ہے پوری تحقیق سے جائزہ لیا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

”ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ مسند میں موضوع روایتیں بھی ہیں ابوالفضل عراقی نے موضوعات ابن جوزی کے تتبع سے نو حدیثوں کو موضوع بتایا ہے، میں نے جب ابن جوزی کے بیان کا مطالعہ کیا تو موضوعات کی تعداد میں نظر آئی لیکن تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے اکثر حدیثیں صحیح ہیں اور ان کو موضوع قرار دینے کا فیصلہ درست نہیں، البتہ چند روایتوں کے بارے میں اس قسم کا شبہ ضرور ہوتا ہے لیکن غالب اور قوی احتمال ان کے بارے میں بھی مدافعت ہی کا ہے۔“ (۲)

بعض علمائے جن میں ابن تیمیہ بھی شامل ہیں، یہ تفریق کی ہے کہ عبداللہ اور قطیبی کے زوائد میں موضوع روایتیں ضرور ہیں لیکن مسند کا وہ حصہ جو امام صاحب کی طرف منسوب ہے، موضوع حدیثوں سے خالی ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ جمہور علمائے نزدیک مسند احمد بن حنبل میں موضوع حدیثیں نہیں پائی جاتیں۔



(۱) منہاج السنہ ج ۳ ص ۶۳ (۲) تجلید المسند ص ۶۔

# امام محمد بن یحییٰ عدنی

(متوفی ۲۴۳ھ)

نام و نسب: محمد نام، ابو عبد اللہ کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: محمد یحییٰ بن ابو عمر۔  
بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابو عمران کے والد کی کنیت تھی (۱) مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔ (۲)

وطن: ان کے آباء و اجداد کا اصل وطن عدن ہے لیکن انھوں نے مکہ میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی، (۳) علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ان کی پیدائش اور نشوونما بھی یہیں ہوئی تھی، (۴) اسی وجہ سے عدنی اور کی کہلاتے ہیں، خاندان اور سنہ ولادت کا حال نہیں معلوم ہو سکا۔

اساتذہ: انھوں نے جن برگزیدہ و بلند پایہ محدثین سے کسب فیض کیا تھا ان میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:

داؤد بن عجلان، سفیان بن عیینہ، عبد الرحیم بن زید غمی، عبد الرزاق، عبد العزیز در اوردی، عبد العزیز بن عبد الصمد غمی، عبد اللہ بن معاذ صنعانی، عبد الجبید بن ابی رواد، عبد الوہاب ثقفی، فرج بن سعید بن علقمہ ماری، فضیل بن عیاض، محمد بن یحییٰ بن قیس مازنی، مروان بن معاویہ، معن بن عیسیٰ، ولید بن مسلم، ہشام بن سلیمان، یحییٰ بن سلیم طاکھی، یحییٰ بن عیسیٰ السلی، یزید بن ہارون، یعقوب بن جعفر بن ابی کثیر اور اپنے والد یحییٰ بن ابو عمر

(۱) تقریب الجذیب ص ۲۳۷ (۲) تہذیب الجذیب ج ۹ ص ۵۱۸ (۳) ایضاً خلاصۃ تہذیب تہذیب

کمال ص ۳۶۶ (۴) کتاب الانساب ورق ۳۸۶۔

وغیرہ سے۔

سفیان بن عیینہ کے خاص تلامذہ میں تھے، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ و لازم ابن عیینہ، پہلی مرتبہ ۱۸ سال کی عمر میں ان کے درس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ (۱)

تلامذہ: محمد بن یحییٰ عدنی کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مؤلفین صحاح میں امام مسلم، امام ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے بلا واسطہ اور امام نسائی نے بالواسطہ روایتیں کی ہیں، امام بخاری نے بھی ان سے ایک حدیث تعلقاً بیان کی ہے، دوسرے ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں۔

ابوحاتم، ابو ذر عدہ دمشقی، ابو ذر عدہ رازی، احمد بن عمرو خلّال کلبی، اسحاق بن ابراہیم بن اسماعیل نسفی، اسحاق بن احمد بن نافع خزاعی، یحییٰ بن مخلد، زکریا بن یحییٰ سجری، عبداللہ بن صالح بخاری، عبداللہ بن محمد بن شیرویہ، عثمان بن خرزافہ، علی بن عبداللہ عسائری، ابوالولید محمد بن عبداللہ ازرقی، مفضل بن محمد جندی، نعیم ازدی، بارہان بن یوسف شطوی، ہلال بن علاء اور ان کے فرزند عبداللہ بن محمد وغیرہ۔ (۲)

حفظ وثقاہت: حافظہ میں امتیاز کی وجہ سے الحافظ کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، عبدالرحمن بن محمد حاتم اپنے والد کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ صالح الحدیث اور صدوق تھے، امام احمد نے بھی ان کو معتبر قرار دیا ہے، مسلمہ کا بیان ہے کہ لابس بہ یعنی عدنی میں کوئی عیب نہ تھا، امام مسلم نے ان کو صدوق و حجت اور ابن حبان و ابن اثیر نے ان کو ثقہ بتایا ہے۔ (۳)

**فضل و کمال:** ان کے کمال کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اکثر اصحاب صحاح نے ان کی

(۱) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۸، ۵۱۹ و تقریب التہذیب ص ۲۳۷ (۲) ایضاً تذکرۃ الحفاظ ج ۲

ص ۸۴ و کتاب الانساب ورق ۳۸۶ (۳) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰ و خلاصۃ تہذیب

تہذیب الکمال ص ۳۶۳ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۴ و کتاب الانساب ورق ۳۸۶

تذکرۃ الحمد شین ..... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

206

روایتوں کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، امام مسلم نے اپنی صحیح میں ان کے واسطے سے ۲۱۶ حدیثیں ذکر کی ہیں، امام احمد کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب ان سے رواقہ مکہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ مکہ کے لوگوں میں ابن ابی عمر سے روایتیں کرو، علمائے طبقات کا بیان ہے کہ وصار شیخ الحرم فی زمانہ یعنی وہ اپنے زمانہ میں شیخ الحرم تھے۔ (۱)  
عبادات و تقویٰ: علم و فضل کے ساتھ بڑے عابد و زاہد اور نہایت صالح و متدین تھے، اکثر طواف کعبہ میں مشغول رہتے، (۲) تمام مورخین نے ان کے زہد و صلاح کا ذکر کیا ہے۔  
حج: حج بیت اللہ سے ۷۷ مرتبہ مشرف ہونے کی سعادت میسر آئی، ان کا خود بیان ہے کہ  
۷۰ مرتبہ پیدل چل کر میں نے حج کیا تھا۔ (۳)

وفات: عدنی نے بڑی طویل عمر پائی اور ذی الحجہ ۲۴۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ (۴)  
اولاد: علمائے سیر نے ان کے تلامذہ کے تذکرہ میں ان کے ایک فرزند عبد اللہ کا ذکر کیا ہے، اسی لیے ان کی کنیت ابو عبد اللہ ہے

تصنیفات: عدنی کی تصنیفات میں صرف مسند کا پتہ چلتا ہے، اس کے راوی ان کے مشہور شاگرد اسحاق بن احمد بن نافع خزاعی تھے، اس مسند کو ایک زمانہ میں بڑی شہرت تھی اور وہ اصہبان وغیرہ میں متداول رہ چکی ہے۔ (۵)

☆☆☆

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۴ و تہذیب ج ۹ ص ۵۱۹ و ۵۲۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۴ (۳) ایضاً و تہذیب ج ۹ ص ۵۱۹، (۴) ایضاً و خلاصۃ تہذیب ص ۳۶۴ (۵) تہذیب المعجزات ج ۶ ص ۵۱۹ و کتاب الانساب ورق ۳۸۶۔



## امام عبد بن حمید

(متوفی ۲۴۹ھ)

نام و نسب: عبد الحمید نام، ابو محمد کنیت، ایک ضعیف روایت یہ بھی ہے کہ عبد الحمید نام تھا۔  
نسب نامہ یہ ہے: عبد الحمید بن حمید بن نصر، عام طور سے وہ عبد الحمید کے بجائے صرف عبد  
بن حمید کہے جاتے تھے۔ (۱)

وطن: وطن گمش یا کس ہے اور اسی کی نسبت سے وہ کشی یا کسی مشہور ہیں، کش جرجان کے  
قریب اس سے ۹ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کا نام ہے، محمد بن طاہر مقدسی نے لکھا ہے کہ  
کس گمش کی تعریف ہے لیکن ابن ماکولا کا بیان ہے کہ کش غلط ہے، جب میں بخاری اور  
سمرقند گیا تو وہاں کے لوگ اس کو کس کہتے تھے، یہ سمرقند کے قریب ایک شہر کا نام ہے، عبد بن  
حمید اسی کی جانب منسوب ہیں، بعض لوگوں نے کش کو اصہبان کا گاؤں بتایا ہے۔ (۲)

اساتذہ: عبد بن حمید کے اساتذہ اور شیوخ میں بلند پایہ محدثین اور مقدس بزرگ شامل  
ہیں، اس کا اندازہ اس فہرست سے ہوگا۔

احمد بن اسحاق حضرمی، جعفر بن عون، حسن اشیب، حسین بن علی عثمی، روح بن  
عبادہ، سعید بن عامر، عارم، عبد الرزاق، عبد الصمد بن عبد الوارث، عبد اللہ بن بکر سہمی،  
عبید اللہ بن موسیٰ، علی بن عاصم، عمر بن یونس یماوی، محمد بن بشر عبدی، محمد بن بکر برسانی، مسلم  
بن ابراہیم، مصعب بن مقدم یحییٰ بن آدم، یزید بن ہارون، یعقوب بن ابراہیم، یعلیٰ بن

(۱) تہذیب المعجزین ج ۶ ص ۳۵۵ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۴۱ و بستان الحدیثین ص ۳۲ (۲) تہذیب

بلدان ج ۷ ص ۲۵۳ و کتاب الانساب مقدس ص ۱۲۹۔

عبید، یونس بن محمد مؤدب، ابن ابی فدیک، ابواسامہ، ابوداؤد حضرمی، ابوداؤد طیالسی، ابو عامر عقدی، ابو عاصم، ابوالنضر، ابوالنعیم، ابوالولید طیالسی وغیرہ۔ (۱)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی وسیع ہے، ان میں سے اکثر کا شمار اجلہ محدثین اور ائمہ فن میں ہے، بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں: ابراہیم بن خریم شامی، بکر بن مرزبان، سلیمان بن اسرائیل جندی، سہل بن شاذویہ، شاہ بن جعفر، ابو معاذ عباس بن ادریس ملقب بخرک، عمر بن بکیر، عمر بن محمد اور آپ کے صاحبزادے محمد بن عبد وغیرہ۔

صحاح ستہ کے مصنفین میں امام مسلم اور امام ترمذی نے اپنی اپنی کتابوں میں ان سے روایتیں لی ہیں اور امام بخاری نے دلائل النبوة میں بطریق تعلیق ان کی روایت نقل کی ہے۔ (۲)

طلب حدیث کی ابتدا اور سفر: آغاز شباب کے بعد ان کو تحصیل علم کا خیال اور حدیث کی طلب و جستجو کا شوق پیدا ہوا اور اس کے لیے مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا، گو اس کی تصریح نہیں ملتی کہ کن کن شہروں اور ملکوں میں گئے لیکن ان کے اساتذہ مختلف ملکوں اور شہروں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کا سفر کیا ہوگا۔

فضل و کمال: عبد بن حمید نامور محدثین میں تھے، ان کی عظمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ ائمہ صحاح تک نے ان سے اپنی کتابوں میں روایتیں نقل کی ہیں، اصحاب طبقات و تراجم کا بیان ہے کہ وہ فن حدیث کے امام تھے۔ (۳)

حفظ و ثقاہت: ان کے حفظ و ضبط اور ثقاہت پر علماء کا اتفاق ہے، علامہ ذہبی نے ان کو اَحْفَظ اور ائمہ ثقات میں بتایا ہے، ابن حبان فرماتے ہیں کہ وہ ان علمائے ثقات میں تھے جنہوں نے جمع و تصنیف کا کام کیا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور حافظ تھے، ابن عماد حنبلی کا بیان ہے

(۱) تجزیب العجذیب ج ۶ ص ۴۵۵، ۴۵۶ (۲) ایضاً ص ۴۵۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۵ و بیسان

أحمد شین ص ۳۲ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۵ و بیسان الحدیث ص ۳۲۔

کہ وہ ثقہ و ثابت تھے، (۱) شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ”خیلی ثقہ و معتبر“۔

وفات: مشہور اور صحیح روایت کے مطابق ۲۴۹ھ میں اپنے وطن کش میں انتقال کیا، شاہ عبدالعزیز صاحب نے ۲۴۳ھ سنہ وفات تحریر کیا ہے، بعض لوگوں کا بیان ہے کہ دمشق میں وفات پائی لیکن عام محققین کے نزدیک ان کا دمشق میں جانا ہی ثابت نہیں ہے۔

تصنیفات: عبد بن حمید کی متعدد تصنیفات ہیں مگر صرف دو کتابوں کا علمائے سیر و طبقات نے ذکر کیا ہے۔

تفسیر: ابن کثیر کے بیان صاحب التفسیر الحافل سے اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ”یاعرب میں یہ تفسیر مشہور و متداول تھی“ اس کے راوی ابن خرمیم ہیں، حافظ ابن حجر کی نظر سے اس کا ایک جز گذرا تھا۔ (۲)

مسند: ان کی دوسری اہم کتاب مسند ہے، مسند میں ان کی دو کتابیں کبیر و صغیر تھیں، مسند صغیر دراصل کبیر کا انتخاب اور ایک جلد پر مشتمل ہے، اس میں بعض مشاہیر صحابہ کی حدیثیں درج نہیں ہیں، عبد بن حمید کے شاگرد ابراہیم بن خرمیم نے اس کی ان سے روایت کی ہے، اس کی ابتدا مسند ابی بکر سے ہوتی ہے، (۳) یہ مسند ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے لیکن اس کے مخطوطے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، جرمنی کے مکتبہ جامع قرطبہ، ایاصوفیہ، کوپرویلو وغیرہ کے علاوہ ہندوستان کے مکتبہ سندھیا، اینٹل پبلک لائبریری بانگی پور اور دارۃ المعارف العثمانیہ میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ (۴)

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۵۶ و تقریب التہذیب ص ۱۳۴ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۴ و بستان الحدیثین ص ۳۴ و تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۵۶ (۳) بستان الحدیثین ص ۳۲ و الرسالة المستطرفة ص ۵۷ و تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۵۶ (۴) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۲۵، فوائد جامعہ برجالہ نافذہ ص ۷۵، تذکرۃ النوادر ص ۳۷، ۳۸ و مفتاح الکوز الخفیہ ج ۱ ص ۲۱۔

# امام اسحاق بن بہلول

(متوفی ۲۵۲ھ)

نام و نسب: اسحاق نام، ابو یعقوب کنیت، نسب نامہ یہ ہے: اسحاق بن بہلول بن حسان بن سنان۔ (۱)

وطن، ولادت اور خاندان: ان کا وطن قدیم اور مشہور شہر انبار ہے جو دریائے فرات کے کنارے بغداد سے ۱۰ فرسنگ کے فاصلہ پر واقع ہے، یہیں وہ ۱۶۳ھ میں پیدا ہوئے، ان کا خاندانی تعلق قبیلہ تنوخ سے ہے، اسی نسبت سے تنوخی اور انباری مشہور ہوئے۔ (۲)

اساتذہ: اسحاق کو جن نامور محدثین سے شرف تلمذ حاصل ہے ان کے نام یہ ہیں:

ابن ابی فدیك، ابواسامہ، ابو بکر کراوی، ابوداؤد حفری، ابو عاصم نمیل، ابو عامر عقدی، ابو عبدالرحمن مقری، ابو معاویہ ضریر، ابو نعیم، ابو یحییٰ حمانی، اسحاق بن یوسف ازرق، اسماعیل بن علیہ، ابوضرہ انس بن عیاض، جعفر بن عون، حسین جعفی، سعید بن سالم قداح، سفیان بن عیینہ، شعیب بن حرب، عبدالرحمن بن مہدی، عبداللہ بن داؤد ذریبی، عبداللہ بن نمیر، عفان بن مسلم، علی بن عاصم، ابوظن عمر بن ہشیم، عبید اللہ بن موسیٰ، غندر، قبیصہ بن عقبہ، محمد بن عبید، محمد بن قاسم ازدی، معاویہ بن ہشام، کعب بن جراح، وہب بن جریر، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، یحییٰ بن آدم، یحییٰ بن سعید قطان، یعلیٰ بن عبید اور ان کے والد بہلول وغیرہ۔ (۳)

تلامذہ: مشہور تلامذہ حسب ذیل ہیں:

ابراہیم حربی، ابو بکر بن ابی الدنیا، قاضی ابو عبداللہ محاطی، عبداللہ بن محمد بن ناجیہ، قاسم بن زکریا مطرز، محمد بن عبدالرحیم صاعقہ، محمد بن موسیٰ نہر تیری، یحییٰ بن صاعد اور دونوں

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶ (۲) ایضاً ص ۳۶۹ (۳) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶۔

صاحبزادے احمد، بہلول اور پوتے یوسف بن یعقوب، جعفر فریابی وغیرہ۔ (۱)  
رحلت و سفر: انھوں نے علم کی جستجو اور حدیث کی طلب و تکمیل کے لئے بغداد، کوفہ، بصرہ،  
مدینہ اور مکہ کا سفر کیا۔ (۲)

حفظ و ضبط: حفظ و ضبط اور صدق و ثقاہت میں بڑے ممتاز تھے اسی لئے علمائے فن نے ان کو  
الحافظ کہا ہے، ابن صاعد کا بیان ہے کہ تقریباً ۵۰ ہزار حدیثیں انھوں نے زبانی بیان کیں مگر  
کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی، خطیب اور حافظ ذہبی لکھتے ہیں وکان ثقہ (یعنی وہ ثقہ و معتبر تھے)  
عبدالرحمن نے اپنے والد ابو حاتم سے ان کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا وہ  
صدقہ تھے۔ (۳)

نقد و تمیز: حفظ و ثقاہت کی طرح ان کو صحیح و غلط روایات میں امتیاز کا بھی ملکہ تھا، ذہبی نے ان  
کو الناقذ لکھا ہے۔ (۴)

فقہ: فقہ میں بھی ممتاز تھے اور اس میں کتابیں بھی لکھی ہیں، اس کی تحصیل و تکمیل حسن بن زیاد  
لولؤئی اور امام ابو یوسف کے ممتاز ترین شاگرد ہشیم بن موسیٰ سے کی تھی مگر وہ فقہائے مقلدین  
میں نہ تھے بلکہ مجتہد تھے اور بعض مسائل میں عام فقہاء سے منفرد رائے رکھتے تھے، خطیب  
کا بیان ہے:

وله مذاہب اختارها ينفرد  
بعض مسائل میں ان کے مختارات  
وتفردات پائے جاتے ہیں۔

بہا۔ (۵)

قرأت: قرأت کے فن سے بھی دلچسپی تھی اور اس میں بھی انھوں نے کتاب لکھی تھی۔

لغت، نحو و عربیت: حدیث و فقہ کے علاوہ ان کو لغت، نحو اور شعر و ادب میں بھی دستگاہ

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶، ۳۶۷، و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۰ (۲) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶

(۳) ایضاً ص ۳۶۸، و البحر ج ۲ ص ۳ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۰ و تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶ (۵)

تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶، ۳۶۷۔

حاصل تھی۔ (۱)

امامت: ان علوم میں کمال کی بنا پر ان کا شمار ائمہ فن میں ہوتا تھا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں وکان من كبار الأئمة (یعنی وہ اکابر ائمہ (۲) میں تھے)

اخلاق و عادات: بڑے فیاض و سیر چشم تھے، ان کی آمدنی وافر تھی مگر خود بقدر کفاف پر زندگی بسر کرتے تھے اور آمدنی کا بڑا حصہ غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ (۳)  
وفات: اسحاق نے طویل عمر پائی ۸۸ سال کی عمر میں اپنے وطن انبار میں ماہ ذوالحجہ ۲۵۲ھ میں انتقال کیا، امیر انبار یحییٰ بن قیس شیبانی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ (۴)

اولاد: علمائے سیر نے ان کے تین صاحبزادوں احمد، بہلول یعقوب اور ایک پوتے یوسف بن یعقوب کا ذکر کیا ہے۔

آمدنی: ان کی زندگی اطمینان و فراغت سے بسر ہوتی تھی، ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ متوکل نے میرے والد کو طلب کر کے ان سے سماع کیا اور اتنی زمین عطا کی جس کی پیداوار سے ۱۲ ہزار سالانہ آمدنی ہوتی تھی، اس کے علاوہ پانچ ہزار درہم سالانہ مزید دفتر شاہی سے ملتا تھا۔ (۵)

تصنیفات: وہ کثیر التصانیف تھے، فقہ، حدیث اور قرأت کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی ان کی تصنیفات تھیں، خطیب کا بیان ہے ہنف فی غیر ذلک من انواع العلم لیکن وہ سب معدوم ہیں، جن کتابوں کا ذکر ملتا ہے وہ یہ ہیں:

۱- قرأت میں ایک کتاب کا تذکرہ کیا جاتا ہے لیکن اس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

۲- فقہ میں ان کی کتاب کا نام المتضاد تھا۔

۳- حدیث میں ایک ضخیم مسند لکھی تھی۔ (۶)

(۲-۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶، ۳۶۷ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۰ والعمیر ج ۲ ص ۳ (۴) تاریخ

بغداد ج ۶ ص ۳۶۵ (۵) ایضاً تذکرہ ج ۲ ص ۱۰۰ (۶) ایضاً۔

## امام ابو محمد عبداللہ دارمی

(متوفی ۲۵۵ھ)

نام و نسب: عبداللہ نام، ابو محمد کنیت، سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن عبدالرحمن بن فضل بن بہرام بن عبدالصمد خزر جی نے بہرام کے بجائے مہران لکھا ہے۔ (۱)

ولادت، خاندان، وطن: ۱۸۱ھ میں خراسان کے مشہور شہر سمرقند میں پیدا ہوئے، قبیلہ تمیم کی ایک شاخ دارم سے نسبی تعلق تھا، اس کی نسبت سے سمرقندی، تمیمی اور دارمی کہلائے، آخری نسبت سے جو دارم بن مالک کی جانب زیادہ مشہور ہوئے۔ (۲)

اساتذہ: امام دارمی کو جن نامور علماء و مشائخ سے استفادہ کا موقع میسر آیا ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

احمد بن اسحاق حضرمی، اسود بن عامر شاذان، اشہل بن حاتم، ابوصالح کاتب، لیث بن سعد ابوبکر حنفی، ابوالغیرہ حمصی، ابو عاصم، ابو نعیم، جعفر بن عون، حبان بن ہلال، ابوالیمان حکم بن نافع بہرانی، حیوۃ بن شریح، زکریا بن عدی، سعید بن عامر ضعی، عبدالصمد بن عبدالوارث، عبداللہ بن موسیٰ، ابویعلیٰ عبید اللہ بن عبد الجبید حنفی، عثمان بن عمر بن فارس، محمد بن مبارک صوری، محمد بن یوسف فریابی، مروان بن محمد، نصر بن شمیم، وہب بن جریر، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، یحییٰ بن حسان تیمسی، یزید بن ہارون اور یعلیٰ بن عبید وغیرہ۔ (۳)

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں بڑے نامور محدثین اور ائمہ فن شامل ہیں، ابن ماجہ کے علاوہ

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ و تہذیب ج ۵ ص ۲۹۴ و خلاصہ تہذیب ص ۲۰۴ (۲) ایضاً و کتاب الانساب

ورق ۲۱۸ (۳) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ و کتاب الانساب ورق ۲۱۸ و تہذیب ج ۵ ص ۲۹۴۔

دوسرے تمام ائمہ صحاح کو ان سے تلمذ کا فخر حاصل ہے، امام مسلم، ابو داؤد اور ترمذی نے اپنی کتابوں میں ان کے مرویات درج کئے ہیں، مشہور محدثین اور علمائے نقد و جرح میں محمد بن یحییٰ ذہلی، ابو زرہ، ابو حاتم اور امام احمد کے فرزند عبداللہ نے بھی ان سے روایت کی ہے، بعض اور ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

قی بن مخلد، بندار بن بشار، جعفر بن محمد فریابی، حسن بن صباح بزار، حفص بن احمد بن فارس رجا، بن مرجمی، صالح بن محمد جزرہ، عبداللہ بن واصل بخاری، عمر بن بکیر، عمر بن محمد بکیری، یحییٰ بن عمر سمرقندی، محمد بن عبدوس بن کامل، سراج اور مطین وغیرہ۔ (۱)

طلب حدیث کے لئے سفر: امام دارمی نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق حدیث کی طلب و تکمیل کے لئے شام، بغداد، مصر، عراق، خراسان اور مکہ و مدینہ کا سفر کیا، خطیب اور دوسرے مورخین نے ان کے سفر و رحلت کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھے جو حدیث کے لئے بہت زیادہ سفر کیا کرتے تھے، بعض علمائے رجال نے لکھا ہے کہ رحل و طوف یعنی طلب حدیث کے لئے سفر کیا اور ملکوں کی خاک چھانی، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں ”صاحب رحلت و اسفارست، اکثر بلاد اسلام را گشتہ و علم حدیث را از بلدان بعیدہ جمع کردہ۔“ (۲)

حفظ و ضبط: قدرت نے ان کو حفظ و ضبط کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا، ائمہ فن کے اعترافات ملاحظہ ہوں:

عبداللہ بن نمیر جیسے بلند پایہ محدث کا بیان ہے کہ ”دارمی حافظ کے لحاظ سے ہم پر فوقیت رکھتے تھے رجا، بن جابر مرجمی کا بیان ہے کہ میں نے احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی اور شاذ کوفی وغیرہ ائمہ حدیث میں سے کسی کو عبداللہ سے بڑا حافظ نہیں پایا،

(۱) تہذیب الحدیث ج ۵ ص ۲۹۵ (۲) العمر ج ۲ ص ۸ و مرآة البیان ج ۲ ص ۱۶۱، شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۳۰، بستان الحدیث۔



امام احمد سے ان کے فرزند عبد اللہ نے حفاظ حدیث کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے چند نوجوانانِ خراسان کا جن میں داری کا نام بھی تھا، ذکر کیا، عبد اللہ اپنے والد سے یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ ”حفظ جن چار آدمیوں پر تمام ہو گیا، ان میں ایک یہ بھی تھے“ عثمان بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ ”ان کے ضبط کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ فائق تھے“ محمد بن ابراہیم شیرازی کا بیان ہے کہ ”داری کا حافظ ضرب المثل ہے“ ابو عبد اللہ حکم فرماتے ہیں کہ ”وہ مشہور و برگزیدہ حفاظ حدیث میں تھے“ ابن حبان لکھتے ہیں کہ ”وہ ان لوگوں میں تھے جنہوں نے حدیثیں حفظ و جمع کیں“ امام نووی تحریر فرماتے ہیں کہ ”داری اپنے زمانہ کے ان مشہور حفاظ میں تھے جن کے بہت کم لوگ فضل و کمال اور حفظ و ضبط میں مسمیٰ تھے، خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ ”وہ ان علمائے اسلام اور حفاظ حدیث میں سے ایک ہیں جو احادیث کے حفظ و جمع کے لئے مشہور ہیں“ بندر فرماتے ہیں، حفاظ دنیا چار ہیں ان میں سمرقند کے امام داری بھی شامل ہیں۔ (۱)

ثقافت: ان کی ثقافت و عدالت کے بھی علمائے فن اور ارباب کمال معترف ہیں، ابو حاتم رازی کا بیان کہ ”وہ سب سے زیادہ ثقہ و ثابت تھے“ امام احمد کو ماورائے ثقافت اور خطیب صاحب صدق و ثقافت بتاتے ہیں، ابن حبان نے ان کو حفاظ متقنین میں اور ابو حاتم نے ثقہ و صدوق لوگوں میں شامل کیا ہے۔ (۲)

معرفت و روایت: وہ احادیث کی معرفت و تمیز کے لئے مشہور تھے روایت کی طرح درایت میں بھی ان کا مقام نہایت بلند تھا، رجا بن جابر مر جی فرماتے ہیں کہ ”میں نے ان سے بڑا کسی کو حدیث سے واقفیت رکھنے والا نہیں دیکھا، احمد بن یسار کہتے ہیں کہ حدیث میں ان کی

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ و تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵، ۲۹۶ و تدریب

الراوی ص ۲۴۲، ۲۴۳ و مقدمہ مسند داری ص ۷ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۰ و تہذیب التہذیب ج ۵

واقفیت غیر معمولی اور نظر بڑی وسیع اور گہری تھی، عثمان بن ابی شیبہ ان کے حافظہ کی طرح ان کی معرفت و بصیرت کے بھی معترف تھے، ابو منصور شیرانی کا بیان ہے کہ ان کی درایت ضرب المثل تھی، علم حدیث میں ان کی واقفیت اور تمیز کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے امام احمد کے سامنے ابن المنذر کی تعریف کی تو انھوں نے فرمایا کہ مجھ کو ان سے کوئی واقفیت نہیں مگر حیرت ہے کہ تم لوگوں کو عبد اللہ بن عبد الرحمن کا علم نہیں، پھر تین مرتبہ تاکید کے ساتھ فرمایا کہ (علیک بسذاک السید) یعنی تم کو اس سردار کے حلقہ فیض سے وابستہ رہنا ضروری اور لازم ہے، ایک اور شخص نے امام احمد سے حمانی کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے ارشاد فرمایا کہ داری کے قول کی بنا پر ہم ان کو متروک الحدیث سمجھتے ہیں، عبد اللہ بن مبارک مخزومی کا بیان ہے کہ ”اے اہل خراسان جب تک یہ تمہارے درمیان موجود ہیں تم کو کسی اور سے اشتغال رکھنے کی ضرورت نہیں۔“ (۱)

**فقہ و تفسیر:** امام داری کو دوسرے اسلامی علوم و فنون میں بھی دستگاہ حاصل تھی، فقہ و تفسیر سے ان کی مناسبت اور تعلق کا اکثر علمائے رجال نے ذکر کیا ہے، حافظ ابن حجر ان کو باکمال مفسر اور صاحب علم فقیہ قرار دیتے ہیں، (۲) ان فنون میں انھوں نے کتابیں بھی لکھی تھیں اور فقہ میں ان کے مجتہدانہ کمالات کا ثبوت ان کی سنن سے بھی ملتا ہے۔

**عقل و دانش:** اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت و دانائی اور عقل و فراست سے بھی خاص طور پر بہرور کیا تھا خطیب اور دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ وہ کان علی غایۃ العقل و نہایۃ الفضل یعنی وہ نہایت عاقل و فاضل شخص تھے، بعض علمائے رجال لکھتے ہیں کہ ”وہ اپنی متانت اور دانشمندی کے لیے مشہور تھے۔“ (۳)

**عبادت و تقویٰ:** امام داری علم و عمل دونوں کے جامع تھے اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے بھی

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۱، ۳۲، تہذیب المعجم ج ۵ ص ۲۹۵ (۲) تہذیب المعجم ج ۵ ص ۲۹۵

(۳) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶۔

تذکرۃ المحمدین..... گلستان حدیث کے مہکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

217

ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا، ان کو عبادت و اطاعت الہی میں بڑا انہماک تھا، عبداللہ بن نمیر فرماتے ہیں کہ ”وہ ورع و تقویٰ کے اعتبار سے ہم سب پر فوقیت رکھتے تھے“ خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ ”وہ زہد و اتقا سے متصف تھے“ ابو منصور شیرازی کا بیان ہے کہ ”ان کی ذات زہد و تقویٰ اور دیانت و عبادت کے لئے ضرب المثل تھی“ عثمان بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے ان کی عصمت اور پاکیزگی نفس کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس سے زیادہ عظیم اور برتر تھے“ (۱)

جاہ و منصب اور دنیا طلبی سے پرہیز: دنیاوی عیش و تنعم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے، قناعت اور سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے، امام احمد فرماتے ہیں کہ ”میرے سامنے کفر پیش کیا گیا میں نے اس کو ٹھکرا دیا، داری کے سامنے دنیا پیش کی گئی اور وہ اس کی جانب مائل اور متوجہ نہ ہوئے“ دنیاوی جاہ منصب سے بے نیازی کا یہ حال تھا کہ ان کو سمرقند کا محکمہ قضا پیش کیا گیا تو قبول کرنے سے انکار کر دیا، پھر سلطان کے اصرار پر چند دنوں کے لئے قبول کر لیا مگر بہت جلد اس سے سبکدوش ہو گئے۔ (۲)

سنت و حدیث کی مدافعت: انھوں نے حدیث کی خدمت و اشاعت اور اس کی حمایت و مدافعت بھی کی اور مخالفین حدیث کا مقابلہ کر کے ان کا زور توڑ دیا، احادیث کے متعلق شکوک و اعتراضات کا جواب اور کذب و دروغ کی آمیزشوں سے ان کو پاک کر کے عوام و خواص سب کے دلوں میں ان کی اہمیت و عظمت اور رسول کی محبت بٹھادی، اس طرح مختلف حیثیتوں سے انھوں نے علم حدیث و آثار کو فروغ بخشا، علمائے رجال لکھتے ہیں ”اپنے وطن سمرقند میں حدیث و سنت کا بول بالا کر کے لوگوں کو اس کی جانب مائل اور مخالفین حدیث کا قلع قمع کر دیا“ (۳)

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ و تہذیب المعجز ج ۵ ص ۲۹۵ (۲) تاریخ

بغداد ج ۱۰ ص ۳۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ (۳) خلاصۃ تہذیب المعجز ج ۵ ص ۲۰۳۔

ریذکرۃ الحمد شین ..... لگستان حدیث کے بہکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

218

فقہی مذہب و مسلک: کتابوں میں ان کے فقہی مذہب کی تصریح موجود نہیں ہے لیکن قیاس اور ان کی سنن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام محدثین کی طرح وہ کسی ایک امام کے مسلک سے وابستہ نہ تھے بلکہ اپنے اجتہاد و تفقہ کے مطابق حدیث و قرآن کی پیروی کرتے تھے۔

**فضل و امامت:** ان گونا گوں کمالات نے ان کی ذات کو مرجع خلافت بنا دیا تھا اور وہ ائمہ مسلمین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ معاصرین نے ان کی اس حیثیت کو تسلیم کیا ہے، امام احمد ان کو امام و سید کے لقب سے موسوم کرتے تھے، ابوسعید اشج کا بیان ہے کہ ”وہ ہمارے امام ہیں“ ابو حاتم فرماتے ہیں کہ ”دارمی اپنے زمانہ کے ائمہ میں تھے“ ابو حامد بن شریح کا خیال ہے کہ ”خراسان میں ۱۱۵ ائمہ حدیث پیدا ہوئے، ان میں ایک یہ بھی تھے۔“ (۱)

**وفات:** مشہور روایت کے مطابق تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں اپنے وطن سمرقند میں انھوں نے ۸ رزی الحجہ ۲۵۵ھ پنجشنبہ کے دن بعد نماز عصر انتقال کیا اور عرفہ کے دن جمعہ کو تجہیز و تکفین ہوئی لیکن بعض مورخین کا بیان ہے کہ انتقال عرفہ کے دن اور تجہیز و تکفین نحر کے دن انجام پائی، امام بخاری کو جب وفات کی خبر ہوئی تو فرط غم سے سر جھکا کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور یہ شعر پڑھا:

ان تبق تفجع بالاحبة کلهم      وفناء نفسک لابلک افجع

اگر تو زندہ ہوتا تو احباب کی مفارقت کے صدمے برداشت کرتا، تیرا

صفحہ ہستی سے معدوم ہونا سب سے زیادہ دردناک سانحہ ہے۔

(۱) خلاصہ تہذیب تہذیب الکمال ص ۲۰۲ و تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ و تہذیب

## تصنیفات

امام داری کی جانب حسب ذیل تصنیفات منسوب ہیں:

۱- کتاب التفسیر

۲- الجامع یا کتاب الجامع: خیر الدین زرکلی نے اس کا نام الجامع الصحیح لکھا ہے

اور اس کو مطبوعہ بتایا ہے، (۱) غالب گمان ہے کہ یہ فقہ و احکام کی کتاب ہے۔

مولانا سید ابوالوزیر احمد حسن صاحب نے حاشیہ مشکوٰۃ میں امام داری کی رد جمہیت

میں بھی کچھ کتابیں بتائی ہیں (۲) لیکن ان کے نام نہیں تحریر کیے ہیں“

اسی طرح علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ ”علمائے سیر نے ان کی تصنیفات میں جامع،

مسند تفسیر اور ان کے علاوہ کتابوں کا ذکر کیا ہے مگر غالباً موجود صرف دو کتابیں ہیں۔ (۳)

۳- سنن داری: یہ ان کی سب سے مشہور اور اہم کتاب ہے، صحاح ستہ کے بعد

حدیث کی جو کتابیں زیادہ اہم اور مستند سمجھی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے، شاہ عبدالحق

صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں ”کتاب اواز احسن کتب حدیث است“ (۴) اس کی

اہمیت کی بنا پر محدثین اور علمائے فن نے اس کی حدیثوں کو قابل احتجاج اور لائق استدلال

خیال کیا ہے، مشکوٰۃ میں جو منتخب کتابوں کی حدیثوں کا منتخب مجموعہ ہے، صحاح اور دوسری معتبر

کتابوں کی طرح اس کی احادیث بھی شامل ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے،

اس کی صحت و اسناد کی بنا پر اس کو صحاح ستہ میں بھی شامل کیا گیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔

کتب و ابواب کی تعداد: سنن داری ۳۵ فصول (کتب) اور ایک ہزار چار سو آٹھ ابواب

(۱) اعلام ج ۲ ص ۵۶۳۔ (۲) حاشیہ تنقیح الرواۃ دیباچہ مشکوٰۃ ص ۶ (۳) تدریب الراوی ص ۵۷ (۴)

اکمال شرح مشکوٰۃ ص ۱۲۔

پر مشتمل ہے۔

ترتیب: عام کتب حدیث و سنن کے برعکس اس کی ابتدا ”باب ماکان علیہ الناس قبل مبعث النبى صلی اللہ علیہ وسلم من الجهل والضلالة“ سے ہوتی ہے، اس فصل کے مختلف ابواب میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اوصاف و خصوصیات کو جو کتب قدیمہ میں مذکور ہیں اور آپ کے معجزات، فضائل و محامد، اتباع سنت اور علم کی اہمیت وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد عام کتب سنن کی طرح طہارت اور نماز وغیرہ کے جملہ ابواب اور آخر میں وصایا اور فضائل قرآن کے ابواب ہیں۔

خصوصیات: ۱- اس میں ۱۵ اثلاثی حدیثیں ہیں یہ تعداد بظاہر تو کم معلوم ہوتی ہے لیکن سنن کی کیفیت اور دوسری کتابوں کے لحاظ سے کم نہیں ہے، اسی لیے بعض علمائے فن کا بیان ہے کہ ”اس کی ثلاثیات بخاری کی ثلاثیات سے زیادہ ہیں اور رباعیات بکثرت ہیں۔ (۱)“

۲- اس کی ایک اہم خصوصیت صحت کا التزام اور علوئے اسناد بھی ہے، علمائے رجال کا بیان ہے ولہ اسانید عالیۃ یعنی داری کی سندیں نہایت عالی اور بلند پایہ ہیں۔ (۲) علمائے جرح و تعدیل نے تصریح کی ہے کہ اس کے اکثر رجال ثقہ اور بیشتر حدیثیں صحیح و ثابت ہیں، علامہ ابن حجر نے اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کو سنن ابن ماجہ سے بھی زیادہ اہم اور فائق بتایا ہے۔ (۳)

۳- یہ اگرچہ حدیث کی کتاب ہے لیکن اس میں فقہی مسائل و مباحث اور ان کے متعلق فقہاء کے اختلافات و دلائل بھی بیان کیے گئے ہیں اور مختلف اقوال میں تطبیق و توجیہ یا مرجح و مختار مسلک کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

۴- احادیث کی طرح صحابہ و تابعین کے آثار و فتاویٰ بھی نقل کیے گئے ہیں، بلکہ

(۱) الرسالہ المسطر ذمہ ۲۹ و مقدمہ منکلوۃ ص ۱۵ و مقدمہ داری ص ۷ (۲) الرسالہ المسطر ذمہ ۲۹ (۳)

بعض بعض ابواب میں صرف صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار ہی مذکور ہیں۔

۵- عام خصوصیات اور جملہ فنی خوبیوں سے بھی یہ کتاب آراستہ ہے، مثلاً روایات کے مفہوم و منشا کی وضاحت، ابہام کی تشریح، دقیق الفاظ اور مشکل لغات کا حل، رواۃ کے ناموں کی مختلف حیثیتوں سے وضاحت، بلاد و اماکن کی تحقیق، تعدد طرق و اسناد و روایات اور ان کے الفاظ کا فرق و اختلاف اور متابعات وغیرہ کی تفصیل مسند، مرفوع اور منقطع و موقوف کی توضیح، خطا، شک، تردد اور اشتباہ کی تصریح، روایات اور رواۃ کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں، اساتذہ کی وضاحت و تشریح، راوی کے سماع و عدم سماع اور لقا و عدم لقا کا ذکر، احادیث کی تصویب، ان کے درمیان ترجیح و اسباب ترجیح اور ان کے نسخ و عدم نسخ وغیرہ کی تفصیل موجود ہے۔

سنن یا مسند داری: اس کتاب کو سنن اور مسند دونوں کہا جاتا ہے، اس لیے اس کی مختصر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

مسند میں صحابہ کے ناموں کی ترتیب پر حدیثیں درج ہوتی ہیں اور سنن کی ترتیب فقہی ابواب پر ہوتی ہے، ایمانیات اور کتاب الطہارۃ سے لے کر وصایا تک کی حدیثیں ابواب کے ماتحت نقل کی جاتی ہیں، اس تعریف کی رو سے داری کا شمار سنن ہی میں ہونا چاہیے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں ”کہا جاتا ہے کہ مسند داری مسند نہیں ہے بلکہ اس کی ترتیب ابواب پر ہے۔“ (۱) صاحب شرح الفیہ کا بیان ہے کہ ”ابن صلاح نے اس کو مسند شمار کیا ہے حالانکہ یہ ان کا وہم ہے کیوں کہ اس کی ترتیب مسند کے بجائے ابواب پر ہے“ (۲) شاہ عبدالعزیز صاحب ارقام فرماتے ہیں:

”وایں کتاب برخلاف اصطلاح محدثین مشہور بمسند گشتہ حالانکہ مرتب

برابواب است نہ بر صحابہ، پس باید کہ آزا سنن داری گوید۔ (۳)

(۱) تدریب الراوی ص ۵۷ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۳ (۳) بستان المحدثین ص ۴۳۔

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی اصل حیثیت سنن کی ہے تاہم ابن صلاح کے قول کو اس قدر شہرت ہوئی کہ اب وہ سنن کے بجائے مسند ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ”کتاب السنن جو مسند داری کے نام سے موسوم کی جاتی ہے مرتبہ میں عام سنن سے کم تر نہیں ہے“ (۱) اس کا سبب یہ ہے کہ مسند کا اطلاق کبھی ان کتابوں پر بھی کیا جاتا ہے جن کی ترتیب صحابہ کے ناموں کے بجائے فقہی ابواب پر ہوتی ہے لیکن ان کی سندیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی اور مذکور ہوتی ہیں، اسی لیے امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام الجامع المسند الصحيح المختصر من امور رسول اللہ و سننہ وایامہ رکھا ہے اور امام مسلم نے بھی صحیح مسلم کو مسند کے نام سے تعبیر کیا ہے، (۲) اس لحاظ سے سنن داری کو بھی مسند کہا جاسکتا ہے، عراقی کا بیان ہے کہ ”یہ مسند کے نام سے مشہور ہے، جیسا کہ امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام بھی مسند رکھا ہے کیوں کہ اس کی احادیث کی سندیں رسول اللہ تک مذکور ہیں“ (۳) یہاں ایک اور شبہ پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دیتے ہوئے مولانا عبدالعلیم چشتی لکھتے ہیں ”اسی طرح سنن داری کو مسند داری کے نام سے ذکر کرتے ہیں حالانکہ اس میں تمام حدیثیں مرفوع نہیں ہیں، مرسل، منقطع اور معطل سب ہی کچھ ہیں مگر مرفوعات کا ذخیرہ زیادہ ہے، اس لیے اس کو بھی مسند کہہ دیتے ہیں۔“ (۴)

اس تفصیل سے ثابت ہو گیا کہ اگرچہ داری کی تصنیف اپنی نوعیت اور ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے سنن میں شامل ہے لیکن وہ مسند کے نام سے بھی مشہور ہے اور اس کو مسند کہنا غلط نہیں ہے۔

کیا سنن داری صحاح ستہ میں شامل ہے؟: جمہور علمائے اسلام کے نزدیک صحاح کی

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۳۳ (۲) نوائد جامعہ برجالہ نافعہ ص ۱۵۸ (۳) تدریب الراوی ص ۵۷

(۴) نوائد جامعہ برجالہ نافعہ ص ۱۸۵۔



چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ ہے لیکن بعض لوگوں نے مؤطا امام مالک کو اور بعض نے داری کو صحاح کی چھٹی کتاب قرار دیا ہے، مغلطی کی یہی رائے ہے، ان لوگوں کے دلائل یہ ہیں کہ داری کی سنن صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی سنن پر فوقیت رکھتی ہے، اس کی سندیں عالی، رجال ثقہ قوی، رباعیات بکثرت اور شاذ و منکر روایات بہت کم ہیں، علاوہ ازیں امام داری کا زمانہ قدیم ہے اور فضل و کمال کے لحاظ سے ان کا مرتبہ زیادہ ہے۔

لیکن بایں ہمہ جمہور کے قول کے مقابلہ میں یہ قول مرجوح سمجھا جائے گا۔

ایک شبہہ کا ازالہ: مسند داری کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے کہ ”وہ مرسل، موقوف، منقطع اور معطل روایات پر مشتمل ہے، تو دراصل یہ امام بخاری کی صحیح کے مقابلہ میں ہے جیسا کہ عراقی کے پورے بیان سے اس کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

”یہ مسند کے نام سے مشہور ہے، جس طرح امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام المسند الجامع رکھا ہے لیکن (بخاری کے مقابلہ میں) داری کے اندر مرسل، منقطع اور معطل روایتیں زیادہ ہیں“ (۱) اور اس قول سے داری کی شہرت و اہمیت میں بھی فرق نہیں آتا کیوں کہ اس کی صحت، علوئے اسناد وغیرہ کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے، باقی وقف، ارسال اور انقطاع وغیرہ تو حقیقت میں امام داری کے حزم و احتیاط کی دلیل ہے اور مؤطا امام مالک جیسی معتبر اور اہم کتاب میں تو اسی قسم کی روایتوں کی زیادتی ہے۔

سنن داری کا ایک قلمی نسخہ ۳۵۷ھ کا لکھا ہوا ۲۵۵ روراق پر مشتمل کتب خانہ خدیوہ مصر میں موجود ہے، (۲) ۱۲۸۶ھ میں نواب صدیق حسن خاں صاحب حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو ان کو وہاں شاہ ولی اللہ صاحب کے ذخیرہ کتب میں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا اور انھوں نے اس کو نقل کر ڈالا، اسی نقل کو ۱۲۹۳ھ میں مولانا عبدالرشید بن محمد شاہ کشمیری نے دو اور نسخوں سے جن میں سے ایک ۸۰۰ھ کا لکھا ہوا تھا اور

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۳۳ (۲) فہرست کتب خانہ خدیوہ مصر ج ۱ ص ۳۲۱۔

س کی تصحیح صاحب حصن حصین علامہ حزری نے کی تھی مقابلہ و تصحیح کے بعد مختصر حواشی کے ساتھ مطبوع نظامی کانیپور سے شائع کیا۔

مولانا عبدالرشید صاحب نے حواشی میں دوسرے نسخوں سے اس کا فرق بھی ظاہر کیا ہے اور مشکل الفاظ، اعراب، اسما و رجال اور بلاد و اماکن کی مختصر تشریح اور حدیث کے معنی و مفہوم کی مختصر وضاحت بھی کی ہے اور اس کے شروع میں ایک مقدمہ کے اندر سنت و حدیث کی اہمیت، محدثین کی عظمت، کتب حدیث کے اقسام اور امام داری کے حالات و سوانح اور ان کی سنن کے مقام و مرتبہ وغیرہ سے بحث کی ہے۔

سنن داری کی ثلاثیات کو الگ سے بھی مرتب کیا گیا ہے، حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

”کتاب ثلاثیات داری..... ان پندرہ حدیثوں پر مشتمل ہے جو

ان کی مسند میں بیان ہوئی ہیں۔ (۱)



## امام بخاریؒ

(متوفی ۲۵۶ھ)

نام و نسب اور ابتدائی حالات: سلسلہ نسب یہ ہے: محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ، ان کا اصلی نام محمد اور کنیت ابو عبد اللہ ہے، ان کے جد اعلیٰ بردزبہ فارس کے رہنے والے اور مذہباً مجوسی تھے۔

امام صاحب کے جد امجد مغیرہ پہلے شخص ہیں، جو اس خاندان میں مشرف بہ اسلام ہوئے، اس زمانہ کا قاعدہ تھا کہ جس شخص کے ہاتھ پر اسلام لاتے تھے، اسی کی نسبت سے نو مسلم مشہور ہو جاتے تھے، مغیرہ چونکہ امیر بخارا ایمان بھٹی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے، اس لئے بھٹی مشہور ہو گئے، اور یہ لقب نسلًا بعد نسل منتقل ہوتا ہوا امام صاحب تک پہنچا، اس بنا پر امام صاحب بھٹی کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔ (۱)

امام صاحب کے دادا ابراہیم کا حال کچھ نہیں معلوم ہو سکا لیکن ان کے والد اسماعیل چوتھے طبقہ کے معتبر محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں، اسماعیل کی ثقاہت اور مرتبہ کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام مالک اور حماد جیسے محدثین کی انھوں نے شاگردی کی اور ابن مبارک جیسے شیوخ کی صحبت میں مدتوں رہے، اہل عراق نے اکثر حدیثیں ان سے روایت کی ہیں، خود امام بخاری نے تاریخ کبیر میں ان کے حالات لکھے ہیں اور اپنے بزرگ والد کے فضل و کمال پر فخر کیا ہے۔ (۲)

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۸ و کتاب الانساب ورق ۱۳۲ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۸۔

امام صاحب کے نام سے زیادہ ان کی وطنیت مشہور ہے، اس لئے اس قدر ہر شخص جانتا ہے کہ ان کا اصلی وطن بخارا ہے، بخارا قدیم جغرافیہ میں اقلیم پنجم کے صوبہ ماوراء النہر کا ایک جلیل القدر شہر سمجھا جاتا تھا (۱) لیکن جدید جغرافیہ کے رو سے ایشیائی ترکستان میں واقع ہے اس کی پشت پر سمرقند، داہنی طرف تاشقند، بائیں طرف صحرائے کراکورم اور سامنے صحرائے قزل خورم ہے، دوسری صدی کے اوائل میں (جب بخارا کو امام صاحب کی پیدائش کا شرف حاصل ہوا) خلفائے عباسیہ کے زیر حکومت تھا اور مقامی انتظام کے لیے دربار خلافت کی طرف سے ایک گورنر ہا کر تا تھا۔

شوال کی تیرہویں تاریخ تھی اور جمعہ کا دن تھا، جب ۱۹۳ھ میں امام بخاری پیدا ہوئے ابھی کھیل کود کے دن ختم نہیں ہوئے تھے کہ ان کے والد اسماعیل ان کو تیمی کا داغ دے کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے، ان کی والدہ جن کی تنہا سرپرستی اور توجہ پر ان کی آئندہ ترقی کا دار و مدار تھا، ان کو اور ان کے بڑے بھائی احمد کو لے کر بخارا سے مکہ معظمہ چلی آئیں، وہیں انھوں نے نشوونما پائی اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ (۲)

امام صاحب کی تحصیل علم کا زمانہ بچپن ہی سے شروع ہوتا ہے، ابتدائی تعلیم میں علم فقہ پر توجہ کی اور امام و کعب اور امام ابن مبارک جیسے اساتذہ فن کی تصنیفات کا مطالعہ کیا، پندرہ برس کی عمر میں فقہ کی تعلیم سے فارغ ہو گئے تو اس مقدس فن کی جانب متوجہ ہوئے، (۳) جس کی پریشان اور پرانگندہ حالت ان کی آئندہ توجہ اور سرپرستی کا انتظار کر رہی تھی، اگرچہ اس تفصیل کا حال نہیں معلوم ہوتا کہ امام صاحب نے کن مشائخ سے فن حدیث کو حاصل کیا لیکن اس قدر مسلم ہے کہ ان کا فضل و کمال اسحاق بن راہویہ اور علی بن المدینی کے فیضان تعلیم کا زیادہ ممنون ہے۔

(۱) معجم البلدان ج ۲ ص ۸۱، ۸۲ و تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۲۳۲ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۷۸ (۳)

ایضاً ص ۷۹ و طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۲ ص ۵۴ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۳۔

ان بزرگوں کے علاوہ اور جن مشائخ کا تاریخوں میں پتہ چلتا ہے، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے شیوخ میں مختلف درجہ اور مختلف طبقے کی جماعتیں شامل تھیں، مثلاً:

۱- تبع تابعین جیسے محمد بن عبداللہ انصاری، ابو عاصم النبیل۔

۲- تبع تابعین کے معاصر، مگر کسی ثقہ تابعی سے انہوں نے حدیث کی روایت نہیں کی، جیسے آدم ابن ایاس۔

۳- تبع تابعین سے جن لوگوں کو اخذ حدیث کا موقع ملا، جیسے قتیبہ بن سعید، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی، یحییٰ بن معین۔ (۱)

۴- ہم درس طلبہ جیسے محمد بن یحییٰ ذہلی، ابو حاتم رازی، محمد بن عبدالرحیم صاعقہ۔

۵- امام صاحب کے معاصرین جیسے عبداللہ بن حماد آملی، عبداللہ بن ابی العاص خوارزمی (۲)

امام صاحب کے شوق علم کا یہ حال تھا کہ بغداد، بصرہ، خراسان، کوفہ، خوارزم، حجاز اور شام میں اس وقت کوئی محدث ایسا نہ تھا، جس سے امام صاحب نے کچھ نہ کچھ اخذ نہ کیا ہو، (۳) ان کے تمام شیوخ کی مجموعی تعداد ایک ہزار اسی ہے جس میں پہلے قسم کے محدثین کا حصہ زیادہ ہے۔ (۴)

امام صاحب فطرۃ نہایت قوی الحافظ تھے، فطرت کی اس فیاضی سے انہوں نے فن حدیث کی تحصیل میں بہت فائدہ اٹھایا، استاذ سے جو حدیث سنتے فوراً زبانی یاد کر لیتے، ابتدا میں کتابت حدیث کے سخت خلاف تھے، ان کا قول تھا کہ:

”کتابت سے انسان کی فطری قابلیت کم ہو جاتی ہے اور محض کتابوں پر

(۱) امام مسلم نیشاپوری نے بھی ان لوگوں سے روایت کی ہے (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۳۷۹، ۳۸۰ (۳)

تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۳ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳ (۴) مقدمہ فتح الباری ص ۳۷۹۔

اعتماد کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔“ (۱)

لیکن آگے چل کر جب ضروریات زمانہ متقاضی ہوئے تو ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی۔ امام صاحب کی شہرت: امام صاحب کے فضل و کمال کی شہرت، اس سے پہلے کہ وہ فارغ التحصیل ہوں دور دور تک پہنچ چکی تھی، حفظ حدیث میں ان کا پایہ اس قدر بلند تھا کہ بڑے بڑے محدثین مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، اس لئے ان کی تیزی ذہن اور قوت حافظہ کا عام طور پر اعتراف کیا جاتا تھا، ان کے زمانہ کے وہ علما جن کے گرد و پیش ایک بڑی جماعت تلامذہ کی رہتی تھی اور جو فضل و کمال کے لحاظ سے خود امام فن کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے کسی مجموعہ حدیث کو امام صاحب صحیح تسلیم کرتے، تو فخر یہ لہجہ میں کہتے کہ:

”ہماری ان حدیثوں کو محمد بن اسماعیل بخاری نے صحیح تسلیم کیا“ (۲)

یعنی ان احادیث کی صحت میں اب کس کو کلام ہو سکتا ہے، جب امام بخاری جیسے نقاد نے صحیح قرار دیا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس شہرت نے وہ ترقی کی کہ دور دور سے لوگ صحیح حدیث کی غرض سے حاضر ہونے لگے، ائمہ حدیث درس دیتے ہوئے امام صاحب کو اپنی مسند خاص پر جگہ دیتے اور امام احمد بن حنبل جیسے بزرگ کہتے ہیں کہ ”خراسان کی سرزمین نے محمد بن اسماعیل جیسا شخص پیدا نہیں کیا“ (۳)

یوسف بن موسیٰ مروزی نے بصرہ میں امام صاحب کی وسعت علم اور شہرت کا پراثر منظر دیکھا تھا، ان کا بیان ہے کہ ایک دن کسی شخص کو گلیوں میں پکارتے ہوئے سنا کہ ”اے قدر دانان علم! ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل آج کل بصرہ میں تشریف فرما ہیں، جو شخص ان کی زیارت کا مشتاق ہو، جامع مسجد میں حاضر ہو، یہ آواز سنتے ہی جامع مسجد میں حاضر ہوا، مسجد میں اس وقت بہت سے علما جمع تھے، ایک ادھیڑ عمر کا شخص ستون کی آڑ میں نماز پڑھ

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۲۸۷ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۲۸۳، ۲۸۴ (۳) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۱۔

رہا تھا، معلوم ہوا کہ امام محمد بن اسماعیل بخاری یہی ہیں، نماز سے فارغ ہو کر علما کی طرف متوجہ ہوئے، حاضرین نے درخواست کی، آج حدیث کے متعلق خطبہ دیں، امام صاحب نے منظور فرمایا، شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ فلاں وقت امام صاحب بیان فرمائیں گے، جو قہر میں جمع ہونے لگے، جب حاضرین کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تو امام صاحب کھڑے ہوئے اور یوں بیان کرنا شروع کیا، کہ اے علمائے بصرہ! آج میں تمہارے سامنے وہ حدیث پیش کروں گا جن کے راوی تمہارے شہر بصرہ کے رہنے والے ہیں، مگر تم کو ان کی خبر نہیں، اس کے بعد انھوں نے جتنی حدیثیں بیان کیں، سب کے رواۃ اہل بصرہ تھے۔ (۱)

امام صاحب کی اس وسعت معلومات اور معرفت حدیث کو دیکھ کر اکثر علما کہا کرتے تھے کہ:

انما هو آية من آيات الله      امام بخاری خدا کی نشانیوں میں سے  
تمشی علی وجه الارض      ایک نشانی ہے جو زمین پر چلتی پھرتی  
ما خلق الا للحدیث. (۲)      نظر آتی ہے، خدا نے ان کو صرف

حدیث ہی کے لیے پیدا کیا۔

تحصیل علم کے لئے مختلف مقامات کا سفر: امام صاحب نے تحصیل علم اور زیارت علما کے لئے دور دراز مقامات کے سفر کئے، مصر و شام میں استفادہ حدیث کی غرض سے دوبارہ گئے، حجاز میں متواتر چھ سال تک قیام کیا، کوفہ و بغداد میں جو علما کا مسکن تھا، بار بار آیا کیے، بصرہ میں چار بار گئے اور بعض مرتبہ پانچ پانچ برس تک قیام کیا، ایام حج میں مکہ معظمہ چلے جاتے اور فراغت کے بعد پھر بصرہ چلے آتے، (۳) ان تمام سفروں میں نیشاپور کا سفر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

(۱) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۶، ۱۵ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۳۸۵ والہدایہ ج ۱ ص ۲۶ و تاریخ بغداد ج ۲

ص ۲۵ (۳) مقدمہ فتح الباری ص ۳۷۹ و تاریخ بغداد ج ۲ ص ۵۴۔

نیشاپور کا سفر: نیشاپور اس زمانے میں علم حدیث کا مرکز تھا، مسلم بن حجاج صاحب صحیح مسلم اور ان کے استاذ امام محمد بن یحییٰ ذہلی جیسے محدث اسی کی خاک سے اٹھے تھے اور ان کے علم و فضل نے نیشاپور کو دور دور تک مشہور کر دیا تھا، ایسی حالت میں امام صاحب کا نیشاپور جانا اور بڑے بڑے اساتذہ کی موجودگی میں اپنے فضل و کمال کا سکہ بٹھانا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔

امام صاحب جس شان سے نیشاپور میں داخل ہوئے اور جس جوش سے ان کا خیر مقدم کیا گیا، اس کی تصویر خود امام مسلم ان مختصر لفظوں میں کھینچی ہے:

”امام بخاری جب نیشاپور میں تشریف لائے تو اس دھوم دھام سے ان

کا استقبال کیا گیا کہ والیان ملک اور سلاطین کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔“ (۱)

امام صاحب نیشاپور پہنچ کر درس و تدریس حدیث میں لگ گئے، علمائے شہر اکثر اوقات حاضر ہوا کرتے اور امام صاحب کی معلومات حدیث سے مستفیض ہوتے، خود امام مسلم کا یہ حال تھا کہ امام صاحب کی روازا نہ مجلس کبھی ان سے خالی نہیں ہوتی تھی، ایک دن امام صاحب کی جامعیت اور تبحر علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بے اختیار پیشانی کا بوسہ لے لیا اور جوش میں آ کر کہا کہ:

دعنی اقبل رجلیک یا امیر

اے ملک حدیث کے بادشاہ! مجھے

اجازت دیجئے کہ میں قدم بوسی کا

المومنین فی الحدیث۔

شرف حاصل کروں۔

امام محمد بن یحییٰ ذہلی اس پایہ کے شخص تھے کہ امام مسلم کے استاذ اور نیشاپور کے مسلم، محدث تھے، انھوں نے اپنے تمام شاگردوں کو حکم دیدیا تھا کہ امام صاحب کی مجلس میں حاضر ہوا کریں خود امام صاحب کی شہرت اور فضل و کمال نے اس طرح لوگوں کو گرویدہ کہ امام ذہلی جیسے بزرگوں کی مجلسیں بے رونق ہو گئیں۔ (۲)

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۳۹۱ (۲) ایضاً و تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۰ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۱۔



ایک دن امام ذہلی نے اپنے مجلس میں فرمایا کہ ”میں کل محمد بن اسماعیل بخاری کی ملاقات کو جاؤں گا جس شخص کا جی چاہے میرے ساتھ چلے“ ساتھ ہی امام ذہلی کو یہ خیال ہوا کہ امام بخاری کی بدولت میری درسگاہ میں جو بے رونقی چھا گئی ہے، اس کا اثر میرے طلبہ پر بھی پڑا ہے، اس لیے میرے ساتھیوں میں سے کوئی طالب علم ایسی بات نہ پوچھ بیٹھے، جس کی بدولت مجھ میں اور محمد بن اسماعیل میں رنجش ہو جائے اور غیر اقوام کو اہل سنت کے اختلاف پر ہنسی اڑانے کا موقع ہاتھ آجائے، اس لیے اپنے ہمراہیوں کو تاکید کر دی کہ امام بخاری سے اختلافی مسائل کے متعلق کوئی سوال نہ کیا جائے۔ (۱)

دوسرے دن امام ذہلی اپنی جماعت کے ساتھ امام صاحب کے یہاں پہنچے، اتفاقاً وہی صورت پیش آگئی جس کا انھیں خوف تھا، ایک شخص نے اٹھ کر امام صاحب سے سوال کیا کہ یا ابا عبد اللہ! قرآن کے جو الفاظ ہماری زبان سے نکلتے ہیں، کیا وہ مخلوق ہیں؟ اس کے اصلی الفاظ یہ تھے، ”لفظی بالقرآن مخلوق“ امام صاحب ساکت رہے، پھر اس شخص نے دوبارہ سوال کیا، امام صاحب نے مجبور ہو کر جواب دیا کہ:

|                               |                                       |
|-------------------------------|---------------------------------------|
| القرآن کلام اللہ غیر مخلوق    | قرآن کلام الہی اور غیر مخلوق ہے، اور  |
| ولفظی بالقرآن الفاظنا         | جو الفاظ ہماری زبانوں سے نکلتے ہیں وہ |
| والفاظنا من افعالنا و افعالنا | ہمارے الفاظ ہیں اور ہمارے الفاظ       |
| مخلوقة. (۲)                   | ہماری زبان کی ایک حرکت ہے اس لئے      |

ہمارا ایک فعل ہے اور افعال مخلوق ہیں۔

امام صاحب نے ان مختصر لفظوں میں درحقیقت اس بحث کا فیصلہ کر دیا تھا، ظاہر ہے کہ اگر قرآن کا مفہوم نفس کلام سے ہے، تو کلام خدا کی ایک صفت ہے، اور خدا کی صفت کیوں کر مخلوق ہو سکتی ہے؟ اگر وہ الفاظ مراد ہیں جو ہماری حادث زبانوں سے نکلتے ہیں، تو

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۳۹۱ (۲) ایضاً۔

چونکہ وہ مخلوق کا ایک فعل ہے، لہذا ان کے مخلوق ہونے میں کلام نہیں۔

لیکن اس دقیق جواب کو عوام نہ سمجھ سکے، اس لئے اس واقعہ کو اس قدر بڑھایا اور شہرت دی کہ امام صاحب کی عام ہر و لعزیزی میں فرق آ گیا مگر جو لوگ دقیقہ رس اور نکتہ سنج تھے، وہ اس جواب کی تہ کو پہنچ گئے اور بیشتر سے زیادہ وقعت کرنے لگے، انہی لوگوں میں ایک شخص امام مسلم بھی تھے، ان کو جب معلوم ہوا کہ امام ذہبی بھی اس جواب کی بدولت امام صاحب کے مخالف ہو گئے اور انھوں نے اپنی مجلس میں منادی کرا دی کہ ”جو شخص لفظی بالقرآن مخلوق کا قائل ہو وہ ہماری مجلس میں شریک نہ ہو“ تو سخت برآشفہ ہوئے اور وہ تمام نوشتے اونٹوں پر لدا کر واپس کر دیے جن میں امام ذہبی کی تقریریں قلمبند کی تھیں۔ (۱)

جب یہ اختلاف ایک نازک حد تک پہنچ گیا تو امام صاحب نیشاپور کو خیر باد کہہ کر اپنے وطن مالوف بخارا کو روانہ ہوئے، اہل بخارا کو جب اطلاع ہوئی کہ ان کا ہم وطن کمال اور شہرت کے خلعت سے آراستہ ہو کر پھر اپنے وطن مالوف کی طرف واپس آرہا ہے تو جوش مسرت میں استقبال کے لئے بڑھے، شہر سے دو کوس کے فاصلہ پر امرائے شہر نے خیر مقدم کیا اور درہم و دینار نثار کرتے ہوئے شہر میں لائے، (۲) اللہ اکبر! ایک وہ زمانہ تھا جب بے باپ کا ایک یتیم بچہ حسرت و یاس کی گود میں بخارا سے نکلا تھا اور ایک یہ زمانہ ہے، جب وہی یتیم بچہ امام حدیث ہو کر امرائے شہر کے غول میں خراں خراں اسی بخارا میں داخل ہو رہا ہے۔

جلا وطنی اور انتقال: بخارا میں امام صاحب نے ایک مدت تک آرام و راحت سے زندگی بسر کی لیکن آخر میں اپنی غیور اور خودار طبیعت کی بدولت مصیبت میں مبتلا ہو گئے، شاہ بخارا نے حکم دیا کہ بخارا سے فوراً نکل جائیں۔

امام صاحب کے بعض رشتہ دار سمرقند کے ایک چھوٹے سے قریہ خرنگ میں رہتے

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۳۹۱، ۳۹۲، (۲) ایضاً ص ۳۹۳۔

تھے، امام صاحب بخارا سے نکل کر وہیں چلے آئے اور آخر عمر تک وہیں رہے، جلاوطنی کا انھیں سخت افسوس تھا، وفورغم میں بے اختیارانہ زبان سے نکل جاتا، کہ الہی باوجود وسعت کے زمین میرے لئے تنگ ہوگئی ہے، اس لئے اب مجھ کو اٹھالے۔ (۱)

عجیب اتفاق ہے کہ یہ دعا ایسی مقبول ہوئی کہ تھوڑے ہی دنوں میں خدانے دنیا سے اٹھالیا، (۲) ۲۵۶ھ میں..... شب کو نماز کے بعد انتقال ہوا، شوال کے مہینے میں تیرہویں تاریخ کو پیدا ہوئے اور شوال ہی کی چاند رات میں دو شنبہ کو وفات پائی اور عید کے دن ظہر کی نماز کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی۔

دوسرے دن جب یہ خبر مشہور ہوئی تو سمرقند میں ایک تہلکہ مچ گیا، اس دھوم دھام سے جنازہ اٹھایا گیا کہ سارا سمرقند مشالیت میں ساتھ ساتھ تھا، اور بڑے بڑے علما اور امرا باچشم پرغم نماز جنازہ میں شریک تھے، نماز ظہر کے بعد جنازہ دفن کیا گیا اور آسمان حدیث کا یہ منور آفتاب سرزمین سمرقند میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

ایک شاعر نے اختصار کے ساتھ امام صاحب کا سال ولادت، سال وفات اور سن عمر کو ذیل کے دو شعروں میں یوں نظم کیا ہے، جو بہت دلچسپ ہے:

كان البخاري حافظا ومحدثا جمع الصحيح مكمل التحرير

ميلاده صدق ومدة عمره فيها حميد وانقضى في نور (۳)

امام صاحب کا حلیہ یہ تھا، جسم دبلا، پتلا، قدمیانہ، رنگ گندی۔ (۴)

## عام اخلاق و عادات، وجہ معاش اور تصنیفات

خودداری: امام صاحب کی مقدس زندگی میں بعض ایسی شائستہ خصوصیات پائی جاتی ہیں، جن سے بڑے بڑے نامور لوگوں کا اخلاقی دامن خالی ہے، ان کی طبیعت سخت درجہ غیور،

(۱) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۴ و مقدمہ فتح الباری ص ۳۹۳ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۲ (۲) ایضاً (۳)

بستان الحمدین ص ۱۳ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۵ و تہذیب ج ۹ ص ۳۸۔

خوددار اور بے تکلف تھی، ان کے واقعات زندگی کے آخری حصہ میں تم پڑھ آئے ہو کہ امیر بخارا نے جلاوطن کر دیا تھا مگر کس لئے؟ صرف اس لئے انھوں نے علم کی عظمت کے آگے ایک دنیا دار کی عزت کا لحاظ نہیں کیا، امیر بخارا کی خواہش تھی کہ امام صاحب اس کے دربار میں حاضر ہو کر صحیح بخاری اور تاریخ کبیر سنائیں، امام صاحب نے اس خواہش کو رد کر دیا کہ میں علم کو ذلیل کرنا نہیں چاہتا، کہ سلاطین کے آستانے پر لے جا کر پیش کش کروں، اگر امیر کو سچا شوق ہے، تو میری مجلس میں آ کر شریک ہو، امیر بخارا کی درخواست تھی کہ وہ قصر شاہی میں آ کر شہزادوں کو تعلیم دیں، امام صاحب نے فرمایا کہ میں امیر کے لڑکوں کو کوئی خصوصیت نہیں دے سکتا، میری مجلس عام ہے، جس کا جی چاہے آ کر شریک ہو، امیر بخارا کو یہ استغنا ناگوار گذرا، حکم دے دیا کہ ہمارے شہر سے نکل جاؤ، امام صاحب نے اپنے وطن سے نکلنا منظور کر لیا مگر علم کی ذلت گوارا نہ کی، (۱) خودداری کا خیال اس درجہ تھا کہ خود ان کا قول ہے:

”میں نے اپنے استاد علی بن مدینی کے سوا اور کسی کے مقابلہ میں اپنے کو

چھوٹا نہ سمجھا۔“ (۲)

سادگی و قناعت: امام صاحب نے عمر بھر کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ عام علما کی طرح کسی امیر یا بادشاہ کی فیاضی سے فائدہ اٹھائیں، کئی مرتبہ اس قسم کے مواقع ہاتھ آئے مگر انھوں نے وظیفہ قبول نہیں کیا، اپنے پدر بزرگوار کی میراث میں جو کچھ ملا، اس پر آخری عمر تک قناعت کی، اس زمانے میں تجارت کی اس خاص صورت کو کہ ایک شخص اپنا روپیہ صرف کرے اور دوسرا اپنی محنت اور مشترکہ تجارت کبھی جائے، مضاربت کہتے تھے، امام صاحب اسی طریقہ کی تجارت میں اپنے روپے لگا دیتے اور اسی کی قلیل آمدنی سے ضروریات زندگی پوری کرتے۔ (۳)

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۳۹۳ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۳۸۴ و تہذیب ج ۹ ص ۵۰ (۳) مقدمہ فتح

الباری ص ۳۸۰۔

انکساری: بہت کم لوگ ہوں گے، جن کو زندگی میں ایسی لاناہتا شہرت نصیب ہوئی ہوگی، جس کو خود ان کی آنکھوں نے دیکھا تھا، باوجود اس کے انہیں معمولی سے معمولی شخص سے بھی کسی نامعلوم امر کو دریافت کرنے میں عار نہیں آتا تھا، ان کے اساتذہ کی طول طویل فہرست میں بعض ان لوگوں کے نام نظر آتے ہیں، جو ان کے ہم عمر یا ہم سبق تھے۔ (۱)

رواداری و بے تعصبی: امام صاحب کا ایک بے نظیر وصف ان کی بے تعصبی ہے، جب ہم ان کے مجموعہ احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہت سی ایسی حدیثیں پاتے ہیں جن کے راوی مذہب اہل سنت کے خلاف تھے، امام صاحب نے ان سے روایت کرنے میں کچھ تامل نہیں کیا، اگرچہ خود ان کے مذہب سے اختلاف رکھتے تھے۔

ورزش: امام صاحب کو جسمانی ورزش کا بہت شوق تھا، سواری اور تیراندازی میں اس درجہ مہارت تھی کہ ان کا نشانہ بہت کم غلط ہوتا تھا۔ (۲)

صفائی: امام صاحب کوئی دنیا دار آدمی نہیں تھے، ان کی زندگی بالکل سیدھی سادھی اور خالص علمی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی صفائی کا اس درجہ خیال رہتا تھا کہ فرش پر ایک تینکے کا پڑا رہنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، اثنائے درس میں ایک شخص نے اپنی ڈاڑھی سے ایک تنکا نکال کر فرش پر ڈال دیا، امام صاحب کی جب نظر پڑی تو چپکے سے اٹھے اور تینکے کو اٹھا کر باہر صحن میں ڈال دیا۔ (۳)

امام صاحب کا حلقہ درس نہایت وسیع تھا، اسلامی دنیا کے ہر حصہ سے طلبہ کی جماعت جوق جوق آکر شریک ہوتی اور بڑے بڑے پایہ کے اشخاص حلقہ تلامذہ میں شامل ہوتے، ان کی مجلس درس کبھی مسجد میں اور کبھی ان کے خاص مکان پر منعقد ہوتی تھی، ان کے شاگردوں میں حافظ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، ابو عبد الرحمن نسائی، مسلم بن حجاج جیسے جید

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۳۸۰ و تہذیب ج ۹ ص ۴۷ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۳۸۱ (۳) مقدمہ فتح

محدث نظر آتے تھے جو حدیث کے ارکان ستہ کے تین جلیل القدر رکن ہیں، ابن خزیمہ، محمد بن نصر مزوری، صالح بن محمد جو آگے چل کر خود بڑے پایہ کے مصنف ہوئے، امام صاحب کے عام شاگردوں میں داخل ہیں۔ (۱)

امام صاحب کو زمانہ تحصیل علم ہی میں تصنیف و تالیف کا شوق ہو اور آخر عمر تک قائم رہا، ان کی ابھی اٹھارہ برس کی عمر تھی، جب ایک کتاب قضا یائے صحابہ و تابعین نامی لکھی (۲) اور بڑے بڑے من مشائخ کو متخیر کر دیا۔

تاریخ کبیرہ مدینہ منورہ کی چاندنی راتوں میں لکھی جب آسمان کی منور اور قدرتی قدیل نے دنیا کے مصنوعی چراغوں سے مستغنی کر دیا تھا۔ (۳)

صحیح بخاری کا مفصل ذکر مستقل عنوان سے آگے آ رہا ہے لیکن اس کے علاوہ دیگر تصنیفات کی مجمل فہرست یہ ہے:

- ۱- تاریخ کبیر، ۲- تاریخ اوسط، ۳- تاریخ صغیر، ۴- خلق افعال عباد، ۵- رسالہ رفع الیدین، ۶- قرأت فاتحہ خلف الامام، ۷- الادب المفرد، ۸- سیر الوالدین، ۹- کتاب الضعفاء، ۱۰- الجامع الکبیر، ۱۱- التفسیر الکبیر، ۱۲- کتاب الاشریہ، ۱۳- کتاب الہبہ، ۱۴- کتاب المسبوط، ۱۵- کتاب الکنی، ۱۶- کتاب العلل، ۱۷- کتاب الفوائد، ۱۸- کتاب المناقب، ۱۹- اسامی الصحابہ، ۲۰- کتاب الواحد، ۲۱- قضا یا الصحابہ۔

## جامع صحیح بخاری

ہجرت کی پہلی صدی تک احادیث کی تدوین نہیں ہوئی، صحابہ کا خیال تھا کہ اگر آثار نبوی مرتب کئے جائیں تو ممکن ہے کہ آگے چل کر ایک زمانہ ایسا آئے کہ کلام الہی اور کلام نبوی میں کوئی امتیاز نہ رہے اور لوگ غلطی میں پڑ جائیں، علاوہ اس کے ابھی اہل عرب

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۳۹۳ (۲) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۷ (۳) ایضاً۔

اس قدر مستند نہیں ہوئے تھے کہ کتابت اور جمع و تصنیف کا عام رواج ہوتا، دوسری صدی میں جب علوم و فنون کی اشاعت اور تدوین کی بنیادیں پڑیں اور کتابت کا عام رواج ہوا تو جمع حدیث پر بھی لوگوں کو توجہ ہوئی، امام مالک نے مؤطا میں اہل حجاز کی حدیثیں جمع کیں، ابن جریج نے مکہ معظمہ میں، امام اوزاعی نے شام میں، سفیان ثوری نے کوفہ میں اور ابوسلمہ حماد نے بصرہ میں احادیث کے مجموعے ترتیب دیے، عبید اللہ بن موسیٰ کوفی اور نعیم بن حماد وغیرہ نے مسندیں مرتب کیں اور دوسری صدی کے اختتام تک بیسوں مجموعے تیار ہو گئے۔ (۱)

تیسری صدی میں امام بخاری کو جمع حدیث پر توجہ ہوئی، کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت تک احادیث کے بے شمار مجموعے مرتب ہو چکے تھے، اس لئے امام صاحب نے اگر ان سے چھانٹ کر ایک مجموعہ تیار کر لیا، تو یہ کوئی اہم کام نہ تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ امام صاحب سے پیشتر اگرچہ متعدد مجموعے مرتب ہو چکے تھے مگر ان کی حالت کیا تھی اور امام صاحب نے جو مجموعہ تیار کیا ہے، اس کی حالت کیا ہے، اس پہلو سے اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو کہ صحیح بخاری کی اصلی خصوصیت کیا ہے؟ اور امام صاحب کا یہ کام کس قدر اہم اور کس درجہ دشوار تھا، ہم اس مضمون میں اسی حیثیت سے صحیح بخاری پر نظر ڈالنی چاہتے ہیں۔

صحیح بخاری کا اصلی نام احادیث اور ابواب وغیرہ کی تعداد: صحیح بخاری کا اصلی نام یہ ہے: "الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ وسننہ وایامہ" حقیقت یہ ہے کہ ایک حدیث کے مجموعے کے لیے اس سے زیادہ مناسب جامع اور واقعی نام نہیں ہو سکتا۔

صحیح بخاری میں تقریباً دس ہزار حدیثیں ہیں جو چھ لاکھ حدیثوں سے منتخب کر کے درج کی گئیں، (۲) ۱۶۰ کتاب ہیں اور تین ہزار چار سو پچاس ابواب ہیں، ان تمام شیوخ کی تعداد جن سے صحیح بخاری کی حدیثیں لی گئی ہیں، دو سو نو اسی ہے، تیرہ سو چالیس مشائخ

(۱) مفہوم از مقدمہ فتح الباری ص ۵۴، (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۳۶۵، ۳۷۰۔

ایسے ہیں جن سے مسلم نے روایت نہیں کی صرف امام بخاری نے روایت کی ہے۔

ثلاثیات اس حدیث کو کہتے ہیں جو صرف تین راویوں کے واسطے سے امام صاحب تک پہنچی ہے، صحیح بخاری میں اس قسم کی بائیس حدیثیں ہیں جن پر امام صاحب کو فخر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بجا فخر ہے۔

صحیح بخاری کی خصوصیات: امام صاحب جمع حدیث پر متوجہ ہوئے، تو بے انتہا مشکلات کا سامنا ہوا، انھوں نے دیکھا کہ جس قدر کتابیں مرتب ہوئی ہیں، وہ محض احادیث کا ایک مجموعہ ہیں، جن میں نہ صحت کا التزام کیا گیا ہے، نہ علت و ضعف سے بحث کی گئی ہے، اس قسم کے مجموعوں کا تیار کر لینا کوئی مشکل اور اہم کام نہ تھا، مشکل یہ تھا کہ ایک صحیح اور اصح مجموعہ تیار کیا جائے، صحت کے علاوہ ترتیب کے لحاظ سے بھی منتظم اور مرتب ہو، صحیح آثار کی غیر صحیح آثار سے تمیز کی جائے، التزام ہو کہ حتی المقدور اعلیٰ اقسام کی حدیثیں اس میں درج کی جائیں۔

امام بخاری پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس التزام اور صحت سے حدیث کا ایک مجموعہ تیار کیا، اس لحاظ سے یہ جس قدر اہم تھا اسی قدر دشوار تھا، امام صاحب نے نہایت کوشش اور جان کا ہی سے اول لاکھوں حدیثیں جمع کیں، پھر نہایت وقت نظر سے ان پر نقادانہ نظر ڈالی، اصول و قواعد کے ساتھ ان میں سے دس ہزار حدیثیں منتخب کیں اور ترتیب وار ایک جلد میں جمع کیا۔

امام بخاری نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے پہلا کام یہ کیا کہ حدیث کے درجے مقرر کیے اور ان کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا، صحت اور سند کے لحاظ سے کوشش کی کہ مستفیض، متواتر، حسن حدیثیں جمع کی جائیں، ان سے دوسرے درجے پر صحیح حدیثوں کو لیا جائے مگر صحیح سے نیچے درجے کی حدیثیں جیسے مطلق حسن، وغیرہ کو صحیح بخاری میں جگہ نہ دی جائے، (۱) اگرچہ

(۱) جس حدیث کو کم از کم تین جلیل القدر صحابیوں نے الگ الگ طریقوں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)



یہ الزام مسلم اور صحاح اربعہ میں بھی پایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ مؤطا امام مالک بھی اس خصوصیت میں شریک ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس خوبی اور عمدگی سے امام صاحب نے اس التزام کو نبھایا ہے، اس کی نظیر کوئی مجموعہ پیش نہیں کر سکتا، یہی وجہ ہے کہ اصح الکتب کے خطاب سے یہ کتاب سرفراز ہوئی۔

بخاری اور مسلم: حدیث کی صحیح کتابوں میں خصوصیت کے ساتھ دو کتابیں زیادہ صحیح، مستند اور قابل اعتماد تسلیم کی گئی ہیں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم ان دونوں کتابوں کی نسبتاً زیادہ صحت میں کسی کو کلام نہیں لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ صحیحین میں اصح کون ہے، عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ان دونوں کتابوں میں صحیح ترین کتاب جامع صحیح بخاری ہے لیکن بعض اہل مغرب کو اس میں کلام ہے، ان کا خیال ہے کہ مسلم بخاری سے زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے لیکن یہ خیال کسی صورت صحیح نہیں ہو سکتا، بخاری کو مسلم پر فضیلت ہے اور اکثر حیثیتوں سے ترجیح حاصل ہے، سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ وجوہ ترجیح کیا کیا ہو سکتے ہیں۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) سے روایت کیا ہو اور اس کے رواۃ میں روز بروز ترقی ہوتی گئی ہو، تو اس حدیث کو مستفیض کہتے ہیں، حدیث کی یہ اعلیٰ قسم ہے، اگر تین سے زیادہ مگر مشہور اصحاب سے مروی ہو تو اس کو متواتر کہتے ہیں انما الأعمال بالنیات ایک مشہور حدیث ہے جس کے اول راوی صرف حضرت عمر ہیں، ان سے علقمہ نے روایت کی اور علقمہ سے صرف محمد بن ابراہیم نے محمد سے فقط یحییٰ بن سعید نے اور یحییٰ سے بے شمار لوگوں نے روایتیں کیں، لہذا یہ حدیث متواتر ہے، متواتر کے بعد تیسرے درجہ پر حدیث حسن ہے، حسن اس حدیث کو کہتے ہیں جو مختلف طریقوں سے مروی ہو اور ہر طریق کی حدیث کا مضمون دوسرے طریق کی حدیث کی تائید کرتا ہو اگر ایک ہی طریق سے مروی ہو تو اس کو غریب مطلق کہتے ہیں، جن کی دو قسمیں ہیں، صحیح اور مطلق، حسن صحیح وہ حدیث ہے جس کے بعض یا کل طریقوں کے تمام راوی ثقہ، عادل، غیر مجروح، غیر منکر اور نیز راوی اول کوئی مشہور صحابی و ساتھ ہی سلسلہ روایت میں اتصال ہو۔ مطلق حسن وہ حدیث ہے جس میں یہ بعض شرائط نہ پائی جائیں۔

صحیح بخاری اور مسلم کا مقابلہ چند حیثیتوں سے کیا جاسکتا ہے، حسن ترتیب، احادیث اور ترجمہ کا تناسب، عدم شدوذ، اعلال، قوتِ رواۃ، استنباط مسائل، اتصال اسناد، زبان، صحت حدیث، پہلی دو حیثیتوں کو چھوڑ کر باقی ہر حیثیت سے بخاری کو مسلم پر فضیلت حاصل ہے، بخاری میں سوء ترتیب اور بعض موقعوں میں عدم مناسبت حدیث و ترجمہ باب کا عیب ضرور ہے مگر اس سے کتاب کی حقیقی خوبیوں پر پردہ نہیں پڑسکتا، صحیح بخاری اس رنگ اور التزام کی پہلی تصنیف ہے، امام صاحب کے سامنے اس قسم کا کوئی نمونہ نہیں تھا، مسلم نقش ثانی ہے، صحیح بخاری نے اس کے لیے راستہ صاف کر دیا تھا، ایک اعلیٰ درجہ کا نمونہ پیش نظر تھا، اس لیے اگر ترتیب وغیرہ میں نسبتاً چند نقص پائے جاتے ہیں تو ان کی بنا پر امام صاحب پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، اس قسم کی فروگزاشتوں کا ایک ایسی کتاب میں جس کے لیے پہلے سے کوئی نمونہ نہ رہا ہو، رہ جانا کوئی مستبعد نہیں ہے اور اس لحاظ سے امام صاحب کی معذوری ظاہر ہے۔

صحیح مسلم کے مقابلہ میں صحیح بخاری کی خوبیاں بے شمار ہیں لیکن جن حیثیتوں کو ہم نے پیش کیا ہے ان کو پیش نظر رکھ کر اگر دیکھا جائے، تو سات خصوصیتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو صرف بخاری کا حصہ ہیں، مسلم کو ان میں شرکت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

۱- امام بخاری کا اصلی مقصود اگرچہ احادیث صحیحہ کی تدوین ہے، مگر ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ترتیب احادیث میں فقہی فوائد کو بھی ملحوظ رکھا اسی لیے صحیح بخاری کی ترتیب فقہی ابواب اور مسائل کے موافق رکھی گئی ہے اور بعض ایسے باب پائے جاتے ہیں جن کو مسائل قرار دے کر ان کے جواز یا عدم جواز میں قرآن مجید کی آیات پیش کی ہیں، کہیں کہیں تعلقات اور مرفوعات سے حلت اور حرمت پر استدلال کیا ہے اور ان کے متعلق اگر حدیثیں ملی ہیں تو ان کو بھی پیش کر دیا، مثلاً صحیح بخاری کی ابتدا میں، الایمان یزداد وینقص کو ایک مسئلہ فرض کر کے لیتزدادوا ایماناً اور لیطمئن قلبی وغیرہ آیات

اور اقوال صحابہ سے زیادہ نقص ایمان کو ثابت کیا ہے، اس خصوصیت کی بدولت صحیح بخاری تحقیق مسائل کا بھی ایک عمدہ ذریعہ ہے، برخلاف مسلم کے کہ اس کی اصلی غرض صرف احادیث صحیح کو ابواب فقہیہ کی حیثیت سے مرتب کرنا ہے، اس لیے مسائل کی تحقیقات کے حصہ سے بالکل خالی ہے۔

۲- ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری احادیث سے اس زمانہ کی معاشرت کا پتہ لگاتے ہیں اور معمولی واقعات سے نہایت مفید نتائج نکال کر ہر نتیجہ کو الگ الگ بابوں میں درج کرتے ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ بریرہ کو جو حضرت عائشہ کی لونڈی تھی، کسی نے کچھ گوشت صدقہ کے طور پر دیا، حضرت عائشہ نے وہ گوشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ کر نہیں دیا کہ ”یہ گوشت صدقہ کا ہے اور آپ صدقہ نہیں کھاتے“ آنحضرت نے فرمایا کہ ”بریرہ کے لیے بیشک صدقہ ہے لیکن اگر بریرہ مجھے دے تو میرے لیے ہدیہ ہے۔“

امام مسلم نے اس حدیث کو باب الصدقہ میں درج کیا ہے، مگر امام بخاری نے اس حدیث سے متعدد نتائج پیدا کئے ہیں اور مختلف بابوں میں نقل کیا ہے، ایک موقع پر یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ جن لوگوں پر صدقہ حرام ہے، ان کی لونڈیوں کو صدقہ دینا جائز ہے، کیونکہ ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لونڈیوں نے صدقہ لیا اور آنحضرت مانع نہیں ہوئے، ایک اور موقع پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو صدقہ دیا جائے اور وہ کسی ایسے شخص کو وہ چیز ہدیہ کے طور پر دے، جس پر صدقہ حرام ہے تو اس کا قبول کرنا جائز ہے۔

۳- ایک باریک فرق صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں یہ ہے کہ جب کسی ایک شیخ کے شاگردوں سے یہ دونوں بزرگ روایت کرتے ہیں تو اس میں شک نہیں کہ ان کے شرط کے مطابق ان میں عدل، ثقاہت، قوت حافظہ، سلامتی ذہن، تقویٰ یہ تمام شرطیں ضرور پائی جاتی ہیں لیکن چونکہ تمام شرطیں ہر راوی میں برابر درجہ کی نہیں ہو سکتیں، کوئی عادل ہے، کوئی زیادہ عادل ہے، کوئی بہت زیادہ عادل ہے، اس لئے امام بخاری جس احتیاط اور دقت نظر کے

ساتھ ان سے روایت کرتے ہیں، وہ امام مسلم میں نہیں پائی جاتی، امام زہری کے تلامذہ کے پانچ طبقے ہیں، اگرچہ سب کے سب معتبر رواۃ میں سے ہیں لیکن اوصاف کی کمی اور زیادتی کے لحاظ سے ان کے مدارج باہم متفاوت ہیں، امام بخاری اول طبقہ سے اصولاً اور دوسرے طبقہ سے ضمناً روایت کرتے ہیں، مگر امام مسلم دوسرے طبقہ سے اصولاً اور تیسرے طبقہ سے ضمناً اور پہلے طبقہ سے کبھی کبھی روایت کرتے ہیں، اسماء الرجال کے ماہرین کو اس کا پتہ آسانی سے لگ سکتا ہے۔

۴۔ بخاری کی قدر و منزلت کا اندازہ مسلم کے مقابلہ میں اس حیثیت سے بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے رواۃ کی تعداد جن سے امام صاحب نے صحیح میں روایت کی ہے ۴۳۰ سے کچھ زائد ہے، اس تعداد میں سے صرف ۸۰ راوی ایسے ہیں جن میں علمائے کلام کیا ہے لیکن مسلم کے خاص راوی ۶۲۰ ہیں، ان میں ۱۶۰ راویوں کو علمائے ضعیف قرار دیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام صاحب کے کمزور راویوں سے مسلم کی ضعیف رواۃ کی تعداد بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ بخاری کے ضعیف رواۃ زیادہ تر بخاری کے شیوخ میں سے ہیں، جن سے امام صاحب کی مدتوں صحبت رہی، ان کے حالات اور خیالات سے اطلاع حاصل کی، اس لئے قیاس اس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ امام بخاری جیسے نقاد مدتوں کی صحبت پر ان کے ضعف سے واقف نہ ہوئے ہوں اور روایت حدیث میں تامل نہ کیا ہو، اس بنا پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان راویوں کو ضعیف قرار دینا صحیح نہیں، برخلاف امام مسلم کے کہ ان کے ضعیف راوی اکثر قدما میں سے ہیں، جن کی تنقید کا نہ ان کو موقع مل سکتا تھا، نہ ان کے حالات کی کافی اطلاع تھی، اس لئے اس صورت میں ان کے ضعف سے بے خبر رہنا زیادہ قرین قیاس ہے۔

۵۔ علمائے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تمام حدیثوں میں سے ۲۱۰ حدیثوں کو ضعیف

قرار دیا ہے، ان میں سے صرف اتنی بلکہ اس سے بھی کم ضعیف حدیثیں بخاری کی ہیں اور ۱۳۰ حدیثیں صحیح مسلم کی۔

۶۔ بخاری و مسلم میں ایک بڑا نازک اور باریک فرق، ادبی حیثیت کا بھی ہے، ایک ہی حدیث کے مضمون کو دونوں کتابوں میں دیکھئے، بخاری کی طرزِ اداء، نشست الفاظ، سلاست بیان، جس قدر پسندیدہ اور اعلیٰ ہوگی، اس کی نظیر مسلم میں کم ملے گی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب نے اس زبان کو پیش نظر رکھا، جو عہد رسالت یا اس سے قریب تر زمانے میں مستعمل تھی، یعنی امام صاحب نے معانی حدیث کے ساتھ الفاظ حدیث کا بھی اوروں سے زیادہ خیال رکھا۔

۷۔ امام مسلم حدیث معنعن کے (۱) اتصال اسناد کے لئے راوی اور مروی عنہ (۲) کی صرف ہم عصری کافی سمجھتے ہیں، بشرطیکہ راوی مدلس (۳) مشہور نہ ہو، چنانچہ صحیح کے مقدمہ میں انھوں نے خود تصریح کر دی ہے لیکن امام بخاری سلسلہ روایت کے اتصال کے لئے صرف معاصرت کو کافی نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک مدلس مشہور نہ ہونے کے ساتھ دونوں کی ملاقات بھی ضروری ہے، چنانچہ امام صاحب نے تاریخ کبیر میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے، ہم اس موقع پر اس اختلاف کے نتیجہ کو دکھانا کافی سمجھتے ہیں۔

امام صاحب چونکہ ملاقات کو شرط قرار دیتے ہیں، اس لئے ایسی حدیث معنعن کو جس کے راوی اور مروی عنہ کی باہم ملاقات ثابت نہ ہوئی ہو، اگرچہ راوی مدلس مشہور نہ ہو، متصل الاسناد تسلیم نہیں کرتے اور اس بنا پر اس کو صحیح بھی نہیں قرار دیتے، کیونکہ صحیح ہونے کے لئے بالا جمال اتصال اسناد کی ضرورت ہے، مگر امام مسلم متصل مان کر صحیح احادیث درج

(۱) معنعن: اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی اسناد عن فلاں عن فلاں کے ساتھ بیان کی گئی ہو۔ (۲) یعنی جس سے روایت کی جائے۔ (۳) مدلس: اس راوی کو کہتے ہیں جو روایت میں اپنے شیخ کا نام درمیان سے چھوڑ دے۔

کردیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صحت اور احتیاط کے لحاظ سے جس قدر صحیح بخاری کا اصول تنقید موافق عقل ہے، اسی قدر مسلم کا اصول، قرآن صحیح اور قواعد احتیاط سے دور ہے۔

امام صاحب اس پہلو پر غور کرتے ہیں کہ صرف معاشرت کیوں کر روایت حدیث کے لئے ہم کو اطمینان دلا سکتی ہے، جب کہ ممکن ہے کہ ایک ہی زمانے میں دو شخص ہوں، مگر ان کی باہمی ملاقات نہ ہوئی ہو اور ایک تیسرے شخص کی وساطت سے کوئی حدیث ایک شخص تک پہنچ گئی ہو، یہ سچ ہے کہ راوی مدلس مشہور نہیں ہے لیکن مدلس نہ ہونا اس امر کے لئے کافی دلیل نہیں ہو سکتی کہ بغیر کسی واسطہ کے بذاتہ راوی نے مروی عندہ سے سماعت حدیث کی ہے، صرف ایک یہی اختلاف اس امر کے لئے کافی ہے کہ مسلم کے مقابلہ میں امام بخاری جمع حدیث میں کس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں اور جو اصول تنقید قائم کئے ہیں، وہ کس درجہ مطابق عقل اور قیاس صحیح کے موید ہیں۔

ہم نے یہاں صحیح بخاری کی سات ایسی خصوصیتیں دکھائی ہیں جو صحیح مسلم کے مقابلہ میں قابل توجہ ہیں، اصح الکتب بعد کتاب اللہ کے خطاب سے تمام کتابیں محروم رہیں، مگر صحیح بخاری کی صحت احتیاط، قوت رواۃ، اتصال اسناد، اور اسی قسم کی بے نظیر خوبیوں نے خود کو اس معزز خطاب کا مستحق ثابت کیا، علمائے اس استحقاق کو بجا تسلیم کیا اور کلام اللہ کے بعد جگہ دی۔

امام صاحب نے اس کا بڑا حصہ مدینہ منورہ میں لکھا ہے، ترتیب سے پہلے تمام ضروری عنوان لکھ لئے تھے، ہر عنوان کے نیچے حدیثیں درج کرتے جاتے تھے، جس عنوان کے متعلق کوئی حدیث نہ ملتی، تو اس کو چھوڑ کر دوسرے بابوں کی ترتیب پر متوجہ ہو جاتے، چنانچہ صحیح بخاری میں بعض عنوان ایسے پائے جاتے ہیں، جن کے متعلق کوئی حدیث درج نہیں ہوئی۔

صحیح بخاری جب مرتب ہو گئی، تو امام صاحب نے اپنے استاد علی بن المدینی اور

امام احمد بن حنبل جیسے اکابر محدثین کی خدمت میں اس غرض سے پیش کیا کہ ان بزرگوں کی نظر ثانی سے مزین ہو جائے لیکن امام صاحب کی احتیاط اور تنقید نے صحیح کو اس درجہ اصح مرتب کیا تھا، کہ صرف چار حدیثوں کو انھوں نے اس قابل بتایا کہ صحیح سے خارج کر دی جائیں، اگرچہ وہ چار حدیثیں بھی دراصل صحیح ہیں۔

صحیح بخاری کی شرحین: صحیح بخاری کو جو حسن قبول حاصل ہوا، اس کی ایک ادنیٰ دلیل یہ ہے کہ شرحین کی جتنی بڑی اور جس درجہ کی جماعت اس کو نصیب ہوئی، شاید کسی کتاب کو ملی ہو، نامعلوم شرحوں کو چھوڑ کر کشف الظنون سے ان ۵۳ شرحوں کا پتہ لگتا ہے، جو امام ابو سلیمان خطابی صاحب معالم السنن، علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ بدرالدین احمد عینی، امام فخر الدین یحییٰ نووی اور حافظ جلال الدین سیوطی جیسے اکابر علما اور محدثین کے قلموں سے نکلی ہیں۔ (۱)



www.KitaboSunnat.com

(۱) حضرت سید صاحب نے طوالت کی وجہ سے ان شرحوں کے نام تحریر نہیں فرمائے، حقیقت یہ کہ بخاری کے شروع و حواشی کی تعداد بہت زیادہ ہے، عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی اس کی شرحیں لکھی گئی ہیں اور ترجمے کئے گئے ہیں، مولانا عبدالسلام مبارکپوری مرحوم نے سیرت البخاری میں ۱۳۳ شرحوں کے نام لکھے ہیں لیکن یہ تعداد بھی مکمل نہیں، (ض)

## امام ابو مسعود رازی

(متوفی ۲۵۸ھ)

نام و نسب: احمد نام، ابو مسعود کنیت، اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن فرات بن خالد۔ وطن، خاندان و ولادت: آخری عمر میں اصہبان میں سکونت اختیار کر لی لیکن اصلی وطن رے ہے، اسی لیے رازی کہلاتے تھے، حنی کی نسبت سے جو قبیلہ مضر کے ایک شخص حبیب بن رد کی جانب ہے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عربی النسل تھے، (۱) ان کے سن ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔ اساتذہ و شیوخ: ان کے چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابن ابی ندیک، ابوداؤد طیالسی، ابوصالح کاتب لیث، ابو عامر عقدی، ابویمان حمصی، ازہر بن سمان، جعفر بن عون حسین بن علی جعفی، ابواسامہ حماد بن اسامہ، شبابہ بن سوار، عبداللہ بن نمیر، عبدالرزاق بن ہمام، محمد بن عبداللہ بن ابی جعفر رازی، محمد بن عبید، محمد بن یوسف فریابی، یعلیٰ بن عبید، یزید بن ہارون وغیرہ۔ (۲)  
تلامذہ: ابو مسعود رازی کے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابن ابی عاصم، امام ابوداؤد، جعفر فریابی، عبدالرحمن بن یحییٰ بن مندہ، عبداللہ بن جعفر بن احمد، ابوخلیفہ عبداللہ بن خلیفہ بصری، محمد بن عبدالرحمن بن مندہ۔ (۳)

(۱) کتاب الانساب ورق ۲۳۳ و ۳۶۱ و الملباب ج ۱ ص ۲۵۰ و ج ۲ ص ۱۷۱ (۲) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۳۳

و تہذیب ج ۱ ص ۶۶ (۳) تہذیب الجہد ج ۱ ص ۶۶۔



رحلت و سفر: حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ۱۲ سال کی عمر میں انھوں نے حدیث کی تحریر و کتابت شروع کر دی تھی، اس کے بعد انھوں مختلف ملکوں اور دور دراز کے مقامات کا سفر کیا، ان کے کثرت اسفار کا اندازہ ذہبی کے ان الفاظ و اکثر الترحال فی لقی الرجال (محمدین سے ملاقات کے لئے انھوں نے بہت سارے سفر کئے) اور ”طوف النواحي“ وغیرہ سے کیا جاسکتا ہے، خطیب بغدادی نے بصرہ، کوفہ، حجاز، یمن، شام، جزیرہ اور بغداد وغیرہ جانے کا ذکر کیا ہے، بغداد امام احمد کی زندگی میں گئے تھے اور وہاں کے نامور علما سے مذاکرہ کیا تھا۔ (۱)

حفظ و ثقاہت: ابوسعود کے حافظہ کی جودت کا علما نے اعتراف کیا ہے، خطیب بغدادی لکھتے ہیں احد حفاظ الحدیث ومن كبار الأیمة فیہ (وہ اکابر حفاظ اور ائمہ محمدین میں تھے) امام احمد فرماتے ہیں کہ ”اس آسمان کے نیچے احادیث نبوی کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں“ ابوبکر بن شیبہ کا ارشاد ہے کہ میرے نزدیک جو تین آدمی سب سے بڑے حافظ حدیث ہیں، ان میں ابوسعود بھی ہیں، ابوالشیخ کا بیان ہے کہ وہ حفاظ کبار میں تھے، ابونعیم کا بیان ہے کہ وہ ائمہ حفاظ میں تھے، ابوبکر اعین اور امام احمد سے مروی ہے کہ مسند روایتوں کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں۔

یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کسمن کو ان سے زیادہ بہتر یادداشت والا نہیں دیکھا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ۱۸ سال کی عمر ہی میں ان کے حافظہ کی شہرت ہو گئی تھی، ان کے حفظ و ضبط کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب وہ مصر تشریف لے گئے تو لوگوں سے کہا کہ مصریوں کی حدیثیں سنو، چنانچہ وہاں کے ہر شیخ کی حدیثیں بیان کرنا شروع کیا حالانکہ ابھی یہاں کے علما سے ملاقات بھی نہیں کی تھی۔

ان کے صدق و ثقاہت کا بھی ائمہ محمدین کو اعتراف ہے، امام ذہبی اور حافظ ابن

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۴ و ۱۲۵ و ۱۲۶ و تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۳۳۔

حجر نے ان کو ثقہ، حافظ اور حجت کہا ہے، علامہ ابن حبان نے بھی ان کی ثقاہت اور ان کے حفظ وضبط، مذاکرہ و استخراج اور جمع و تصنیف احادیث کا ذکر کیا ہے، ابو عمرو بن کابیان ہے کہ وہ حافظہ میں ابو بکر بن ابی شیبہ اور تعبث میں احمد بن سلیمان رباوی کے ہم پایہ تھے، ابراہیم بن اور مر فرماتے ہیں کہ اس وقت تین ہی حفاظ رہ گئے ہیں، ان میں بھی ابو مسعود احسن الحدیث ہیں، امام احمد سے بھی ان کی توثیق منقول ہے، ایک مرتبہ فرمایا کہ تم لوگ ان سے حدیثیں لکھو وہ صدوق ہیں، خلیلی اور حاکم نے ان کو ثقہ کہا ہے۔ (۱)

**فضل و کمال:** ابو مسعود رازی کے فضل و کمال اور حدیث میں امتیاز و تبحر کے متعلق کتابوں میں بہت سے علمائے فن اور ماہرین حدیث کے اعترافات موجود ہیں، امام احمد ان کی بڑی تعظیم و توقیر اور ہمیشہ مدح و توصیف کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے، جب یحییٰ بن معین اور امام احمد کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور احادیث کا بحث و مذاکرہ شروع ہوتا تو یہ حدیثیں بیان کرتے تھے اور امام احمد خاموشی سے سنتے تھے، ایک دفعہ پانچ آدمیوں نے پانچ حدیثیں بیان کیں جب انہوں نے چھٹی حدیث بیان کی تو امام بہت مسرور ہوئے کیوں کہ ان کو اس کا علم نہ تھا، علی بن مدینی ان کو علمائے راہین میں بتاتے ہیں اور جاج بن شاعر کہتے ہیں کہ میں نے اس فن میں ان سے زیادہ ماہر اور صاحب کمال آدمی نہیں دیکھا، مورخین اور اصحاب سیر نے احوالہ علامہ محدث اصہبان اور من کبار الاممہ وغیرہ لکھا ہے۔ (۲)

احادیث کی حمایت: ان کے زمانہ میں احادیث کی مخالفت و وضع کا فتنہ پھلتا تھا، اس لیے ائمہ محدثین کی طرح یہ بھی اس کی مخالفت اور احادیث کی حفاظت و نصرت کے لیے کمر بستہ رہتے تھے۔ (۳)

**زہد و اتقا:** خطیب نے لکھا ہے کہ وہ نیک اور صاحب خیر لوگوں میں تھے اور ابن حبان کا

(۱) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۳۳ و تہذیب ج ۱ ص ۶۶ و ۶۷ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۵ و خلاصہ تہذیب

تہذیب الکمال ص ۱۱ (۲) ایضاً (۳) تہذیب العہد ج ۱ ص ۶۷۔

بیان ہے کہ سنن و آداب نبوی کے اتباع و تمسک کا بڑا التزام رکھتے تھے۔ (۱)

وفات: شعبان ۲۵۸ھ میں انتقال کیا۔ (۲)

تصنیفات: ابو مسعود رازی کثیر التصانیف تھے مگر ان کی تصنیفات دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہیں اور نہ ان کا کوئی ذکر ملتا ہے، صرف تفسیر و حدیث کی کتابوں کا علمائے سیر نے ذکر کیا ہے، تفسیر کی کتاب کا بھی نام نہیں معلوم ہو سکا۔

مسند: اس کا سب نے تذکرہ کیا ہے (۳) مگر نام کے علاوہ اور کچھ نہیں معلوم، بعض قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جمع و تالیف میں انھوں نے بڑی چھان بین اور نہایت حزم و احتیاط سے کام لیا تھا، ابو مسعود کا خود بیان ہے کہ میرے استاذ عبدالرزاق ایک ایک حدیث کا مجھ سے ۵۰۰ مرتبہ تکرار کرتے تھے، ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ میں نے ایک ہزار سات سو پچاس اشخاص سے حدیثیں سنیں اور لاکھوں حدیثیں تحریر کیں لیکن اپنی تصنیف میں صرف ۳۱۰ شیوخ کی روایتیں شامل کی ہیں جن کی تعداد پانچ ہزار ہے۔ (۴)



(۱) تہذیب الجہد ج ۱ ص ۶۷ و تاریخ بغداد ج ۴ ص ۲۳۳ (۲) ایضاً (۳) تہذیب الجہد ج ۱ ص ۶۷، ۶۸ و تذکرۃ الصالحین ج ۲ ص ۱۶ و امرأة الجنان ج ۲ ص ۱۹۹ (۴) تہذیب الجہد ج ۱ ص ۶۷، ۶۸ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۵ الرسالة المستطرفة ص ۷۳۔

## امام مسلم

(متوفی ۲۶۱ھ)

نام و نسب اور ابتدائی حالات: سلسلہ نسب یہ ہے: مسلم بن حجاج بن مسلم بن ورد بن کوشاد، ان کا اصلی نام مسلم اور ابو الحسین کنیت اور عسا کر الدین لقب ہے، (۱) مولد و مسکن کے لحاظ سے اگرچہ ان کے مایہ خمیر میں عجم کی خاک کا عنصر بھی شامل ہے لیکن دراصل ان کا سلسلہ نسب عرب کے مشہور قبیلہ بنی قشیر سے ملتا ہے، اسی بنا پر ان کو قشیری بھی کہتے ہیں۔ (۲)

امام مسلم تیسری صدی کے اوائل یعنی ۲۰۶ھ میں خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے، (۳) یہ وہ مبارک زمانہ تھا، جس میں علم حدیث نے صحابہؓ اور تابعین کے مقدس سینوں سے نکل کر مستقل فن کا قالب اختیار کر لیا تھا اور ہزاروں مجتہد اور امام پیدا ہو گئے تھے، اس لئے عام طور پر علم حدیث کا غلغلہ بلند تھا اور اس کے ساتھ خوش قسمتی سے امام صاحب کی ولادت نیشاپور جیسے شہر میں ہوئی تھی جو اس زمانہ میں محدثین کا پایہ تخت تھا، اس لحاظ سے لازمی طور پر امام صاحب نے بھی اس مقدس فن کی طرف ایسے مناسب وقت میں توجہ کی جو ہر قسم کے علمی نشوونما کا اصلی زمانہ تھا، چنانچہ (۴) اگر سال ولادت کے متعلق عام روایتوں کا اعتبار کیا جائے تو انھوں نے بارہ برس کی عمر میں حدیث کی سماعت شروع کر دی تھی، محدثین کے گروہ میں اگرچہ بہت سے ایسے بزرگ ہیں، جنھوں نے پانچ ہی

(۱) بستان المحدثین ص ۱۰۴ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۵۳، ۳۵۴ (۳) تاریخ ابن خلکان ج ۲

ص ۳۵۷ و تہذیب الاسماء واللغات ص ۹۱ جلد دوم قسم اول (۴) امام صاحب (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

سات برس کی عمر میں حدیث کی سماعت شروع کر دی تھی اور یہ واقعہ ان کے کارناموں میں غیر معمولی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، خود امام بخاری کی سماعت کا ابتدائی زمانہ ۲۰۵ھ سے شروع ہوتا ہے، (۱) جس میں ان کا سن دس برس سے زائد نہ تھا لیکن درحقیقت یہ فخر و مہابت کا ذریعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ بالکل کم سنی کے زمانہ میں کوئی شخص ایسے عظیم الشان فن کا پورے طور پر متحمل نہیں ہو سکتا، امام صاحب کو بھی اس زمانہ کی حالت اور نیشاپور کی علمی وسعت کے لحاظ سے اس قسم کے مواقع حاصل تھے، تاہم انھوں نے علم حدیث کی سماعت کو اس زمانے پر موقوف رکھا جو ہر قسم کی اہلیت کا زمانہ ہوتا ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے اس فن کے نشیب و فراز اور اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر اس میدان میں قدم رکھا لیکن افسوس ہے کہ امام صاحب کی طالب علمی کے حالات اس قدر کم معلوم ہیں کہ اس کا پتہ بھی نہیں چل سکتا کہ انھوں نے سب سے پہلے کس کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا مگر انھوں نے جس سرگرمی کے ساتھ اس مقدس فن کی طرف توجہ کی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں اگرچہ خود خراسان اور نیشاپور میں، اسحاق بن راہویہ اور امام ذہلی جیسے اساتذہ فن موجود تھے، تاہم امام صاحب نے ان بزرگوں کو چھوڑ کر ان تمام مقامات کی خاک چھانی، جہاں جہاں علم حدیث کا جلوہ نظر آتا تھا، رے کے محدثین میں سے محمد بن مہران جمال اور (پچھلے صفحہ کا بقیہ) کے سال ولادت کے متعلق اگرچہ عام تذکرے متفق اللفظ ہیں تاہم علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا سال ولادت ۲۰۴ھ بتایا ہے اور ان کے سماعت حدیث کی ابتدا ۲۱۸ھ میں قرار دی ہے، اس لحاظ سے ان کی سماعت کا زمانہ ۱۴ برس کی عمر سے شروع ہوتا ہے، اس سے اگرچہ ہمارے قیاس کی اور زیادہ تائید ہوتی ہے لیکن ہم نے سال ولادت کے متعلق ابن خلکان کا زیادہ اعتبار کیا ہے کیوں کہ انھوں نے بطور خود زیادہ تحقیق سے کام لیا ہے، اس کے علاوہ ذہبی کے الفاظ بھی ضعف پر دلالت کرتے ہیں، حافظ ابن حجر، علامہ ابن کثیر اور بعض مورخین نے بھی ۲۰۴ھ کی روایت کی ہے اور شاہ عبدالعزیز نے ان دونوں کے علاوہ ۲۰۲ھ کی بھی روایت کی ہے (۱) (۱۰۶) (۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۳۔

ابو غسان وغیرہ سے سماعت کی، عراق میں امام احمد بن حنبل اور ابو عبد اللہ بن مسلمہ قعنبی سے فائدہ اٹھایا، حجاز میں سعید بن منصور اور ابو مصعب سے روایتیں حاصل کیں، مصر میں عمرو بن سواد اور حرملہ بن یحییٰ جو امام شافعیؒ کے ممتاز شاگرد تھے کے حرمین فیض کی خوشہ چینی کی، (۱) بغداد میں آخر عمر تک سفر کا سلسلہ قائم رکھا، چنانچہ ۲۵۹ھ میں بغداد کا سفر امام صاحب کا آخری سفر تھا۔ (۲) کیوں کہ اس کے بعد موت نے دو برس سے زیادہ جینے کا موقع نہیں دیا، بغداد میں یحییٰ بن صاعد اور محمد بن مخلد سے استفادہ کیا، احمد بن سلمہ کی رفاقت میں بصرہ اور بلخ کا بھی سفر کیا (۳) امام بخاری سے بھی ان کے نیشاپور کے سفر میں بہت کچھ فائدہ اٹھایا، (۴) ان بزرگوں کے علاوہ احمد بن یونس یربوعی، اسماعیل بن ابی اویس، عون بن سلام، اسحاق بن راہویہ، یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری، قتیبہ بن سعید، علی بن جند، محمد بن ریح، ابراہیم بن منذر، ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ، وغیرہ سے بھی استفادہ کیا۔ (۵)

امام صاحب کی شہرت: امام صاحب کے زمانہ میں علم حدیث کے عام مذاق اور مذہبی احساس کے باہمی اختلاط نے اگرچہ سیکڑوں ہزاروں ائمہ فن پیدا کر دیئے تھے، جن کی شہرت اور فضیلت کا عموماً اعتراف کیا جاتا تھا اور جن میں اکثر بزرگوں کو امام صاحب کی استادی کا بھی شرف حاصل تھا، تاہم امام صاحب کی فطری قابلیت اور قوت حافظہ نے ان تمام بزرگوں کو اپنے فضل و کمال کا معترف بنا لیا، یہاں تک کہ وہ محدثین بھی جو امام صاحب کے ہم درجہ

(۱) مقدمہ صحیح مسلم للنووی (۴) مابین خلکان نے اس سفر کا ذکر ان کے اساتذہ اور تحصیل علم کے ضمن میں کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغداد کا سفر بھی اسی غرض سے ہوا تھا اگرچہ اس کی خود تصریح نہیں کی، خطیب نے بھی سفر بغداد کا اسی طور پر ذکر کیا ہے مگر ان کے یہاں یہ لفظ بھی ملتا ہے "حدث بھا" ج ۱۳ ص ۱۰۱، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب سے بغداد کے لوگوں نے بھی کسب فیض کیا تھا (۳) تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۲۱۰ و تذکرہ احمد بن سلمہ (۴) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ و تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۵۲

(۵) تہذیب الاسماء جلد ۲ قسم اول ص ۹۱۔

اور فن حدیث کے امام تھے، ان سے روایت کرنے میں مطلق درجہ نہیں کرتے تھے، چنانچہ ابو حاتم رازی، موسیٰ بن ہارون، احمد بن سلمہ، ابو یوسفی ترمذی، یحییٰ بن صاعد، ابو عوانہ اسفراکینی، اسی قسم کے بزرگ ہیں، ان بزرگوں میں احمد بن سلمہ وہ بزرگ ہیں جو بصرہ اور بلخ کے سفر میں امام صاحب کے رفیق اور ۱۵ برس تک صحیح مسلم کی ترتیب میں شریک رہ چکے ہیں، امام صاحب کی طباعی اور ذہانت نے خود ان کے اساتذہ کو اس قدر گرویدہ بنا لیا تھا کہ اسحاق بن راہویہ جیسے امام فن ان مختصر الفاظ میں ان کے فضل و کمال کی نسبت پیشین گوئی کرتے تھے:

ای رجل یکون هذا؟ خدا جانے یہ کس بلا کا شخص ہوگا۔

امام صاحب کی تعقید اور حقیقت شناسی کا اس قدر شہرہ تھا کہ ابو زرعہ اور ابو حاتم جیسے ادا شناس بزرگ ان کو معرفت حدیث میں اس زمانے کے تمام مشائخ پر ترجیح دیتے تھے، (۱) اسحاق کو سچ خود امام صاحب سے خطاب کر کے فرماتے تھے:

لن نعدم الخیر ما بقی اللہ جب تک خدا آپ کو مسلمانوں کے  
للمسلمین۔ (۲) لئے زندہ رکھے گا بھلائی ہمارے ہاتھ  
سے نہ جانے پائے گی۔

ابو قریش نے ان کو دنیا بھر کے حفاظ اربعہ میں شمار کیا ہے۔ (۳)

غرض کہ امام صاحب کی مقبولیت اور شہرت اس درجہ کو پہنچ گئی کہ اہل مغرب نے ان کے نام کو امام بخاری جیسے مسلم امام کے نام سے بھی اونچا اچھالا۔

وفات: امام صاحب کے واقعات زندگی میں ان کی وفات کا واقعہ جس قدر افسوس ناک ہے، اس سے زیادہ حیرت انگیز اور قابل لحاظ ہے، کیونکہ اس سے امام صاحب کی علمی شہرت کی

(۱) ایضاً وبتسن المحدثین ص ۱۰۴ و تہذیب الاسماء قسم اول ج ۲ ص ۹۱ و تاریخ بغداد ج ۱۳ و مقدمہ نووی

ص ۱۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۶۵ و تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۲ (۳) تذکرۃ ذہبی ج ۲ ص ۱۶۶

و تہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۸۔

پتہ چلتا ہے، اصل واقعہ یہ ہے کہ عین مجلس حدیث میں لوگوں نے امام صاحب سے ایک حدیث پوچھی، سوء اتفاق سے امام صاحب کو وہ حدیث یاد نہ تھی، اس لئے مکان پر آ کر اپنے مجموعہ حدیث میں اس کی جستجو شروع کی، اس چھان بین میں اس قدر محو ہوئے کہ سامنے خرما کا ایک ڈھیر رکھا ہوا تھا، اس سے نکال نکال کر کھاتے جاتے تھے لیکن حدیث کی فکر میں اس کی مطلق ان کو خبر نہیں ہوئی کہ اس بے خودی کی حالت میں کتنے خبرے کھا گئے، یہی واقعہ ان کی موت کا سبب ہوا۔ (۱)

عام طور پر تذکرہ نویسوں نے اگرچہ اس واقعہ سے نفیاً یا اثباتاً کچھ تعرض نہیں کیا، لیکن اس قسم کے واقعے عقلاً ممکن بلکہ واقع ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں، بہر حال امام صاحب نے ۲۵ رجب ۲۶۱ھ کو یکشنبہ کے دن نیشاپور میں بوقت شام ۵۵ برس کی عمر میں (۲) وفات پائی، دو شنبہ کے دن جنازہ اٹھایا گیا اور نیشاپور کے باہر ایک مقام مہر آباد میں سپرد خاک کر دیے گئے۔ (۳)

اخلاق و عادات: امام صاحب نہایت پاکیزہ خواد انصاف پسند تھے، اس زمانہ میں اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی اخلاقی حالت نہایت مہذب اور شائستہ تھی تاہم جس طرح اس زمانے کے اہل کمال میں باہم ان بن رہتی ہے، اسی طرح اُس زمانہ کے مقدس اصحاب بھی اس سے خالی نہ تھے؛ اسی بنا پر رجال کی کتابوں میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ باہم معاصرین کی جرح و قدح قابل قبول نہیں کیوں کہ وہ لوگ ایک دوسرے کی نسبت رشک و حسد سے بہت کچھ برا بھلا کہہ دیا کرتے تھے، یہ محض معمولی درجہ کے لوگوں کا شیوہ نہ تھا بلکہ یحییٰ بن معین جیسے مقدس اصحاب بھی اس زمرہ میں شامل ہیں مگر امام صاحب کا دامن ہمیشہ اس قسم

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ و تہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۷ (۲) صحیح روایت کے مطابق امام صاحب کی عمر

انتقال کے وقت ۵۵ سال تھی مگر بعض مورخین نے جن میں ابن کثیر بھی شامل ہیں ۵۷ سال عمر بتائی ہے

(۳) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۲۷۔



کے دھبوں سے پاک رہا اور انھوں نے ہمیشہ نہایت فیاضی سے اس کا عملی ثبوت دیا، نیشاپور کے سفر میں امام بخاری کی مجلس میں ضرور آتے تھے اور ان سے استفادہ کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ان کے تبحر علمی سے متاثر ہو کر نہایت بے خودی کی حالت میں پکاراٹھے، دَعْنِیْ اِقْبَلْ رَجْلِیْکَ یَا امیر المؤمنین فی الحدیث (۱) یعنی اے ملک حدیث کے بادشاہ! مجھ کو قدم بوسی کی اجازت دیجئے، اسی طرح اپنی کتاب مسلم کو خود ابو زرعہ رازی کی خدمت میں پیش کیا، وہ جن حدیثوں کو صحیح بتاتے تھے، ان کو بعینہ قائم رکھتے تھے اور جن حدیثوں پر نکتہ چینی کرتے تھے، ان کو بے تکلف چھوڑتے جاتے تھے (۲) لیکن ان کا حقیقی وصف، ان کی آزادی اور حق گوئی ہے اور اس کی وقعت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب مسلمانوں کی عام حالت کا اندازہ کیا جائے، آج تو مسلمانوں کا رواں رواں تقلید کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے لیکن اس زمانے میں بھی قرون اولیٰ کے بعد ہی سے بے جا طرف داری اور ناجائز رعایت کا مادہ پیدا ہو گیا تھا اور امتداد زمانہ کے ساتھ روز بروز اس کو ترقی ہوتی جاتی تھی لیکن امام صاحب پر اس کا بالکل اثر نہ پڑ سکا وہ اس قدر حق پرست تھے کہ اس کے مقابلہ میں اپنے اساتذہ کا بھی خیال نہیں کرتے تھے، چنانچہ جب امام بخاری نے نیشاپور کا سفر کیا اور سوء اتفاق سے ایک جزئی سوال، یعنی مسئلہ خلق قرآن کے متعلق عوام اور عوام کے ساتھ امام ذہلی جیسے نکتہ سنج محدث بھی امام صاحب کے مخالف ہو گئے اور اس مخالفت کا یہ اثر ہوا کہ امام ذہلی نے اپنی مجلس حدیث میں عام اعلان کر دیا۔

الا من قال باللفظ فلا یحل له  
ان یحضر مجلسنا۔

خبردار جو شخص قرآن مجید کے الفاظ کو  
مخلوق کہے گا اس کو ہماری مجلس میں آنا

حرام ہے۔

(۱) خطیب اور ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں دَعْنِیْ حَتّٰی اِقْبَلْ رَجْلِیْکَ یَا استاذ الاستاذین  
وسید المحدثین وطیبیب الحدیث فی عللہ دیکھو تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ و البردایین ج ۱۱  
ص ۳۳ (۲) مقدمہ مسلم نووی ص ۲۶۔

اس موقع پر امام صاحب نے اپنی اسی حق پرستی سے کام لیا، وہ امام بخاری کی رائے کو صحیح سمجھتے تھے، اس لیے ایک حق بات پر امام ذہلی کے شاگردانہ تعلق کو بالکل بھلا دیا اور سر مجلس اپنی چادر تان کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی مجلس کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا اور گھر پر جا کر ان کی تقریروں کے تمام نوشتے اونٹوں پر لدا کر بھجوا دیے۔ (۱)

امام بخاری کی یہ تائید اور حمایت بھی ایک خاص مسئلہ بھی تھی، ورنہ عام طور پر وہ امام بخاری کے بھی ہم زبان نہیں، چنانچہ معنسن روایتوں میں امام بخاری ہم عصری کے ساتھ راوی اور مروی عنہ میں ملاقات کی جو ایک ضروری شرط قرار دیتے ہیں، امام صاحب اس کے سخت مخالف ہیں، چنانچہ صحیح مسلم کے مقدمہ میں جہاں اس مسئلہ کی بحث کی ہے، اس کو پڑھ کر سخت حیرت ہوتی ہے، یا تو یہ حال تھا کہ ایک جزئی مسئلہ پر امام ذہلی کے قدیم شاگردانہ تعلق کو چھوڑ کر امام بخاری کے ہم خیال بن گئے اور اپنی عمر کی کمائی (یعنی امام ذہلی کے مجموعہ حدیث) کی بھی کچھ پروانہ کی یا خود امام بخاری کی تردید ان الفاظ میں کرتے ہیں:

|                            |                                   |
|----------------------------|-----------------------------------|
| وقد تکلم بعض منتحلی        | یعنی ہمارے زمانہ کے بعض مدعیان    |
| الحديث من اهل عصرنا في     | حدیث اسانید کی صحت اور سقم کے     |
| تصحیح الاسانید وسقمها      | متعلق ایک ایسے قول کے قائل ہوئے   |
| بقول لوضربنا عن حکایتہ     | ہیں کہ اگر ہم اس کے ذکر اور اس کی |
| ونکر فسادہ لکان رأیا متینا | تردید سے اعراض کرتے تو اچھا       |
| ومذهبنا صحیحًا اذا         | ہوتا کیوں کہ مردود اقوال سے اعراض |
| الاعراض عن القول المطرح    | کرنا ہی مناسب ہے۔                 |

احری (۲)

کہاں یہ خوش اعتقادی کہ ان کے فضل و کمال سے متاثر ہو کر نہایت جوش کے

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ اور تاریخ ابن خلکان ص ۵۲۷ (۲) مقدمہ مسلم مصر ص ۱۲۷، ۱۲۸۔

ساتھ فرماتے تھے۔

دعنى اقبل رجلىك يا امير  
يعنى اے علم حدیث کے بادشاہ مجھ کو  
المومنين فى الحديث .  
قدم بوسى كى اجازت دیجئے۔

كهاں یہ کیفیت کہ ان ہی کا ذکر اس بے پروائی کے ساتھ کرتے ہیں۔  
زعم القائل الذى افتتحنا  
هم نے جس قائل کے قول اور اس کی  
الكلام على الحكاية عن قوله  
غلط جنبی کا ذکر کیا ہے وہ گمان کرتا ہے  
والاخبار عن سوء رويته. (۱)

الغرض ان کی حق پسند روش، ان کو تقلید، تعصب اور بے جا طرف داری کا مطلق  
خوگر نہیں ہونے دیتی تھی، اس لیے وہ اسی شاہراہ پر چلتے تھے جس کی طرف ان کا حق پرست  
دل رہ نہائی کرتا تھا۔ (۲)

تصنيفات وتالیفات: امام صاحب کو تصنیف و تالیف کا فطری شوق تھا، صحیح مسلم کو جس  
تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھا اس کا ذکر ایک مستقل عنوان سے آگے آئے گا لیکن اس  
(۱) مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۲۹۔ (۲) اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عموماً محدثین کا گروہ اگرچہ کسی امام کا  
مقلد نہ تھا اور نہ اس کو ہونا چاہیے تھا تاہم ان میں کسی بزرگ کا مذہب، کسی خاص امام سے زیادہ ملتا جلتا تھا  
تو ان کو تقلید پرست لوگ اس امام کی طرف منسوب کر دیتے تھے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ الباقیہ  
میں لکھتے ہیں:

وكان صاحب الحديث ايضاً قد ينسب الى احد المذاهب لكثرة موافقته  
به كالنسائي والبيهقي ينسبان الى الشافعي غالباً اى بنا پر یا اور کسی وجہ سے صاحب کشف  
الظنون نے امام صاحب کو ایک ضمنی تذکرے میں امام شافعی کی طرف منسوب کر دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے  
کہ وہ بجائے خود ایک مستقل امام تھے اور ہر مسئلہ کے متعلق اپنی آزاداندہ رائے رکھتے تھے اس لیے ان کو کسی  
مذہب کی طرف منسوب کرنا ان کی حقیر ہے۔

کے علاوہ اور بھی نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں جن کے موضوع اور اجمالی حالت کا اندازہ خود ان کے نام کی فہرست سے ہوگا:

- ۱- مسند کبیر، ۲- الاسماء (الکنی)، ۳- جامع کبیر، ۴- کتاب العلل، ۵- کتاب التمزیر، ۶- کتاب الوجدان، ۷- کتاب الافراد، ۸- کتاب الاقران، ۹- کتاب سولاتہ لاحمد بن حنبل، ۱۰- کتاب حدیث عمرو بن شعیب، ۱۱- کتاب الانتفاع باہب السباع، ۱۲- کتاب مشارح مالک، ۱۳- کتاب مشارح ثوری، ۱۴- کتاب مشارح شعبہ، ۱۵- کتاب من لیس لہ الاراد واحد، ۱۶- کتاب الخضر مین، ۱۷- کتاب اولاد الصحابہ، ۱۸- کتاب اوہام المحدثین، ۱۹- کتاب الطبقات، ۲۰- کتاب افراد الشامیین۔

## صحیح مسلم

امام صاحب نے اگرچہ جیسا کہ ہم ابھی لکھ آئے ہیں، علم حدیث کے متعلق خاص خاص موضوع پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں لیکن ان کو صحیح مسلم کی شہرت اور مقبولیت نے اس طرح دبایا ہے کہ آج کوئی شخص ان کا نام بھی نہیں جانتا، امام صاحب کی تصنیفات سے قطع نظر کر کے، حدیث کی عام کتابوں کا بھی قریب قریب یہی حال ہے، خود صحیح بخاری کو اگرچہ ائمہ فن نے متعدد وحیثیتوں سے مسلم پر ترجیح دی ہے، تاہم مسلم کو یہ شرف قبول حاصل ہے کہ ہمیشہ بخاری کے ساتھ ساتھ اس کا بھی نام لیا جاتا ہے، اس لئے ہم مسلم کی ان خصوصیات کو دکھانا چاہتے ہیں، جنہوں نے اس کو اس قدر شہرت دی ہے۔

اس سلسلہ میں جو چیز سب سے زیادہ قابل ذکر ہے وہ اس کتاب کا مقدمہ ہے، کیوں کہ اس سے ایک طرف جرح و تعدیل اور اصول حدیث کے متعلق نہایت مہتمم بالشان نکتے معلوم ہوتے ہیں اور دوسری طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے جس زمانے میں

اس کو مرتب کیا، اس میں کس قدر موضوع حدیثیں پیدا ہوئی تھیں، اس لئے ایسی حالت میں ایسی صحیح کتاب کا مرتب کرنا کس قدر دشوار اور اہم تھا، اس بنا پر ہم سب سے پہلے اسی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

مقدمہ مسلم: مذہب اگرچہ دنیا کی تمام قوموں کو عزیز ہے، تاہم مسلمانوں نے اس کو جس عزت کی نگاہ سے دیکھا، دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ علمی حیثیت سے مسلمانوں نے سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ کی وہ یہی مذہبی علوم و فنون تھے، ان میں نحو، ادب، تفسیر، اصول فقہ اگرچہ سب کے سب بالذات یا بالواسطہ مذہبی علوم ہیں اور اس لئے مسلمانوں نے ان سب میں کمال پیدا کیا، تاہم ان میں علم حدیث چونکہ مذہب کا سب سے زیادہ ضروری عنصر تھا، اس لئے یہ مقدس فن ایک مدت تک عام طور پر مسلمانوں کے دل و دماغ کا جولانگہ رہا، اس عام مذاق نے اگرچہ نہایت مفید نتائج پیدا کئے، تاہم چونکہ مذہبی حیثیت سے یہ گروہ نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس لئے نااہل اور خود غرض لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس فن کو محض نام و نمود کا ذریعہ قرار دے کر موضوع اور غیر معتبر روایتوں کا ایک طوفان اٹھادیا، چنانچہ خود امام صاحب اپنے مقدمہ میں ضعیف راویوں کا استقصا کر کے لکھتے ہیں:

|                          |                                    |
|--------------------------|------------------------------------|
| ولاحسب کثیراً ممن یعرج   | وہارا خیال ہے ان مجہول الاسناد اور |
| من الناس علی ما وصفنا من | ضعیف روایتوں پر جن کو ہم نے بیان   |
| ہذہ الاحادیث الضعاف      | کر دیا ہے، ان کے ضعف کے ظاہر       |
| والاسانید المجهولة ویعتد | ہونے کے بعد بجز ان لوگوں کے جن کو  |
| بروایتها بعد معرفته      | عوام کے نزدیک کثرت سے حدیثیں       |
| وبمافیہا من التوہن       | بیان کرنے کا شوق ہوتا ہے، تاکہ یہ  |
| والضعف الا ان الذی یحملہ | کہا جائے کہ فلاں نے کس کثرت        |
| عن روایتها والاعتداد بہا | سے حدیثیں جمع کی ہیں، اکثر لوگ     |
| ارادة التکثیر بذلک عند   | اعتبار نہ کریں گے لیکن جو لوگ علم  |

حدیث میں یہ مسلک اختیار کرتے  
ہیں، ان کو اس فن میں ذرا بھی دخل نہیں  
اور ان کو بجائے عالم کے جاہل کہنا  
اچھا ہے۔

العوام ولان يقال ما اكثر  
ما جمع فلان من الحديث  
والف من العدو ومن ذهب في  
العلم هذا المذهب ومسلک هذا  
الطريق فلانصيب له فيه  
وكان بان يکنى جاهلا اولی  
من ان ينسب الی العلم۔

(ص ۱۲۷)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ اس زمانے میں محض شہرت کے لئے ہر  
قسم کی رطب و یابس حدیثوں کے روایت کرنے کا مذاق پیدا ہو چلا تھا لیکن ان خود غرض  
لوگوں سے گزر کے جو دفتر غیر معتبر اور موضوع حدیثوں کی روایت میں شہرت عام رکھتا تھا،  
وہ متعسف زاہدوں اور مسجد نشینوں کا مقدس فرقہ تھا، چنانچہ اس زمانہ کے نکتہ سنج لوگ، ان  
بزرگوں کو جس نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کا اندازہ ذیل کی روایتوں سے ہوگا:

مجھ سے محمد بن ابی عتاب اور ان سے  
عفان اور ان سے محمد بن یحییٰ بن سعید  
بن قطان اور ان سے ان کے باپ  
نے حدیث بیان کی کہ ہم حدیث میں  
صالحین سے زیادہ جھوٹا کسی کو نہیں  
دیکھتے، دوسری روایت میں ہے کہ ابن  
ابی عتاب کا بیان ہے کہ میں نے محمد بن  
یحییٰ بن سعید بن قطان سے ملاقات کی

حدثنی محمد بن ابی عتاب  
قال اخبرنی عفان عن محمد  
بن یحییٰ بن سعید القطان  
عن ابیه قال لم نر الصالحین  
فی شیء اکذب منهم فی  
الحديث قال ابن ابی عتاب  
فلقیته ابامحمد بن یحییٰ بن  
سعید القطان فسالتہ عنہ

اور اس حدیث کو پوچھا تو انھوں نے اپنے باپ کے ذریعہ سے بیان کیا کہ تم حدیث میں اہل خیر سے زیادہ جھوٹا نہ پاؤ گے، امام مسلم کا بیان ہے کہ ان کے قول کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ جھوٹ بول جاتے ہیں مگر اس کا قصد نہیں کرتے۔

حلوانی نے ہم سے روایت کی کہ میں نے عصفان سے سنا کہ انھوں نے حماد بن سلمہ کے پاس صالح مری کے ذریعہ سے ثابت سے ایک روایت بیان کی، انھوں نے کہا کہ صالح جھوٹ کہتا ہے، اسی طرح ان کا بیان ہے کہ میں نے صالح مری کے ذریعہ سے ہام کے پاس ایک حدیث بیان کی، انھوں نے فرمایا کہ وہ جھوٹ کہتا ہے۔

حالانکہ صالح مری اتنے بڑے زاہد، خدا ترس اور رقیق القلب تھے جن کی نسبت

شارح نووی نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

صالح رحمہ اللہ نہایت خوش الحانی سے قرآن پڑھتے تھے، یہاں تک کہ بہت

وکان صالح رحمہ اللہ حسن الصوت بالقرآن و قد مات

فقال عن ابیه لم تراہل الخیر فی شیء اکذب منهم فی الحدیث قال مسلم یقول یجسری الکذب علی لسانہم ولا یتعمدون الکذب (ص ۹۴، ۹۵)

حدثنا الحلوانی قال سمعت عفان قال حدثت حماد بن سلمة عن صالح المري بحديث عن ثابت فقال كذب وحدثت هماما عن صالح المري بحديث فقال كذب. (مقدمہ مسلم ص ۱۱۰، ۱۱۱)

بعض من سمع قرآته وكان  
شديد الخوف من الله تعالى  
كثيرا البكاء قال عفان ابن  
مسلم كان صالح اذا اخذ في  
قصصه كانه رجل مذعور  
يفزعك امره من حزنه وكثرة  
بكائه كانه ثكلى  
(حاشیہ مقدمہ مسلم ص ۱۱۱)

سے لوگ ان کی قرأت سن کر مر گئے، وہ  
خدا کا سخت خوف کرتے تھے اور اکثر  
روتے رہتے تھے، عفان بن مسلم کا  
بیان ہے کہ جب وہ قہے بیان کرتے  
تھے تو اس خوف زدہ آدمی کی طرح  
معلوم ہوتے تھے جو اپنے کثرت خوف  
سے تم کو بھی خوف و دہشت میں مبتلا کر  
دے گا اور ان کی نو حزاری سے معلوم  
ہوتا تھا کہ گویا وہ ایک عورت ہیں جو  
اپنے لڑکے کا ماتم کر رہی ہے۔

صالح مری کی طرح اور بھی بہت سے بزرگ تھے جو مذہب کے سخت پابند تھے  
لیکن احادیث میں بہت کچھ طمع سازی کیا کرتے تھے۔

حدثني محمد بن عبد الله بن  
قهبزاد من اهل مرو قال  
اخبرني علي بن حسين بن  
واقد قال قال عبد الله بن  
المبارك قلت سفیان الثوري  
ان عباد بن كثير من تعرف  
حاله واذا حدث جاء  
بامر عظيم فتري ان اقول  
للناس لا تاخذوا عنه قال

مجھ سے محمد بن عبد اللہ بن قہزاد مروزی  
نے روایت کی کہ مجھ کو علی بن حسین بن  
واقد نے خبر دی کہ عبد اللہ بن مبارک  
فرماتے تھے کہ میں نے سفیان ثوری  
سے کہا کہ آپ تو عباد بن کثیر کا حال  
خوب جانتے ہیں، جب وہ حدیث  
بیان کرتے ہیں تو قیامت ڈھاتے  
ہیں، تو کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں  
کہ میں لوگوں سے کہہ دوں کہ ان کی



حدیثیں نہ قبول کرو، انہوں نے کہا  
ہاں، عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ  
اس کے بعد جب کسی مجلس میں عباد کا  
ذکر آتا تھا تو میں ان کے تدین کی  
تعریف کرتا تھا لیکن اسی کے ساتھ ہی  
لوگوں سے یہ بھی کہتا تھا کہ ان کی  
حدیثیں قبول نہ کرو۔

ہم سے محمد اور ان سے عبداللہ بن عثمان  
نے حدیث بیان کی کہ ان کے باپ  
نے کہا کہ ہم سے عبداللہ بن مبارک  
نے فرمایا کہ میں شعبہ کے پاس گیا تو  
انہوں نے فرمایا کہ یہ عباد بن کثیر ہے  
اس سے بچتے رہو۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض محدثین نے صاف صاف تصریح کر دی ہے کہ یہ لوگ  
اس فن میں اہلیت نہیں رکھتے تھے۔

ہم سے احمد بن ابراہیم اور ان سے  
سلیمان بن حرب اور ان سے حماد بن  
زید نے روایت کی کہ ایوب کے یہاں  
فرقد کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا کہ فرقد  
اہل حدیث نہیں۔

سفیان بلی قال عبداللہ  
فکننت اذا کننت فی مجلس  
نکر فیہ عباداً اثنتی علیہ فی  
دینہ واقوز، لاتاخذوا عنہ۔  
(مقدمہ مسلم ص ۹۴)

حدثنا محمد حدثنا عبداللہ  
بن عثمان قال قال ابی قال  
عبداللہ بن المبارک انتہیت  
الی شعبۃ فقال هذا عباد بن  
کثیر فاحذروه۔  
(مقدمہ صحیح مسلم ص ۹۴)

حدثنی احمد بن ابراہیم  
قال حدثنی سلیمان بن  
الحرب عن حماد بن زید  
قال نکر فرقد عند ایوب  
فقال ان فرقداً لیس صاحب  
حدیث۔ (مقدمہ مسلم ص ۱۲۲)

حالانکہ فرقد تابعی اور بہت بڑے عابد شخص تھے، چنانچہ شارح نووی کہتے ہیں:

|                           |                                            |
|---------------------------|--------------------------------------------|
| التابعی العابد لا یحتج    | یعنی فرقد تابعی اور عابد شخص تھے، اہل      |
| بحدیثہ عند اهل الحدیث     | حدیث کے نزدیک ان کی حدیثوں کا              |
| لکونہ لیس صفتہ کما قدمنا  | اس بنا پر اعتبار نہیں کیا جاتا کہ یہ ان کا |
| فی قوله لم نر الصالحین فی | فن نہیں تھا، جیسا کہ ہم نے لم نر           |
| شیء اکذب منهم فی الحدیث۔  | الصالحین فی شیء اکذب منهم                  |
| (حاشیہ مقدمہ ص ۱۲۲)       | فی الحدیث کے ذکر میں بیان کیا۔             |

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چونکہ یہ تمام بزرگ نہایت خدا ترس، متقشف اور عبادت گزار ہوتے تھے، اس لیے محدثین نے ان کی دروغ گوئی اور ضعیف روایت کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہ لوگ اہل فن نہ تھے، چنانچہ پہلی حدیث میں خود امام صاحب نے تصریح کر دی ہے کہ یہ لوگ عمداً جھوٹ نہیں بولتے تھے، چنانچہ شارح نووی اس قول کی شرح میں لکھتے ہیں:

|                             |                                     |
|-----------------------------|-------------------------------------|
| معناه ما قالہ مسلم انه یجری | یعنی مسلم نے جو یہ کہا ہے کہ وہ لوگ |
| الکذب علی السننہم           | یوں ہی جھوٹ بول جاتے ہیں لیکن       |
| ولا یتعمدون ذلک لکونہم      | اس کا قصد نہیں کرتے، اس کے معنی یہ  |
| لا یعانون صناعۃ اهل         | ہیں کہ وہ لوگ صاحب فن نہ تھے، اس    |
| الحدیث فیقع الخطافی         | لیے ان کی روایتوں میں غلطی واقع     |
| روایاتہم ولا یعرفونہ        | ہو جاتی ہے لیکن وہ لوگ اس کو نہیں   |
| ویروون الکذب ولا یعلمون     | جانتے جھوٹ روایت کر دیتے ہیں        |
| انه کذب۔ (حاشیہ مقدمہ ص ۹۲) | اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہ جھوٹ ہے۔   |

اس وجہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں لیکن ہم کلیتہً اس سے اتفاق نہیں کر سکتے

کیوں کہ جس طرح اس زمانے کے عام واعظ، مریدین کو خوش اور مجلس و عظ کے گرامانے کے لیے نہایت عجیب و غریب حدیثیں بیان کر جاتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کی نسبت بھی اس قسم کا خیال پیدا ہو سکتا ہے، بہر حال واقعہ جو کچھ ہو لیکن ان بزرگوں کی یہ تمام خانہ براندازیاں چوں کہ مذہب اور مذہب کے ساتھ زہد کے پردے میں تھیں، اس لیے عام طور پر کوئی شورش نہیں پیدا ہوئی خیر، اس بنا پر محدثین کے گروہ میں زیادہ تر شور وغل اس وقت ہو جب عقائد کے متعلق مبتدعانہ خیالات ظاہر ہوئے، اسلام میں اختلافی مسائل کی بنیاد اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہی پڑ گئی تھی لیکن بدعت کا آغاز صحابہؓ کے آخری زمانہ میں ہوا، چنانچہ معبد چینی، غیلان دمشق، یونس اسواری نے اسی زمانہ میں قضا و قدر کا انکار کیا (۱) تابعین کے زمانے میں اس قسم کے اور بھی بہت سے گمراہ پیدا ہوئے، چنانچہ جعد بن درہم نے بنی امیہ کے زمانے میں ایک عجیب و غریب خیال ظاہر کیا، اس نے صراحتاً دعویٰ کیا کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا اور نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا (۲) اس جرم پر اس کو خالد بن عبداللہ قسری نے جو ہشام بن عبدالملک کی طرف سے عراق کا گورنر تھا، عید انجلی کے دن عجیب شان سے قتل کیا، پہلے اس نے ایک عام اعلان کیا کہ میں آج خدا کی راہ میں قربانی کرنا چاہتا ہوں، جس کو شریک ہونا ہو شریک ہو، اس طور پر اس نے مسلمانوں کے مجمع عام میں قربانی کی، (۳) اس کے بعد اس کا عام مذاق پیدا ہو گیا اور نہایت کثرت سے لوگوں نے محدثین کے خلاف اپنے خیالات ظاہر کرنا شروع کیے، جہم بن صفوان نے جس کی طرف فرقہ جہمیہ منسوب ہے، نصر بن سيار کے زمانے میں

(۱) ملل و نحل شہرستانی ص ۳۱ بر حاشیہ ملل ابن حزم جلد اول مطبوعہ ادیبہ مصر طبع اول ۱۳۱۷ھ و شرح مواقف ج ۲ ص ۲۷۹ (۲) میزان الاعتدال ذہبی جلد ۱ ص ۱۸۵ مطبوعہ سعادت مصر ۱۳۲۵ھ (۳) اس کا واقعہ نہایت مشہور ہے، اسی کی طرف علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے فقط علی ذلك بالعراق يوم النحر والقصة مشهورة میزان الاعتدال جلد اول ص ۱۸۵

ترمذ میں اپنی بدعت کی اشاعت کی، وہ جبریہ اعتقاد رکھتا تھا، اس لیے بندے کو مجبور محض قرار دیتا تھا، اس جرم پر سالم بن اجوز المازنی نے اس کو بنی امیہ کے آخری زمانے میں مرو میں قتل کر ڈالا، (۱) تقریباً اسی زمانے میں بصرہ میں واصل بن عطاء الغزال جو حسن بصری کا شاگرد تھا اور اس کے شاگرد عمرو بن عبید نے اعتزال کی بنیاد قائم کی، مقاتل بن سلیمان مفسر نے خراسان میں خدا کے لیے ہر قسم کے صفات ثابت کیے اور حسمت کا قائل ہوا، ان سب کے بعد جحستان میں ابو عبد اللہ بن کرام نے چند مذاہب - کچھ مسائل اخذ کر کے ایک جدید مذہب قائم کیا اور اس کو ایک کتاب کے ذریعہ سے خراسان وغیرہ میں رواج (۲) عام دیا، اس کا خیال تھا کہ ایمان محض قول باللسان کا نام ہے، اس لحاظ سے اگر کوئی شخص دل میں کفر کا اعتقاد رکھے اور زبان سے خدا اور شریعت کا اقرار کرے تو وہ مومن ہے، اس بنا پر نیشاپور میں آٹھ سال تک قید رہا، اس کے بعد بیت المقدس چلا گیا اور شام میں ۲۵۵ھ میں وفات پائی اور اس کے مقلدین واصحاب نے اس کی قبر پر اع تکاف کیا (۳) اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فرقے پیدا ہو گئے تھے لیکن ہم کو جہاں تک معلوم ہے، ان گمراہ سازوں میں روایتوں کے گڑھنے میں صرف عمرو بن عبید، مقاتل بن سلیمان اور کرامیہ مشہور ہیں، جہم بن صفوان کے متعلق تو علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں صاف تصریح کر دی ہے:

وما علمتہ روی شیئا و لکنہ ہمارے خیال میں اس نے کوئی روایت  
زرع شرا عظیمہ نہیں کی، البتہ بہت بڑی برائی کا بیج  
(جلداول ص ۱۹۷) ہو گیا۔

اسی طرح غیلان دمشقی، یونس اسواری، جعد بن درہم وغیرہ کا بھی رواۃ حدیث میں شمار نہیں، کرامیہ عموماً ترغیب وترہیب کے متعلق وضع احادیث کو جائز رکھتے تھے اور بعض

(۱) ملل و نحل شہرستانی جلد اول ص ۱۰۹ (۲) ملل و نحل شہرستانی جلد اول ص ۱۳۵، ۱۳۳ (۳) میزان الاعتدال ذہبی ج ۳ ص ۱۲۷۔

ریا کار زاد بھی اس خیال میں انہی کے ہمزبان تھے، ان کا یہ دعویٰ محض زبانی نہ تھا، بلکہ اس کو استدلال سے بھی ثابت کرتے تھے، مثلاً ایک روایت میں ہے:

من کذب علی متعمداً یضل  
یعنی گمراہ سازی کے لئے جو میری  
به فلیتبعوا مقعده من النار.  
طرف جھوٹ باتیں منسوب کرتا ہے  
اس کو جہنم میں اپنا ٹھکانا بنا لینا چاہئے۔

اور چونکہ ترغیب و ترہیب کے لئے جھوٹ بولنا گمراہ سازی میں داخل نہیں اس لئے اس کا مرتکب، شرعی مجرم نہیں قرار پاسکتا، اسی طرح بعض کا یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ اس دروغ مصلحت آمیز سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی نقصان نہیں ہوتا (۱) اس لئے اس پر من کذب علی (۲) کا حکم نہیں جاری ہو سکتا لیکن اس کا مجرم صرف کرامیہ اور زہاد کو قرار دینا خلاف انصاف ہے، خود ہمارے علما بھی اس قسم کی حدیثوں میں بہت کچھ سہل نگاری کرتے ہیں، (۳) مقاتل بن سلیمان کا وضع حدیث میں جو پایہ تھا، اس کا اندازہ میزان الاعتدال کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے:

عن النسائی قال والکذابون  
یعنی امام نسائی نے فرمایا کہ مدینہ میں  
المعروفون بوضع الحدیث  
ابن ابی یحییٰ بالمدينة  
ابن ابی یحییٰ بغداد میں واقدی،  
والواقدی ببغداد ومقاتل  
خراسان میں مقاتل بن سلیمان اور  
بن سلیمان بخراسان  
و محمد بن سعید الشامی

(جلد ۳ ص ۶۴)

(۱) نووی حاشیہ مقدمہ مسلم ص ۷۰ (۲) مطلب یہ کہ علی ضرر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے جب ترغیب و ترہیب سے شرعی فائدے حاصل ہوتے ہیں، تو اس قسم کے جھوٹ بولنے میں کیا حرج ہے (۳) حاشیہ نووی مطبوعہ ہند ص ۲۱۔

معتزلہ کا گروہ چونکہ زیادہ تر عقلیات کا شیفہ تھا، اس لئے روایتوں سے بہت کم اعتنا رکھتا تھا لیکن اس گروہ میں صرف عمرو بن عبید بنک خاندان ہے، اس کو حسن بصری کی صحبت کا شرف حاصل تھا، اس لئے اکثر روایتوں کو غلط طور پر ان کی طرف منسوب کر دیتا تھا اور اسی کے ساتھ بعض اس قسم کی روایتیں بھی بیان کرتا تھا، جس سے معتزلہ کے مذہب کی تائید ہوتی تھی:

|                                                                                                                                                                                                                                     |                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                     |
|-------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|---------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|
| حدثنی عمر و بن علی ابو حفص قال سمعت معاذ بن معاذ یقول قلت لعوف بن جمیلہ ان عمر و بن عبید حدثنا عن الحسن ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من حمل علینا السلاح فلیس منا قال کذب واللہ عمر و ولکنہ اراد ان یحوزہا الی قولہ الخبیث . | مجھ سے عمرو بن علی حفص نے روایت کی کہ میں نے معاذ بن معاذ سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے عوف بن جمیلہ سے کہا کہ ہم سے عمرو بن عبید نے حسن بصری سے روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم سے نہیں، انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم عمرو جھوٹ کہتا ہے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس روایت کو اپنے مردود قول کی طرف الٹ پھیر کر لائے۔ |
|-------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|---------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۰۹)

اس حدیث کی صحت میں کوئی کلام نہیں لیکن چونکہ عمرو بن عبید نے اس کو غلط طور پر حسن بصری کی طرف منسوب کر دیا تھا، اس لئے عوف بن جمیلہ نے اس کو مردود قرار دیا، کیونکہ عمرو بن عبید کو اس حدیث سے معتزلہ کے ایک خیال کی تائید منظور تھی، معتزلہ کا مذہب ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب دائرۃ ایمان سے نکل کر ہمیشہ کے لئے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے، وہ لوگ اس قسم کے مجرم کو فاسق کا خطاب دیتے ہیں، چنانچہ عمرو بن عبید کو اس حدیث کے

ظاہری معنی سے اسی خیال کی تائید کرنا منظور تھی، اس کے علاوہ عمرو بن عبید میں یہ کمال بھی تھا کہ خفیف تغیر و تبدل سے احادیث کے اصلی معنی بدل دیا کرتا تھا:

|                          |                                     |
|--------------------------|-------------------------------------|
| حدثنی حجاج بن الشاعر     | مجھ سے حجاج بن شاعر اور ان سے       |
| قال حدثنا سليمان بن      | سليمان بن حرب اور ان سے ابن زيد     |
| حرب حدثنا ابن زيد يعني   | یعنی حماد نے بیان کیا کہ ایوب سے    |
| حماد قال قيل لايوب ان    | کہا گیا کہ عمرو بن عبید نے حسن بصری |
| عمرو بن عبيد روى عن      | سے روایت کی ہے کہ تاڑی سے نشہ       |
| الحسن قال لايجلد السكران | کرنے والے شخص کو کوڑے نہیں          |
| من النبيذ فقال كذب       | مارے جائیں گے، انھوں نے فرمایا      |
| انما سمعت الحسن يقول     | کہ وہ جھوٹ کہتا ہے، میں نے تو ان    |
| يجلد السكران من النبيذ.  | سے سنا ہے کہ ایسے شخص کو کوڑا مارا  |
| (مقدمہ مسلم ص ۱۱۰)       | جائے گا۔                            |

اس روایت میں عمرو بن عبید نے صرف لفظ ”لا“ کے بڑھا دینے سے ایسا عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا، مختصر یہ کہ اعتراف کی وجہ سے عمرو بن عبید روایت حدیث میں سخت بدنام تھا:

|                            |                                      |
|----------------------------|--------------------------------------|
| حدثنی حجاج قال نا          | مجھ سے حجاج اور ان سے سليمان بن      |
| سليمان بن حرب قال سمعت     | حرب نے بیان کیا، کہ میں نے سلام      |
| سلام بن ابى مطيع يقول بلغ  | بن ابی مطیع کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ   |
| ايوب انى آتى عملاً فاقبل   | ایوب کو معلوم ہوا کہ میں عمرو کے پاس |
| على يوماً فقال ارأيت رجلاً | آمد و رفت رکھتا ہوں، تو وہ میرے      |
| لاتأمنه على دينه كيف تأمنه | پاس آئے اور فرمایا کہ تمہیں جس شخص   |

علی الحدیث۔ کے مذہب پر اعتماد نہیں اس کی  
(مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۱۰) حدیثوں پر کیوں کر اعتماد کرتے ہو۔

اسی سلسلہ میں محمد بن سعید مصلوب اور عبداللہ بن مسعود ابو جعفر المدنی بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، محمد بن سعید مصلوب کو وضع حدیث میں جو جرات اور بے باکی تھی، اس کا اندازہ شارح نووی کی اس عبارت سے ہو سکتا ہے:

قال خالد بن يزيد سمعته  
يقول اذا كان كلام حسن لم  
اربأ سآ ان اجعل له اسناداً.  
یعنی خالد بن یزید کا بیان ہے کہ میں  
نے خود اس کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ  
جب کوئی اچھا کلام مل جاتا ہے تو مجھے  
اس کے لئے اسناد گڑھنے میں ذرا بھی  
تامل نہیں ہوتا۔

اسی ضعف روایت کی وجہ سے مدلسین نے اس کے سیکڑوں نام بدلے ہیں، تاکہ انہیں مصنوعی ناموں کے پردے میں اس کا عیب چھپ جائے، اس کے ساتھ یہ مذہبی حیثیت سے بھی مہتمم تھا، چنانچہ احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ اس کو زندقہ کی تہمت میں ابو جعفر نے قتل کر ڈالا، (۱) عبداللہ بن مسور اگرچہ مذہبی حیثیت سے بدنام نہ تھا، تاہم وضع حدیث میں وہ بھی محمد بن سعید کا ہم خیال تھا:

حدثنا عثمان بن ابي شيبة  
قال نا جرير عن رقة ان  
ابا جعفر الهاشمي المدني كان  
يضع احاديث كلام حق  
وليست احاديث النبي ﷺ  
هم سے عثمان بن ابی شیبہ نے اور ان  
سے جریر نے رقبہ کے ذریعہ سے  
روایت کی کہ ابو جعفر ہاشمی مدنی اچھے  
کلام کو حدیث کے قالب میں ڈھال کر  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت



وكان يرويهان النبي ﷺ  
 (مقدمہ مسلم ص ۱۰۸، ۱۰۷)

کرتا تھا، حالانکہ وہ آنحضرتؐ کا کلام  
 نہیں ہوتا تھا۔

اسی طرح عبدالقدوس شامی بھی عام طور پر کذاب خیال کیا جاتا تھا۔

حدثني احمد بن يوسف  
 الازدي قال سمعت عبد  
 الرزاق يقول ما رأيت ابن  
 المبارك يفتح يقوله كذاب  
 الالعبد القدوس فاني سمعت  
 يقول له كذاب.

مجھ سے احمد بن یوسف  
 بیان کیا، کہ میں نے عبد الرزاق  
 سے سنا کہ ابن مبارک کسی شخص کو  
 کذاب نہیں کہتے تھے، لیکن میں  
 نے ان کو عبدالقدوس کو کذاب کہتے  
 ہوئے سنا۔

(مقدمہ مسلم ص ۱۱۷)

اس فرقہ مبتدعہ میں روافض کا بھی شمار ہے، بلکہ اہل حدیث زیادہ تر اسی گروہ سے  
 تالاں ہیں، کیونکہ یہی لوگ زیادہ تر اپنے مذہب کی تائید میں موضوع اور غلط حدیثیں روایت  
 کرتے تھے، چنانچہ اسی بنا پر امام شافعیؒ ان کی حدیثوں کو مطلقاً دائرۃ اعتبار سے خارج سمجھتے  
 ہیں، حالانکہ ان کو عام طور پر اہل بدعت کی روایتوں کے قبول کرنے میں اس قدر تشدد نہیں:

حدثني سلمة بن شبيب قال  
 نا الحميدي قال نا سفيان  
 قال كان الناس يحملون عن  
 جابر قبل ان ما يظهر ما اظهر  
 فلما اظهر ما اظهر اتهمه الناس  
 في حديثه وتركه بعض  
 الناس فقييل له وما اظهر

مجھ سے سلمہ بن شیبب اور ان سے  
 حمیدی اور ان سے ابوسفیان نے بیان  
 کیا کہ قبل اس کے کہ جابر اپنا خیال  
 ظاہر کرے، لوگ اس سے حدیثیں  
 روایت کرتے تھے لیکن جب اس نے  
 اپنا خیال ظاہر کیا تو لوگ اس کو معہم  
 کرتے تھے بلکہ بعض لوگوں نے اس

قال الايمان بالرجعة. (۱) کو بالکل متروک الحدیث قرار دیا، پھر ان سے پوچھا گیا کہ اس نے کیا خیال ظاہر کیا، فرمایا ایمان بالرجعة۔

حدثنی حسن الحلوانی قال  
نا ابو یحییٰ الحمّانی قال  
ناق بیصۃ واخوه انهما سمعا  
الجراح بن ملیح یقول سمعت  
جابر بن یزید عندی سبعون  
الف حدیث عن ابی جعفر عن  
النبی ﷺ کلها۔

مجھ سے حسن حلوانی اور ان سے ابویحییٰ  
حمّانی اور ان سے قبیصہ اور ان کے  
بھائی نے روایت کی کہ ہم دونوں نے  
جراح بن ملیح سے سنا کہ وہ فرماتے تھے  
کہ میں نے خود جابر بن یزید سے یہ سنا  
کہ میرے پاس ۷۰ ہزار حدیثیں ہیں  
جو کل کی کل آنحضرتؐ سے ابو جعفر کے

ذریعہ سے مروی ہیں۔

لیکن بایں ہمہ ہم کو اس گروہ کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس نے علم حدیث کے متعلق  
قدما کی رائے میں ایک نہایت مفید انقلاب پیدا کر دیا، چنانچہ اس کے پہلے اسناد کا اس قدر  
التزام نہ تھا، یا تھا تو کم از کم اس کے متعلق اس قدر تشدد سے کام نہیں لیا جاتا تھا لیکن جب  
بدعت نے زیادہ زور پکڑا تو محدثین نے اس کی طرف خاص توجہ کی اور اس کو لوازم مذہب  
سے قرار دیا۔

حدثنا ابو جعفر محمد بن  
الصباح قال ثنا اسماعیل بن  
زکریا عن عاصم الاحول عن

ہم سے ابو جعفر محمد بن صباح اور ان  
سے اسماعیل بن زکریا اور ان سے  
عاصم الاحول نے ابن سیرین سے

(۱) رواضع کا خیال ہے کہ حضرت علیؑ بادلوں کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں، چنانچہ جب وہ آسمان سے  
پکاریں گے تو ہم ان کی اولاد کے ساتھ خروج کریں گے۔

روایت کی کہ لوگوں سے پہلے اسناد نہیں  
پوچھے جاتے تھے لیکن جب فتنہ پھیلنا تو  
لوگ کہنے لگے کہ ہم کو اپنے راویوں  
کے نام بتاؤ تاکہ اہل سنت کو دیکھ کر  
حدیثیں قبول کی جائیں اور اہل بدعت  
کی حدیثیں نہ لی جائیں۔

ابن سیرین قال لم  
یکونوا یسئلون عن الاسناد  
فلما وقعت الفتنة قالوا  
سموالنارجالکم فی نظر الی  
اهل السنة فیوخذ حدیثہم  
وینظر الی اهل البدع  
فلا یوخذ حدیثہم۔

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۸۴)

سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اسی گروہ کی برکت سے احادیث کی تالیف  
و تدوین کا سلسلہ قائم ہوا کیوں کہ عمرو بن عبید، جہم بن صفوان، واصل بن عطا، مقاتل بن  
سلیمان کے ظہور کا زمانہ وہ پر آشوب زمانہ تھا جس میں ملکی انقلاب کا حشر برپا تھا، حوادث  
زمانہ نے بنو امیہ کا دفتر الٹ کر بنی عباس کو صاحب تخت و تاج قرار دیا تھا، علما و محدثین بھی  
اس قیامت خیز انقلاب سے محفوظ نہ تھے، خراسانی لشکر نے سیکڑوں اہل علم کو تہ تیغ کر دیا تھا،  
اس لیے خوف تھا کہ ملکی تغیر کے ساتھ، ان خانہ براندازوں کے خیالات سے اسلام کے اصلی  
عقائد میں کہیں انقلاب نہ پیدا ہو جائے، اس بنا پر علمائے تدوین کتب کی طرف توجہ کی اور  
علوم شریعت صحابہ اور تابعین کے مقدس سینوں سے نکل کر منظر عام پر آ گئے، یہ سچ ہے کہ اس  
ذریعہ سے مسلمانوں کا اصلی جوہر قوت حافظہ مٹ گیا لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آج  
ہمارے پاس جو کچھ بچا کھچا سہ ماہیہ رہ گیا ہے، وہ انہیں کوششوں کا نتیجہ ہے۔

بہر حال یہاں تک جو بحث تھی، اس کا تعلق ایک خاص گروہ کے ساتھ تھا لیکن  
ایک عام بات جس کا تعلق ہر گروہ اور ہر شخص کے ساتھ ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ کثرت روایت  
سے احتراز کیا جائے اور اسی کے ساتھ ہر شخص کے فہم و درایت کے موافق روایتیں کی جائیں

اور عموماً ہر کس و ناکس سے روایتوں کے قبول کرنے میں سختی اور احتیاط سے کام لیا جائے چنانچہ صحابہ اور تابعین میں جو لوگ نکتہ سنج اور حقیقت شناس تھے، وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے۔

ہم سے یحییٰ بن یحییٰ نے روایت کی کہ ہم کو ہشیم نے سلیمان تیمی سے اور ان سے عثمان نہدی نے خبر دی کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب فرماتے تھے کہ آدمی کے لیے یہی جھوٹ بہت ہے کہ جو کچھ سنے اس کو روایت کر دے۔

حدثنا يحيى بن يحيى قال نا هشيم عن سليمان التيمي عن ابي عثمان النهدي قال قال عمر بن الخطاب بحسب المرء من الكذب او يحدث بكل ماسمع.

(مقدمہ مسلم ص ۷۴، ۷۵)

ہم سے ابوطاہر احمد بن عمرو بن عبد اللہ بن عمرو بن سرج نے روایت کی کہ ہم کو ابن وہب نے خبر دی کہ مجھ سے امام مالک نے فرمایا کہ تم خوب سمجھ لو کہ جو شخص جو کچھ سنتا ہے اور اس کی روایت کرتا ہے وہ خطا سے نہیں بچ سکتا اور وہ شخص امام نہیں ہو سکتا۔

حدثني ابو الطاهر احمد بن عمرو بن عبد الله بن عمرو بن سرج قال نا ابن وهب قال قال لي مالك اعلم انه ليس يسلم رجل حدث بكل ماسمع ولا يكون اماما وهو يحدث بكل ماسمع.

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۷۵)

ہم سے ابوطاہر اور حرملة بن یحییٰ نے روایت کی کہ ہم دونوں کو ابن وہب نے خبر دی کہ ہم سے یونس نے اور ان سے ابن شہاب نے اور ان سے

حدثني ابو الطاهر و حرملة بن يحيى قال نا ابن وهب قال اخبرني يونس عن ابن شهاب عن عبيد الله بن

عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ نے روایت کی کہ عبد اللہ بن مسعود فرماتے تھے کہ جب تم کسی قوم کے مبلغ عقل سے باہر حدیث بیان کرو گے تو وہ یقیناً ان میں سے بعض کے لیے فتنہ و فساد ہوگی۔

مجھ سے فضل بن سہل نے بیان کیا کہ مجھ سے عفان بن مسلم نے روایت کی

کہ ہم کو ہمام نے خبر دی کہ میرے پاس ابوداؤد اعلیٰ آئے اور کہنے لگے کہ مجھ سے براء نے حدیث بیان کی اور زید بن ارقم نے حدیث بیان کی تو میں نے اس کا ذکر قتادہ کے سامنے کیا انھوں نے کہا وہ جھوٹ کہتا ہے، اس نے ان میں سے کسی سے نہیں سنا، وہ تو طاعون جارف کے زمانے میں لوگوں سے بھیک مانگا کرتا تھا۔

عبد اللہ بن عتبہ ان عبد اللہ بن مسعود قال ما انت بمحدث قوماً حدیثاً لا تبلغہ عقولہم الاکان لبعضہم فتنۃ۔ (مقدمہ مسلم ص ۷۶)

حدثنی الفضل بن سہل قال حدثنی عفان بن مسلم قال نا ہمام قال قدم علینا ابوداؤد الاعمی فجعل یقول ثنا البراء وثنا زید بن ارقم فذکرنا ذلک لقتادۃ فقال کذب ماسمع منہم انماکان ذلک سأل یتکفف الناس زمن الطاعون الجارف۔

(مقدمہ مسلم ص ۱۰۴)

اور درحقیقت قداما کے یہ اقوال بالکل دورانہی پر مبنی ہیں، کیوں کہ عادتاً ہر شخص جھوٹی سچی باتیں سنا کرتا ہے، اس لیے کثرت روایت سے کوئی شخص جھوٹ سے نہیں بچ سکتا، اسی طرح بہت سی حدیثیں عام لوگوں کے دائرہ عقل سے خارج ہوتی ہیں، اس لیے ان کے سامنے اس قسم کی حدیثوں کے بیان کرنے میں نہایت دقیق اور خطرناک غلطیوں کا احتمال ہے۔

ان ہی عام غلطیوں میں تدلیس اور واقعہ تاریخی کے خلاف روایتیں بھی ہیں تدلیس کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اکثر لوگ روایت حدیث میں مجہول اور ضعیف ہوتے تھے، اس لیے اکثر رواۃ ان کے عیوب کی پردہ پوشی کے لیے ان کے نام کو کنیت اور کنیت کو نام سے بدل کر روایات کیا کرتے تھے تاکہ وہ لوگ جس نام اور کنیت کے ساتھ ضعیف مشہور ہیں، ان میں التباس اور اشتباہ پیدا ہو جائے، اسی طرح بہت سے لوگ واقعہ تاریخی کے خلاف روایتیں کیا کرتے تھے۔

حدثنا اسحاق بن ابراہیم  
الحنظلی قال سمعت بعض  
اصحاب عبد الله قال قال ابن  
المبارك نعم الرجل بقیة لولا  
انه یکنی الاسامی ویسمی  
الکنی کان دھرا یحدث عن  
ابی سعید الوحاظی فاذا هو  
عبد القدوس۔ (مقدمہ مسلم ص ۱۷)

ہم سے اسحاق بن ابراہیم  
روایت کی کہ میں نے عبد اللہ بن  
مبارک کے بعض اصحاب سے سنا کہ وہ  
فرماتے تھے کہ بقیہ کیا اچھا آدمی تھا اگر  
وہ ناموں کو کنیت اور کنیت کو ناموں سے  
نہ بدلتا، ایک زمانے تک وہ ابو سعید  
وحاظی سے روایت کرتا تھا آخر وہ  
عبد القدوس نکلا۔

حدثنی عبد اللہ بن  
عبد الرحمن الدارمی قال  
سمعت ابانعم و ذکر المعلى  
بن عرفان فقال قال حدثنا  
ابو وائل قال خرج علينا ابن  
مسعود بصفيين فقال ابو نعیم  
اتراه بعث بعد الموت۔

ہم سے عبد اللہ بن عبد الرحمن الدارمی  
نے روایت کی کہ ہم نے ابو نعیم سے  
معلى بن عرفان کا ذکر سنا وہ فرماتے  
تھے کہ معلى نے ہم سے ابو وائل کی سند  
سے روایت کی کہ ہم پر حضرت ابن  
مسعود نے جنگ صفین میں چڑھائی کی  
راوی کا بیان ہے کہ ابو نعیم نے اس سے

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۱۷، ۱۱۸) کہا کہ کیا تمہارے نزدیک وہ قبر سے اٹھ کر آئے تھے۔

مطلب یہ کہ معنی نے ابو وائل کی طرف اس حدیث کی غلط نسبت کی کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کی خلافت ختم ہونے سے تین برس پہلے ۳۲ یا ۳۳ھ میں وفات پائی اور جنگ صفین حضرت علیؓ کے زمانے میں واقع ہوئی، اس لئے ابو وائل جیسے ثقہ اور ضابط شخص ایسی خلاف عقل حدیث کیوں کر روایت کر سکتے تھے، ان تحقیقات کے بعد امام صاحب نے معنعن حدیث کی بحث چھیڑی ہے اور نہایت سختی کے ساتھ امام بخاری کے مذہب کو باطل کیا ہے، معنعن روایتوں کے متعلق محدثین کی رائیں نہایت مختلف ہیں، امام بخاری کا مذہب یہ ہے کہ راوی اور مروی عند میں ملاقات ثابت ہونی چاہئے، متاخرین نے اس سے بھی زیادہ سختی سے کام لیا ہے، چنانچہ قابسی کے نزدیک مطلق لقا بھی کافی نہیں بلکہ اچھی طرح ملاقات کرنی چاہیے، ابو المنظر سمعانی نے امتداد صحبت کی قید لگائی، ابو عمرو الدانی المقری نے ان تمام شرائط پر اس شرط کا بھی اضافہ کیا ہے کہ دونوں میں روایت بھی ثابت ہو لیکن امام مسلم کے نزدیک صرف راوی اور مروی عند کی ہم عصری اور امکان ملاقات صحت روایت کے لیے کافی ہو سکتا ہے بشرطیکہ راوی مدلس نہ ہو۔ (۱)

اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے، (۲) ان کا استدلال یہ ہے کہ ثبوت لقا کے بعد معنعن روایت عموماً متصل الاسناد سمجھی جاتی ہے، حالانکہ اس صورت میں ارسال کا احتمال قائم رہتا ہے، فرض کرو زید نے عمرو سے عمرو نے بکر سے روایت کی، زید اور عمرو میں لقا بھی ثابت ہے، زہد ثقہ بھی ہے لیکن پھر بھی یہ احتمال باقی ہے کہ زید اور عمرو کے درمیان میں کوئی واسطہ ہو، مگر صحت روایت پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا، اسی طرح امکان لقا کی صورت میں راوی کے غیر مدلس اور ثقہ ثابت ہونے کے بعد ارسال اور انقطاع کا شبہ قابل

(۱) مقدمہ مسلم نووی ص ۳۳ و تدریب الراوی ص ۷۴ (۲) ایضاً۔

اعتبار نہیں لیکن درحقیقت امام صاحب کا یہ مذہب صحیح نہیں، کیونکہ راوی ثقہ اور غیر مدلس ہے اور لقا بھی ثابت ہے تو اس صورت میں ظن غالب ہے کہ وہ بلا واسطہ روایت کرتا ہے، کیونکہ ثقہ اور غیر مدلس راویوں کے حالات کے تنوع سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس طور پر حدیثیں اسی وقت روایت کرتے تھے، جب بذات خود سن لیتے تھے لیکن عدم لقا کی صورت میں اس قسم کا غلبہ ظن نہیں پیدا ہو سکتا، اب اس تحقیق کے بعد ہم مسلم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

صحیح مسلم اور اس کی خصوصیات: اوپر گزر چکا ہے کہ امام صاحب نے جس زمانے میں صحیح مسلم کو مرتب کیا، اس میں موضوع، ضعیف، غلط ہر قسم کی حدیثیں موجود تھیں، اس بنا پر انھوں نے صحیح کے مقدمہ میں احادیث کی تین قسمیں اور راویوں کے تین طبقے قرار دیئے ہیں۔

۱- وہ حدیثیں جو بالکل صحیح ہوں، اور ان کے رواۃ عموماً متقن، حافظ، ضابط اور

ثقہ تسلیم کئے گئے ہوں۔

۲- وہ حدیثیں جن کے رواۃ کو یا اعتبار ثقاہت اور حفظ و اتقان پہلے قسم کے

راویوں سے کم درجہ رکھتے ہوں۔

۳- وہ حدیثیں جن کے رواۃ کو عموماً یا اکثر محدثین نے مردود قرار دیا ہو۔

امام صاحب نے تصریح کی ہے، کہ میں پہلی قسم کی حدیثوں کے بعد دوسری قسم کی

روایتوں کو درج کروں گا لیکن مجھ کو تیسری قسم کی حدیثوں سے کچھ تعلق نہیں (۱) اس تصریح

کے موافق طبقہ ثالثہ کی روایتوں کے متعلق تو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا تھا، البتہ اس مسئلہ میں

اہل علم نہایت مختلف رائے ہیں کہ صحیح مسلم میں دوسرے طبقہ کی حدیثیں درج ہوئیں یا

نہیں۔

حافظ ابو عبد اللہ حاکم اور حافظ ابو بکر بیہقی کا خیال ہے کہ امام صاحب کو موت نے

دوسرے طبقے کی حدیثوں کے تخریج کا موقع نہیں دیا، اس لیے صحیح مسلم میں صرف طبقہ اول

(۱) مقدمہ مسلم ص ۵۰۲۴۸۔



کی حدیثیں درج ہو سکیں، امام ابوسفیان کا (جو خود امام صاحب کے ہم صحبت ہیں، بیان ہے کہ امام صاحب نے ہر طبقہ کے لیے الگ الگ کتابیں مرتب کیں اور ان میں بالاستقلال ہر طبقہ کی روایتیں جمع کیں، چنانچہ انھیں کتابوں میں سے ایک صحیح مسلم بھی ہے۔

لیکن قاضی عیاض کی تحقیق یہ ہے کہ صحیح مسلم میں دونوں طبقہ کی حدیثیں موجود ہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ دوسرے قسم کی حدیثیں متابعہ یا شاہد اور ج کی گئی ہیں، اسی طرح ان ابواب میں بھی اس قسم کی حدیثیں آگئی ہیں، جن میں پہلے طبقہ کی حدیثیں دستیاب نہ ہو سکیں، اسی طور پر ان راویوں کی روایتوں سے بھی تعرض کیا گیا ہے، جن کو بعض بعض محدثین نے معتبر اور بعض نے غیر معتبر قرار دیا ہے یا یہ کہ ان کے رواۃ متہم بالبدعہ ہیں، جیسا کہ خود امام بخاری نے کیا ہے، اس تحقیق کے موافق صحیح مسلم میں بجز ان حدیثوں کے جن کے رواۃ کو عموماً اکثر محدثین نے مردود قرار دیا ہے، ہر قسم کی روایتیں درج ہیں۔ (۱)

بہر حال صحیح یعنی قسم اول کی حدیثوں میں امام صاحب کی شرط یہ ہے کہ حدیث متصل الاسناد ہو، شروع سے اخیر تک ثقہ راویوں کے ذریعہ سے مروی ہو، شد و ذوعلتہ سے خالی ہو، اس میں امام صاحب کی خصوصیت نہیں، بلکہ عموماً محدثین کے نزدیک جب کسی حدیث میں یہ تمام شروط پائے جاتے ہیں تو وہ صحیح تسلیم کی جاتی ہے، البتہ اختلاف اس وقت ہوتا ہے، جب ان شرائط میں سے کوئی شرط موجود نہ ہو، اور ان میں باہم اس شرط کے اشتراط میں اختلاف زیادہ ہو، زیادہ تر اختلاف ان روایتوں میں ہوتا ہے، جن میں ایک فریق کے نزدیک صحیح کے تمام شرائط موجود ہوں اور دوسرے کے نزدیک معدوم، مثلاً امام بخاری کے نزدیک ابوزیر کی، سہیل بن ابی صالح، حماد بن سلمہ وغیرہ میں صحیح کے تمام شرائط موجود نہیں، اس لئے وہ ان سے روایت نہیں کرتے، اس کے بخلاف یہ لوگ امام مسلم کے نزدیک قابل اعتبار ہیں، اسی طرح عکرمہ عمرو بن مرزوق سے امام بخاری روایت کرتے ہیں لیکن امام مسلم

ان کو قابل روایت نہیں قرار دیتے، اس بنا پر امام مسلم نے امام بخاری کے چار سو چونتیس راویوں سے اور امام بخاری نے امام مسلم کے چھ سو پچیس راویوں سے روایت نہیں کی۔ (۱) اس موقع پر اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بخاری کو قوت اسناد کے لحاظ سے مسلم پر ترجیح ہے، تاہم مسلم میں بھی چند خصوصیتیں ایسی پائی جاتی ہیں، جو امام بخاری کے مقابل میں مرجحانہ حیثیت سے پیش کی جاتی ہیں، چنانچہ ہم ان کو ایک خاص ترتیب سے درج کرتے ہیں۔

۱- حسن ترتیب: صحیح مسلم کو جن حیثیتوں سے ایک بے نظیر تصنیف کا خطاب دیا گیا ہے، ان میں ایک عام وصف اس کتاب کی طرز ادا اور حسن ترتیب ہے، (۲) امام بخاری نے اگرچہ روایتوں کی تنقید میں نہایت احتیاط اور نکتہ سنجی سے کام لیا ہے تاہم چونکہ وہ متون حدیث سے ایک خاص نتیجہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس لئے ان احادیث کو متعدد طریقوں سے مختلف بابوں میں درج کرتے ہیں، بلکہ اکثر احادیث کو ان ابواب میں درج کر دیتے ہیں جو بظاہر ان کے بالکل مناسب نہیں ہوتے، اس لحاظ سے بخاری میں اس قدر سوء ترتیبی پیدا ہو گئی ہے کہ متاخرین کے ایک گروہ نے بخاری کی ان روایتوں کا کلیہ انکار کر دیا، جو نامناسب ابواب میں درج تھیں، کیوں کہ ابواب کے عدم تناسب اور غیر موزونی سے ان کی طرف خیال بھی مائل نہیں ہو سکتا تھا، اس کے بخلاف امام مسلم ہر حدیث کو ایک خاص اور مناسب باب میں درج کرتے ہیں، اور اسی کے ساتھ طرق مختلفہ اور اسانید کی تشریح اور رواۃ کے خاص خاص الفاظ کی طرف بھی اشارہ کرتے جاتے ہیں، اس لئے مسلم میں حسن ترتیب کے ساتھ احادیث کی تحقیق اور تفتیش کا موقع بھی نہایت آسانی سے مل سکتا ہے۔ (۳)

۲- امام بخاری چونکہ فقہی مسائل کے استنباط کی غرض سے احادیث پر مجتہدانہ نظر ڈالتے ہیں، اس لئے اسناد کے متصل ہونے کا بہت کم خیال رکھتے ہیں، چنانچہ بخاری میں

(۱) نووی ص ۱۵، ۱۶، (۲) ایضاً ص ۱۱، (۳) ایضاً ص ۱۳، ۱۵۔

غیر مسند روایتیں اور تعلیقات کی کثرت اسی کا نتیجہ ہے، (۱) اسی طرح وہ اجتہاد کے موقعوں پر اکثر ان احادیث کی طرف جو پہلے گزر چکی ہیں، نہایت خفیف اشارہ کرتے جاتے ہیں، اس بنا پر اس طریقہ سے اگر چہ ان کی دقت نظر اور اجتہادی قوت کا پتہ چلتا ہے اور وہ حدیثیں بھی درحقیقت متصل الاسناد اور صحیح ہوتی ہیں تاہم بظاہر ان کے متعلق بہت سے خدشے پیدا ہو جاتے ہیں، چنانچہ ابن حزم ظاہری نے حرمت ملاہی کا اسی بنا پر انکار کر دیا کہ بخاری میں اس کے متعلق جو حدیث مروی ہے، وہ منقطع یعنی معلق ہے لیکن امام مسلم نے چون کہ احادیث کو محض محدثانہ حیثیت سے دیکھا ہے، اس لیے مسلم میں یہ ظاہری فرو گذاشت بہت کم نظر آتی ہے، چنانچہ تحقیقی رائے کے مطابق اس میں صرف بارہ جگہ تعلیقات یعنی منقطع روایتیں پائی جاتی ہیں۔

۳- امام بخاری اہل شام سے جو روایتیں کرتے ہیں ان کے نام اور کنیت میں اکثر ان کو اشتباہ ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ نام اور کنیت کے لحاظ سے ان کو مختلف موقعوں پر دو شخص سمجھ جاتے ہیں لیکن امام مسلم کو کسی موقع پر اس قسم کا دھوکا نہیں ہوا، اس سے امام صاحب کی قوت ممیزہ اور وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

۴- امام بخاری کی حدیثوں میں تقدیم و تاخیر، حذف اور اسقاط کی وجہ سے اکثر تعقید اور پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں لیکن مسلم کی نشست الفاظ میں کہیں اس قسم کی تعقید نہیں پائی جاتی، یہ سچ ہے کہ بخاری کی دوسری روایتوں کی اعانت سے تعقید کی یہ گرہ کھل جاتی ہے، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم کا طرز ادا بخاری کی بہ نسبت زیادہ صاف ہے، واضح اور قریب الفہم ہے، ان خصوصیتوں کے علاوہ امام صاحب نے عموماً صحیح مسلم میں حزم اور احتیاط کے جو پہلو اختیار کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- محدثین کی درس گاہ میں عموماً درس و تدریس کے دو طریقے معین تھے، ایک تو یہ

کہ اساتذہ خود حدیثوں کو پڑھتے تھے اور ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی کرتے جاتے تھے، دوسرے یہ کہ اساتذہ اپنے مجموعہ حدیث کو خود شاگرد کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، وہ اس کو پڑھتا تھا اور شیخ کو محض تشریح مطلب کی زحمت گوارا کرنی پڑتی تھی، ان دونوں طریقوں سے اگرچہ احادیث کی صحت اور قطعیت پر مساویانہ اثر پڑتا ہے، تاہم راویانہ حیثیت سے یہ بحث آپڑتی ہے کہ دوسری قسم کی حدیثوں کو ”حدثننا“ کے ساتھ روایت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ امام بخاری امام زہری، یحییٰ بن سعید قطان وغیرہ کے نزدیک اس لفظ کے ساتھ روایت کر سکتے ہیں لیکن محدثین کا ایک بہت بڑا گروہ جن میں امام شافعی، امام اوزاعی، امام نسائی جیسے اکابر فن داخل ہیں، ان دونوں قسموں میں تفریق کرتا ہے اور دوسری قسم کی روایتوں کو صرف ”اخبرنا“ سے جائز رکھتا ہے، امام مسلم بھی انہی بزرگوں کے ہم خیال ہیں (۱) اس لیے ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ طریقہ کس قدر حزم، احتیاط اور دواندیشی پڑنی ہے۔

اس مسئلہ کو طے کرنے کے لیے سب سے پہلے لفظ ”حدیث اور خبر“ کی حقیقت پر غور کرنا چاہیے، خبر ایک عام لفظ ہے کیوں کہ اس کے لیے بالذات یا بواسطہ محض اظہار واقعہ کی ضرورت ہے، اس کے بخلاف حدیث (گفتگو) ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا وجود بغیر اپنی زبان کے ہو ہی نہیں سکتا اور اگر کسی دوسرے ذریعہ سے ہو تو وہ محض ترجمانی یا اخبار ہوگا، اس بنا پر صرف انہی حدیثوں کو ”حدثننا“ سے روایت کر سکتے ہیں جن کو شیخ نے خاص اپنی زبان سے بیان کیا ہو، (۲)

۲- اکثر روایتوں میں راویوں کے الفاظ، متن حدیث کے بعض حروف اور رواۃ کے اوصاف اور نام و نسب میں اختلاف ہو جاتا ہے، اس لیے امام صاحب نہایت احتیاط کے ساتھ ہر ایک کی تفصیل کر دیتے ہیں، جن سے متعدد نتائج پیدا ہوتے ہیں، اولاً تو خود امام صاحب کی وسعت نظر اور صداقت کا پتہ چلتا ہے، دوسرے یہ کہ اختلاف لفظ کی وجہ سے

بعض موقعوں پر معنوی اختلاف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ (۱)

۳- محدثین کے زمانے میں علم حدیث کی وسعت نے بعض ایسے مجموعے پیدا کر دیے تھے جن میں صرف ایک ہی روایت اور ایک ہی اسناد سے تمام حدیثیں مروی ہوتی تھیں، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس قسم کے مجموعوں سے متعدد روایتیں کی جائیں تو بوقت روایت ہر حدیث کے لیے تجدید اسناد کی ضرورت ہوگی یا احادیث کے متحد الاسناد ہونے کی وجہ سے بعد کی، دوسری حدیثیں اسی پہلی اسناد پر محمول کر دی جائیں گی، وکیع بن جراح اور یحییٰ بن معین کے نزدیک تجدید اسناد کی کوئی ضرورت نہیں لیکن استاذ ابواسحاق اسفراہینی جو اصول حدیث کے بہت بڑے امام ہیں، اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور ہر حدیث کو بقید اسناد روایت کرنا ضروری سمجھتے ہیں، امام مسلم بھی انھیں کے ہم زبان ہیں اور اپنی خاص روایتوں میں اس کی تفریق کر دیتے ہیں، چنانچہ صحیفہ ابن ہمام سے جو روایتیں کی ہیں، اسی اصول پر کی ہیں (۲) اب غور کرنا چاہیے کہ امام صاحب کا یہ طرز عمل، کس قدر دورانہوشی پر مبنی ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تجدید اسناد سے راوی کی احتیاط اور دیانت کا ٹھیک پتہ چل جاتا ہے لیکن اس سے قطع نظر کر کے اگر عام طور پر اس طریقہ سے سہل انگاری کی جائے تو آئندہ چل کر رواۃ کی بے احتیاطی سے اکثر حدیثوں میں اختلاط پیدا ہو جائے، اس لیے صداقت اور تورع کے علاوہ امام صاحب کا یہ اصول بالکل عقل کے موافق ہے۔

۴- امام صاحب احادیث کی روایت میں اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں کہ لغزش کا گمان بھی نہیں ہو سکتا، چنانچہ سلسلہ روایت میں ایک موقع پر سلیمان بن بلال اور یحییٰ بن سعید کا نام آ گیا ہے لیکن چون کہ امام صاحب نے اپنے شیخ سے ان راویوں کا نام بقید نسب نہیں سنا تھا، اس لیے سلسلہ روایت میں ان کے نسب کا ذکر اس تصریح کے ساتھ کیا

(۱) مقدمہ نووی ص ۲۴ (۲) ایضاً۔

ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خود امام صاحب کا ذاتی اضافہ ہے، اس سے امام صاحب کی صداقت اور دیانت کا پتہ چلتا ہے۔ (۱)

صحیح مسلم کا طریق روایت: ان اصول و شرائط ہی کے لحاظ سے صحیح مسلم ایک بے نظیر اور مستند تصنیف نہیں بلکہ جن ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے، ان میں بھی وہی قطعیت اور قوت پائی جاتی ہے جو اس کتاب کے لیے موزوں تھی، عام طور پر جن بزرگوں کی متصل الاسناد روایتوں کے ذریعہ سے اس کتاب نے شہرت پائی ہے ان کے نام یہ ہیں: ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن سفیان، ابواحمد محمد بن عیسیٰ الجلووی، ابوالحسین عبدالغافر فارسی، ابوعبداللہ محمد بن الفضل فراوی، امام فقیہ الحرمین ابوالفتح منصور بن عبدالمنعم فراری، ابواسحاق ابراہیم بن ابی حفص، عمرو بن مفر الواسطی، ان بزرگوں میں سب سے پہلے امام ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن سفیان نے خود امام مسلم سے روایت کی اس کے بعد علی سبیل الترتیب یہ مبارک سلسلہ امام ابواسحاق واسطی تک پہنچا، چنانچہ شیخ محی الدین نووی شارح مسلم نے جامع دمشق میں انہی سے پوری کتاب کی سماعت کی، ان بزرگوں میں فضل و کمال اور ثقاہت کے علاوہ جو بات خاص لحاظ کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ یہ تمام اصحاب نیشاپوری اور سن رسیدہ ہیں، ان میں اگرچہ امام ابواسحاق ابراہیم، واسطی ہیں لیکن چون کہ انہوں نے ایک مدت تک نیشاپور میں اقامت کی ہے، اس لیے یہ بھی درحقیقت اسی سلسلہ میں داخل ہیں، طرق روایت کی اس خصوصیت نے مسلم کو اور بھی قطعی اور یقینی بنا دیا ہے لیکن اس کے علاوہ اہل مغرب کے نزدیک یہ کتاب ابی محمد بن علی القلانسی کی روایت سے بھی مشہور ہے، ابو محمد قلانسی سے ابو بکر احمد بن یحییٰ کے توسط سے ابی العلاء عبد الوہاب بن عیسیٰ نے روایت کی تھی، چنانچہ ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ نے مصر میں ان سے اس کتاب کی سماعت کی اور اس کو خاص اپنی روایت کے ذریعہ سے مغرب میں پہنچایا، مگر مغرب کے سوا یہ طریقہ روایت عام طور پر نہ پھیل سکا، اس

لیے تمام تر دار و مدار ابواسحاق ابراہیم بن سفیان کی روایت پر آجاتا ہے۔ (۱)  
 مسلم کے شروع وغیرہ: صحیح مسلم کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی  
 ہو سکتا ہے کہ تعلیقات اور شروع کے علاوہ اہل علم کے ایک بہت بڑے گروہ نے جن میں وہ  
 اصحاب بھی شامل ہیں، جنہوں نے مسلم کے اکثر شیوخ کی آنکھیں دیکھی تھیں، مسلم کے طرز  
 پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں اور مسلم کی احادیث کو خاص اپنی اسانید سے جمع کیا، ان  
 کتابوں میں اگرچہ مسلم کی خصوصیتیں نہ پیدا ہو سکیں، تاہم چون کہ اسی پیمانہ پر لکھی گئی تھیں،  
 اس لیے صحت اور قطعیت کی جھلک ان میں بھی نظر آتی ہے اور اسی کے ساتھ چون کہ وہ لوگ  
 اپنی خاص خاص اسانید سے روایتیں کرتے ہیں، اس لیے روایت کے متعدد طرق پیدا  
 ہو جاتے ہیں اور اس ذریعہ سے علاوہ اسناد کے ساتھ احادیث میں نہایت قوت آجاتی ہے،  
 چنانچہ ان میں چند کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

- ۱- تخریج ابی جعفر احمد بن حمدان بن علی النیشافوری المتوفی ۳۱۱ھ
- ۲- تخریج ابی نصر محمد بن محمد الطوسی الشافعی المتوفی ۳۳۳ھ
- ۳- مسند الصحیح لابی بکر محمد بن محمد بن رجا النیشافوری الاسفراہینی المتوفی ۲۸۶ھ
- ۴- مختصر المسند الصحیح علی مسلم للمحافظ ابی عوانہ یعقوب بن اسحاق الاسفراہینی

المتوفی ۳۱۶ھ

- ۵- تخریج ابی حامد احمد بن محمد الشاذلی الفقیہ الشافعی الہروی المتوفی ۳۰۵ھ
- ۶- مسند صحیح لابی بکر محمد بن عبد اللہ الجوزقی النیشافوری الشافعی المتوفی ۴۸۸ھ
- ۷- المسند المستخرج علی کتاب مسلم للمحافظ ابی نعیم احمد بن عبد اللہ الاصبہانی

المتوفی ۴۳۰ھ

- ۸- المحرر علی صحیح مسلم لابی الولید حسان بن محمد القرشی الفقیہ الشافعی ۴۳۹ھ (۲)

(۱) مقدمہ نووی ص ۱۱ (۲) مقدمہ نووی ص ۲۴ و ۲۷۔

شرح کی تعداد ان کتابوں سے بھی زیادہ ہے اور ان میں بعض شرحیں قاضی عیاض اور امام جلال الدین سیوطی جیسے ائمہ فن کے قلم سے نکلی ہیں لیکن آج کل عام طور پر شیخ محی الدین نووی کی شرح زیادہ مشہور اور عام طور پر متداول ہے، شرح کی کثرت کے ساتھ شرح کے سلسلے میں شافعی، مالکی، حنفی، غرض ہر مذہب کے لوگ داخل ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ ہر فرقہ بلا تخصیص مذہب مسلم کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ (۱)

مسلم پر اعتراضات: اہل فن نے تنقیدی حیثیت سے مسلم پر جو نکتہ چینیوں کی ہیں، وہ اگرچہ اس کی خوبیوں کے مقابل میں اس قدر کم وقعت اور بے حقیقت ہیں کہ ان کی طرف خیال بھی نہیں مائل ہو سکتا تاہم چونکہ اس سے اس امر کا اندازہ ہوگا کہ مسلم کی صحت اور خصوصیات کے مقابل میں جب اس زمانہ میں اس سے زیادہ نہ ہو سکا، تو اب اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتا، اس لیے ہم خاص طور پر ان کا ذکر کرتے ہیں۔

مسلم پر ایک عام اعتراض جس میں امام بخاری بھی شامل ہیں، یہ ہے کہ امام مسلم اور بخاری نے بہت سی حدیثوں کو چھوڑ دیا جن کے راویوں کی سند سے وہ خود صحیحین میں روایت کرتے ہیں، یہاں تک کہ اکثر ان حدیثوں سے بھی اعراض کر گئے ہیں، جن کو صحابہ کی ایک جماعت نے خود آنحضرت ﷺ سے روایت کی تھی اور صحابہ کے بعد وہ حدیثیں نہایت صحیح طور پر مروی ہوئیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ صحیفہ ابن ہمام کو یہ دونوں بزرگ بالاتفاق صحیح تسلیم کرتے ہیں لیکن روایتوں میں خاص خاص حدیثیں منتخب کر لیتے ہیں، حالانکہ صحت اور قطعیت میں وہ تمام مساوی ہیں، اس لحاظ سے بخاری اور مسلم کو احادیث صحیحہ کا کامل مجموعہ نہیں کہا جاسکتا، اس کے علاوہ مسلم نے ضعفا اور طبقہ ثانیہ کے رواۃ سے بھی روایتیں کی ہیں، حالانکہ صحیح مسلم میں طبقہ اولیٰ کی روایتوں کا التزام کیا گیا ہے۔ (۲)

امام ابوالحسن دارقطنی نے خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا

(۱) اس سلسلہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی فتح اللہ بھی قابل ذکر ہے (۲) مقدمہ نووی ص ۲۳۔



نام الاستدراکات والتعجیب ہے، اس میں انھوں نے استقر کر کے صحیحین کی ان روایتوں کی تعداد دو سو بتائی ہے (۱) لیکن یہ اعتراضات درحقیقت محض عامیاناہ اعتراضات ہیں کیوں کہ بخاری اور مسلم کو اگر احادیث صحیحہ کا مجموعہ تسلیم کیا گیا ہے تو صرف اس بنا پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ان میں جو حدیثیں درج ہیں وہ تمام صحیح اور متعین ہیں، اس لیے اگر بہت سی صحیح حدیثیں، ان کتابوں میں نہ درج ہو سکیں تو ان پر کوئی الزام نہیں آ سکتا کیوں کہ ان میں تمام صحیح حدیثوں کا حصر مقصود نہیں، اسی طرح مسلم پر ضعف رواۃ اور عدم صحت کا الزام بھی نہیں دیا جاسکتا، کیوں کہ انھوں نے اس قسم کی روایتوں کو متابعات اور شواہد کے سلسلہ میں قوت اسناد کے لیے درج کر دیا ہے، اس لیے اس ذریعہ سے اصل حدیث پر کوئی حرف نہیں آ سکتا اور اس کے ساتھ اکثر راویوں کا ضعف امام صاحب کی روایت کے بعد ظاہر ہوا ہے، چنانچہ احمد بن عبد الرحمن بن وہب اسی قسم کے راوی ہیں، اس لیے اس ضعف کا اثر خود امام صاحب کی روایت پر نہیں پڑ سکتا۔

ان اعتراضات سے قطع نظر کر کے جو بات خاص لحاظ کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ معین روایتوں کے متعلق اگرچہ امام صاحب کا مذہب صحیح نہیں، تاہم اس کا اثر خود ان کی کتاب پر کچھ نہیں پڑ سکتا، کیوں کہ طرق روایت کی کثرت سے صحیح مسلم میں کوئی ایسی حدیث نہیں مل سکتی جس میں اس غلط اصول پر عمل کیا گیا ہو، چنانچہ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

وان کننا لانحکم علی مسلم بعمله فی صحیحہ بهذا المذہب

لکونہ یجمع طرفاً کثیراً یتعذر معها وجود هذا الحكم الذی جوزہ۔ (۲)

بہر حال ان معمولی اعتراضات کی بنا پر مسلم کی صحت، تنقید اور احتیاط کا انکار نہیں

کیا جاسکتا۔

(۱) مقدمہ نووی ص ۲۷ (۲) مقدمہ نووی ص ۱۳۔

## امام ابن ماجہ<sup>ؒ</sup>

(متوفی ۲۴۳ھ)

نام و نسب: محمد نام، ابو عبد اللہ کنیت، ابن ماجہ لقب اور سلسلہ نسب یہ ہے: محمد بن یزید بن عبد اللہ۔ (۱)

ماجہ کو بعض لوگوں نے آپ کے دادا اور بعض نے آپ کی ماں کا نام بتایا ہے لیکن علمائے محققین کے نزدیک آپ کے والد کا لقب تھا، شاہ عبد العزیز صاحب فرماتے ہیں:

”ماجہ لقب پدر ابو عبد اللہ است نہ لقب جد او نہ نام مادر او۔“

قزوین کے مشہور مورخ خلیلی کا بیان ہے کہ ”ماجہ یزید کا عرف تھا“ اور محدث رافعی لکھتے ہیں ”ان کا نام محمد بن یزید ہے اور ماجہ یزید کا لقب..... اور ان کا شجرہ نسب اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے ”محمد بن یزید بن ماجہ“ مگر پہلی بات زیادہ ثابت ہے۔“ (۲)

ولادت: ان کا خود بیان ہے کہ میں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوا۔ (۳)

خاندان و وطن: ماجہ سے جو دراصل ماہ یا ماچہ کا معرب ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابن ماجہ عجمی نژاد تھے لیکن عرب کے مشہور قبیلہ ربیعہ سے ان کا رشتہ موالات تھا، اس لیے ربیعہ اور مولیٰ ربیعہ کہلاتے ہیں، عراق، عجم و ایران کے مشہور اور مردم خیز شہر قزوین کو آپ کے وطن

(۱) بستان الحدیث ص ۱۱۲ (۲) مجلہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۲۳ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲ و تہذیب ج ۹ ص ۵۳۲ (۳) وفیات الاعیان ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۳ و شروط الائمة ص ۹۔

ہونے کا فخر حاصل ہے، اس نسبت سے آپ قزوینی کہے جاتے ہیں۔ (۱)

اساتذہ اور شیوخ: ان کے شیوخ کی تعداد بکثرت ہے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سو سے زیادہ شیوخ سے استفادہ کیا تھا، امام مالک اور لیث کے تلامذہ سے بھی آپ کو روایت کرنے کا شرف حاصل ہے، حافظ ابوالقاسم علی بن حسن متوفی ۵۷۱ھ نے ائمہ صحاح کے شیوخ پر ایک مستقل رسالہ تحریر کیا تھا، اس میں ابن ماجہ کے اساتذہ کا بھی ذکر ہے، چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں۔

ابراہیم بن منذر حزامی م ۲۳۶ھ، ابوبکر بن ابی شیبہ م ۲۳۵ھ، جبارہ بن مغلس م ۲۳۱ھ، حمدون بن عمارہ بغدادی، داؤد بن رشید م ۲۳۹ھ، کھل بن اسحاق بن ابراہیم واسطی، عبداللہ بن محمد معروف بحافظ ابوبکر بن ابی الدین بغدادی، عبداللہ بن معاویہ م ۲۳۳ھ، علی بن حسن جرثمی، علی بن سعید نسائی، محمد بن احمد جوزجانی، محمد بن روح م ۲۳۲ھ، محمد بن سعید بغدادی، محمد بن عبداللہ بن نمیر م ۲۳۳ھ، ابوجعفر محمد بن ہارون بغدادی اور ہشام بن عماد م ۲۳۵ھ۔ (۲)

تلامذہ: ابن ماجہ کے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن دینار جرثمی، احمد بن ابراہیم قزوینی، ابوالطیب احمد بن روح شعرانی، احمد بن محمد مدنی، اسحاق بن محمد قزوینی، جعفر بن ادریس، ابوبکر حامد ابہری، حسین بن علی، سعدون، سلیمان بن یزید قزوینی، ابوالحسن علی بن ابراہیم قطان قزوینی، علی بن سعید غدالی، محمد بن عیسیٰ صفار۔ (۳)

رحلت و سفر: امام ابن ماجہ کے زمانہ میں محدثین اطراف عالم میں پھیلے ہوئے تھے، اس لیے انہوں نے حصول حدیث کے لئے مختلف ملکوں کا سفر کیا، خراسان، عراق، حجاز، مصر، شام،

(۱) وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۸۳ و المختصر ابن جوزی ج ۵ ص ۹۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ و تہذیب

احمد ج ۹ ص ۵۳۱ (۳) ایضاً۔

بصرہ، کوفہ، مکہ، رے اور بغداد وغیرہ کی تصریح کتابوں میں موجود ہے، شروع میں اکیس، بائیس سال کی عمر تک اپنے وطن قزوین ہی میں جو خود علم فن کا گہوارہ اور علماء محدثین کا بڑا مرکز تھا، حدیث اور دوسرے علوم کی تکمیل فرماتے رہے، ۲۳۰ھ میں علم کی تلاش و جستجو میں اپنے وطن سے باہر نکلے۔ (۱)

حدیث میں امتیاز: انھوں نے جب آنکھیں کھولیں تو اس وقت ہر طرف حدیث کے درس و تدریس اور اس کی کتابت و تحریر کا کام سرگرمی سے جاری تھا اور اسی کی طلب تکمیل کو فضیلت و کمال کا اصلی معیار خیال کیا جاتا تھا، اس لئے ان کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بھی یہی فن بنا اور اکابر حفاظ و محدثین کی کثرت کے باوجود انھوں نے اس میں اتنا امتیاز و کمال اور ایسی شہرت حاصل کی کہ ان کی علمی جلالت کا سکہ بیٹھ گیا اور بڑے بڑے ائمہ فن ان کی عظمت و برتری کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے، اس کا اندازہ درج ذیل اقوال سے ہوتا ہے۔

اعتراف کمال: حافظ ابو یعلیٰ خلیل فرماتے ہیں، وہ ایک بلند پایہ معتبر اور لائق حجت محدث تھے، ان کی عظمت و ثقاہت پر اتفاق ہے، ان کو فن حدیث سے پوری واقفیت تھی اور وہ اس کے جلیل القدر حافظ تھے، ابو القاسم رافعی فرماتے ہیں، کہ ”ائمہ مسلمین میں ابن ماجہ بھی ایک بڑے معتبر امام ہیں، ان کی قبولیت پر سب کا اتفاق ہے“ علامہ ابن جوزی تحریر فرماتے ہیں ”وہ حدیث و تاریخ اور تفسیر کے ممتاز ماہر تھے“ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں ”وہ فن حدیث کے امام اور اس کے متعلقات پر بڑا عبور رکھتے تھے“ علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ”ابن ماجہ عظیم الشان حافظ و ضابط صادق القول اور وسیع العلم تھے“ علامہ ابن اثیر رقمطراز ہیں کہ وہ ذی عقل، صاحب علم اور امام حدیث تھے، جمال الدین تغری بروی لکھتے ہیں ”ابن ماجہ امام، حافظ، حجت اور ناقد حدیث تھے..... ان کو متعدد فنون میں مہارت حاصل تھی“ ابن ناصر الدین،

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۲ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ و تہذیب المعجم ج ۹ ص ۵۳۱ و خلاصہ

تذہیب تہذیب الکمال ص ۳۴۔

ارشاد فرماتے ہیں ”مشہور علمائے اسلام میں ایک ابن ماجہ بھی ہیں..... وہ حدیثوں کے حافظ اور اس میں نہایت معتبر اور بلند پایہ شخص تھے“ حافظ ابن حجر عسقلانی کا بیان ہے کہ ”وہ صاحب سنن، حافظ حدیث اور امام فن تھے“ (۱)

ان اقوال سے ان کے محدثانہ کمال و عظمت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

**فقہی مسلک:** ان کے فقہی مسلک کے بارے میں یقینی طور سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی، گمان غالب یہ ہے کہ وہ بھی عام محدثین کی طرح کسی خاص مذہب فقہ سے وابستہ نہ رہے ہوں گے، البتہ اہل عراق کے مقابلہ میں ان کا رجحان اہل حجاز کی طرف زیادہ تھا، اس کا اندازہ ان کی سنن سے بھی ہوتا ہے، اسی بنا پر بعض علما ان کو حنبلی اور شافعی کہہ دیتے ہیں جو صحیح نہیں ہے، علامہ ابن طاہر جزائری فرماتے ہیں ”ابن ماجہ وغیرہ علمائے حدیث ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے مقلد نہیں تھے، البتہ فقہا محدثین امام شافعی، احمد اور اسحاق بن راہویہ وغیرہ کے قول کی طرف میلان رکھتے تھے“۔ (۲)

**اعمال و اخلاق:** امام ابن ماجہ کے حالات زندگی پردہٴ خفایں ہیں، اس لئے ان کے اعمال و اخلاق کے بارہ میں کوئی تفصیل نہیں بیان کی جاسکتی، حافظ ابن کثیر نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ ”وہ علم و فضل کی طرح تین و تقویٰ اور زہد و صلاح کے بھی جامع تھے، احکام شریعت کی شدت سے پابندی کرتے تھے، اور اصول و فروع میں پورے طور پر متبع سنت تھے، اس پر خود ان کی سنن شاہد ہے“۔ (۳)

**متعلقین اور اہل خاندان:** ان کے خاندانی حالات اور ازواج و اولاد کی بھی تفصیل نہیں ملتی، صرف ان کے ایک صاحبزادے عبداللہ اور دو بھائیوں ابوبکر، اور ابو عبداللہ کا محمد بن

(۱) وفيات الاعيان خلكان ج ۲ ص ۲۸۴ تہذيب الجہد ج ۹ ص ۱۵۳، المنتظم فی اخبار الملوک والامم

ج ۵ ص ۹۰ کمال ابن اثیر مطبوعہ لیڈن ج ۷ ص ۲۹۸ و شذرات الذهب ج ۲ ص ۱۶۴ وغیرہ (۲) توجیہ

المنظر ص ۱۸۵ (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۵۲۔

طاہر نے ان کی وفات اور تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے۔ (۱)  
 وفات: امام ابن ماجہ نے دو شنبہ ۲۲ رمضان المبارک ۲۷۳ھ کو ۶۲ سال کی عمر میں داعی  
 اجل کو لبیک کہا دوسرے دن سہ شنبہ کو تجہیز و تکفین ہوئی، (۲) ایک روایت یہ بھی ہے کہ  
 ۲۷۵ھ میں وفات پائی، ان کے سانحہ وفات پر بعض شعرا نے نہایت پر درد مرثیے کہے، محمد  
 بن اسود قرظوی نے کے مرثیہ کا پہلا شعر یہ ہے:

لقد ادهى دعائم عرش علم وضع ركنه فقد ابن ماجه  
 ترجمہ: ابن ماجہ کی وفات سے علم کے پایہ تخت کے ستون ڈھ گئے۔  
 یحییٰ بن زکریا طراکھی کہتا ہے:

ایا قبر بن ماجه غثت قطرا ملثا بالغداة وبالعشى (۳)  
 ترجمہ: اے ابن ماجہ کی قبر تو صبح و شام بارانِ رحمت سے سیراب ہو۔

تصنیفات: ابن ماجہ کی علمی و تصنیفی یادگاروں میں تین اہم اور مشہور تصنیفات ہیں۔  
 تفسیر: اس کی اہمیت کا اندازہ علامہ ابن کثیر کے اس بیان سے ہوتا ہے:

ولابن ماجه تفسیر حافل۔ یعنی ابن ماجہ کی ایک ضخیم و جامع تفسیر  
 ہے۔

علامہ سیوطی نے دور صحابہ و تابعین کے بعد کی تفسیروں کا تذکرہ کرنے کے بعد  
 تفسیر ابن جریر کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک اہم ماثوری  
 و منقولی تفسیر اور ابن جریر کی طرح اس میں بھی احادیث و آثار صحابہ و تابعین کو بالاسناد نقل کیا  
 گیا تھا۔

تاریخ: ان کو تاریخ میں بھی درک تھا اور تاریخ میں بھی کوئی کتاب لکھی تھی، ابن خلکان نے  
 تاریخ طبرستان اور حافظ ابن کثیر نے تاریخ کامل کے وصف سے اس کا ذکر کیا ہے، حافظ ابو ذر

(۱) شروط الامم ۱۷۵ ص ۹۹ (۲) ایضاً (۳) تہذیب ج ۹ ص ۹۳۱۔

فرماتے ہیں کہ ”میری نظر سے قزوین میں ابن ماجہ کی تاریخ گذری تھی، یہ دراصل عہد صحابہ سے لے کر مصنف کے زمانہ تک کی تاریخ اور بلاد اسلامیہ اور ادیان حدیث کے حالات پر مشتمل ہے“ (۱) اس سے اس تاریخ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ دستبرد زمانہ سے معدوم ہو گئی۔

سنن: ابن ماجہ کا سب سے بڑا علمی و تصنیفی اور دینی کارنامہ ان کی ممتاز اور شہرہ آفاق تصنیف سنن ہے، اس کی بدولت ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، موجودہ کتب حدیث میں یہ ایک اہم اور متداول کتاب خیال کی جاتی ہے اور اکثر مدارس کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

ترتیب و تعداد احادیث: عام کتب سنن کی طرح اس میں بھی ایمانیات سے وصایا تک کے جملہ ابواب فقہی ترتیب کے مطابق درج ہیں اور یہ ۳۲ کتب، ۱۵۰۰ ابواب اور چار ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے۔ (۲)

رواۃ: رافعی کا بیان ہے کہ ابن ماجہ سے ان کے جن تلامذہ نے سنن کی روایت کی ہے ان میں چار اشخاص زیادہ مشہور ہیں:

۱- ابوالحسن قطان، ۲- سلیمان بن یزید، ۳- ابو جعفر محمد بن عیسیٰ، ۴- ابو بکر حامد ابہری۔ حافظ ابن حجر نے اس فہرست میں دو ناموں کا اور اضافہ کیا ہے سعدون، ابراہیم بن دینار (۳) ان تمام رواۃ میں حافظ ابوالحسن قطان کی روایت کو زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

”ابوالحسن قطان کہ صاحب روایت سنن اوست از جملہ شاگردان رشید اوست۔“ (۴)

سنن کا جو نسخہ ابوالحسن سے مروی ہے اس کی بہت سی روایتیں خود ان کی سند سے

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ والبدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۵۲ وشرط الائمہ ص ۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ

ج ۲ ص ۲۱۰ وبتان الحمد ثین ص ۱۱۲ والبدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۵۲ (۳) تہذیب المعجم ص ۹ ج ۵۳۲

(۴) بتان الحمد ثین ص ۱۱۲۔

تذکرۃ المحدثین.... گلستان حدیث کے مہکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

بھی منقول ہیں۔

اہمیت: سنن ابن ماجہ، حدیث کی ان چھ مشہور اور معتبر کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جو صحاح ستہ کہلاتی ہیں، علمائے فن کو اعتراف ہے کہ ”یہ اسلامیات کی عظیم ترین اور حدیث کی امہات کتب میں ہے“ حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ ”سنن سے ابن ماجہ کے علمی تبحر اور کثرت معلومات کا پتہ چلتا ہے“ حافظ ابو زرعد جیسے باکمال محدث کا ارشاد ہے کہ ”اگر یہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی تو حدیث کی سب یا اکثر کتابیں بالکل معطل ہو جائیں گی“ حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ ”یہ نہایت جامع و جدید کتاب اور بے شمار ابواب و غرائب پر مشتمل ہے“ سنن ابن ماجہ کی اس عظمت و اہمیت کی بنا پر اس کو ہر زمانہ میں نہایت مستند اور قابل حجت خیال کیا گیا ہے، رافعی فرماتے ہیں ”محدثین نے اس کو صحیحین اور سنن ابی داؤد و سنن نسائی کے ساتھ شامل کیا ہے اور اس کے مرویات کو حجت و مستند قرار دیا ہے۔“ (۱)

خصوصیات: سنن ابن ماجہ کو صحاح میں آخری درجہ پر رکھا گیا ہے تاہم اس میں بھی بعض اہم خصوصیات پائے جاتے ہیں۔

۱- اس میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جن سے صحاح ستہ کی دوسری کتابیں خالی ہیں، علمائے فن نے اس کی اسی خصوصیت کی بنا پر اس کو صحاح میں شامل کیا ہے۔ (۲)

۲- حسن ترتیب و تبویب کے لحاظ سے تمام کتب حدیث اور صحاح میں اس کو امتیاز حاصل ہے، یعنی جس خوبی کے ساتھ احادیث کو ابواب کے اندر بلا تکرار، اختصار کے ساتھ اس میں نقل کیا گیا ہے، دوسری کتابیں اس سے خالی ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

”فی الواقع از حسن ترتیب و سرد احادیث بے تکرار آنچہ کہ اس کتاب دارد بیچ از کتب ندارد۔“ (۳)

(۱) شذرات ج ۲ ص ۱۶۳ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۲ و تذکرہ ج ۲ ص ۲۱۰ و تہذیب ج ۲ ص ۵۳۱ (۳)



اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ”اس مفید ترین کتاب کی تیویب فقہی اعتبار سے نہایت عمدہ ہے۔“

۳- عدم تکرار اور اختصار کے باوجود سنن کی ابن ماجہ نہایت جامع کتاب ہے اور دوسری کتابوں کی بہ نسبت زیادہ مسائل و معلومات پر مشتمل ہے، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں، ابن ماجہ کی کتاب سنن، واحکام کی حیثیت سے بہت عمدہ اور جامع ہے، غالباً اسی خوبی کی بنا پر حافظ ابو زرعہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس کے سامنے حدیث کے دوسرے جوامع اور مصنفات بے کار ہو جائیں گے، ان کا یہ خیال بڑی حد تک صحیح ثابت ہوا، چنانچہ حدیث کی بہت سی کتابیں جو صحت و جودت کے لحاظ سے اس سے زیادہ اہم اور بلند پایہ ہیں لیکن ان کو اس کے جیسی شہرت و مقبولیت نہیں حاصل ہو سکی، حضرت شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ ”اگر کسی شخص کو بہت زیادہ متون پر مشتمل کتاب کی تلاش ہو تو اس کو سنن ابن ماجہ کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس وصف میں وہ دوسری کتب حدیث سے منفرد و ممتاز ہے“ (۱)

۴- سنن ابن ماجہ میں ۵ تلافی روایتیں ہیں، اس خصوصیت میں اس کو صحیح بخاری کے سوا تمام کتب صحاح پر فوقیت حاصل ہے۔

۵- کتب حدیث کی عام خصوصیت یعنی متعدد اور گونا گوں تشریحات اور حدیثوں کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں اس میں بھی موجود ہیں بعض حدیثوں کے بارے میں اس قسم کی تصریح بھی ہے کہ ”یہ فلاں شہر والوں کی حدیث ہے۔“

کیا سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل نہیں ہے؟ اگرچہ جمہور اور متاخرین علما کے نزدیک یہ صحاح ستہ میں شامل ہے تاہم بعض لوگوں نے اس کے بجائے مؤطا امام مالک اور سنن دارمی کو یہ درجہ دیا ہے، اس لیے اس مسئلہ کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے:

شروع میں صرف صحیحین اور سنن ابی داؤد و سنن نسائی کو حدیث کی اہم ترین

کتابیں خیال کیا جاتا تھا، حافظ ابن السکن اور حافظ ابن مندہ وغیرہ سے اس کی تصریح منقول ہے، (۱) اس کے بعد حافظ ابوطاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی ان کتابوں میں شامل کر لیا، ساتویں صدی ہجری کے نامور محدثین میں علامہ ابن صلاح اور علامہ نووی نے بھی ان ہی پانچوں مصنفین کی وفیات ذکر کی ہیں لیکن غالباً پہلی مرتبہ محمد بن طاہر مقدسی م ۵۰۷ھ نے جو شروط الائمة السنۃ اور اطراف الکتب السنۃ کے مصنف ہیں، امام ابن ماجہ کو بھی مصنفین صحاح کے زمرہ میں شامل کر لیا اور حافظ عبدالغنی مقدسی م ۶۰۰ھ نے پانچوں کتابوں کی طرح اس کے رجال کو بھی مدون کیا، ان کے بعد جمہور متاخرین کے نزدیک یہ روایت چل نکلی، علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ ”ابن طاہر کے بعد مصنفین اطراف و رجال نے ان کی متابعت کی“ (۲) اسی بنا پر ساتویں صدی ہجری کے نامور محدث نووی کے متعلق جنھوں نے ابن ماجہ کی سنن کو نظر انداز کر دیا تھا حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں (۳) ”مصنف نے سنن ابن ماجہ کو صحاح میں داخل نہیں کیا حالانکہ خود ان کے عہد میں اور اس کے بعد کچھ اہم اور بنیادی کتابوں میں شمار ہونا شہرت پذیر ہو چکا تھا“ اس سلسلہ میں دوسرے علما اور ائمہ فن کے اقوال یہ ہیں:

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ”صحاح ستہ کی ایک کتاب سنن ابن ماجہ بھی ہے“ ابن عماد نے بھی اس قول کو نقل کیا ہے، علامہ ابن ناصر الدین فرماتے ہیں ”ابن ماجہ کی سنن اسلامیات کی بنیادی کتابوں میں ہے“ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں ”ابن ماجہ اُس سنن کے مصنف ہیں جو صحاح ستہ میں شامل ہے۔“ ابوالقاسم رافعی فرماتے ہیں ”محدثین نے سنن ابن ماجہ کو صحیحین اور سنن ابی داؤد و سنن نسائی کے ساتھ شامل کیا ہے“ صاحب مرآة الجنان لکھتے ہیں ”کہ ان کی کتاب ان چھ کتابوں میں سے ایک ہے جس کو بنیادی کتب اور امہات فن میں شمار کیا جاتا ہے“ حافظ عبدالقادر قرشی کا بیان ہے کہ ”جب محدثین کسی روایت کے

(۱) شروط الائمة السنۃ ص ۸ (۲) تدریب الراوی ص ۳۰ (۳) ایضاً۔

متعلق رواۃ الائمۃ السہ کہتے ہیں تو اس سے امام بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کو مراد لیتے ہیں، حافظ سخاوی لکھتے ہیں ”علمائے سنن ابن ماجہ کو موطا پر اس لیے مقدم اور صحاح میں شامل کیا ہے کہ اس میں کتب خمسہ سے بہت سی روایتیں زیادہ ہیں“ شارح سندی ارشاد فرماتے ہیں ”عام متاخرین اس بات کے حق میں ہیں کہ ان کی سنن صحاح کی چھٹی کتاب ہے“ شاہ عبدالعزیز صاحب رقمطراز ہیں کہ ”ابن ماجہ جن مفید اور نفع بخش کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں یہ سنن بھی ہے جو صحاح ستہ میں ہے“ نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں ”شاہ عبدالحق صاحب دہلوی کا بیان ہے کہ ”ابن ماجہ کی سنن کا شمار انہم ترین اسلامی وحدثی کتابوں میں ہوتا ہے جن کو اصول ستہ، کتب ستہ اور صحاح ستہ کہا جاتا ہے، میں اس میں امہات ستہ کا اضافہ کرتا ہوں اور جب محدثین رواہ الجماعۃ کہتے ہیں تو اس سے یہی چھ اشخاص مراد ہوتے ہیں اور جب رواہ الاربعہ کہتے ہیں تو ان کی مراد شیخین کے بجائے، امام ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ سے ہوتی ہے۔ (۱) دوسرے علماء تراجم و فہرست نے بھی اس کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے۔ (۲)

لیکن علما کی ایک جماعت کو موطا کو صحاح کی چھٹی کتاب ماننے پر اصرار ہے، رزین بن معاویہ عبدری م ۵۲۵ھ نے کتاب التجرید للصحاح والسنن میں کتب خمسہ اور موطا امام مالک کی روایتیں درج کی ہیں، ابن اثیر جزری م ۶۰۶ھ نے بھی اپنی کتاب جامع الاصول میں اسی کی تقلید کی ہے، حافظ ابو جعفر بن زبیر غرنطی کہتے ہیں ”ان سب میں بہتر وہ کتابیں ہیں جن کے اعتماد پر مسلمانوں کا اتفاق ہے اور یہ، یہی کتب خمسہ اور موطا ہے جو تصنیف میں ان پر مقدم اور مرتبہ میں کمتر نہیں، عبدالغنی ناغبی کا بیان ہے کہ اہل

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۳ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۰۳ و الباعث الحثیث ص ۹۰ و مرآة

البحان ج ۲ ص ۸۸ و مقدمہ شرح سندی باب ذکر الدیلم و فضل تزوین فتح المغیث ص ۳۳ و بستان المحدثین

ص ۱۱۲ و الخط فی ذکر الصحاح السہ ص ۱۱۰۔ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۳ و اعلام ج ۳ ص ۱۰۰۲۔

مشرق کے نزدیک چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ اور اہل مغرب کے نزدیک امام مالک کی مؤطا ہے۔ (۱)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنن ابن ماجہ کے مقابلہ میں مؤطا کے ماننے والوں کی تعداد بہت کم ہے، اس لیے یہ قول مرجوح سمجھا جائے گا لیکن جہاں تک مؤطا کی صحت و جودت اور اہمیت و عظمت کا سوال ہے، اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں، وہ حدیث کی طرح فقہ، آثار اور فتاویٰ صحابہ و تابعین سب کا مجموعہ ہے اور مرفوع، مقوف، مرسل و مسند ہر قسم کی روایتوں پر مشتمل ہے، اس لیے اس کی موجودہ شکل و صورت میں اس کا حدیث کی مروج و متداول کتابوں سے مقابلہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس کا جو مقام و مرتبہ ہے اس میں حدیث کی کوئی کتاب بھی اس کی ہمسری نہیں کر سکتی، اس کی قدامت، عظمت اور صحت کی وجہ سے اکثر محققین علمائے صحیحین پر بھی اس کو فوقیت دی ہے، خطیب کے نزدیک وہ تمام جوامع و مسانید سے بڑھ کر ہے، (۲) شاہ ولی اللہ صاحب کا بھی یہی خیال ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں ”شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی اور ان لوگوں کے نزدیک جوامع کے ہمنوا ہیں، حدیث و فقہ میں صحیح ترین کتاب مؤطا ہے، پھر بخاری پھر مسلم، شاہ صاحب نے شرح مؤطا یعنی مصنفی کے شروع میں روئے زمین کی تمام کتابوں پر مؤطا کی ترجیح کے سلسلہ میں بڑی لمبی بحث کی ہے اور یہی صحیح ہے۔“ (۳)

سنن ابن ماجہ کو مؤطا پر مقدم کرنے کی وجہ اس کی مزید افادیت ہے جو بہت سی زائد حدیثوں کے درج کرنے سے اس میں پیدا ہو گئی ہے، ورنہ صحت و قوت کے اعتبار سے سنن ابن ماجہ کیا صحاح ستہ کی کوئی کتاب بھی مؤطا کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی۔

رہا سنن دارمی کا معاملہ تو اس کے قائل صرف حافظ صلاح الدین خلیل علائی

(۱) بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۲۴ (۲) تدریب الراوی ص ۳۶ (۳) مک الختام شرح بلوغ المرام

۷۶۱ھ میں، ان کی دلیل یہ ہے کہ ”اس میں ضعیف رواۃ اور شاذ و منکر روایتیں بہت کم ہیں، اس لیے سنن ابن ماجہ کے بجائے اس کو صحاح کی چھٹی کتاب قرار دینا بہتر ہے۔“ (۱) حافظ ابن حجر کی جانب بھی اس قسم کا قول منسوب کیا جاتا ہے، مگر ان سے اس کے برعکس باتیں بھی منقول ہیں، محمد بن اسماعیل امیر یرمینی کا بیان ہے کہ وہ مؤطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شامل کرتے تھے، اس کے علاوہ شارح سنن علاؤالدین مغلطائی پر جن کے قول پر علامہ خلیل علانی کی رائے کی بنیاد ہے، ابن حجر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”دارمی کو مغلطائی سے پہلے کسی نے صحاح میں شامل نہیں کیا اور وہ بھی اس بنیاد پر کہ انھوں نے حافظ منذری کے قلم سے یہی لکھا دیکھا تھا۔“ (۲) حافظ ابن حجر کے ان مختلف اقوال کی بنا پر ان کو علانی کا مؤید نہیں کہا جاسکتا لیکن علانی کے قول کا دارودار مغلطائی کے ایک خیال پر مبنی ہے، جس کے متعلق محمد امیر یرمینی لکھتے ہیں کہ علانی کو مغلطائی کے قول سے مغالطہ ہوا ہے حالانکہ مغلطائی کے قول میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ وہ سنن دارمی کو صحاح ستہ میں داخل کرتے تھے، بلکہ اصلی احتمال یہ ہے کہ انھوں نے اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے کہ اس کے رجال و روایات اکثر و بیشتر صحیح ہیں، سنن ابن ماجہ پر اس کو مقدم اور اہم قرار دیا ہے۔“ (۳)

بہر حال سنن دارمی کو خواہ صحت و قوت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی سنن پر فوقیت کیوں نہ حاصل ہو لیکن تھا اس خصوصیت کی بنا پر اس کو ابن ماجہ کی جگہ صحاح ستہ میں نہیں رکھا جاسکتا اور نہ علانی کے ایک منفرد خیال کی وجہ سے جمہور کی رائے کو مسترد کیا جاسکتا ہے۔

صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کا درجہ: ان بیانات سے اتنا تو واضح ہو گیا کہ ابن ماجہ کی سنن صحاح ستہ میں شامل ہے لیکن اس کا مرتبہ پانچوں سے کمتر ہے، شارح سند کی کہتے ہیں ”وہ کتب حمہ سے کمتر ہے“ ابن وزیر یرمینی کا بیان ہے کہ اس کا درجہ سنن نسائی و سنن ابی داؤد کے بعد ہے لیکن یہ ترجیح مجموعی حیثیت سے ہے، یعنی اس میں دوسری کتابوں کے مقابلہ میں

(۱) مقدمہ سنن دارمی ص ۷۷ (۲) تدریب الراوی ص ۵۷، (۳) تیسرے ایہ الحدیث ص ۳۶، ۳۷۔

ضعیف روایتیں زیادہ ہیں مگر کتب خمسہ کی ہر روایت صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی ہر روایت پر فوقیت نہیں رکھتی، بعض علما کا بیان ہے کہ ابن ماجہ کی بعض روایتیں صحیح بخاری کی بعض حدیثوں سے بھی اصح ہیں۔ (۱)

سنن ابن ماجہ کی ضعیف و منکر روایتیں: امام ابن ماجہ کی احتیاط اور کوشش کے باوجود سنن میں ضعیف روایتیں بھی شامل ہو گئی ہیں مگر علمائے فن کے ایک گروہ کے نزدیک ان کی تعداد بہت کم ہے، چنانچہ ابوزرعہ رازی کا بیان ہے کہ ”مجھے اس میں بہت کم ایسی حدیثیں ملیں جن میں کسی قسم کا شک یا خرابی ہو، دس سے کچھ زیادہ روایتیں ایسی ہوں گی، ان کی دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے میں سے کم حدیثوں کو ضعیف الاسناد قرار دیا، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ سنن ابن ماجہ کی تھوڑی حدیثوں کے سوا سب بہتر اور عمدہ ہیں۔“ (۲)

مگر حافظ ابن حجر کہتے ہیں ”اس میں ضعیف روایتیں بہت زیادہ ہیں۔“ علامہ ذہبی، حافظ ابوزرعہ کے مذکورہ بالا قول پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۳۰ سے ان کی مراد ساقط الاسناد حدیثیں ہوں گی، ورنہ جن حدیثوں سے حجت قائم نہیں ہوتی، ان کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے، شاید ایک ہزار کے قریب ہوں، اسی طرح علامہ سیوطی نے لکھا ہے، ابن طاہر نے ابوزرعہ سے جو روایت کی ہے وہ صحیح نہیں ہے، اس کی سند منقطع ہے، اگر اس کو محفوظ تسلیم کیا جائے تو غالباً اس سے ابوزرعہ کی مراد ساقط الاعتبار روایتیں ہوں گی، یا لکن کی نظر سے اس وقت تک اس کتاب کا تھوڑا حصہ گذرا تھا، ورنہ ابوزرعہ نے سنن ابن ماجہ کی بہت ساری روایتوں کو منکر، باطل اور ساقط بتایا ہے۔“

ان اقوال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابن ماجہ میں بھی دوسری کتابوں کی طرح ضعیف روایات ہیں اور ان کی تعداد کتب خمسہ کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ ہے، اسی لیے اس کا

(۱) توفیح الافکار ج ۱ ص ۲۲۲ و ۲۲۳ بحوالہ امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۳۲ (۲) شروط الائمة المئۃ ص ۹

وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۰ والبدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۵۲۔

درجہ ان کے مقابلہ میں کمتر سمجھا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس سے اس کی اہمیت اور عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، کیوں کہ کسی کتاب کا صحاح ستہ میں ہونا اس کی تمام روایتوں کی صحت و استناد کا ثبوت نہیں ہے بلکہ مجموعی حیثیت کے اعتبار سے ان کو صحاح میں شامل کیا گیا ہے، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں ”ان چاروں کتابوں (ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ) میں حدیث کی جملہ اقسام، یعنی صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی روایتیں پائی جاتی ہیں اور ان کو صحاح کا نام علی وجہ التغلیب دیا جاتا ہے۔“ (۱)

۲- محدثین اور علماء رجال نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ سنن کے اندر منکر، واہی اور موضوع روایتیں بھی ہیں، صرف حافظ ابن حجر کی رائے ہے کہ اس کی منکر حدیثوں کی تعداد زیادہ ہے، ورنہ سیوطی اور ذہبی کے گذشتہ بیانیوں سے ظاہر ہے کہ ساقط الاعتبار روایتوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، حافظ ذہبی نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سنن ابن ماجہ بہترین کتاب ہے، کاش اس کو چند واہی حدیثیں جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے خراب نہ کر دیتیں، علامہ ابن جوزی نے ۳۴ حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے، مولانا عبدالرشید نعمانی نے ان سب کو اور آٹھ مزید روایات یعنی کل ۴۲ حدیثیں نقل کر کے ان پر فنی حیثیت سے بحث کی ہے۔ (۲)

اس تفصیل سے اگرچہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سنن میں منکر روایتیں بھی ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور نہ اتنے بڑے ذخیرہ میں چند منکر و واہی روایات کا پایا جانا کوئی خاص عیب ہے۔

۳- اس سلسلہ کی آخری مگر اہم بحث یہ ہے کہ ”ابن ماجہ کے تفردات ضعیف

(۱) تہذیب المعجم ج ۹ ص ۵۳۱ و توضیح الافکار ص ۲۳۳ بحوالہ امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۳۹

و مقدمہ زہرا ربی علی الجبیتی ص ۸ و حواشی سعدی ص ۱۵ (۲) تہذیب المعجم ج ۹ ص ۵۳۱، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۰

تاسم الیہ الحاجہ ص ۳۸، ۳۵۔

ہیں۔“ حافظ ابن حجر نے ابوالحجاج مزنی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ”ابن ماجہ کی وہ سب روایتیں ضعیف ہیں جن میں وہ ائمہ خمسہ سے منفرد ہیں لیکن حافظ ابن حجر کو خود اس اصول و کلیہ سے اتفاق نہیں ہے وہ لکھتے ہیں کہ ”اگرچہ سنن ابن ماجہ میں ضعیف و منکر روایتیں زیادہ ہیں لیکن میرے استقصا و تتبع کے مطابق ان کے تفردات کے بارے میں مطلقاً یہ حکم لگانا درست نہیں ہے..... مزنی کے قول کو رجال پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے، حدیثوں پر اس کا اطلاق صحیح نہیں ہے، کیوں کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جن روایتوں میں ابن ماجہ منفرد ہیں ان میں صحیح و حسن ہر قسم کی حدیثیں ہیں“ (۱) شارح سندى کا بیان ہے کہ ”سنن ابن ماجہ میں صحاح خمسہ پر زوائد بہت ہیں اور مشہور یہ ہے کہ ان کے تفردات ضعیف ہوا کرتے ہیں حالانکہ یہ کلیہ صحیح نہیں ہے“ مولانا عبدالرشید نعمانی نے حافظ ابن حجر کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رجال کے متعلق بھی کلی طور پر یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا اور اس کی چند مثالیں دے کر تردید کی ہے۔ (۲)

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ضعیف اور بعض منکر روایتوں کے باوجود سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل ہے اور جن حدیثوں میں انھوں نے ائمہ خمسہ سے تفرد کیا ہے ان میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں۔

شروح و تعلیقات: سنن ابن ماجہ کے ساتھ علمائے بڑا اعتنا کیا اور اس کے متعدد حواشی و شروح لکھے جن کی تعداد انسانی کے شروح و حواشی سے زیادہ ہے۔

۱- شرح سنن ابن ماجہ: سب سے پہلے علاؤ الدین مغلاطائی بن قلیج م ۷۶۲ھ نے سنن ابن ماجہ کی ایک جامع شرح لکھنا شروع کی تھی، مگر وہ اس کو مکمل نہ کر سکے، یہ نامکمل شرح پانچ جلدوں میں ہے، (۳) اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ نو تک میں موجود ہے۔ (۴)

(۱) تہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ (۲) تائیس الیہ الحاجہ ص ۳۸ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۳ (۴) امام ابن

ماجہ اور علم حدیث ص ۲۳۵۔



۲- تلمس الیہ الحاجۃ علی سنن ابن ماجہ: شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن م ۸۰۴ھ نے سنن کی ان حدیثوں کی جو کتب خمسہ میں نہیں ہیں، ۸ جلدوں میں ایک مفصل شرح لکھی۔

۳- شرح سنن ابن ماجہ: ابن رجب زبیری کی یہ شرح نایاب ہے، شیخ ابوالحسن ہندی نے اپنے حواشی میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۴- الدیبلجہ فی شرح سنن ابن ماجہ: شیخ کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیری م ۸۰۸ھ نے ۵ جلدوں میں شرح لکھی مگر تسوید و تمییز سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔

۵- شرح سنن ابن ماجہ: ابن سبط عجمی بہ برہان الدین ابراہیم بن محمد حلبي م ۸۴۱ھ کی سنن پر یہ ایک لطیف تعلیق ہے۔

۶- مصباح الزجاجة: علامہ جلال الدین سیوطی م ۹۱۱ھ کا مختصر حاشیہ جو نہایت مقبول و متداول اور سنن کے ساتھ طبع ہو چکا ہے، مصر سے اس کا اختصار بھی شائع ہوا ہے۔

۷- شرح سنن ابن ماجہ: ابوالحسن محمد بن عبد البہادی ہندی م ۶۳۸ھ نے صحاح کی دوسری کتابوں کی طرح اس کا بھی حاشیہ لکھا جو سنن کے ساتھ چھپ کر بہت مقبول ہوا، اس میں مشکل اور غریب الفاظ اور اعراب کی وضاحت کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔ (۱)

۹- شرح انبج الحاجۃ: شیخ عبدالغنی بن ابوسعید مجددی دہلوی م ۱۲۹۵ھ کی یہ مختصر مگر جامع شرح ہے اور سنن کے ساتھ حاشیہ پر دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

۱۰- حاشیہ بر سنن ابن ماجہ: مولانا فخر الحسن گنگوہی نے اس تعلیق کے اندر علامہ سیوطی اور مولانا مجددی دونوں شرحوں کو مفید اضافہ کے ساتھ جمع کیا ہے جو کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔

۱۱- مفتاح الحاجۃ: یہ شیخ محمد علوی کا حاشیہ ہے جو اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

۱۲- رفع العجاہ عن سنن ابن ماجہ: مشہور عالم اور مترجم حدیث مولانا وحید الزماں

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۳، الضوء الملامع ج ۱ ص ۱۴۱۔

وقار نواز جنگ نے سنن ابن ماجہ کا اردو ترجمہ اور اس کی مختصر شرح اردو میں لکھی ہے، جو متوسط تقطیع کی تین ضخیم جلدوں میں مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۱۰ھ میں چھپ چکی ہے۔

شرحوں اور حواشی کے علاوہ سنن کے زوائد، رجال اور اس کی دوسری حیثیتوں پر بھی کام کئے گئے ہیں۔

۱۳- الجردنی اسماء رجال ابن ماجہ: علامہ ذہبی نے اس میں ابن ماجہ کے اُن رواۃ کا تذکرہ کیا ہے، جن سے صحیحین میں کوئی روایت درج نہیں ہے، اس کا قلمی نسخہ دمشق کے کتب خانہ ظاہر یہ میں بیس ورقوں میں موجود ہے۔

۱۴- زوائد ابن ماجہ: یہ حافظ شہاب الدین بوسیری م ۸۴۰ھ کی تالیف ہے، اس میں ہر روایت کے اسناد کی قوت و ضعف کو بیان کیا گیا ہے، یہ کتاب اگرچہ ناپید ہے لیکن علامہ سندی نے اپنی شرح میں اس کی اہم اور ضروری باتیں نقل کر دی ہیں۔

۱۵- ماتمس الیہ الحاجہ لمن یطالع سنن ابن ماجہ: یہ دونوں مفید کتابیں مولانا عبدالرشید نعمانی..... ابن ماجہ اور علم حدیث..... نے عربی اور اردو میں لکھی ہیں، ان میں ابن ماجہ کے حالات و سوانح اور سنن پر مبسوط تبصرہ کے علاوہ، حدیث کی حجیت، تاریخ و تدوین اور ائمہ اربعہ اور مصنفین صحاح کے شرائط اور امام ابن ماجہ کے عہد تک کے بعض اکابر محدثین کا مختصر تذکرہ بھی ہے۔



## امام ابوداؤد سجستانی

(متوفی ۲۷۵ھ)

نام و نسب: سلیمان نام، ابوداؤد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد بن عمرو بن عمران۔ (۱)

بعض مورخین سے نسب نامہ میں معمولی اختلاف بھی منقول ہے۔

امام کے جد اعلیٰ عمران کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جنگ صفین میں حضرت علیؑ کے ساتھ تھے اور اسی میں ان کی شہادت ہوئی۔ (۲)

ولادت و خاندان: امام ابوداؤد کا خود بیان ہے کہ وہ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے تھے، (۳) اور مشہور قبیلہ ازد سے ان کا نسبی تعلق تھا، اس لیے ازدی کہلاتے ہیں۔

وطن: خراسان کے مشہور علاقہ سجستان (سیدتان) کو امام صاحب کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن بعض لوگوں نے بصرہ کے ایک گاؤں سجستان یا سجستانہ کو آپ کا وطن بتایا ہے جو صحیح نہیں، محمد بن طاہر مقدسی لکھتے ہیں ”میں نے محمد بن نصر، قتل ہوا اللہ خاں سے سنا کہ امام ابوداؤد کا وطن بصرہ کا ایک گاؤں سجستان ہے جو خراسان کے سجستان سے الگ ہے، اسی طرح کی ایک اور روایت بھی ہے لیکن ابن نصر کا یہ بھی بیان ہے کہ انھوں نے جب بصرہ

(۱) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۵ و کتاب الانساب تاورق ۲۹۲ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸۱ (۲) کتاب

الانساب ورق ۲۹۲ و تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۶۹ (۳) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۶۔

والوں سے اس کی تحقیق کی تو پتہ چلا کہ وہاں کے لوگ اس نام کے کسی گاؤں سے واقف نہیں، یہ روایات ناقابل اعتماد ہیں، دوسرے معتبر علما و حفاظ حدیث میں سے بھی کسی نے اس طرح کی تصریح نہیں کی ہے کہ ان کا وطن مشہور بھستان کے علاوہ کسی اور جگہ ہے۔ (۱) علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ”بھستان کی جانب نسبت ہے جو کابل کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔“ (۲) شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں ”ابن خلکان کو انساب میں مہارت اور تاریخ دانی میں کمال کے باوجود اس نسبت کے متعلق غلط فہمی ہو گئی ہے اور بقول صاحب طبقات علامہ تاج الدین سبکی یہ وہم ہے، صحیح یہ ہے کہ یہ نسبت سیستان (بھستان) کی جانب ہے جو ایک مشہور ملک اور سندھ و ہرات کے درمیان قندھار کے قریب واقع ہے، چشت بھی جو بزرگان چشت کا مسکن ہے، اسی ملک کے اندر ہے اور قدیم زمانہ میں اس ملک کا پایہ تخت بست تھا۔ (۳)

مگر علامہ ابن خلکان بھی جمہور کے قول کو راجح سمجھتے ہیں، ان کا بیان یہ ہے ”بھستانی..... کی نسبت مشہور شہر بھستان کی جانب ہے لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بصرہ کے ایک گاؤں بھستان یا بھستان کی جانب منسوب ہے، واللہ اعلم۔“

علامہ ذہبی نے بھی دونوں اقوال ذکر کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں ”ابوداؤد کا وطن بھستان ہے جو مکران اور سندھ کے اطراف و جوانب اور ہران کے مقابل میں واقع ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا تعلق بصرہ کے ایک گاؤں بھستان سے تھا۔“ (۴)

اس غلط فہمی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ امام صاحب نے آخر عمر میں بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اس لیے بعض لوگوں نے ان کا اصلی وطن بھی اس کے قرب و جوار ہی کے علاقہ کو سمجھ لیا۔

(۱) کتاب الانساب مقدسی ص ۱۰۹ (۲) کتاب الانساب سمعانی ورق ۲۹۲ (۳) بستان الحمد شین ص ۱۰۷ والخطہ ص ۱۲۵ (۴) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۳ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۷۰۔

اساتذہ و شیوخ: حافظ ابن حجر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے اساتذہ کی تعداد تین سو کے قریب ہے، ان میں امام احمد بن حنبل، اسحاق بن رواہویہ اور ابو ثور جیسے بلند پایہ فقہائے محدثین اور یحییٰ بن معین، ہشام بن عبد الملک طرابلسی، ابو بکر بن ابی شیبہ اور عثمان بن ابی شیبہ جیسے نامور ناقدین فن اور ائمہ محدثین شامل ہیں، چند اور مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

حیوة بن شریح، خلف بن ہشام بغدادی، ربیع بن نافع حلبی، زہر بن حرب، سعید بن سلیمان بزار واسطی، سعید بن منصور، سلیمان بن حرب، سلیمان بن عبد الرحمن دمشقی، شجاع بن مخلد، صفوان بن صالح دمشقی، عبد اللہ بن رجاء بصری، عبد اللہ بن محمد نفیلی دمشقی، عمرو بن عون بزار واسطی، ابورجاء قتیبہ بن سعید، محمد بن بشار بندار بصری، محمد بن صباح بزار دولابی، محمد بن منہال، مسدود بن مسرہد، ہشام بن خالد ازرق دمشقی، ہناد بن عمرو اور ابو محمد وہب بن یقینہ وغیرہ۔ (۱)

تلامذہ: امام صاحب کے تلامذہ کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہے، سنن کے رواۃ میں ابو عمر و احمد بن علی حسن بصری، ابو علی محمد بن احمد بن عمرو ولولوی، ابو الطیب احمد بن ابراہیم اشنائی، ابو سعید احمد بن محمد بن زیاد اعرابی، ابو بکر محمد بن عبد الرزاق بن داسہ ابو الحسن علی بن حسن بن عبد انصاری، ابو عیسیٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید ربلی اور ابو اسامہ محمد بن عبد الملک بن یزید واس۔

دوسری کتابوں کے رواۃ میں: ابو عبد اللہ محمد بن احمد بصری، ابو بکر احمد بن سلیمان بخارا، اسماعیل بن محمد صفار، ابو عبید محمد بن علی بن عثمان آجری اور دوسرے مشہور علما میں آپ کے صاحبزادے ابو بکر بن ابی داؤد، ابو عوانہ، یعقوب بن اسحاق الفرائینی، حرب بن اسماعیل کرمانی، زکریا ساجی، ابو بکر احمد بن محمد خلال اور احمد بن محمد بن یسین ہروی وغیرہ۔

صحاح ستہ کے مصنفین میں امام ترمذی اور امام نسائی کو بھی آپ سے تلمذ حاصل

(۱) تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۱۷۲، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴

ہے اور امام احمد نے بھی جو ان کے اساتذہ میں تھے، ایک حدیث ان سے روایت کی ہے، (۱) امام ابوداؤد کے تلامذہ میں چار اشخاص زیادہ مشہور و ممتاز ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

”وچہار کس از جملہ شاگردان او خلیے سرآمد محدثین شدند اول پرش

ابوبکر بن ابی داؤد، دوم لولوی، سوم ابن الاعرابی، چہارم ابن داستہ۔ (۲)

سماع حدیث کے لیے سفر: ابوداؤد نے اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق حصول حدیث کے لیے مختلف مقامات کا سفر کیا، وہ بختان میں پیدا ہوئے لیکن بصرہ کو مسکن بنایا جو اس زمانہ میں علم فن اور محدثین و فقہا کا بہت بڑا مرکز تھا، کئی بار بغداد تشریف لے گئے، حجاز، عراق، خراسان، مصر، شام، جزیرہ نیشاپور، مرو اور اصہبان وغیرہ کے محدثین کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر ان سے استفادہ کیا۔ (۳)

حفظ و ضبط: ان کا حافظہ نہایت قوی اور ذہن بڑا رسا تھا، محمد بن یسین ہروی فرماتے ہیں ”حفاظ حدیث میں ابوداؤد بھی ایک مشہور حافظ ہیں“ ابو حاتم کا بیان ہے کہ ”وہ حفظ کے اعتبار سے دنیا کے اماموں میں ایک امام تھے“ محمد بن مخلد فرماتے ہیں کہ ابوداؤد ہزاروں حدیثوں کا مذاکرہ کرتے تھے، اور جب انھوں نے سنن مرتب کی تو تمام اہل زمانہ ان کے حفظ و تقدم کے معترف ہو گئے، امام نووی فرماتے ہیں کہ جمہور علمائے اسلام کو ان کے کمال حفظ کا اعتراف ہے۔ (۴)

جرح و تعدیل: حفظ و ضبط اور ثقاہت و عدالت کی طرح جرح و تعدیل میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا اور صحیح و سقیم، قوی و ضعیف، مشہور و منکر اور حسن و شاذ ہر قسم کی روایتوں کے

(۱) تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۲۲۱ و ۲۲۲ اور ۱۷۰ و ۱۷۱ و ۱۷۲ و ۱۷۳ و ۱۷۴ و ۱۷۵ و ۱۷۶ و ۱۷۷ و ۱۷۸ و ۱۷۹ و ۱۸۰ و ۱۸۱ و ۱۸۲ و ۱۸۳ و ۱۸۴ و ۱۸۵ و ۱۸۶ و ۱۸۷ و ۱۸۸ و ۱۸۹ و ۱۹۰ و ۱۹۱ و ۱۹۲ و ۱۹۳ و ۱۹۴ و ۱۹۵ و ۱۹۶ و ۱۹۷ و ۱۹۸ و ۱۹۹ و ۲۰۰ و ۲۰۱ و ۲۰۲ و ۲۰۳ و ۲۰۴ و ۲۰۵ و ۲۰۶ و ۲۰۷ و ۲۰۸ و ۲۰۹ و ۲۱۰ و ۲۱۱ و ۲۱۲ و ۲۱۳ و ۲۱۴ و ۲۱۵ و ۲۱۶ و ۲۱۷ و ۲۱۸ و ۲۱۹ و ۲۲۰ و ۲۲۱ و ۲۲۲ و ۲۲۳ و ۲۲۴ و ۲۲۵ و ۲۲۶ و ۲۲۷ و ۲۲۸ و ۲۲۹ و ۲۳۰ و ۲۳۱ و ۲۳۲ و ۲۳۳ و ۲۳۴ و ۲۳۵ و ۲۳۶ و ۲۳۷ و ۲۳۸ و ۲۳۹ و ۲۴۰ و ۲۴۱ و ۲۴۲ و ۲۴۳ و ۲۴۴ و ۲۴۵ و ۲۴۶ و ۲۴۷ و ۲۴۸ و ۲۴۹ و ۲۵۰ و ۲۵۱ و ۲۵۲ و ۲۵۳ و ۲۵۴ و ۲۵۵ و ۲۵۶ و ۲۵۷ و ۲۵۸ و ۲۵۹ و ۲۶۰ و ۲۶۱ و ۲۶۲ و ۲۶۳ و ۲۶۴ و ۲۶۵ و ۲۶۶ و ۲۶۷ و ۲۶۸ و ۲۶۹ و ۲۷۰ و ۲۷۱ و ۲۷۲ و ۲۷۳ و ۲۷۴ و ۲۷۵ و ۲۷۶ و ۲۷۷ و ۲۷۸ و ۲۷۹ و ۲۸۰ و ۲۸۱ و ۲۸۲ و ۲۸۳ و ۲۸۴ و ۲۸۵ و ۲۸۶ و ۲۸۷ و ۲۸۸ و ۲۸۹ و ۲۹۰ و ۲۹۱ و ۲۹۲ و ۲۹۳ و ۲۹۴ و ۲۹۵ و ۲۹۶ و ۲۹۷ و ۲۹۸ و ۲۹۹ و ۳۰۰ و ۳۰۱ و ۳۰۲ و ۳۰۳ و ۳۰۴ و ۳۰۵ و ۳۰۶ و ۳۰۷ و ۳۰۸ و ۳۰۹ و ۳۱۰ و ۳۱۱ و ۳۱۲ و ۳۱۳ و ۳۱۴ و ۳۱۵ و ۳۱۶ و ۳۱۷ و ۳۱۸ و ۳۱۹ و ۳۲۰ و ۳۲۱ و ۳۲۲ و ۳۲۳ و ۳۲۴ و ۳۲۵ و ۳۲۶ و ۳۲۷ و ۳۲۸ و ۳۲۹ و ۳۳۰ و ۳۳۱ و ۳۳۲ و ۳۳۳ و ۳۳۴ و ۳۳۵ و ۳۳۶ و ۳۳۷ و ۳۳۸ و ۳۳۹ و ۳۴۰ و ۳۴۱ و ۳۴۲ و ۳۴۳ و ۳۴۴ و ۳۴۵ و ۳۴۶ و ۳۴۷ و ۳۴۸ و ۳۴۹ و ۳۵۰ و ۳۵۱ و ۳۵۲ و ۳۵۳ و ۳۵۴ و ۳۵۵ و ۳۵۶ و ۳۵۷ و ۳۵۸ و ۳۵۹ و ۳۶۰ و ۳۶۱ و ۳۶۲ و ۳۶۳ و ۳۶۴ و ۳۶۵ و ۳۶۶ و ۳۶۷ و ۳۶۸ و ۳۶۹ و ۳۷۰ و ۳۷۱ و ۳۷۲ و ۳۷۳ و ۳۷۴ و ۳۷۵ و ۳۷۶ و ۳۷۷ و ۳۷۸ و ۳۷۹ و ۳۸۰ و ۳۸۱ و ۳۸۲ و ۳۸۳ و ۳۸۴ و ۳۸۵ و ۳۸۶ و ۳۸۷ و ۳۸۸ و ۳۸۹ و ۳۹۰ و ۳۹۱ و ۳۹۲ و ۳۹۳ و ۳۹۴ و ۳۹۵ و ۳۹۶ و ۳۹۷ و ۳۹۸ و ۳۹۹ و ۴۰۰ و ۴۰۱ و ۴۰۲ و ۴۰۳ و ۴۰۴ و ۴۰۵ و ۴۰۶ و ۴۰۷ و ۴۰۸ و ۴۰۹ و ۴۱۰ و ۴۱۱ و ۴۱۲ و ۴۱۳ و ۴۱۴ و ۴۱۵ و ۴۱۶ و ۴۱۷ و ۴۱۸ و ۴۱۹ و ۴۲۰ و ۴۲۱ و ۴۲۲ و ۴۲۳ و ۴۲۴ و ۴۲۵ و ۴۲۶ و ۴۲۷ و ۴۲۸ و ۴۲۹ و ۴۳۰ و ۴۳۱ و ۴۳۲ و ۴۳۳ و ۴۳۴ و ۴۳۵ و ۴۳۶ و ۴۳۷ و ۴۳۸ و ۴۳۹ و ۴۴۰ و ۴۴۱ و ۴۴۲ و ۴۴۳ و ۴۴۴ و ۴۴۵ و ۴۴۶ و ۴۴۷ و ۴۴۸ و ۴۴۹ و ۴۵۰ و ۴۵۱ و ۴۵۲ و ۴۵۳ و ۴۵۴ و ۴۵۵ و ۴۵۶ و ۴۵۷ و ۴۵۸ و ۴۵۹ و ۴۶۰ و ۴۶۱ و ۴۶۲ و ۴۶۳ و ۴۶۴ و ۴۶۵ و ۴۶۶ و ۴۶۷ و ۴۶۸ و ۴۶۹ و ۴۷۰ و ۴۷۱ و ۴۷۲ و ۴۷۳ و ۴۷۴ و ۴۷۵ و ۴۷۶ و ۴۷۷ و ۴۷۸ و ۴۷۹ و ۴۸۰ و ۴۸۱ و ۴۸۲ و ۴۸۳ و ۴۸۴ و ۴۸۵ و ۴۸۶ و ۴۸۷ و ۴۸۸ و ۴۸۹ و ۴۹۰ و ۴۹۱ و ۴۹۲ و ۴۹۳ و ۴۹۴ و ۴۹۵ و ۴۹۶ و ۴۹۷ و ۴۹۸ و ۴۹۹ و ۵۰۰ و ۵۰۱ و ۵۰۲ و ۵۰۳ و ۵۰۴ و ۵۰۵ و ۵۰۶ و ۵۰۷ و ۵۰۸ و ۵۰۹ و ۵۱۰ و ۵۱۱ و ۵۱۲ و ۵۱۳ و ۵۱۴ و ۵۱۵ و ۵۱۶ و ۵۱۷ و ۵۱۸ و ۵۱۹ و ۵۲۰ و ۵۲۱ و ۵۲۲ و ۵۲۳ و ۵۲۴ و ۵۲۵ و ۵۲۶ و ۵۲۷ و ۵۲۸ و ۵۲۹ و ۵۳۰ و ۵۳۱ و ۵۳۲ و ۵۳۳ و ۵۳۴ و ۵۳۵ و ۵۳۶ و ۵۳۷ و ۵۳۸ و ۵۳۹ و ۵۴۰ و ۵۴۱ و ۵۴۲ و ۵۴۳ و ۵۴۴ و ۵۴۵ و ۵۴۶ و ۵۴۷ و ۵۴۸ و ۵۴۹ و ۵۵۰ و ۵۵۱ و ۵۵۲ و ۵۵۳ و ۵۵۴ و ۵۵۵ و ۵۵۶ و ۵۵۷ و ۵۵۸ و ۵۵۹ و ۵۶۰ و ۵۶۱ و ۵۶۲ و ۵۶۳ و ۵۶۴ و ۵۶۵ و ۵۶۶ و ۵۶۷ و ۵۶۸ و ۵۶۹ و ۵۷۰ و ۵۷۱ و ۵۷۲ و ۵۷۳ و ۵۷۴ و ۵۷۵ و ۵۷۶ و ۵۷۷ و ۵۷۸ و ۵۷۹ و ۵۸۰ و ۵۸۱ و ۵۸۲ و ۵۸۳ و ۵۸۴ و ۵۸۵ و ۵۸۶ و ۵۸۷ و ۵۸۸ و ۵۸۹ و ۵۹۰ و ۵۹۱ و ۵۹۲ و ۵۹۳ و ۵۹۴ و ۵۹۵ و ۵۹۶ و ۵۹۷ و ۵۹۸ و ۵۹۹ و ۶۰۰ و ۶۰۱ و ۶۰۲ و ۶۰۳ و ۶۰۴ و ۶۰۵ و ۶۰۶ و ۶۰۷ و ۶۰۸ و ۶۰۹ و ۶۱۰ و ۶۱۱ و ۶۱۲ و ۶۱۳ و ۶۱۴ و ۶۱۵ و ۶۱۶ و ۶۱۷ و ۶۱۸ و ۶۱۹ و ۶۲۰ و ۶۲۱ و ۶۲۲ و ۶۲۳ و ۶۲۴ و ۶۲۵ و ۶۲۶ و ۶۲۷ و ۶۲۸ و ۶۲۹ و ۶۳۰ و ۶۳۱ و ۶۳۲ و ۶۳۳ و ۶۳۴ و ۶۳۵ و ۶۳۶ و ۶۳۷ و ۶۳۸ و ۶۳۹ و ۶۴۰ و ۶۴۱ و ۶۴۲ و ۶۴۳ و ۶۴۴ و ۶۴۵ و ۶۴۶ و ۶۴۷ و ۶۴۸ و ۶۴۹ و ۶۵۰ و ۶۵۱ و ۶۵۲ و ۶۵۳ و ۶۵۴ و ۶۵۵ و ۶۵۶ و ۶۵۷ و ۶۵۸ و ۶۵۹ و ۶۶۰ و ۶۶۱ و ۶۶۲ و ۶۶۳ و ۶۶۴ و ۶۶۵ و ۶۶۶ و ۶۶۷ و ۶۶۸ و ۶۶۹ و ۶۷۰ و ۶۷۱ و ۶۷۲ و ۶۷۳ و ۶۷۴ و ۶۷۵ و ۶۷۶ و ۶۷۷ و ۶۷۸ و ۶۷۹ و ۶۸۰ و ۶۸۱ و ۶۸۲ و ۶۸۳ و ۶۸۴ و ۶۸۵ و ۶۸۶ و ۶۸۷ و ۶۸۸ و ۶۸۹ و ۶۹۰ و ۶۹۱ و ۶۹۲ و ۶۹۳ و ۶۹۴ و ۶۹۵ و ۶۹۶ و ۶۹۷ و ۶۹۸ و ۶۹۹ و ۷۰۰ و ۷۰۱ و ۷۰۲ و ۷۰۳ و ۷۰۴ و ۷۰۵ و ۷۰۶ و ۷۰۷ و ۷۰۸ و ۷۰۹ و ۷۱۰ و ۷۱۱ و ۷۱۲ و ۷۱۳ و ۷۱۴ و ۷۱۵ و ۷۱۶ و ۷۱۷ و ۷۱۸ و ۷۱۹ و ۷۲۰ و ۷۲۱ و ۷۲۲ و ۷۲۳ و ۷۲۴ و ۷۲۵ و ۷۲۶ و ۷۲۷ و ۷۲۸ و ۷۲۹ و ۷۳۰ و ۷۳۱ و ۷۳۲ و ۷۳۳ و ۷۳۴ و ۷۳۵ و ۷۳۶ و ۷۳۷ و ۷۳۸ و ۷۳۹ و ۷۴۰ و ۷۴۱ و ۷۴۲ و ۷۴۳ و ۷۴۴ و ۷۴۵ و ۷۴۶ و ۷۴۷ و ۷۴۸ و ۷۴۹ و ۷۵۰ و ۷۵۱ و ۷۵۲ و ۷۵۳ و ۷۵۴ و ۷۵۵ و ۷۵۶ و ۷۵۷ و ۷۵۸ و ۷۵۹ و ۷۶۰ و ۷۶۱ و ۷۶۲ و ۷۶۳ و ۷۶۴ و ۷۶۵ و ۷۶۶ و ۷۶۷ و ۷۶۸ و ۷۶۹ و ۷۷۰ و ۷۷۱ و ۷۷۲ و ۷۷۳ و ۷۷۴ و ۷۷۵ و ۷۷۶ و ۷۷۷ و ۷۷۸ و ۷۷۹ و ۷۸۰ و ۷۸۱ و ۷۸۲ و ۷۸۳ و ۷۸۴ و ۷۸۵ و ۷۸۶ و ۷۸۷ و ۷۸۸ و ۷۸۹ و ۷۹۰ و ۷۹۱ و ۷۹۲ و ۷۹۳ و ۷۹۴ و ۷۹۵ و ۷۹۶ و ۷۹۷ و ۷۹۸ و ۷۹۹ و ۸۰۰ و ۸۰۱ و ۸۰۲ و ۸۰۳ و ۸۰۴ و ۸۰۵ و ۸۰۶ و ۸۰۷ و ۸۰۸ و ۸۰۹ و ۸۱۰ و ۸۱۱ و ۸۱۲ و ۸۱۳ و ۸۱۴ و ۸۱۵ و ۸۱۶ و ۸۱۷ و ۸۱۸ و ۸۱۹ و ۸۲۰ و ۸۲۱ و ۸۲۲ و ۸۲۳ و ۸۲۴ و ۸۲۵ و ۸۲۶ و ۸۲۷ و ۸۲۸ و ۸۲۹ و ۸۳۰ و ۸۳۱ و ۸۳۲ و ۸۳۳ و ۸۳۴ و ۸۳۵ و ۸۳۶ و ۸۳۷ و ۸۳۸ و ۸۳۹ و ۸۴۰ و ۸۴۱ و ۸۴۲ و ۸۴۳ و ۸۴۴ و ۸۴۵ و ۸۴۶ و ۸۴۷ و ۸۴۸ و ۸۴۹ و ۸۵۰ و ۸۵۱ و ۸۵۲ و ۸۵۳ و ۸۵۴ و ۸۵۵ و ۸۵۶ و ۸۵۷ و ۸۵۸ و ۸۵۹ و ۸۶۰ و ۸۶۱ و ۸۶۲ و ۸۶۳ و ۸۶۴ و ۸۶۵ و ۸۶۶ و ۸۶۷ و ۸۶۸ و ۸۶۹ و ۸۷۰ و ۸۷۱ و ۸۷۲ و ۸۷۳ و ۸۷۴ و ۸۷۵ و ۸۷۶ و ۸۷۷ و ۸۷۸ و ۸۷۹ و ۸۸۰ و ۸۸۱ و ۸۸۲ و ۸۸۳ و ۸۸۴ و ۸۸۵ و ۸۸۶ و ۸۸۷ و ۸۸۸ و ۸۸۹ و ۸۹۰ و ۸۹۱ و ۸۹۲ و ۸۹۳ و ۸۹۴ و ۸۹۵ و ۸۹۶ و ۸۹۷ و ۸۹۸ و ۸۹۹ و ۹۰۰ و ۹۰۱ و ۹۰۲ و ۹۰۳ و ۹۰۴ و ۹۰۵ و ۹۰۶ و ۹۰۷ و ۹۰۸ و ۹۰۹ و ۹۱۰ و ۹۱۱ و ۹۱۲ و ۹۱۳ و ۹۱۴ و ۹۱۵ و ۹۱۶ و ۹۱۷ و ۹۱۸ و ۹۱۹ و ۹۲۰ و ۹۲۱ و ۹۲۲ و ۹۲۳ و ۹۲۴ و ۹۲۵ و ۹۲۶ و ۹۲۷ و ۹۲۸ و ۹۲۹ و ۹۳۰ و ۹۳۱ و ۹۳۲ و ۹۳۳ و ۹۳۴ و ۹۳۵ و ۹۳۶ و ۹۳۷ و ۹۳۸ و ۹۳۹ و ۹۴۰ و ۹۴۱ و ۹۴۲ و ۹۴۳ و ۹۴۴ و ۹۴۵ و ۹۴۶ و ۹۴۷ و ۹۴۸ و ۹۴۹ و ۹۵۰ و ۹۵۱ و ۹۵۲ و ۹۵۳ و ۹۵۴ و ۹۵۵ و ۹۵۶ و ۹۵۷ و ۹۵۸ و ۹۵۹ و ۹۶۰ و ۹۶۱ و ۹۶۲ و ۹۶۳ و ۹۶۴ و ۹۶۵ و ۹۶۶ و ۹۶۷ و ۹۶۸ و ۹۶۹ و ۹۷۰ و ۹۷۱ و ۹۷۲ و ۹۷۳ و ۹۷۴ و ۹۷۵ و ۹۷۶ و ۹۷۷ و ۹۷۸ و ۹۷۹ و ۹۸۰ و ۹۸۱ و ۹۸۲ و ۹۸۳ و ۹۸۴ و ۹۸۵ و ۹۸۶ و ۹۸۷ و ۹۸۸ و ۹۸۹ و ۹۹۰ و ۹۹۱ و ۹۹۲ و ۹۹۳ و ۹۹۴ و ۹۹۵ و ۹۹۶ و ۹۹۷ و ۹۹۸ و ۹۹۹ و ۱۰۰۰

تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۲۳۔

تذکرۃ المحدثین.... گلستان حدیث کے مہکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

309

پرکھنے میں ان کو پورا ملکہ حاصل تھا، ان کی قوت تمیز، نقد و نظر اور ثقاہت و عدالت پر اساطین فن کا اتفاق ہے، محمد بن یسین ہروی فرماتے ہیں کہ ”وہ احادیث نبوی کے حافظ و واقف کار بھی تھے اور ان کی اسنادِ علی کے ماہر بھی“ ابو عبد اللہ بن مندہ کا بیان ہے کہ ”احادیث کی تخریج، معلول و ثابت اور غلط و صحیح میں تمیز کرنے والے چار آدمی ہیں، امام بخاری اور امام مسلم اور ان کے بعد ابو داؤد اور نسائی“ حافظ ابن جوزی جیسے سخت گیر کو بھی علی حدیث میں ان کی معرفت کا اعتراف ہے، ابو حاتم فرماتے ہیں کہ ”وہ احادیث میں نہایت معتبر و متقن اور امام تھے۔“ (۱)

حدیث میں کمال: ابو داؤد اس دور میں پیدا ہوئے تھے، جب دنیائے اسلام نامور محدثین سے معمور تھی، اس زمانہ میں انھوں نے اس فن میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ائمہ حدیث اور اساطین فن میں ان کو امتیازی درجہ حاصل ہو گیا اور سب نے ان کی جلالتِ قدر کا اعتراف کیا، ابراہیم حربی کہتے ہیں کہ ”فن حدیث ان کے لیے اس طرح آسان ہو گیا تھا، جس طرح حضرت داؤد کے لیے لوہانزم اور موم بن گیا تھا، موسیٰ بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ ”وہ دنیا میں تحصیل حدیث اور عقبیٰ میں جنت کے لیے پیدا کیے گئے تھے، میں نے ان سے زیادہ افضل و برتر کوئی آدمی نہیں دیکھا“ احمد بن محمد بن یسین ہروی نے ان کو فرسان حدیث میں شمار کیا ہے، حاکم صاحب مستدرک کی رائے ہے کہ ”وہ اپنے دور میں امام المحدثین تھے“ امام نووی فرماتے ہیں کہ ”علمائے اسلام ابو داؤد کی مدح و توصیف ان کے ذوقِ علم حدیث میں فہم صائب اور ذہن رسا پر متفق ہیں“ محمد بن مخلد کہتے ہیں کہ ابو داؤد کے معاصرین اور اہل زمانہ ان کی امامت فن کے معترف تھے۔“ (۲)

فقہ و اجتہاد: اگرچہ امام ابو داؤد کی شہرت محدث کی حیثیت سے زیادہ ہے لیکن فقہ و اجتہاد

(۱) تہذیب المعجم ج ۳ ص ۱۷۰ تا ۱۷۱ و المستنصر ج ۵ ص ۵۷ (۲) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۸ و ابن

خلکان ج ۱ ص ۲۸۲، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۶۹ و تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۳۳۔

میں بھی ان کو بڑی بصیرت حاصل تھی اور حدیث کی طرح فقہ میں بھی ان کی نظر وسیع اور گہری تھی، ابو حاتم ان کو امام فقہ قرار دیتے ہیں، صاحب شذرات اور یافعی نے لکھا ہے کہ ”وہ حدیث و فقہ دونوں میں ممتاز اور بلند حیثیت رکھتے تھے“، بعض علما کا بیان ہے کہ اصحاب صحاح میں امام بخاری کے بعد اجتہاد و تفقہ کے لحاظ سے ابوداؤد کا مرتبہ سب سے بلند ہے“ ان پر فقہی ذوق اتنا غالب تھا کہ تمام ارباب صحاح ستہ میں صرف ان ہی کو ابواسحاق شیرازی نے طبقات الفقہاء میں شامل کیا ہے، اسی فقہی ذوق کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں صرف احکام و مسائل کے متعلق حدیثیں درج کی ہیں۔

تفسیر و دیگر علوم: تفسیر کے بھی عالم تھے، اس موضوع پر انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی، حدیث، فقہ و تفسیر کے علاوہ دوسرے علوم سے بھی ان کو پوری واقفیت تھی، ابوبکر خلیل کا بیان ہے کہ ”ابوداؤد اپنے زمانہ کے صاحب فضیلت اور پیش رو امام تھے، علوم کی تخریج و معرفت اور ان کے مواقع و مقامات کی واقفیت و آگاہی میں ان کا کوئی ہم سر نہ تھا۔“

فقہی مذہب: ابواسحاق شیرازی نے طبقات الفقہاء میں ابوداؤد کو حنابلہ میں شمار کیا ہے، ان کے حنبلی ہونے کا ایک قوی قرینہ یہ ہے کہ وہ امام احمد کے خاص شاگرد اور متعدد مسائل میں ان کے ہمنوا تھے لیکن بعض لوگوں نے ان کو شافعی المذہب قرار دیا ہے۔ (۱)

تدین و تقویٰ: علم و فن کی طرح وہ زہد و تقویٰ کے بھی امام تھے، ابو حاتم کا بیان ہے کہ وہ فقہ و علم، حفظ و ضبط اور عبادت و تقویٰ ہر اعتبار سے دنیا کے اماموں میں ایک امام تھے، یسین ہر وہی فرماتے ہیں کہ ”وہ بے مثال عالم و حافظ ہونے کے علاوہ عبادت و ریاضت، عفت و پاکدامنی، خیر و صلاح اور ورع و تقویٰ میں بھی منفرد خصوصیات کے مالک تھے“ (۲) آداب شریعت کی پابندی اور سنت نبوی کے اتباع کا خاص اہتمام تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

(۱) اتمام النبلاء ۲۵۶ (۲) تہذیب العہد ج ۳ ص ۱۷۲۔



”در حفظ حدیث و اتقان روایت و عبادت و تقویٰ و صلاح و احتیاط درجہ عالی داشت۔“ (۱)

علامہ ابن کثیر کا بیان ہے:

وكان في اعلى درجة البنك والعفاف والصلاح والورع. (۲)

دنوی جاہ و حشمت سے بے زاری: امام صاحب کو دنیا اور اس کے لذائذ و مرغوبات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، امرا و سلاطین کے دربار سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور دنیاوی جاہ و حشمت اور اعزاز و اکرام کی کبھی طلب نہیں کی، خلفا کی وجاہت کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں تھا اور وہ ان کو عام لوگوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور نہ ان کے ساتھ کوئی امتیاز برتتے تھے، ان کے خادم ابو بکر بن جابر کا بیان ہے کہ ”میں امام صاحب کے ساتھ بغداد میں مقیم تھا، ایک دن جب وہ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہوئے تو کچھ دیر کے بعد دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی، میں نے دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ امیر ابو احمد موفق امام صاحب سے ملنے کے خواہش مند ہیں، میں نے اطلاع کی، آپ نے ان کو اندر بلوایا اور پوچھا کہ کیسے زحمت فرمائی؟ انھوں نے کہا کہ میں تین درخواستیں لے کر حاضر ہوا ہوں، ایک تو یہ کہ آپ بصرہ میں مستقل قیام فرمائیں تاکہ مختلف مقامات کے طالبان حدیث آپ سے استفادہ کر سکیں، دوسرے میرے بچوں کو سنن کی تعلیم دیں، تیسرے روایت اور درس حدیث کے حلقہ میں میرے بچوں کے لیے مخصوص نشست کا انتظام فرمادیں، امام صاحب نے فرمایا کہ پہلی دونوں باتیں مناسب ہیں لیکن تیسری بات ناممکن ہے، علم کے معاملہ میں شریف و وضع، اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہیں، اس لیے کوئی امتیاز نہیں برتا جاسکتا، چنانچہ امیر کے لڑکے بھی عام لوگوں کی طرح حلقہ درس میں شریک ہو کر سماع حدیث کرتے۔ (۳)

وفات و اولاد: بہتر سال کی عمر میں بروز جمعہ ۱۶ شوال ۲۷۵ھ کو امام صاحب نے عالم

(۱) بستان المحدثین ص ۱۰۸ (۲) البدایہ والنہایج ۱۱ ص ۵۵ (۳) دیباچہ غایۃ المقصود۔

آخرت کا سفر اختیار کیا، عباس بن عبد الواحد نے جنازہ کی نماز پڑھائی، (۱) اولاد میں ایک صاحبزادہ ابوبکر عبد اللہ کا جو آپ کے شاگرد اور نامور محدث تھے ذکر ملتا ہے۔

تصنیفات: امام صاحب کی جن تصنیفات کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

۱- کتاب الرد علی اہل القدر: اس کے راوی ابوعبد اللہ بصری ہیں۔

۲- کتاب النسخ والمنسوخ: ابوبکر نجار اس کے راوی ہیں۔

۳- کتاب المسائل: ابوعبید آجری نے اس کی روایت کی ہے اور اس میں ان کے

وہ سوالات درج ہیں جو انھوں نے اپنے استاذ امام احمد سے کیے تھے۔ (۲)

۴- مسند مالک: اسماعیل بن محمد صفار اس کے راوی ہیں۔

۵- کتاب المرئیل: یہ رسالہ ۱۳۱۰ھ میں مطبع علمی سے شائع ہوا ہے اور ۵۶

صفحات پر مشتمل ہے۔ (۳)

۶- کتاب المصاحیح و کتاب المصاحف: صاحب کشف الظنون نے ان

دونوں کو امام صاحب کے صاحبزادہ ابوبکر عبد اللہ کی تصنیف بتایا ہے لیکن ابن ندیم نے امام

صاحب کی تصنیفات میں ان کو شمار کیا ہے۔ (۴)

۸- کتاب البعث والنشور، ۹- کتاب التفسیر، ۱۰- کتاب نظم القرآن، ۱۱- کتاب

فضائل القرآن، ۱۲- کتاب شریعۃ التفسیر، ۱۳- کتاب شریعۃ القاری، ۱۴- سنن ابی داؤد،

یہ امام صاحب کی سب سے مشہور و مقبول اور فن حدیث کی بڑی اہم اور مستند کتاب ہے، اس

کا مفصل تعارف درج ذیل ہے۔

سنن ابی داؤد: یہ چار ہزار آٹھ سو منتخب حدیثوں پر مشتمل ہے، امام صاحب نے اس کی

ترتیب و تالیف کا کام ۲۴۱ھ سے پہلے بغداد میں انجام دیا، (۵) سنن ابی داؤد سے پہلے

(۱) اتحاف النظار ص ۲۵۷ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۹۰ (۳) معجم المطبوعات کاملہ ص ۳۱۰ (۴) کشف

الظنون ج ۲ ص ۳۰۱ و ۳۳۵، الفہرست ص ۳۲۲ (۵) معالم السنن ج ۱ ص ۶ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۸

و تاریخ بغداد ص ۵۶۔

حدیث کی جو کتابیں لکھی گئیں ان کا تعلق جوامع اور مسانید سے ہے، یعنی ان میں سنن، احکام، تفسیر، قصص، اخبار، مواعظ، و آداب ہر قسم کی روایتیں ہیں لیکن امام ابوداؤد نے اپنی راہ سب سے الگ نکالی، تمام محدثین میں..... ان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے صرف سنن و احکام کی روایات اپنے مجموعہ میں درج کی ہیں، اہل مکہ کے نام اپنے رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں ”میں نے سنن میں صرف احکامی روایات جمع کی ہیں، زہد اور فضائل اعمال وغیرہ کی حدیثیں

اس میں شامل نہیں ہیں، اس کی جملہ چار ہزار حدیثیں احکام و مسائل سے متعلق ہیں۔“ (۱) سنن کی اہمیت: سنن ابی داؤد کا شمار حدیث کی امہات کتب اور صحاح ستہ میں ہوتا ہے، اکثر علمائے اسلام نے صحیحین کے بعد تمام کتب حدیث میں اس کو سب سے اہم بتایا ہے، اس کتاب کو مرتب کرنے کے بعد جب اس کو امام احمد کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو بہت پسند کیا اور اس کی تعریف کی، زکریا ساجی کا بیان ہے کہ قرآن مجید، اسلام کی اصل بنیاد اور سنن ابوداؤد اس کا ستون ہے، ابن الاعرابی فرماتے ہیں ”مصحف یعنی کتاب اللہ اور سنن ابوداؤد کے بعد کسی اور چیز سے واقفیت کی ضرورت نہیں“ محمد بن مخلد کہتے ہیں کہ ”ابوداؤد نے سنن مرتب کرنے کے بعد جب لوگوں کے سامنے اس کو بیان کیا تو محدثین نے اس کو مصحف کی طرح قابل اتباع سمجھا“ امام خطابی فرماتے ہیں ”سنن ابوداؤد ایک عمدہ اور نفیس کتاب ہے، علوم دینیہ میں ایسی بے نظیر کتاب نہیں لکھی گئی، تمام لوگوں میں اسے حسن قبول حاصل ہوا اور وہ اہل علم اور فقہاء کے مختلف طبقات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے، اس میں ہر ایک کی آسودگی کا سامان موجود ہے اور عراق، مصر، بلاد مغرب اور اکثر ملکوں کے لوگوں کا اس پر اعتماد و ارودار ہے، علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں ”ابوداؤد کبار محدثین اور ماہرین فن علماء میں تھے اور ان کی سنن جیسی کتاب کسی اور نے نہیں لکھی“ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں ”سنن ابی داؤد علماء کے درمیان مشہور و متداول اور قبول تصنیف خیال کی جاتی ہے، ابوالعلا محسن کا بیان

ہے کہ انھوں نے خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

من اراد ان یستمسک بالسنن  
فلیقرأ سنن ابی داؤد۔  
سنن ابی داؤد کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

امام ابوداؤد خود فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ کے بعد اس کتاب سے زیادہ کسی اور چیز کا علم ضروری نہیں، اگر کسی شخص کو ان دونوں کے علاوہ کسی اور چیز سے واقفیت نہ ہو تو اس کو کوئی نقصان نہ ہوگا۔ (۱)

**خصوصیات: ۱-** سنن ابی داؤد کی سب سے اہم خصوصیت اور اس کا امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف احکام و مسائل سے متعلق روایات و اخبار پر مشتمل ہے، امام ابوداؤد سے پہلے اس قسم کی حدیث کی کتابیں لکھنے کا رواج نہ تھا، امام نووی کا بیان ہے کہ اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر وہ ائمہ حدیث اور علمائے آثار کی توجہات کا مرکز بن گئی اور گو اس تخصیص کی بنا پر وہ احادیث کے بہت سے ابواب سے خالی ہے لیکن فقہی احادیث کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے، وہ صحاح ستہ کی کسی اور کتاب میں نہیں، حافظ ابو جعفر بن زبیر غرناطی متوفی ۷۰۸ھ نے صحاح ستہ کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

ولابی داؤد فی حصر  
احادیث الاحکام واستیعابها  
اور فقہی حدیثوں کے حصر و استیعاب  
کے سلسلہ میں ابوداؤد کو جو خصوصیت  
حاصل ہے وہ دوسرے محققین کو نہیں۔ (۲)

احکام و مسائل میں اس کی جامعیت کی بنا پر علمائے امت نے کتاب اللہ کے بعد دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کی تعلیم کو زیادہ ضروری قرار دیا ہے اور اسی خصوصیت کی

(۱) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۶، ابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۲، البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۵، تذکرۃ الحفاظ ج ۲

ص ۱۶۹، مقدمہ معالم السنن ج ۱ ص ۷۸، ۹، تہذیب الحدیث ج ۳ ص ۱۷۱، صفحۃ الصفوۃ ج ۵ ص ۵۱ (۲)

کتاب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۲، تدریب الراوی ص ۷۶۔

وجہ سے وہ فقہا و مجتہدین کا معتمد علیہ ماخذ رہی ہے، زاہد الکوثری لکھتے ہیں ”حلال و حرام کے متعلق احکامی احادیث کے لیے یہ نہایت مفید اور نفع بخش کتاب ہے“، بعض علمائے اصول کا بیان ہے کہ ”مجتہدین کے لیے اس کی احادیث سے واقفیت کافی ہے“ ابو بکر بھاص کی احکام و مسائل کے متعلق جملہ کتابوں (احکام القرآن، جامع کبیر، شرح مختصر طحاوی اور شرح مختصر کرنی وغیرہ) کا خاص ماخذ و مرجع یہی کتاب ہے۔ (۱)

۲- فقہ و استنباط احکام و مسائل کے لحاظ سے بھی یہ بڑی بلند پایہ کتاب ہے کیونکہ امام ابوداؤد کا درجہ فقہ و اجتہاد میں بھی نہایت بلند تھا۔

۳- امام ترمذی کی طرح ابوداؤد کی بھی اکثر و بیشتر روایتیں علماء و ائمہ مجتہدین، فقہاء امصار، صحابہ و تابعین اور تبع تابعین وغیرہ کی معمول بہا ہیں، خصوصاً امام مالک، سفیان ثوری اور امام اوزاعی وغیرہ محدثین اور فقہاء کے مسالک و مذاہب کے لیے تو وہ اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، علامہ خطابی کا بیان ہے کہ ”وہ فقہا و مجتہدین کے اختلاف کے درمیان حکم اور حجت ہے اور عراق، مصر، بلاد مغرب اور دیگر ممالک کے لوگوں کا اس پر دار و مدار ہے“۔ (۲)

۴- سنن میں صحیح الاسناد، قوی، متصل اور مرفوع حدیثوں کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، اس کی صحت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امام صاحب نے پہلے پانچ لاکھ حدیثیں جمع کی تھیں، پھر ان میں کل چار ہزار آٹھ سو حدیثیں منتخب کیں، اس سلسلہ میں خود لکھتے ہیں ”سنن میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں شامل ہیں، جو سب صحیح یا قریب قریب صحیح ہیں، میں نے اپنے علم و یقین بھر صحیح بلکہ اصح روایتیں نقل کرنے کی کوشش کی ہے اور ہمیشہ ان حدیثوں کو ترجیح دی ہے جو سند کے اعتبار سے بلند اور اعلیٰ درجہ کی ہیں، مرسل حدیثیں اس وقت نقل کرتا ہوں جب مسند اور متصل روایتیں نہیں ملتیں کیوں کہ مرا سئل بھی ائمہ متقدمین، مالک،

(۱) دیباچہ رسالہ کبیری داؤد ص ۲ (۲) مقدمہ معالم السنن ص ۲۔

ثوری اور اوزاعی وغیرہ کے نزدیک لائق حجت اور قابل استناد ہیں، البتہ امام شافعی اور امام احمد کو ان کی حجیت میں کلام ہے، میرے نزدیک مسند و متصل روایات کے نہ ہونے کی صورت میں وہ معتبر و مستند ہیں لیکن ان کی طرح ان کو قوی نہیں سمجھتا، میں نے اس میں کوئی ایسی حدیث نہیں درج کی جس کے متروک اور ساقط ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہو۔ اسی طرح متروک الاحادیث راویوں سے روایت کرنے میں بھی پرہیز کیا ہے، منکر اور ضعیف الاسناد روایتوں کو میں قابل اعتنا ہی نہیں سمجھتا لیکن صحیح روایتوں کے نہ ہونے کی صورت میں ان کو ان کے ضعف اور وجوہ نکارت کی تصریح کے بعد نقل کیا ہے، جن غیر صحیح الاسناد روایتوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے، وہ قابل احتجاج اور صالح سمجھی جائیں گی، اسی طرح غریب اور شاذ روایات کے بجائے مشہور اور معمول بہ روایتیں جمع کرنے پر خاص دھیان دیا ہے۔ (۱)

۵- امام ابوداؤد کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی سند اور ایک ہی متن میں متعدد اسانید اور مختلف متون کو جمع کر دیتے ہیں اور ہر حدیث کے الفاظ کو علاحدہ علاحدہ بیان کرتے ہیں۔

۶- روایتوں کے تکرار سے حدیث کی کوئی کتاب خالی نہیں لیکن امام ابوداؤد نے حتی الامکان تکرار سے احتراز، کثرت طرق کو نظر انداز اور طویل حدیثوں کو مختصر کر دیا ہے، تکرار سے اسی وقت کام لیا ہے، جب روایت میں کوئی خاص اور نئی بات نظر آئی ہے۔

۷- نقل روایات میں استقصا و جامعیت کے علاوہ اس میں حسن ترتیب و تالیف کی بھی شان پائی جاتی ہے، علامہ خطابی فرماتے ہیں:

الان کتاب ابی داؤد احسن رصفا یعنی ابوداؤد کی سنن ترتیب و حسن تالیف کے لحاظ سے سب میں عمدہ ہے، پڑھنے والوں کے مذاق و طبیعت کے لحاظ ہی کی وجہ سے

(۱) رسالہ ابی داؤد بھتانی ص ۷۔

انہوں نے تکرار، کثرت طرق اور طول بیان سے پرہیز کیا ہے۔

۸- سنن ابی داؤد میں ایک ثلاثی روایت بھی ہے۔

۹- رواۃ کے ناموں، کنتیوں اور القاب کے اجمال و ابہام کی تفصیل و توضیح، ان کی

ثقافت و عدم ثقافت کی نشاندہی اور روایات کے حسن و قبح اور صحت و سقم وغیرہ کی وضاحت بھی کی ہے۔

سنن ابی داؤد کی چار حدیثیں: امام ابو داؤد فرماتے ہیں کہ میرے اس منتخب مجموعہ احادیث میں صرف چار حدیثیں انسان کو دین پر عمل کرنے کے لیے کافی ہیں اور وہ یہ ہیں، انما الاعمال بالنیات، من حسن اسلام المرء ترکہ ما لا یغنیہ، لایکون المؤمن المومناحتی رضی لایحیہ ما یرضاه لنفسہ اور الحلال بین والحرام بین وینہما مشتبہات۔

امام صاحب کی اس تصریح میں بڑی بصیرت و حکمت پوشیدہ ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”ایک مجتہد و مرشد کو شریعت کے کلی قاعدوں اور مہمات امور سے واقف ہونے کے بعد جزئی مسائل اور واقعات میں ان کے سوا کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیوں کہ پہلی حدیث عبادات کی صحت و درستگی، دوسری عمر عزیز کے اوقات کی حفاظت، تیسری پڑوسیوں، قرابتداروں، متعارف لوگوں اور دوسرے متعلقین وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اور چوتھی ان تمام شکوک و شبہات کے ازالہ کے لیے کافی ہے جو علما کے اختلافات و دلائل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ (۱)

سنن کے متداول نسخے اور ان کے رواۃ: امام ابو داؤد سے ان کے سات تلامذہ نے سنن کی روایت کی ہے لیکن ان میں چار تلامذہ زیادہ مشہور ہیں اور ان کی نسبت سے ہر زمانہ میں سنن کے چار نسخے مشہور و متداول رہے ہیں۔ (۲)

۱- نسخہ لولوی: یعنی ابو علی محمد بن احمد بن عمرو لولوی کا نسخہ جو ہندوستان اور بلاد مشرق میں رائج

(۱) بستان المحمدین ص ۱۰۷ (۲) مقدمہ معالم السنن۔

و مقبول ہے اور سب زیادہ مستند و معتبر سمجھا جاتا ہے کیوں کہ امام صاحب نے آخر عمر یعنی ۳۷۵ھ میں اس کا املا کرایا تھا، اس کے بعد ان کی وفات ہو گئی تھی، اس لیے یہ گویا آخری نسخہ ہے۔

۲- نسخہ ابن داسہ: یعنی حافظ ابو بکر محمد بن بکر تمار، بصری کا نسخہ، یہ بلاد مغرب میں مشہور و مقبول تھا، اس میں اور لولوی کے نسخے میں بڑی یکسانیت ہے، کہیں کہیں محض تقدیم و تاخیر کا جزوی اختلاف ہے، کئی بیشی کا کوئی فرق نہیں، بعض علما کے نزدیک سب سے زیادہ کامل اور جامع یہی نسخہ ہے، مشہور شارح سنن علامہ خطابی کے پیش نظر یہی تھا، انھوں نے ابن داسہ سے براہ راست تحصیل علم اور روایت کی تھی۔

۳- نسخہ رطلی: یعنی حافظ ابو یسٰی اسحاق بن موسٰی بن سعید آملی کا نسخہ، یہ تقریباً ابن داسہ کے نسخہ سے ملتا جلتا ہے، آملی ابوداؤد کے وراق تھے۔

۴- نسخہ ابن اعرابی: اس میں اور دوسرے نسخوں میں بڑا فرق و اختلاف ہے اور ان کے مقابلہ میں اس میں کمی بھی ہے، کتاب الفتن و الملاحم، کتاب الحروف، کتاب الخاتم وغیرہ مکمل اور کتاب اللباس کا نصف حصہ اور کتاب الوضوء، کتاب الصلوٰۃ اور کتاب الزکاح کے بھی بیشتر حصے اس میں درج نہیں ہیں۔ (۱)

شروح و تعلیقات: سنن ابی داؤد کی اہمیت اور افادیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علما نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، اس کے مختصرات مرتب کیے، اس کی شرحیں اور حواشی لکھے، جن میں اہم مباحث و مشکلات کا حل رواۃ اور غریب الفاظ وغیرہ کی تحقیقات کی گئی ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

معالم السنن: مشہور محدث امام ابو سلیمان حمد بن محمد خطابی (م ۳۸۸ھ) کی شرح جو سب سے قدیم اور مشہور اور سب میں ممتاز ہے، اس کو مطبعہ علمیہ حلب نے ۱۳۵۱ھ میں نہایت اہتمام سے شائع کیا۔

(۱) مقدمہ علامہ المقصود من مقدمہ معالم السنن ص ۲۳۔



**شرح قطب الدین:** قطب الدین ابوبکر بن احمد بن دین یمنی شافعی م ۶۵۲ھ نے اس کی چار ضخیم جلدوں میں شرح لکھی تھی، مگر نایاب ہے۔

**تلخیص منذری:** ابو محمد زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی مصری م ۶۵۶ھ نے سنن ابی داؤد کا اختصار کیا تھا اور اس کا نام تہجدی رکھا، غایۃ المقصود کے ساتھ اس کو بھی شائع کیا گیا ہے۔

**شرح نووی:** مشہور محدث اور باکمال شارح حدیث ابوزکریا محی الدین یحییٰ ابن شرف نووی م ۶۷۶ھ نے بھی اس کی شرح لکھنا شروع کی تھی مگر مکمل نہیں کر سکے۔ (۱)

**شرح ابن قیم:** حجۃ الاسلام شمس الدین محمد بن ابوبکر قیم جوزی م ۷۵۱ھ نے منذری کی تہذیب کے مطابق ابوداؤد کی شرح و تہذیب کی تھی جو نہایت بلند پایہ اور مفید کتاب ہے، اس میں اس کے مشکلات سے تعرض اور معلول احادیث پر فاضلانہ بحثیں کی گئی ہیں، یہ کتاب شائع ہو چکی ہے، غایۃ المقصود کی پہلی جلد کے ساتھ یہ بھی شامل ہے:

**شرح مغلطائی:** یہ حافظ علاؤ الدین مغلطائی بن قلیچ م ۶۲۷ھ کی ناتمام شرح ہے۔

**اتقاء السنن یا عجالة العالم:** ابو محمود شہاب الدین احمد بن محمد مقدسی م ۶۵۷ھ نے خطابانی کی معالم السنن کی تلخیص کی اور اس کا نام اتقاء السنن واقفاء السنن رکھا، بعض لوگوں نے اس کا نام عجالة العالم من کتاب العالم بتایا ہے، مکتبہ آستانہ سے چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

**شرح ابن ملقن:** شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن شافعی م ۸۰۴ھ نے زوائد علی الصحیحین کے نام سے دو جلدوں میں ابوداؤد کی ان روایتوں کی شرح کی ہے جو صحیحین میں نہیں ہیں۔

**شرح عراقی:** ابوزرعہ ولی الدین احمد بن عبدالرحیم زین الدین عراقی م ۸۲۶ھ نے بھی اس کی ایک ناتمام شرح لکھی جو ابتدا سے سجدہ سہو تک سات جلدوں میں ہے، ایک اور جلد میں صیام، حج اور جہاد وغیرہ ابواب کی بھی شرح ہے، اگر یہ شرح مکمل ہوتی تو تقریباً چالیس

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوزی ص ۶۲۔

جلدوں پر مشتمل ہوتی۔

شرح ابن رسلان: ابو العباس احمد بن حسین رملی مقدسی معروف بہ ابن رسلان م ۸۳۳ھ نے سنن ابوداؤد کی بڑی مکمل اور جامع شرح لکھی تھی، جو سخاوی کے بیان کے مطابق ۱۱ جلدوں میں ہے لیکن علامہ حسین بن محسن انصاری کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ شرح عرب ممالک میں آٹھ ضخیم جلدوں میں دیکھی ہے جو نہایت مفید اور عمدہ مطالب پر مشتمل ہے، مولانا شمس الحق مرحوم لکھتے ہیں کہ میں نے اس کا ایک حصہ دیکھا تو ہے، اس سے اندازہ ہوا کہ وہ نہایت عمدہ شرح ہے، زاہد الکوثری کا بیان ہے کہ وہ ابوداؤد کی نہایت عمدہ شرحوں میں ہے اور کتب خانہ آستانہ میں اس کی چار جلدیں پائی جاتی ہیں، ابن رسلان حافظ ابن حجر کے ارشد تلامذہ میں تھے، اس لیے انھوں نے اس شرح میں ان کے اقوال و آراء بھی نقل کیے ہیں۔

شرح عینی: علامہ بدر الدین عینی م ۸۵۵ھ کی شرح جو صرف ایک جز پر مشتمل ہے۔

شرح سیوطی: علامہ جلال الدین سیوطی م ۹۱۱ھ نے مرقاۃ الصعود الی سنن ابی داؤد کے نام سے شرح لکھی۔

شرح سنندی: علامہ ابوالحسن سنندی م ۱۱۳۹ھ نے دیگر کتب صحاح کی طرح فتح الودود علی سنن ابی داؤد کے نام سے اس کا بھی حاشیہ لکھا تھا جو نہایت مشہور اور مقبول ہے، صاحب کشف الظنون نے اس کو شرح لطیف کہا ہے۔ (۱)

غایۃ المقصود: مولانا شمس الحق عظیم آبادی مرحوم نے ۳۲ جلدوں میں سنن ابی داؤد کی ایک نہایت مبسوط و جامع اور مفصل شرح لکھی، اس کی صرف ایک ہی جلد دہلی کے مطبع انصاری سے شائع ہوئی ہے، یہ نہایت عمدہ شرح ہے، اس کے شروع میں ایک طویل مقدمہ بھی ہے جس میں ابوداؤد اور سنن کے متعلق بڑے مفید معلومات درج ہیں، اس کی اہمیت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے ”میں نے شیخ ابوالطیب شمس الحق کی شرح

(۱) کشف الظنون و مقدمہ غایۃ المقصود ص ۷۲ تا ۱۰۲ اتحاد العلماء ص ۹۰ و ۹۱۔

غایۃ المقصود کا ایک حصہ دیکھا، وہ سنن ابوداؤد کے اسرار وغوامض کے کشف و اظہار کے لیے کافی ہے، واللہ یہ خوب شرح ہے، مصنف نے اس میں پوری کاوش کی ہے اور تلاش و جستجو کا حق ادا کر دیا ہے (۱) اس شرح کے ساتھ ابن قیم کی شرح اور..... کی تلخیص بھی شامل ہے۔

عمون المعبود: یہ بھی مولانا شمس الحق ہی کی شرح ہے اور سنن ابی داؤد کے متن کے ساتھ ۴ جلدوں میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے، یہ دراصل غایۃ المقصود کا خلاصہ ہے۔

عام طور سے اس کے مؤلف اور شارح مولانا شمس الحق ڈیانوی سمجھے جاتے ہیں

لیکن شرح کی جلد اول کے خطبہ اور اسی جلد کے خاتمہ اور دوسری جلد کے خاتمہ میں مولانا کے چھوٹے بھائی مولانا شرف الحق صاحب نے اس کو اپنی تصنیف بتایا ہے، مگر خود مولانا شمس الحق صاحب نے چوتھی جلد کے خاتمہ و آغاز اور تیسری جلد کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ ان کی تصنیف ہے، مولانا ظلیل احمد سہارن پوری اور صاحب معجم المطبوعات نے اس کو مولانا شرف ہی کی تصنیف قرار دیا ہے، (۲) مگر مولانا تالطف حسین صاحب نے جو مولانا شمس الحق صاحب کے ہم عصر و ہم سبق اور عمون المعبود کے ناشر بھی ہیں لکھا ہے کہ ”مولانا شمس الحق صاحب کو شرح ابی داؤد لکھنے کا مبارک خیال مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کی ترغیب سے ہوا، انھوں نے سنن کے گیارہ نسخے جمع کئے اور ان کا مقابلہ کر کے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور اسی کو اصل قرار دیا، مزنی کی تحفۃ الاشراف، منذری کی تلخیص اور امام خطابی کی معالم السنن اور ابن اثیر کی جامع الاصول وغیرہ کو بھی پیش نظر رکھ کر غایۃ المقصود کی تالیف و ترتیب شروع کی مگر بعض وجہ سے اسی درمیان میں ایک مختصر شرح لکھنے کا خیال بھی ان کو ہوا تو عمون المعبود کی تالیف شروع کی اور چند ممتاز علما کو اس کام میں معاون بنایا، جنھوں نے متن کی تصحیح اور شرح کی تالیف میں ان کا ہاتھ بنایا اور مولانا نے ان سب سے ان کی استعداد کے مطابق کام لیا، ان علما کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) مقدمہ بذل العمود ج اول ص ۱۔ (۲) ایضاً معجم المطبوعات کا ص ۳۱۰۔

۱- مولانا ابو عبد الرحمن شرف الحق محمد اشرف ڈیانوی جو شارح کے چھوٹے بھائی تھے، ۲- شیخ الحدیث مولانا عبد الرحمن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی، ۳- مولانا ابو عبد اللہ محمد اور لیس ڈیانوی جو شارح کے صاحبزادے ہیں، ۴- مولانا عبد الجبار بن نور احمد ڈیانوی جو مصنف کے ماموں زاد بھائی تھے۔ (۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام حضرات بھی عون المعبود کی تالیف میں کسی نہ کسی حیثیت سے مصنف مولانا شمس الحق کے شریک تھے اور بقول مولانا تالطف حسین ”یہ تمام لوگ شارح عون المعبود مولانا شمس الحق صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے اور شب و روز اس خدمت کو انجام دیتے جو مولانا ان کے سپرد کرتے (۲) لیکن اصل شارح مولانا شمس الحق ہی تھے، البتہ چند اور علمائے ترتیب و تالیف میں ان کی اعانت کی تھی، مگر اس اعانت کی بنا پر ان کی جانب اس شرح کو منسوب کرنا صحیح نہیں ہے، یہ عام قاعدہ ہے کہ اساتذہ و شیوخ اپنے شاگردوں سے مواد و معلومات اکٹھا اور مآخذ و حوالے تلاش کراتے اور تصنیف و تالیف کے سلسلہ کے بعض امور ان کے سپرد کرتے ہیں بلکہ بعض ابواب و فصول بھی ان سے لکھا کر ان میں حسب منشا معمولی یا غیر معمولی ترمیم کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اصل کتاب اساتذہ ہی کی جانب منسوب کی جاتی ہے اور اس کو معیوب نہیں خیال کیا جاتا، اس لیے مولانا شرف صاحب کو اس کا مصنف و شارح قرار دینا غلط ہے، وہ صرف اس علمی بورڈ کے ایک رکن تھے، مولانا شمس الحق نے ان کی دلہی کی وجہ سے کچھ اجزا ان کی جانب منسوب ہو جانے کو ناپسند نہیں کیا۔

التعلیق المحمود: اس کو شیخ فخر الحسن مگنکوہی نے مرتب کیا ہے۔

(۱) خاتمہ عون المعبود جلد رابع ص ۵۵۳، اس جماعت میں اور بھی بعض حضرات شامل تھے، مولوی ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی نے اس فہرست میں قاضی یوسف حسین خان پوری ہزاروی اور مولوی محمد شاہ جہان پوری کے نام بھی تحریر کیے ہیں (تراجم علمائے اہل حدیث ص ۴۰۲) (۲) خاتمہ عون المعبود جلد رابع ص ۵۵۳۔

الہدیٰ المحمود لترجمہ سنن ابی داؤد: مشہور مترجم حدیث وقار نواز جنگ مولانا وحید الزماں ابن مسیح الزماں م ۱۹۲۰ء نے دو ضخیم جلدوں میں ایک شرح لکھی جو سنن کے اردو ترجمہ اور تشریحی فوائد پر مشتمل اور چھپ چکی ہے، صاحب شرح کے حالات میں مولانا عبدالعلیم چشتی نے ایک جامع کتاب لکھی ہے جو مکتبہ نور محمد آرام باغ کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

بذل المحمود فی حل ابی داؤد: مشہور حنفی عالم و محدث مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری کی شرح جو پانچ جلدوں پر مشتمل اور شائع ہو چکی ہے، یہ شرح مفید علمی و فنی مطالب پر مشتمل ہے۔

المتمہل المورود: یہ مفید و مختصر شرح حال ہی میں حجاز سے شائع ہوئی ہے لیکن ہماری نظر سے نہیں گذری۔

ایک اعتراض کا جواب: بعض علمائے جرح و تعدیل نے سنن ابی داؤد میں موضوع روایتوں کی بھی نشاندہی کی ہے، علامہ ابن جوزی کے نزدیک اس قسم کی حدیثوں کی تعداد نو ہے لیکن علمائے محققین نے اس اعتراض کو تسلیم نہیں کیا ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

”سنن ابی داؤد کی اعلیٰ و مستند ترین روایتیں وہ ہیں جن کی شیخین نے

تخریج کی ہے اس قسم کی حدیثیں نصف کتاب پر مشتمل ہیں، اس کے بعد ان روایتوں کا نمبر ہے جن کی شیخین میں سے کسی ایک نے تخریج کی ہے، تیسرا درجہ ان روایتوں کا ہے جن کی کو صحیحین میں تخریج نہیں کی گئی ہے تاہم وہ علت و شدوؤ سے پاک اور سنداً قوی و جید ہیں، اس کے بعد وہ روایتیں ہیں جو صحیح الاسناد اور صالح لیسھی جاتی ہیں اور دو تین طرق سے مروی ہونے کی بنا پر علمائے ان کو قبول کیا ہے، بعض ایسی روایات بھی ہیں جو رواۃ کے سوء حفظ کی بنا پر ضعیف ہیں اور ان کے بارے میں ابوداؤد نے سکوت اختیار کیا ہے، بعض احادیث باعتبار رواۃ ضعیف ہیں مگر ابوداؤد نے ان کے ضعف کی تصریح کر دی ہے لیکن بعض اوقات وہ

ضعف کے متعلق اس لیے خاموش رہتے ہیں کہ نکارت کا پہلو بہت واضح اور نمایاں ہوتا ہے۔“ (۱)

امام خطابی تحریر فرماتے ہیں:

”محدثین کے نزدیک حدیث کی تین قسمیں ہیں ۱- صحیح، ۲- حسن، ۳- سقیم، امام ابوداؤد کی کتاب صحیح اور حسن دونوں قسموں کی جامع اور سقیم کی مختلف بڑی اور اہم قسموں مثلاً موضوع، مقلوب اور مجہول وغیرہ سے یکسر خالی ہے، اگر شاذ و نادر سقیم کی معمولی اور چھوٹی قسموں کی روایتیں درج ہو گئی ہیں تو امام صاحب اس کی حقیقت و نوعیت بیان کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گئے ہیں“ (۲)

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنن ابی داؤد موضوع روایتوں سے پاک ہے، البتہ ضعیف و مرسل روایتوں کے پائے جانے کا خود امام صاحب نے اپنے رسالہ میں ذکر و اعتراف کیا ہے لیکن اس سے اس کی اہمیت، شہرت، وثوق اور اعتبار و استناد میں کوئی فرق نہیں آتا۔

امام صاحب کا یہ بیان کہ ”مالم یذکر فیہ شیء فہو صالح“ یعنی جن روایتوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے، وہ صالح ہیں، علمائے فن کی بحث و نظر کا خاص موضوع رہا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام طور سے علمائے اس طرح کی حدیثوں کو صحیح و حسن تسلیم کیا ہے لیکن مکمل استقصا و تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی بعض حدیثیں ضعیف بھی ہیں۔ واللہ اعلم۔

# امام بقی بن مخلد قرطبیؒ

(متوفی ۲۷۶ھ)

نام و نسب: بقی نام، ابو عبد الرحمن کنیت اور شیخ الاسلام لقب تھا، سلسلہ نسب یہ ہے: بقی بن مخلد بن یزید۔

ولادت و وطن: اندلس کے مشہور شہر اور اسلامی علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کے مرکز قرطبہ میں ۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ (۱)

اساتذہ و شیوخ: بقی بن مخلد نے تقریباً تین سو اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا، ان کا شمار امام احمد کے خاص اور مایہ ناز شاگردوں میں ہوتا ہے، ان کے اکثر شیوخ کو امام مالک، سفیان بن عیینہ، امام شافعی اور حماد بن زید وغیرہ جلیل القدر محدثین اور فقہا سے شرف تلمذ حاصل تھا، چند ممتاز مشائخ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن محمد شافعی، ابراہیم بن منذر حزامی، ابو ثور، ابو مصعب زہری، احمد بن ابراہیم دورقی، ابو طاہر احمد بن سرح، بکار بن عبد اللہ، حارث بن مسکین، خلیفہ بن خیاط، دجیم، ابو خیمہ زہیر بن حرب، زہر بن حماد، سکون بن سعید، سلمہ بن شعیب، صفوان بن صالح، ابو بکر عبد اللہ بن ابی شیبہ، عبد اللہ بن ذکوان، عون بن یوسف، محمد بن بشار بن دار، محمد بن عبد اللہ بن نمیر، محمد بن عبید بن حسان، محمد بن عیسیٰ آشی، محمد بن عمر عدنی، محمد بن محمد مصطفیٰ حمصی، ہارون بن عبد اللہ جمال، یحییٰ بن عبد اللہ بن کبیر، یحییٰ بن عبد الحمید حمانی، یحییٰ بن یحییٰ الشیبی وغیرہ (۲)

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۷ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۷۷ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴

و تاریخ العلماء و الرواۃ الاندلس لابن الفرغنی ص ۱۰۹۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، بعض کے نام حسب ذیل ہیں:

”احمد بن قحی، احمد بن عبد اللہ اموی، اسلم بن عبد العزیز، حسن بن سعید

(یا سعد) عبد اللہ بن یونس قیری مرادی، (۱) محمد بن عمر لبابہ، محمد بن وزیر وغیرہ۔

طلب علم کے لیے سفر: انھوں نے علم کی تحصیل و تکمیل کے لیے مغرب و مشرق کے اکثر شہروں کا سفر کیا تھا، مورنین نے ان کو ذورحلتہ واسعہ (یعنی کثیر الاسفار بتایا ہے) ابن مندہ

اور حمیدی کا بیان ہے کہ ”رحلت اور طلب حدیث کے لیے ان کے سفر مشہور ہیں“

علم کی طلب و تحصیل میں تن آسانی کو ناپسند کرتے تھے، اپنے شاگردوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ طالب علم بننے ہو؟ اس طرح بھی علم کی طلب کی جاتی ہے کہ جب تم فارغ ہوتے ہو اور تم کو کوئی ضرورت نہیں ہوتی تو حصول علم کے لیے نکلتے ہو، میں نے ایسے جانناز اور شوقین طالب علم دیکھے ہیں جن کے پاس کھانے کے لیے درخت کے پتوں کے سوا کچھ نہ تھا اور انھوں نے کاغذ خریدنے کے لیے اپنے پانچ ماہ تک بیچ دیے۔

حدیث میں درجہ و مرتبہ: امام قحی نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق علم حدیث کی جانب زیادہ توجہ کی اور اس میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ان کا شمار اکابر محدثین میں ہوتا ہے، مورنین اور علمائے سیر نے لکھا ہے کہ بالغ فی الجمع والروایۃ یعنی حدیث کی روایت و تحریر میں ان کو بڑا انہماک تھا، حفظ و ضبط اور صدق و ثقاہت میں بھی ممتاز تھے، علامہ ذہبی نے ان کو ثقہ حجت اور ثبت اور حافظ ابن عساکر نے الحافظ اور حمیدی نے من الحفاظ الحدیثین لکھا ہے، حدیث کے ضبط و نقل میں ان کی احتیاط اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ ان کو کم سنی میں سفیان ثوری کے بعض تلامذہ سے ملاقات و استفادہ کا موقع ملا تھا مگر ان سے روایت کرنے سے احتراز کیا۔ (۲)

تفقہ و اجتہاد: فقہ و اجتہاد میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے، کسی خاص امام یا مذہب کے پابند نہ

(۱) یہ امام قحی کے بڑے ممتاز شاگرد اور ان کے راویہ کہلاتے تھے، قحی کی کتابوں کی نشر و اشاعت میں ان

کا بڑا ہاتھ ہے (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۶۰۴ و تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۷۹۔



تذکرۃ المحدثین.... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ 327

تھے بلکہ خود فقیر و مجتہد اور صاحب اختیارات تھے، حافظ ذہبی اور علامہ ابن عساکر وغیرہ نے لکھا ہے وکان مجتهدا متخیرا لایقلد احدا، (۱) یعنی وہ مجتہد، صاحب اختیارات اور کسی امام کے مقلد نہ تھے۔

علوم کی اشاعت: ایک بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ممالک مشرق سے واپسی کے بعد اندلس کی سرزمین کو احادیث و روایات کی نشر و اشاعت سے معمور کر دیا، حافظ ابن عساکر وغیرہ کا بیان ہے:

رجع الی الاندلس فملأها  
یعنی اندلس واپس آ کر اس کو علوم سے  
علما جما۔ مملو کر دیا۔

متعدد اہم اور امہات کتب کو اندلس میں متعارف کرایا، مورخین کا بیان ہے:  
کتب المصنفات الکبار وہ بڑی اور بلند پایہ کتابوں کو نقل کر کے  
وادخلها الاندلس ونشر بها اندلس لائے اور یہاں علم کی اشاعت  
علم الحدیث. (۲) کی۔

ابن الفرضی نے تصریح کی ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الفقہ (الام) امام شافعی، کتاب التاریخ و کتاب الطبقات لخلیفہ بن خیاط اور سیر عمر بن عبدالعزیز کو وہی اندلس لائے اور اہل اندلس کو اس سے متعارف کرایا۔ (۳)

علم و فضل کا اعتراف: محدثین اور ارباب کمال نے امام فہمی کے دینی و علمی کمالات کا اعتراف کیا ہے، علامہ ذہبی نے ان کو امام، قدوہ، احد الائمة الاعلام، عدیم المثال اور یکتائے روزگار لکھا ہے، احمد بن ابی خشیہ فرماتے ہیں کہ ”جس شہر میں فہمی جلوہ فرما ہوں، وہاں کے کسی آدمی کو ہم لوگوں کے پاس آنے کی کیا ضرورت؟“ علامہ ابن حزم لکھتے ہیں کہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۶۰۴ و تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۷۹ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۷۹

(۳) تاریخ العلماء والرواۃ: لاندلس ص ۱۰۸ و ۱۰۹۔

”وہ امام احمد کے مخصوص اور ارشد تلامذہ میں تھے اور امام بخاری، مسلم اور نسائی کے ہمسرہ و مثیل تھے“ طاہر بن عبد العزیز کا بیان ہے کہ میں نے مسند قحی کا ایک جز محمد بن اسماعیل صانع کو دکھایا تو انھوں نے فرمایا کہ ”یہ شخص بحر علم کا شناور ہے“ وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ”عراق سے واپسی کے بعد میں اپنے محترم استاذ یحییٰ بن بکیر کی خدمت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو انھوں نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھایا اور مجھ سے سات حدیثیں سنیں۔ (۱)

بعض فقہاء کی مخالفت: دوسرے ارباب کمال کی طرح ان کو بھی علماء و فقہاء کی ایک جماعت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، وہ بڑے قنوع سنت تھے، اس لیے مجتہدین اور فقہاء کی تقلید کے بجائے براہ راست احادیث و آثار کی پیروی کرتے تھے، اس زمانہ میں اندلس میں فقہ مالکی کا غلبہ تھا، اس لیے عموماً لوگوں کو موطن اور اہل مدینہ کی حدیثوں سے زیادہ واقفیت تھی اور اس کے مقابلہ میں اہل عراق کے متعلق یہ بدگمانی تھی کہ وہ قلیل الاحادیث ہیں، چنانچہ قحی نے جب مصنف ابن ابی شیبہ کا جس کو وہ لائے تھے درس دینا اور احادیث کی نشر و اشاعت شروع کی تو فقہاء کی ایک جماعت مسائل میں اختلاف کو برداشت نہ کر سکی اور قحی کی مخالفت شروع کر دی، عوام کو بھی ان کے خلاف بھڑکا دیا، ان کو مخالفت کے اس طوفان سے مجبور ہو کر درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر دینا پڑا، جب فرمانروائے اندلس محمد بن عبدالرحمن بن حکم اموی کو جو خود بھی صاحب علم اور علم و فن اور علماء کا بڑا قدر شناس تھا، اس ہنگامہ کی خبر ہوئی تو اس نے شیخ الاسلام اور ان کے مخالفین کو طلب کیا اور مصنف ابن ابی شیبہ کو منگا کر خود اس کا مطالعہ کیا اور اس قدر پسند کیا کہ اپنے کتب خانہ کے لیے اس کی نقل فراہم کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ ہمارا کتب خانہ ایسی اہم کتاب سے خالی نہ ہونا چاہیے اور شیخ الاسلام سے کہا کہ آپ علم کی نشر و اشاعت جاری رکھیں اور احادیث رسول کا جو ذخیرہ آپ کے پاس ہے اس سے لوگوں کو فیض یاب فرمائیں اور مخالفین کو بھی تنبیہ کی کہ ان سے آئندہ کسی قسم کا تعرض نہ کریں۔ (۲)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۳ و ۲۰۵ و تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۹ و تاریخ العلماء والرداء ص ۱۰۸ (۲)

زہد و تقویٰ: زہد و ورع میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، مورخین اور علمائے سیر نے ان کو متدین، زاہد اور صاحب تقویٰ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ائمہ محدثین اور زاہد صالحین میں تھے۔  
 نماز: شب بیدار اور نوافل و تہجد کے پابند تھے، یافعی نے متجمل اور ذہبی نے عابد و متہجد لکھا ہے۔

تلاوت قرآن: تلاوت قرآن سے اتنا شغف تھا کہ ہر رات کو تہجد کی نماز میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔

روزہ: رمضان کے علاوہ بھی اکثر مسلسل روزے رکھتے تھے لیکن جمعہ کو افطار کرتے تھے۔  
 حج بیت اللہ: تیس یا پینتیس مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے دوبار بلاد مشرق تشریف لے گئے، پہلی مرتبہ بیس اور دوسری دفعہ چودہ سال تک وہاں مقیم رہے، دونوں مرتبہ ان کا معمول تھا کہ وہ سال بھر مختلف شہروں کے علمائے فن اور محدثین کی خدمت میں حاضر ہو کر علم و فن کی تحصیل کرتے تھے اور حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ چلے جاتے اور حج و زیارت سے شرف اندوز ہوتے تھے۔

جہاد: ان میں جہاد کا بھی جذبہ تھا، چنانچہ کئی جنگوں میں شریک ہوئے۔  
 دعا کی برکت: مستجاب الدعوات تھے اکثر لوگ ان کی دعا کی برکت و تاثیر کی وجہ سے ان سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔

اخلاق و عادات: بڑے ستودہ صفات، متواضع اور خلیق تھے، لوگوں کے درد و غم میں شریک رہتے، ان کی حاجت روائی کرتے، مریضوں کی عیادت اور جنازوں میں شرکت معمول تھا، ہر نیک کام سے رغبت تھی، کبھی کسی سائل کو واپس نہ کرتے، اگر کچھ نہ ہوتا تو کپڑے تک دے دیتے۔

حق پسندی: بڑے حق پسند اور حق گو تھے سچی بات کہنے میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ (۱)

(۱) تذکرۃ الخلفاء ج ۲ ص ۲۰۲ تا ۲۰۵ تاریخ ابن مساکر ج ۳ ص ۲۷۸۔

**وفات:** مشہور اور صحیح روایت کے مطابق انھوں نے سہ شنبہ ۲۹ جمادی الاخریٰ ۲۷۶ھ کو اندلس میں وفات پائی، امام دارقطنی نے ۲۷۳ھ کی بھی روایت کی ہے لیکن یہ ضعیف ہے، محمد بن یزید نے نماز جنازہ پڑھائی اور بنو عباس کی جانب منسوب ایک قبرستان میں دفن کیے گئے۔ (۱)

**حلیہ:** دراز قد تھے، داڑھی گھنی تھی، بالوں میں خضاب لگاتے تھے۔ (۲)

**تصنیفات:** علامہ حقی کثیر التصانیف اور صاحب کمال مصنف تھے، ابن عساکر نے لکھا ہے، انھوں نے نہایت عمدہ کتابیں لکھیں جو ان کی جامعیت، دقت نظر، کثرت مطالعہ اور وسعت معلومات پر شاہد ہیں، ان کی تصنیفات بے نظیر اور اسلام کی اہم اور بنیادی کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں، (۳) مگر افسوس ہے کہ بہت سے قدما کی طرح ان کی کتابیں بھی ناپید ہو گئیں جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- فتاویٰ صحابہ و تابعین و من دونہم۔

۲- کتاب التفسیر: اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ علامہ ذہبی و یافعی نے اس کو جلیل القدر بتایا ہے، علامہ ابن حزم کے خیال میں یہ لاجواب اور عدیم المثال تفسیر تھی، وہ اس کو تفسیر ابن جریر پر بھی ترجیح دیتے تھے۔

۳- ان کی تصنیفات میں مسند کبیر سب سے اہم اور عظیم الشان تصنیف ہے، جو ایک ہزار تین سے زیادہ صحابہ کی حدیثوں پر مشتمل ہے، حافظ ابن جوزی اور علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ سولہ سو سے زیادہ صحابہ کی حدیثیں اس میں درج تھیں، اس کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے، اس لیے اس کو مصنف و مسند دونوں کہا جاتا ہے، ابن حزم کے حسب ذیل بیان سے اس کی اہمیت اور صحت و اعتبار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۹ و تاریخ العلماء الاندلس ص ۱۰۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴ (۳)

تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۹۔

”اس کتاب کو انھوں نے صحابہ کے ناموں پر مرتب کیا ہے، اس میں ایک ہزار تین سو سے زیادہ کی روایات ہیں، ہر صحابی کی حدیث کو فقہ و احکام کے ابواب و عنوانات کے تحت نقل کیا گیا ہے، اس اعتبار سے یہ مسند بھی ہے اور مصنف بھی، میرے علم میں اس مرتبہ و اہمیت کی اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، انھوں نے اپنی ثقاہت، ضبط، اتقان، حدیث میں جامعیت اور جودت شیوخ کے باوجود ایک سو چوہاڑی راویوں سے اس کی روایت کی ہے جو قریب قریب سب مشہور اور بلند پایہ محدث ہیں۔“ (۱)

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ”ابن حزم نے اس کو مسند احمد بن حنبل پر ترجیح دی ہے، جو میرے خیال میں محل نظر ہے، مسند ابن حنبل اس سے بھی زیادہ جامع و جید کتاب ہے۔“ (۲)



(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۷۹ و کشف الظنون ج ۲ ص ۳۳۱ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۵۶۔

## امام ابو عیسیٰ ترمذیؒ

(متوفی ۲۷۹ھ)

نام و نسب: امام موصوف نسا قبیلہ بنی سلیم سے تعلق رکھتے تھے، محمد نام، ابو عیسیٰ کنیت ہے اور نسب نامہ یہ ہے:

محمد بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک، سلمی ترمذی بوغی، علامہ سمعانی نے ضحاک کے بجائے شدا لکھا ہے۔ (۱)

وطن: خراسان اور ماوراء النہر کا خطہ ہمیشہ سے علم و فن اور ارباب کمال کا مرکز رہا ہے، تاریخ اسلام کے بہت سے نامور علما اسی خاک سے اٹھے، امام ابو عیسیٰ ترمذی بھی اسی مردم خیز سرزمین کے ایک فرزند تھے، صنعانیان کے مشہور شہر ترمذ کو آپ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے، ترمذ کا لفظ ترمذ، ترمذ، ترمذتینوں طریقوں سے ہے لیکن عام طور پر ترمذی مشہور ہے، یاقوت نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے، (۲) یہ شہر دریائے جیحون کے مشرقی کنارے پر بلخ کے محاذ میں کسی زمانہ میں بڑا آباد اور بارونق شہر تھا، یہاں بڑے بڑے ارباب کمال پیدا ہوئے، سمعانی اور یاقوت نے بعض کے مختصر حالات لکھے ہیں، بوغی ایک قریہ بوغ کی جانب نسبت ہے، جو ترمذ سے چھ فرسخ کی مسافت پر ہے، بعض روایتوں کے مطابق امام ترمذی اسی میں آسودہ خواب ہیں۔ (۳)

(۱) دیکھو کتاب الانساب نسبت ترمذی ورق ۱۰۶ (۲) معجم البلدان ج ۲ ص ۳۸۲ ذکر ترمذ (۳) ابن خلکان

**پیدائش:** امام موصوف ۲۰۹ھ میں ترمذ میں پیدا ہوئے، اس کی تفصیل نہیں ملتی کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی لیکن اس زمانہ میں خراسان اور ماوراء النہر کا علاقہ علم و فن کا مرکز بن چکا تھا اور امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث کی مسندِ علم بچھ چکی تھی اور دور دور کے تشنگانِ علم یہاں کھج کھج کر آتے تھے، اس سے قیاس یہی ہے کہ امام ترمذی نے ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی ہوگی۔

**سماع حدیث کے لیے سفر:** اسلام کی تعلیمات اور علم دین کی بنیاد کتاب اللہ کے بعد حدیث نبوی پر ہے، اس کے بغیر دین کا صحیح اور پورا علم نہیں ہو سکتا، اس لیے ہر دور میں مسلمانوں نے اس کی جانب بڑا اہتمام کیا، خصوصاً ابتدائی چند صدیوں میں اس کی اشاعت و حفاظت کا اتنا اہتمام کیا جس کی مثال دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی، نفس حدیث کے متعلق بہت سے علوم ایجاد ہو گئے، حجاز، عراق، خراسان، ماوراء النہر، شام و مصر و مغرب وغیرہ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں مرکز حدیث قائم ہو گئے تھے، حجاز کے بعد عراق و خراسان کو اس باب میں ایک خاص امتیاز حاصل رہا ہے، اکثر بڑے بڑے محدثین یہیں پیدا ہوئے، اس لیے ان مقامات میں حدیث کا ذوق و شوق عام تھا، امام بخاری کے علم و شہرت نے اس شوق کو اور بڑھایا، اسی ماحول میں امام ترمذی کا نشوونما ہوا، خود ان کے وطن میں امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث پیدا ہو چکے تھے، اس لیے امام ترمذی کو بھی حدیث نبوی کا شوق دامن گیر ہوا، چنانچہ انھوں نے خراسان اور ماوراء النہر کے علاوہ سماع حدیث کے لیے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں کا سفر کیا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں طاف البلاد و سماع خلقاً من الخراسانیین و العراقیین و الحجاز۔ (۲) یعنی انھوں نے متعدد شہروں کا سفر کیا اور خراسان و عراق اور حجاز کے ارباب کمال سے سماع کیا۔

**اساتذہ:** ان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، ان کے ناموں پر نظر ڈالنے سے اندازہ

ہوتا ہے کہ انھوں نے اس دور کے ہر خرمین حدیث سے خوشہ چینی کی، ان میں امام بخاری و مسلم کے شیوخ بھی ہیں، ان سب کا استقصا دشوار ہے، سمعانی اور ذہبی نے بعض ممتاز شیوخ کے نام لکھے ہیں، امام بخاری، مسلم، علی بن حجر مروزی، ہناد بن سری، ابو کریب، محمد بن العلاء، محمد بن موسیٰ الزمن، محمد بن بشار، عبد اللہ بن عبد الرحمن الدارمی، قتیبہ بن سعید، ابو مصعب، ابراہیم بن عبد اللہ ہروی، اسماعیل بن موسیٰ، سوید بن نصر، محمد بن عبد الملک، عبد اللہ بن معاویہ نجفی، وغیرہ (۱) یہ تمام شیوخ اپنے عہد کے جلیل القدر محدث تھے، اکثر اصحاب صحاح نے ان سے استفادہ کیا ہے، ان کے مختصر حالات یہ ہیں:

۱- ابوالحسن علی بن حجر بن ایاس سعدی مروزی بڑے متبحر عالم اور ا کا برحفاظ حدیث میں تھے، شعر و ادب کا بھی ذوق رکھتے تھے، حدیث کے علاوہ قرآن کے بڑے عالم تھے، ذہبی نے ان کی کتاب احکام القرآن کا ذکر کیا ہے ۲۴۴ھ میں وفات پائی۔ (۲)

۲- ابوالسری ہناد بن سری تمیمی، بڑے عابد و مرتاض محدث تھے، ذہبی انھیں قدوہ، زاہد اور شیخ الکوفہ لکھتے ہیں، ساری عمر علاقہ دنیوی سے آزاد ہو کر، عبادت و ریاضت میں بسر کی، زہد و عبادت کی وجہ سے کوفہ کے راہب کہلاتے تھے، امام احمد لوگوں کو ان کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیتے تھے، زہد پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، ۲۴۳ھ میں وفات پائی (۳)

۳- ابو کریب محمد بن العلاء بڑے جلیل القدر حافظ تھے، کوفہ میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا، حفظ حدیث میں وہ اپنے شیوخ سے بھی زیادہ معتبر مانے جاتے تھے، انھوں نے کوفہ میں تین لاکھ حدیثوں کی اشاعت کی، ان کے ایک شاگرد موسیٰ بن اسحاق نے ان سے ایک لاکھ حدیثیں سنی تھیں، ۲۴۸ھ میں وفات پائی۔ (۴)

۴- ابوبکر محمد بن بشار بن عثمان عبدلی، بصرہ کے بڑے حافظ حدیث تھے، ان کے

(۱) کتاب الانساب نسبت ترمذی و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۷ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۶ (۳) ایضاً

ص ۹ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۰۔



تلامذہ کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، ان کی روایات میں بعض محدثین نے کلام کیا ہے لیکن ان کا درجہ اس سے ظاہر ہے کہ بخاری و مسلم ان سے حدیثیں لیتے تھے، ۲۵۲ھ میں وفات پائی۔ (۱)

۵- ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمن تمیمی، داری، سمرقند کے جلیل القدر عالم اور حافظ حدیث تھے، ان کی علمی جلالت اور حفظ حدیث پر محدثین کا اتفاق ہے، امام احمد بن حنبل انھیں امام حدیث کہتے تھے، فقہ و تفسیر میں بھی کمال حاصل تھا، زہد و ورع میں بھی ممتاز تھے، محمد بن ابراہیم کا بیان ہے کہ وہ عقل و دیانت کے انتہائی درجہ پر تھے، ان کا علم حفظ و درایت اور زہد و عبادت ضرب المثل تھا، سمرقند میں انہی کی ذات سے حدیث و آثار کی اشاعت ہوئی، وہ مفسر کامل اور فقیہ عالم تھے، فن حدیث و تفسیر میں ان کی تصانیف ہیں، ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ حافظ و متقن اور زہد و متورع تھے، انھوں نے حفظ کے ساتھ حدیثوں کو جمع کیا، ان کو سمجھا، اس پر کتاب لکھی، سنت کو پھیلایا، اس کی حفاظت کی، اس کی دعوت دی، اس کے مخالفوں کو مٹایا، خطیب لکھتے ہیں کہ انھوں نے حدیث کی تلاش میں بڑے طویل سفر کیے، وہ حفظ و اتقان، صدق و ورع، زہد و عبادت تمام کمالات کے جامع تھے، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی سب نے ان سے فیض حاصل کیا ہے، دنیاوی وجاہت سے بھاگتے تھے، ایک مرتبہ اصرار سے مجبور ہو کر عہدہ قضا قبول کر لیا تھا لیکن پھر ایک ہی فیصلہ کے بعد مستعفی ہو گئے، ۲۵۵ھ میں وفات پائی۔ (۲)

۶- ابور جاقیبہ بن سعید بلخی، بغلانی، خراسان کے نامور حافظ حدیث تھے، حافظ ذہبی انھیں شیخ الحفاظ اور محدث خراسان لکھتے ہیں، ان کے حفظ پر محدثین کا اتفاق ہے، دولت علم کے ساتھ دولت دنیا سے بھی بہرہ ور تھے، ۲۴۰ھ میں وفات پائی۔ (۳)

۷- ابو مصعب احمد بن ابی بکر زہری امام مالک کے شاگرد رشید اور مدینہ منورہ

(۱) تہذیب العہد ج ۹ ص ۷۰، ۷۱، (۲) تہذیب ج ۵ ص ۲۹۶، (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۳۔

کے مشہور محدث، فقیہ اور قاضی تھے، فقہ میں ان کا پایہ بلند تھا، ذہبی انہیں امام الفقہ لکھتے ہیں، اہل مدینہ کے مذاہب پر بڑی وسیع نظر تھی، ابن حجر نے سند وفات ۲۳۲ھ اور ذہبی نے ۲۹۹ھ لکھا ہے۔ (۱)

۸- ابواسحاق ابراہیم بن عبدالرحمن ہروی، اصل وطن ہرات تھا لیکن بغداد میں متوطن ہو گئے تھے، ہرات کے ممتاز حفاظ میں تھے۔ (۲)

۹- ابو محمد اسماعیل بن موسیٰ فزاری کوفہ کے محدث تھے، ان کے تشیع کی وجہ سے بعض محدثین نے ان کی روایات میں کلام کیا ہے لیکن ابن حبان نے ثقات میں لکھا ہے اور بخاری، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے روایت کی ہے، ۲۳۵ھ میں وفات پائی۔ (۳)

۱۰- ابوبکر محمد بن عبدالملک، امام احمد بن حنبل کے خاص اصحاب میں ہیں، بغداد کے محدث تھے، طلب حدیث میں بڑے طویل سفر کئے، تمام اصحاب سنن نے ان سے روایتیں لی ہیں ۲۵۸ھ میں وفات پائی۔ (۴)

۱۱- ابو جعفر عبداللہ بن معاذ یہ نجفی بصرہ کے محدث تھے، ابن حبان نے ثقات میں لکھا ہے، اصحاب صحاح میں ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ کے شیخ تھے ۲۳۳ھ میں وفات پائی (۵)

حافظہ: امام ترمذی کے لیے قدرت کی جانب سے حفظ کے تمام سامان فراہم ہو گئے تھے، ایک طرف شیوخ میں ایسے اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا، دوسری طرف حافظہ نہایت قوی تھا اس کا ایک حیرت انگیز واقعہ رجال کی تقریباً سب کتابوں میں موجود ہے کہ انہوں نے ایک شیخ سے ایک جزو کے بعد حدیثیں قلم بند کیں، اتفاق سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کو پھر ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا، انہوں نے شیخ مذکور سے دوبارہ سماع حدیث کی

(۱) تہذیب ج ۱ ص ۲۰ و تذکرہ ج ۲ ص ۲۷ (۲) تہذیب تذکرہ ابراہیم (۳) تہذیب ج ۱ ص ۳۳۵  
(۴) تذکرہ ج ۲ ص ۱۳۳ (۵) تہذیب ج ۶ ص ۳۸

درخواست کی، شیخ نے سنا شروع کی، امام ترمذی کے ہاتھ میں ایک سادہ بیاض تھی، شیخ کو شبہہ ہوا کہ اس میں وہ حدیثیں لکھی ہوئی ہیں، ابو عیسیٰ امتحاناً ایسا کر رہے ہیں، اس لیے ان کو ناگوار ہوا، ابو عیسیٰ نے یہ غلط فہمی دور کر کے کہا کہ مجھے آپ کی حدیثیں حفظ ہیں اور اسی وقت کل حدیثیں سنادیں، شیخ نے کہا معلوم ہوتا ہے تم نے میرے پاس آنے سے پہلے ان کو حفظ کر لیا تھا، ابو عیسیٰ نے کہا نہیں، اگر آپ کو شبہہ ہو تو دوسری حدیثیں سنا کر امتحان کر لیجئے، شیخ نے امتحاناً چالیس غریب حدیثیں سنائیں، ابو عیسیٰ نے صرف ایک مرتبہ سن کر اسی وقت چالیسوں حدیثیں دہرائیں، یہ غیر معمولی حافظہ دیکھ کر شیخ کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ (۱)

اعتراف کمال: یوں تو امام ترمذی نے بہت سے شیوخ سے استفادہ کیا تھا لیکن جس سے ان کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا، وہ امام بخاری ہیں، وہ امام بخاریؒ کے خاص تلامذہ میں تھے، ان کے فیض اور امام ترمذی کے حافظہ ذوق و شوق اور تلاش و جستجو نے ان کو اس عہد کا امام بنا دیا، ان کے علم و کمال پر تمام محدثین اور علما کا اتفاق ہے، ابن حبان لکھتے ہیں کہ امام ترمذی ان لوگوں میں تھے جنہوں نے حدیثوں کا ذخیرہ جمع کیا، اس پر تصنیف کی اور انہیں حفظ کیا، حافظ ذہبی اور ابن حجر دونوں ان کو امام حدیث لکھتے ہیں، امام بخاری کے بعد خراسان میں ان سے بڑا کوئی محدث نہ تھا، "مات البخاری ولم یخلف بخراسان مثل ابی عیسیٰ فی العلم والورع" وہ امام بخاری کے خلیفہ شمار کئے جاتے تھے، خود امام بخاری کو لائق شاگرد پرناز تھا اور انہوں نے ان الفاظ میں ان کے کمال علم کی سند عطا کی تھی کہ تم نے مجھ سے جتنا فائدہ حاصل کیا، اس سے زیادہ میں نے تم سے حاصل کیا، (۲)

اس سند کے بعد امام ترمذی کے لیے اور کسی سند کی ضرورت نہیں رہ جاتی، امام بخاری نے ان سے ایک حدیث روایت کی ہے۔

تلامذہ: ان کے علمی کمالات نے ان کی ذات کو طالبان حدیث کا مرجع بنا دیا تھا، ان کے

(۱) بستان مس ۱۳۱ (۲) تہذیب ج ۹ ص ۳۸۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۸ و بستان الحدیثین ص ۱۳۱۔

تلامذہ میں خراسان اور ترکستان کے علاوہ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمیوں کے نام ملتے ہیں، چند ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابو حامد احمد بن عبداللہ بن داؤد مروزی، یثیم بن کلیب الشامی، محمد بن محبوب، ابو العباس محبوبی مروزی، احمد بن یوسف نسفی، ابوالحارث اسد بن حمدیہ، داؤد بن نصر بن سہل بزدوی، عبد بن محمد بن محمود نسفی، محمود بن نمیر، محمد بن محمود، محمد بن سکی بن نوح، ابوجعفر محمد بن سفیان بن النظر، محمد بن المنذر وغیرہ۔ (۱)

تفسیر: حدیث امام ترمذی کا خاص فن تھا، اس کے علاوہ تفسیر میں پورا درک اور فقہ میں کمال رکھتے تھے، ترمذی میں انھوں نے ابواب تفسیر کے تحت میں آیات قرآنی کے متعلق جو احادیث نبوی اور آثار صحابہ جمع کیے ہیں ان سے تفسیر کے متعلق ان کے علم و نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

فقہ: حفظ حدیث کے ساتھ وہ مجتہد فقہ تھے، ان کے تفقہ پر جامع ترمذی شاہد ہے، ترمذی کا خاص امتیاز یہی ہے کہ وہ محض احادیث کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ فقہی اجتہاد کی کتاب بھی ہے، اس میں امام ترمذی نے مختلف ائمہ کے فقہی مذاہب، ان کے استنباطات اور دلائل کو جمع کر دیا ہے اور جا بجا اس پر تنقید بھی کرتے گئے ہیں، مزید بحث آئندہ آئے گی۔

عملی زندگی: امام ترمذی میں جس درجہ کا علم تھا، اسی درجہ کا عمل اور زہد و تقویٰ بھی تھا، وہ زہد و ورع میں بھی امام بخاری کے جانشین تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

مات البخاری ولم یخلف بخراسان مثل ابی عیسیٰ فی العلم

والحفظ والورع والزهد۔ (۲)

خشیت الہی: ان کا دل خشیت الہی سے اتنا لبریز تھا کہ ہر وقت رویا کرتے تھے اور روتے روتے آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی (۳) لیکن دل کی آنکھیں روشن ہو گئی تھیں، بعض

(۱) تہذیب التجذیب ج ۹ ص ۳۸۷ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۸ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۸

روایتوں میں ہے کہ وہ پیدائشی نابینا تھے لیکن یہ صحیح روایتوں کے خلاف ہے اور یوں بھی خلاف قیاس ہے، اس لیے کہ ایک نابینا کا ایسے زمانہ میں جب کہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں ساری دنیائے اسلام کی خاک چھاننا عقل سے بعید ہے اور طلب حدیث کے لیے امام ترمذی کی سیاحت مسلم ہے۔

امام ترمذی کا مذہب: امام ترمذی کا زمانہ ائمہ اربعہ کے بعد ہے لیکن وہ ان میں سے کسی کے مقلد نہ تھے بلکہ خود مجتہد تھے، بعض مسائل میں امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کی تائید سے بعضوں کو یہ گمان ہوا کہ وہ شافعی یا حنبلی تھے لیکن اس سے ان کی تقلید کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے، انہوں نے بعض مسائل میں ان کی مخالفت بھی کی ہے، مثلاً گرمی کی شدت میں نماز ظہر کی تاخیر کے مسئلہ میں ان کی رائے امام شافعی کے خلاف ہے، وہ اپنی تحقیق سے جو رائے دیتے تھے، کبھی کسی کے موافق پڑ جاتی تھی اور کبھی مخالف، اس لیے کسی امام کی تائید سے ان کو اس کا مقلد سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

ایک التباس کا ازالہ: امام ابو عیسیٰ ترمذی کے علاوہ دو اور محدثین ترمذی کی نسبت سے مشہور ہیں، ایک ابو عبد اللہ محمد بن علی المعروف بحکیم الترمذی، دوسرے ابوالحسن احمد بن حسن ترمذی، یہ دونوں صاحب تصنیف ہیں، حدیث میں حکیم ترمذی کی نوادر الاصول مشہور کتاب ہے لیکن یہ بہت غیر معتبر ہے، اس لیے نام سے دھوکا نہ کھانا چاہیے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

www.KitaboSunnat.com

”حکیم ترمذی ابو عیسیٰ ترمذی کے علاوہ دوسرے شخص ہیں، حکیم ترمذی کی نوادر الاصول کی اکثر حدیثیں غیر معتبر ہیں، ناواقف حکیم ترمذی کو ابو عیسیٰ ترمذی سمجھ کر ان کی غیر معتبر حدیثیں امام ترمذی کی جانب منسوب کر دیتے ہیں، ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے (۱) ابوالحسن ترمذی البتہ بڑے پایہ کے محدث ہیں امام احمد بن حنبل کے اصحاب میں

(۱) بستان الحدیث ص ۶۸۔

تھے، بخاری، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ نے ان سے روایتیں کی ہیں، ۲۴۰ھ میں وفات پائی۔ (۱)

وفات: مشہور روایت کے مطابق امام ترمذی نے ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔ (۲)

تصانیف: مورخین کے اجمالی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذی کی بہت سی تصانیف تھیں لیکن ان کی تین تصانیف کا علم ہے، جامع یاسنن ترمذی، شمائل ترمذی اور کتاب العلیل، ابن ندیم نے تین کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں دو تو ترمذی اور کتاب العلیل ہیں لیکن تیسری کا نام اس نے کتاب التاريخ لکھا ہے۔ (۳)

جامع ترمذی سے پہلے کی کتب حدیث: امام ترمذی سے بہت پہلے مسلمانوں میں نہ صرف حفظ و طلب حدیث بلکہ اس کی تدوین کا بھی شوق پیدا ہو گیا تھا اور محدثین کی یادداشتوں کے علاوہ باقاعدہ مرتب و موب کتابیں مرتب ہو چکی تھیں، خود ترمذی کے زمانہ میں بھی حدیث کی مختلف قسموں کے مجموعے مرتب ہوئے، ان میں اولیت کا سہرا امام دارالہجرۃ امام مالک کے مرہبے۔

مؤطا کے علاوہ اس وقت تک حدیث کی جو کتابیں تالیف ہو چکی تھیں، ان میں سے بعض قابل ذکر کتابوں کے نام یہ ہیں:

مسند ابوداؤد طیالسی التوفی ۲۰۴ھ، مصنف عبدالرزاق بن ہمام التوفی ۳۱۱ھ،  
مسند عبداللہ بن زبیر جمیدی التوفی ۲۱۹ھ، سنن سعید بن منصور التوفی ۲۲۷ھ، مصنف عبداللہ  
بن محمد المعروف بہ مصنف ابن ابی شیبہ التوفی ۲۳۵ھ، مسند عبداللہ بن حمید الکشی التوفی  
۲۴۰ھ، مسند احمد بن حنبل التوفی ۲۴۱ھ، مسند عبداللہ بن عبدالرحمن تمیمی داری التوفی ۲۵۵ھ،  
صحیح محمد بن اسماعیل بخاری التوفی ۲۵۶ھ، صحیح مسلم بن حجاج التوفی ۲۶۱ھ، سنن ابن ماجہ  
التوفی ۲۷۳ھ، سنن ابی داؤد التوفی ۲۷۵ھ، مسند یحییٰ بن عبدالحمید حمانی التوفی ۲۲۸ھ، مسند

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۷ (۲) اتحاف النبلا ص ۳۸۷ (۳) فہرست ابن ندیم ص ۳۲۵۔

نعیم بن حماد خزاعی المتوفی ۲۲۸ھ، مسند مسدد بن مسرہ المتوفی ۲۲۸ھ، مسند اسحاق بن راہویہ المتوفی ۲۳۸ھ۔ (۱)

ان کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام ترمذی سے پہلے کتنے راہرو اس دشوار گزار منزل سے گذر چکے تھے، گو ان میں سے زیادہ تر مؤطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو حسن قبول کا درجہ حاصل ہوا لیکن اعتبار اور استناد سے بعض اور کتابیں بھی محروم نہ رہیں، ان کی موجودگی میں حدیث کی کسی اور کتاب کی تالیف کا خیال اور اس کا حسن قبول پانا اور بھی دشوار تھا، اس لیے امام ترمذی نے گذشتہ کتابوں سے الگ اپنی راہ نکالی اور اپنی کتاب میں ایسی خصوصیات پیدا کیں جن سے گذشتہ کتابیں خالی تھیں، اس سے نہ صرف یہ کتاب اپنی ماسبق کتابوں سے ممتاز ہوگئی، بلکہ فائدہ کے لحاظ سے بھی سب سے بڑھ گئی، اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

جامع ترمذی: تمام فنون خصوصاً فن حدیث میں کمیت سے زیادہ اس کی کیفیت نقص و کمال کا معیار ہے، یعنی روایت اور درایت کے اصول کے اعتبار سے صحیح حدیثوں کا مختصر مجموعہ معلل حدیثوں کے ضخیم مجموعوں سے کہیں بہتر ہے، اسی معیار سے ہم کو جامع ترمذی کا جائزہ لینا چاہیے، ترمذی کا درجہ صحت اس سے ظاہر ہے کہ امت نے اس کو صحاح کا درجہ دیا اور ترتیب میں اس کو صحیحین کے بعد ہی جگہ ملی۔

حدیث کی صحت و عدم صحت کا مدار دو چیزوں پر ہے، رواۃ کی حیثیت اور سلسلہ سند کی کیفیت، اصول حدیث کے رو سے رواۃ کے بارے میں سب اصحاب صحاح کے بنیادی شرائط تقریباً یکساں ہیں، یعنی راوی کا اسلام، فہم و فراست، صداقت، عدم تدلیس، عدالت مع جملہ شرائط حفظ، ضبط، تحقیق، عدم وہم، سلامت دہن اور صحت عقیدہ سب کے نزدیک ضروری شرائط ہیں۔ (۲) پھر ان اوصاف میں کمی و زیادتی کے اعتبار سے رواۃ کے

(۱) ان کتابوں کی تفصیل کے لیے دیکھو بستان الحدیثین شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی (۲) اصحاب سے کے شرائط بہت سی کتابوں میں ہیں، ہمارے پیش نظر ابو بکر حازمی کی شروط الائمة الخمسة ہے۔

مدارج قائم ہو جاتے ہیں اور ان مدارج اور سند کی حیثیت اور اس کے اقسام کے اعتبار سے حدیث کی صحت و عدم صحت اور نقص و کمال سے اختلاف شروع ہو جاتا ہے، مثلاً امام بخاری اور مسلم عموماً وہی حدیثیں قبول کرتے ہیں جن کے راویوں کی ثقاہت و عدالت متفق علیہ ہو، جرح و تعدیل کے رو سے بالکل مامون و مصنون ہوں، سند ناقص سے پاک ہو، بلکہ حاکم نے صحیحین کے شرائط میں ایک روایت کے لیے ان اوصاف کے درجہ اولیٰ کے ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن یہ شرط کلیہ کی صورت میں صحیح نہیں ہے کیوں کہ امام بخاری کی تمام روایتیں اس شرط کے مطابق نہیں ہیں، البتہ اس کا بڑا حصہ اسی قسم کا ہے۔

امام ترمذی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ روایت کسی نہ کسی امام یا محدث کی معمول بہا ہونا چاہیے، خواہ راوی اور سند اصول حدیث کے رو سے یکسر ناقص سے پاک نہ ہو، چنانچہ وہ چوتھے طبقہ تک کے راویوں کی روایتیں قبول کر لیتے ہیں اور صحیح، مسلسل اور مرفوع روایتوں کے ساتھ ضعیف، مرسل، منقطع اور مضطرب روایتوں کو بھی رد نہیں کرتے لیکن عموماً اس قسم کی روایتوں کو وہ شواہد اور متابعات کی حیثیت سے لیتے ہیں یعنی ایک صحیح روایت کے ساتھ اس کی تائید میں دوسری معطل روایت قبول کرتے ہیں لیکن وہ ہر روایت کا عیب و ہنر اور نقص و کمال بھی ظاہر کر دیتے ہیں، اس لیے پڑھنے والے کو اس کی حیثیت اور درجہ کا علم ہو جاتا ہے، یہ خصوصیت ترمذی کے علاوہ صحاح کی اور کسی کتاب میں نہیں ہے۔

جامع ترمذی کی خصوصیات: گو صحاح میں ترتیب کے لحاظ سے ترمذی کا درجہ صحیحین کے بعد ہے لیکن اس کی خصوصیات کی وجہ سے اس کا افادہ صحاح کی تمام کتابوں سے زیادہ عام ہے، شیخ الاسلام اسماعیل ہروی لکھتے ہیں کہ ترمذی بخاری اور مسلم سے زیادہ فائدہ بخش ہے، ان دونوں کتابوں سے صرف صاحب کمال اور صاحب نظر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ترمذی نے احادیث کی ضروری شرح بھی کر دی ہے، اس لیے اس سے محدثین اور فقہاء وغیرہ ہر طبقہ کے



لوگ مستفید ہو سکتے ہیں، (۱) ترمذی کی یہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱- اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تمام حدیثیں کسی نہ کسی امام، محدث، یا فقیہ کی معمول بہا ہیں، یعنی ہر روایت کسی نہ کسی صاحب علم کے نزدیک صحیح، اسقام سے پاک، لائق حجت اور قابل عمل ہے، صرف دو حدیثیں اس سے مستثنیٰ ہیں، ایک یہ کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر خوف و خطر یا سفر اور بارش کی رخصت کے مدینہ میں ظہر اور عصر کی نمازیں ایک ساتھ پڑھیں۔“ دوسری یہ کہ ”جب کوئی شراب پیئے تو اس کے کوڑے لگاؤ، تین مرتبہ سزا کے بعد بھی اگر باز نہ آئے تو قتل کر دو۔“ (۲)

۲- دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف اس میں روایات کی تکرار بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، دوسری طرف ایک مسئلہ کے متعلق مختلف روایتوں کی جانب اشارہ بھی کر دیا ہے، مثلاً ایک روایت نقل کرنے کے بعد لکھ دیتے ہیں کہ اس باب میں فلاں فلاں راویوں سے بھی حدیث مروی ہے اور اس روایت کے متن میں جو کمی یا زیادتی ہوتی ہے اس کو بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔

۳- تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جرح و تعدیل کے رو سے جس روایت یا سند میں جو عیب و ہنر ہوتا ہے، اس کو ظاہر کر دیتے ہیں، مثلاً یہ حدیث صحیح ہے، حسن ہے، ضعیف ہے، مضطرب ہے، مرسل ہے، منقطع ہے، غیر محفوظ ہے، سند قوی نہیں ہے، فلاں راوی منقطع فیہ ہے، اس کے حفظ میں کلام ہے، یا نسیان ہے، وغیر ذالک، جس سے پڑھنے والے کو اس کی حیثیت اور درجہ کا علم ہو جاتا ہے۔

۴- چوتھی یہ کہ فقہی حدیثوں میں فقہاء کے مذاہب، ان کے استنباطات و دلائل اور ان کے اختلافات اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتے ہیں مثلاً اس حدیث سے فلاں امام نے احتجاج و استدلال کیا ہے، اس میں یہ اختلاف ہے، یا اس کا استدلال صحیح نہیں ہے، (۱) مقدمہ احوذی (۲) کتاب العلل ص ۶۴۶۔

اس سے ائمہ کے مذاہب اور ان کے اختلافات کا بھی علم ہو جاتا ہے، اس خصوصیت نے ترمذی سے فقہی استفادہ کو بہت آسان کر دیا ہے۔

۵- پانچویں یہ کہ رواۃ کے ناموں، کنتوں اور القاب کے جمال کی تفصیل کر دی ہے۔ اس کی ان خصوصیات نے ترمذی کی افادی حیثیت کو بھی بڑھا دیا ہے، ابن اثیر جزری لکھتے ہیں کہ حسن ترتیب مکررات کی کمی اور فائدہ کی زیادتی کے لحاظ سے ترمذی حدیث کی بہترین کتابوں میں ہے، اس کے علاوہ اور کسی کتاب میں مختلف مذاہب، ان کے وجوہ استدلال اور حسن و غریب حدیث کے اقسام کی تفصیل نہیں ہے۔“ (۱)

شمال ترمذی کے محشی شیخ ابراہیم بن محمد شافعی باجوری کہتے ہیں کہ امام ترمذی کی جامع تمہارے لیے کافی ہے، وہ تمام حدیثی اور فقہی فوائد اور سلف و خلف کے مذاہب کی جامع، مجتہد کے لیے کافی اور مقلد کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے۔ (۲)

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک جامع ترمذی، بخاری، مسلم اور ابوداؤد تینوں کی بعض اچھی خصوصیات کی جامع ہے اور اس میں ان سے زیادہ مفید باتیں ہیں، چنانچہ وہ بخاری، مسلم اور ابوداؤد کی خصوصیات بتانے کے بعد لکھتے ہیں:

”چوتھے ابو یسٰی ترمذی ہیں، انھوں نے بخاری، مسلم اور ابوداؤد کی بعض خصوصیات کو اپنی کتاب میں جمع کر دیا ہے، شیخین کے طریقہ پر متون اور اسناد کے ابہام کی تفصیل کر دی ہے اور ابوداؤد کے طریقہ پر ان احادیث کو جمع کر دیا ہے جن پر کسی کا عمل ہے اور ان تینوں پر یہ اضافہ ہے کہ صحابہ اور مختلف ملکوں کے فقہاء کے مذاہب کا بھی ذکر کر کے اپنی کتاب کو جامع بنا دیا ہے، طرق حدیث کا نہایت لطیف اختصار کیا ہے، اس طرح کہ ایک حدیث نقل کر کے دوسرے طرق کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور ہر حدیث کے عیب و ہنر کو ظاہر کر دیا ہے کہ صحیح یا حسن یا ضعیف یا منکر ہے اور وجہ ضعف بھی بتادی ہے تاکہ طالب کو قابل

اعتبار اور ناقابل اعتبار حدیث سے واقفیت ہو جائے، جس کا نام بتانے کی ضرورت تھی، اس کا نام لے لیا ہے جس کی کنیت کی ضرورت تھی، اس کی کنیت بتادی ہے، غرض انہوں نے صاحب علم کے لیے کوئی چیز مخفی نہیں چھوڑی ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جامع ترمذی مجتہد کے لیے کافی اور مقلد کے لیے دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے، (۱) شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رقمطراز ہیں کہ ”یہ جامع ترمذی حدیث کی بہترین کتابوں میں ہے بلکہ بعضے وجوہ اور حیثیات سے حدیث کی تمام کتابوں سے بہتر ہے، ایک ترتیب و عدم تکرار کی حیثیت سے دوسرے فقہاء کے مذاہب اور ان کے استدلال کے ذکر کی حیثیت سے، تیسرے حدیث کے اقسام صحیح، حسن، ضعیف، غریب اور معلل بععلل کے ذکر کی حیثیت سے، چوتھے رواۃ کے نام، ان کے القاب اور کنیتوں اور علم رجال کے متعلق دوسرے فوائد کی حیثیت سے۔“ (۲)

ابن حزم کی تنقید: امام ترمذی کی علمی جلالت اور جامع ترمذی کی مذکورہ بالا خصوصیات کے باوجود اس پر بعض محدثین نے تنقید بھی کی ہے، ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز امام ابن حزم کا امام ترمذی کو مجہول لکھنا ہے لیکن ان کے اس بیان کو بالا اتفاق محدثین نے رد کیا ہے اور اس کو امام ترمذی سے ابن حزم کی ناواقفیت کا نتیجہ قرار دیا ہے، چنانچہ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں:

”حافظ العلم ابو عیسیٰ ترمذی کی ثقاہت متفق علیہ ہے اور ان کے بارے میں ابو محمد بن حزم کا یہ قول کہ وہ مجہول ہیں، ناقابل توجہ ہے، درحقیقت ابن حزم ان سے اور ان کی کتاب جامع اور علل سے واقف ہی نہ تھے۔“ (۳)

حافظ ابن حجر امام ترمذی کے کمالات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:

”ابو محمد بن حزم نے ترمذی کو مجہول لکھ کر اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے، وہ غالباً

(۱) حجة الله بالاندرج ص ۱۲۱ (۲) بستان الحدیث ص ۱۲۱ (۳) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۱۷۔

ترمذی سے واقف ہی نہ تھے اور نہ ان کو ان کے حفظ اور تصانیف کی خبر تھی، ابن حزم نے اس قسم کے الفاظ بعض اور مشہور ثقافت حفاظ مثلاً امام ابو القاسم بغوی، اسماعیل بن محمد الصفار اور ابو العباس الاصم وغیرہ کے متعلق بھی استعمال کئے ہیں، یہ البتہ تعجب انگیز امر ہے کہ حافظ ابن الفرضی نے اپنی کتاب ”المؤتلف والمختلف“ میں ترمذی کے رتبہ کے مطابق ان کا تذکرہ کیا ہے، اس پر ابن حزم کی نظر کیسے نہیں پڑی۔“ (۱)

موضوعات ابن جوزی اور جامع ترمذی: اس سلسلہ میں دوسری چیز یہ ہے کہ ابن جوزی نے موضوعات میں ترمذی کی ۲۳ روایتوں کو موضوع شمار کیا ہے لیکن محدثین نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے، اس بارے میں ابن جوزی کا تشدد مشہور ہے، جس طرح حاکم حدیث کی تحسین کرنے میں غیر محتاط ہیں، اسی طرح ابن جوزی موضوع کہہ دینے میں تشدد ہیں اور ان دونوں کا یہ تشدد و تساہل مشہور ہے، ابن جوزی نے ترمذی کے علاوہ صحاح کی بعض اور کتابوں بلکہ صحیح مسلم تک کی بعض روایات کو موضوع کہہ دیا ہے، محدثین نے ان کے اس تشدد پر بحث کی ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ:

”ابن جوزی کی موضوعات میں زیادہ تر موضوع حدیثیں ہیں اور قابل تنقید حدیثوں کے مقابلہ میں ناقابل تنقید حدیثیں بہت کم ہیں، پھر بھی اس میں ایک خرابی یہ ہے کہ ابن جوزی بعض ان حدیثوں کو بھی جو موضوع نہیں ہیں، موضوع گمان کر لیتے ہیں جس طرح حاکم میں یہ نقص ہے کہ وہ غیر صحیح حدیث کو بھی صحیح کہہ دیتے ہیں، ان دونوں کے اس تشدد و تساہل کی وجہ سے ان کی کتابوں سے ماہرین کے علاوہ دوسرا فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس لیے کہ ان کی ہر نقل کردہ حدیث میں اس تساہل اور بے احتیاطی کا امکان رہتا ہے“ حافظ سیوطی نے القول الحسن فی الذب عن السنن میں ثابت کیا ہے کہ ترمذی کی روایتیں موضوع نہیں ہیں۔ (۲)

(۱) تہذیب الجہد ج ۹ ص ۳۸۸ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۸۰۔

ایک اعتراض واضح اور اس کا جواب: امام ترمذی پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انہوں نے جامع ترمذی کی روایات کی تحسین و تصحیح میں تسامیل سے کام لیا ہے اور وہ ایک ہی حدیث کو حسن صحیح، حسن غریب اور حسن صحیح غریب تک کہہ دیتے ہیں، حالانکہ کسی ایک حدیث میں ایک ساتھ ان تینوں اوصاف یا ان میں سے کسی دو کا اجتماع نہیں ہو سکتا، محدثین نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں۔

درحقیقت یہ اعتراض اور اشکال اس لیے پیش آتا ہے کہ حدیث، حسن، صحیح اور غریب کے ایک متعین معنی ایک خاص تعریف اور ایک قسم کو معیار قرار دے کر اس پر ترمذی کے حسن، صحیح اور غریب کو منطبق کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے اگر ان حدیثوں کے جملہ مراتب و درجات ان کے اقسام ان کی مختلف نوعیتوں اور اس بارے میں محدثین کے اختلافات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ اشکال پیدا نہیں ہو سکتا، اولاً ترمذی خود مجتہد تھے، انہوں نے ان اصطلاحوں کے مروجہ معنی کو بکنہ قبول نہیں کیا تھا بلکہ ان کی بعض اصطلاحوں کا مفہوم عام اصطلاحوں سے مختلف تھا، مثلاً حسن کی مشہور تعریف یہ ہے کہ جس کا مخرج معلوم ہو اور اس کے رجال مشہور ہوں، (۱) لیکن ترمذی کے نزدیک حسن وہ ہے جس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور روایت شاذ نہ ہو (۲) اور جیسا کہ شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے مقدمہ شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ یہ بھی حسن کی محض ایک قسم کی تعریف ہے، (۳) نیز امام ترمذی نے خود اس کی تصریح کر دی ہے کہ جس حدیث کو انہوں نے حسن کہا ہے، اس سے عام محدثین کی اصطلاح نہیں بلکہ ان کا حسن مراد ہے۔ (۴)

اسی طریقہ سے حدیث کی صحت کے بہت سے مدارج اور اس کی مختلف نوعیتیں ہیں اور اس کے لحاظ سے صحیح کی بہت سی قسمیں ہو جاتی ہیں، ابن صلاح لکھتے ہیں کہ ”حدیث

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۳ (۲) کتاب العلل ص ۲۵۳ مطبع العلوم دہلی (۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی (۴)

صحیح وہ ہے جس کی سند شروع سے آخر تک مسلسل ہو، اس کے تمام راوی عادل و ضابط ہوں اور روایت شاذ و معطل نہ ہو، ایسی حدیث بالاتفاق تمام محدثین کے نزدیک صحیح ہے، یعنی یہ صحت کا اعلیٰ درجہ ہے، پھر کسی حدیث میں ان اوصاف کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کے اختلاف کی بنا پر صحت کے لیے کسی امام یا محدث کے نزدیک ان شرائط میں سے کسی شرط کے ضروری نہ ہونے کی بنا پر اس حدیث کی صحت و عدم صحت میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، جیسے مرسل حدیث جن ائمہ کے نزدیک حجت ہے، ان کے نزدیک وہ حدیث صحیح میں شامل ہے اور جن کے نزدیک حجت نہیں ہے، ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے، پھر جب محدثین کسی حدیث کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے نزدیک صحت کے شرائط اس میں موجود ہیں، یہ ضروری نہیں ہے کہ واقع میں بھی ایسا ہی ہو..... اسی طریقہ سے جب کسی حدیث کے متعلق محدثین کہتے ہیں کہ وہ صحیح نہیں ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ جھوٹی ہے کیوں کہ ایسی بعض حدیثیں بھی درحقیقت سچی ہوتی ہیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی سند ان کے نزدیک صحت کے شرائط کے مطابق ہے..... پھر صحیح حدیث کی دو قسمیں ہیں، متفق علیہ اور مختلف فیہ، پھر اس کی قسمیں مشہور اور غریب ہیں پھر کسی حدیث میں صحت کے شرائط کے تمکن کے لحاظ سے صحت کے درجات میں فرق پیدا ہو جاتا ہے یعنی جس کمال کے ساتھ یہ شرائط پائے جائیں گے، اسی قدر صحت کا درجہ بڑھ جائے گا اور اس میں جتنی کمی ہوگی اسی اعتبار سے صحت میں فرق پیدا ہو جائے گا، اس لحاظ سے صحیح حدیث کی بے شمار قسمیں ہو جاتی ہیں۔ (۱)

اسی طرح صحیح اور حسن کی دو قسمیں ہیں، صحیح لذتہ اور حسن لذتہ اور صحیح لغیرہ اور حسن لغیرہ، صحیح لذتہ اور حسن لذتہ کی تعریف تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی، صحیح لغیرہ وہ ہے جس میں صحیح لذتہ کے تمام شرائط تو نہ پائے جاتے ہوں لیکن کثرت طرق نے اس کی کوپورا



کر دیا ہو، حسن لغیرہ وہ حدیث ہے جس میں ضعف ہو لیکن تعدد طرق نے اس ضعف کو دور کر دیا ہو، اسی طرح سے غرابت کی دو قسمیں ہیں، متن کی غرابت اور سند کی غرابت، یعنی سند میں کوئی راوی منفرد ہو گیا ہو یا کسی حدیث کے اصل متن میں عام روایات کے خلاف کوئی جزوی کمی یا زیادتی یا تغیر ہو۔

ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنے کے بعد حسن، صحیح اور غریب کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا، مثلاً ایک ہی حدیث میں ایک محدث کے نزدیک حسن یا صحیح کے جملہ شرائط پائے جاتے ہیں، اس لیے اس کے نزدیک وہ حسن یا صحیح ہوگی اور دوسرے کے نزدیک نہیں پائے جاتے، اس لیے اس کے نزدیک نہ حسن ہوگی نہ صحیح، ایک کے نزدیک حسن کے شرائط پائے جاتے ہیں دوسرے کے نزدیک صحیح کے، اس لیے ایک کے نزدیک حسن ہوگی دوسرے کے نزدیک صحیح ہوگی۔

اسی طریقہ سے ایک ہی حدیث ایک کے نزدیک حسن ہو سکتی ہے اور دوسرے کے نزدیک صحیح، جس کو امام ترمذی نے حسن صحیح سے تعبیر کیا ہے بلکہ ایک شخص کے نزدیک ایک ہی حدیث حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ ہو سکتی ہے، یا ایک حدیث دو سندوں سے مروی ہے، ایک سند کے اعتبار سے حسن ہے، دوسری متن کے اعتبار سے صحیح، پھر صحیح کے بہت سے مدارج ہیں، ان مدارج کے اعتبار سے صحیح کے ادنیٰ درجہ کا اجتماع حسن کے اعلیٰ درجہ کے ساتھ ہو سکتا ہے اور اس لحاظ سے کہ صحیح کے اعلیٰ شرائط کے تحت میں حسن کے ادنیٰ شرائط خود بخود آجاتے ہیں، ہر صحیح حدیث حسن کہی جاسکتی ہے اور متقدمین کے یہاں صحیح حدیث پر حسن کا اطلاق ملتا ہے، اس کے علاوہ حسن اور صحیح کے اجتماع کی محدثین نے اور صورتیں بھی نقل کی ہیں۔

اسی طریقہ سے غرابت اور حسن میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے، ممکن ہے ایک حدیث سند کے اعتبار سے غریب ہو اور متن کے اعتبار سے حسن اور ترمذی کی مراد یہی ہے، اسی طریقہ سے صحت اور غرابت کا اجتماع بھی ہو سکتا ہے، شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے

مقدمہ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ صحت اور غرابت کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ (۱) غرض صحیح حسن اور غریب کے جملہ اقسام و مدارج اور اختلاف کو پیش نظر رکھنے کے بعد ان کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا، اسی سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ترمذی نے حدیثوں کی تحسین و تصحیح میں بھی تساہل سے کام نہیں لیا ہے بلکہ وہ کسی نہ کسی پہلو سے حسن و صحیح ہوتی ہے۔

یوں تو کتاب اللہ کے علاوہ کسی کتاب کے متعلق قطعی صحت کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا، بخاری و مسلم تک خردہ گیری سے محفوظ نہیں ہیں، ایسی حالت میں ترمذی کیوں محفوظ رہتی لیکن مجموعی حیثیت سے سلف سے لے کر خلف تک اس کی صحت مسلمہ چلی آتی ہے جس کا ثبوت صحاح ستہ میں اس کا شمار ہوتا ہے، پھر صحاح میں بھی صحیحین کے بعد ہی اس کو جگہ ملی، ملا کا تب چلی لکھتے ہیں ”ہو ثالث الكتب لستة في الحديث“ (۲) اور ائمہ حدیث اس کو احادیث حسن کی بنیاد قرار دیتے ہیں، ابن صلاح لکھتے ہیں ”کتاب ابی عیسیٰ اصل فی معرفۃ الحدیث الحسن“ (۳) یعنی امام ترمذی کی کتاب حدیث حسن کی معرفت کے لیے اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ترمذی کے متعلق اوپر بہت سے اکابر علماء و محدثین کی رائیں گزر چکی ہیں، یہاں تک ان کے اعادے کی ضرورت نہیں، خود ترمذی کے زمانہ میں عراق، خراسان اور حجاز کے علماء و محدثین سے اس کو حسن قبول کی سند مل چکی ہے، امام ترمذی کا بیان ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے بعد میں نے اس کو حجاز، عراق اور خراسان کے علماء کے سامنے اظہار رائے کے لیے پیش کیا، ان سب نے اس کو پسند کیا اور اہل نظر نے اس کو یہ سند عطا کی کہ من کان فی بیتہ هذا الكتاب فکانما فی بیتہ نبی یتکلم یعنی جس کے گھر میں یہ کتاب موجود

(۱) تحفۃ الاحوذی بحوالہ مقدمہ مشکوٰۃ ص ۲۰۰ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۷۵ (۳) مقدمہ ابن صلاح



ہو، اس کے گھر میں گویا نبی بول رہا ہے، (۱) اہل علم شعرا نے اس کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے بستان المحدثین اور حط میں یہ قصائد نقل کئے ہیں۔ (۲)

شروع ترمذی: ترمذی کی اہمیت اور اس کی فائدہ رسانی کی وجہ سے علماء محدثین نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا، اس کی شرحیں لکھیں، حواشی لکھے، مختصرات مرتب کیے، اس کے مشکلات حل کیے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر معلومات کا بیش قیمت ذخیرہ فراہم کر دیا۔

صاحب کشف الظنون نے اس کی آٹھ شرحوں کا ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

۱- سب سے پہلی اور قدیم شرح حافظ ابو بکر محمد بن عبداللہ شیبلی المعروف بہ ابن العربی المتوفی ۵۴۶ھ کی عارضۃ الاحوذی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے بستان المحدثین میں اس کا مستقل تذکرہ کیا ہے، (۳) اس کا ایک حصہ مجموعہ شروع اربعہ کے ساتھ چھپ گیا ہے، (۴) اور کمال نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۲- دوسری حافظ ابوالفتح محمد بن محمد بن سید الناس یحییٰ شافعی المتوفی ۳۳۷ھ کی شرح، یہ بڑی ضخیم ہے، شارح نے اس میں حدیث کے علاوہ اور بھی بہت سے مباحث شامل کر دیے ہیں، دو ٹکٹ کی یہ شرح دس جلدوں میں آئی ہے اور مصنف کے قلم سے تمام نہ ہو سکی، ان کے بعد حافظ زین الدین عبدالرحیم بن حسین العراقی المتوفی ۸۰۶ھ نے پوری کی، اس کا مکمل نسخہ بھی مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں ہے۔

۳- تیسری صحیحین اور ابوداؤد پر ترمذی کے زوائد کی سرانج الدین عمر بن علی الملقن

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۸ (۲) حط ص ۱۰۴، بستان المحدثین ص ۱۲۲ (۳) بستان المحدثین ص ۱۳۷ (۴)

نواب محمد علی خاں مرحوم والی ٹوٹک کے فرزند نواب زادہ محمد عبدالوہاب خاں صاحب ترمذی کی چار شرحوں عارضۃ الاحوذی قوت المقتدی سیوطی اور ابوہیب سندھی اور سرانج احمد سرہندی کی شرحوں کو مجموعہ شروع اربعہ کے نام سے چھپوایا تھا غالباً اس کی ایک ہی جلد چھپ سکی۔

التونفی ۸۰۳ھ کی شرح ہے۔

۴- چوتھی سراج الدین عمر بن رسلان بلقینی شافعی التونفی ۸۰۵ھ کی شرح العرف الشذی یہ بھی تمام نہ ہو سکی، صرف ایک ٹکڑے کی شرح ہے۔

۵- پانچویں حافظ زین الدین عبدالرحمن بن احمد بن نقیب حنبلی التونفی..... کی شرح بیس جلدوں میں تھی، کسی ہنگامے میں ضائع ہو گئی، اب اس کا نام صرف کتابوں میں ملتا ہے۔

۶- چھٹی حافظ جلال الدین سیوطی التونفی ۹۱۱ھ کی شرح القوت المعتدی، اس کا ایک حصہ شروع اربعہ کے ساتھ چھپا ہے۔

۷- ساتویں حافظ زین الدین عبدالرحمن بن احمد بن رجب حنبلی التونفی ۷۹۵ھ کی شرح، اس کا اور کچھ حال نہیں معلوم۔

۸- آٹھویں شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندھی مدنی التونفی ۱۱۳۸ھ کی شرح، شیخ مذکور نے اس کو مدینہ طیبہ میں لکھا تھا، کشف الظنون نے اسے بڑی لطیف شرح لکھا ہے۔ (۱) ملاکاتب حنبلی نے صرف ان آٹھ شروع کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کے علاوہ اور شرحیں بھی ہیں، مثلاً

۹- نویں شیخ سراج احمد سرہندی کی فارسی شرح، اس کا بھی ایک حصہ شروع اربعہ میں چھپا ہے۔

۱۰- دسویں حافظ ابن حجر عسقلانی التونفی ۸۵۲ھ کی اللباب فی ما یقول الترمذی فی الباب، امام ترمذی نے فی الباب عن فلاں کہہ کر جن روایتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اس میں اس کی تفصیل مع جرح و تعدیل ہے، اس کا نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۱- گیارہویں ابوطیب سندھی التونفی ۱۱۰۹ھ کی شرح، یہ بھی شروع اربعہ میں ہے۔

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۷۵۔

۱۲- بارہویں حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اپنی ایک شرح کا حوالہ دیا ہے۔

۱۳- تیرہویں مولانا شمس الحق مرحوم عظیم آبادی کی ہدایۃ اللوغزی بنکات

الترمذی۔

۱۴- چودہویں اللکوب الدرری مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، یہ جامع ترمذی

پر مولانا کے افادات ہیں، جسے مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی مرحوم نے مرتب کیا تھا اور مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم نے شائع کیا ہے۔

۱۵- پندرہویں العرف الشذی کے نام سے مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری کے

افادات کو ان کے ایک شاگرد نے جمع کیا ہے۔

۱۶- سولہویں مولانا عبدالرحمن مرحوم مبارکپوری کی التھتۃ الاحوذی، یہ چھپ گئی

ہے، اس کا مقدمہ خاص طور سے اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے، کاتب سطور نے اس مضمون میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

۱۷- مولانا اصغر حسین صاحب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے حنفی نقطہ نظر طلبہ

کے استفادہ کے لیے نزول الثوی کے نام سے ترمذی کی احادیث کے متعلق مختلف قسم کے سوالات اور ان کے جوابات لکھے ہیں، اس کا ایک حصہ چھپ گیا ہے۔

**مختصرات ترمذی:** شرحوں کے علاوہ ترمذی کے مختصرات بھی کیے گئے، کشف الظنون میں

تین مختصروں کا حال لکھا ہے، ایک نجم الدین محمد بن عقیل الیاسی شافعی التونی ۷۲۹ھ کا، دوسرا

نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی الطونی حنبلی التونی ۷۱۰ھ کا، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ

خدیوہ مصر میں موجود ہے، (۱) اسی سے حافظ صلاح الدین خلیل بن کلیدی علانی نے ترمذی

کی سوحدیثوں کا انتخاب کیا ہے۔

**تجرید ترمذی:** ابوالفضل محمد تاج الدین بن عبدالحسن المعروف بہ قلعی نے ترمذی کی تجرید

(۱) فہرست کتب خانہ خدیوہ مصر جلد اول ص ۳۱۱۔

بھی کی، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیوہ میں ہے۔ (۱)

حواشی: ان مستقل کتابوں کے علاوہ ترمذی پر بہت سے حواشی بھی لکھے گئے، ہندوستان کی مطبوعہ ترمذی میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری کا حاشیہ زیادہ شائع ہے۔

شمال ترمذی: اس مضمون کا اصل مقصد جامع پر تبصرہ تھا اور امام ترمذی کی باقی دونوں کتابیں یعنی شمال اور کتاب العلل موضوع سے خارج ہیں لیکن شمال کی اہمیت کی وجہ سے اس کا بھی مختصر تذکرہ مناسب معلوم ہوا۔

جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں، اسی طرح آپ کے اخلاق مبارک، اعمال، طور طریقے، طبعی امور، آپ کی زندگی کا ہر پہلو اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے حالات جستہ جستہ حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں لیکن امام ترمذی سے پہلے خاص اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہ تھی، یہ سعادت سب سے پہلے امام ترمذی کے حصہ میں آئی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیہ مبارک، لباس، ساز و سامان، عادات و خصائل، رفتار و گفتار، نشست و برخاست، اخلاق اور معمولات کے متعلق جتنی روایتیں امام ترمذی کو پہنچیں، انھوں نے ان کو شمال میں جمع کر دیا ہے، گو یہ کتاب مختصر ہے لیکن ایسی جامع ہے کہ اس میں اخلاق نبوی کا پورا مرقع نظر آ جاتا ہے، شمال ترمذی کے بعد اس موضوع پر اور کتابیں لکھی گئیں لیکن اولیت کا سہرا امام ترمذی کے سر رہا، کشف الظنون میں شمال ترمذی کے علاوہ دو اور کتابوں کا نام ملتا ہے، ایک ابو العباس جعفر بن محمد المستغفری المتوفی ۴۳۲ھ کی ”شمال النبی“ دوسری ابو الحسن علی بن محمد بن ابراہیم فزاری المعروف بہ ابن المقرئ غرناطی المتوفی ۵۵۲ھ کی ”شمال بالنور الساطع اکامل“ (۲)

اس کے علاوہ ایک اور کتاب ”شمال محمدی“ شیخ عبدالرسول بن عبدالصمد کی ہے (۳)

(۱) فہرست کتب خانہ خدیوہ مصر ج اول ص ۲۷۹ (۲) کشف الظنون ج اول ص ۶۷ (۳) فہرست کتب

خانہ رام پور ص ۹۳۔

لیکن جو حسن قبول شامل کو حاصل ہو اوہ کسی کے حصہ میں نہ آیا۔

اس کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ جامع ترمذی کی طرح علما و محدثین نے اس کی بھی بہت سی شرحیں اور حواشی لکھے، بعض شرحوں اور ان کے شارحین کے نام یہ ہیں:

۱- اشرف الوسائل فی شرح الشمائل، حافظ ابن حجر مکی المتوفی ۹۷۳ھ، یہ شرح حرم محترم میں رمضان کے مقدس مہینے میں لکھی گئی تھی۔ (۱)

۲- شرح شمائل مصلح الدین محمد بن صلاح بن جمال اللاری المتوفی ۹۷۹ھ یہ شرح عربی میں ہے، اس کے علاوہ انھوں نے فارسی میں بھی ایک شرح لکھی ہے۔

۳- زہر الحمائل علی الشمائل حافظ جلال الدین سیوطی۔

۴- جمع الوسائل، نور الدین علی بن سلطان محمد القاری المعروف بہ ملا علی قاری المتوفی ۱۰۱۶ھ شیخ محمد بن عمر بن حمزہ انطاکی نے تہذیب الشمائل کے نام سے اس کی تہذیب کر کے اس کو سلطان بایزید کی خدمت میں پیش کیا تھا، (۲) یہ شرح قسطنطنیہ میں ۱۲۹۰ھ میں چھپ چکی ہے۔

۵- شرح شمائل مولانا عصام الدین ابراہیم بن محمد اسفراہینی المتوفی ۹۴۳ھ (۳)

۶- شرح شمائل مولیٰ محمد حنفی، یہ شرح ۹۲۶ھ میں لکھی گئی۔ (۴)

۷- شرح شمائل حافظ زین الدین محمد المعروف بہ عبدالرؤف بن تاج العارفین

مناوی المتوفی ۱۰۳۱ھ یہ شرح مولانا عصام الدین اسفراہینی اور ابن حجر مکی کی شرحوں کا

(۱) اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیوہ مصر اور کتب خانہ راپور میں موجود ہے، فہرست کتب خانہ خدیوہ ج ۴

۳۵۹، فہرست کتب خانہ رام پور ص ۶۵ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۶۷، اس کا قلمی نسخہ مصر کے شاہی کتب

خانہ میں ہے، ملاحظہ ہو فہرست کتب عربی کتب خانہ خدیوہ ج ۱ ص ۳۲۷ (۳) اس کا قلمی نسخہ مصر اور پٹنہ

لاہور فری میں ہے، فہرست کتب خانہ خدیوہ ج ۱ ص ۳۲۷، مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۲۷۱ (۴) اس کا قلمی

نسخہ پٹنہ اور راپور کے کتب خانوں میں ہے، مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۱۷۱، فہرست راپور ج ۱ ص ۹۰۔

خلاصہ ہے اور کچھ مزید اضافے بھی ہیں، خواجہ اسحاق آقندی التوفیٰ ۱۱۲۰ھ نے ترکی میں اس کا ترجمہ کیا اور مصطفیٰ بن حسین حلبی المعروف بہ مظلوم زادہ نے اسے ترکی میں نظم کیا، (۱) یہ شرح مصر اور قسطنطنیہ کے مطبوعوں سے شائع ہو چکی ہے، (معجم المطبوعات کالم ۱۷۹۹)۔

کشف الظنون میں صرف ان شرحوں کا تذکرہ ہے لیکن ان کے علاوہ اور بھی بعض شرحیں ہیں جن کے نام یہ ہیں:

۸- الفوائد الجلیلیۃ السببیۃ شیخ محمد بن قاسم بن محمد احمد بن جسوس، شارح بارہویں صدی کے آخر کے ممتاز علما میں تھے، (۲) یہ مطبع بولاق میں ۱۲۹۶ھ میں چھپ گئی ہے۔

۹- مواہب محمد یہ شیخ سلیمان بن منصور بجمیلی شافعی التوفیٰ ۱۲۰۴ھ، اس کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیوہ اور پینڈلا بھریری میں ہیں۔ (۳)

۱۰- شرح شمائل شاہ میرک بخاری۔ (۴)

۱۱- اس فخر و منزلت سے ہندوستان بھی محروم نہ رہا اور یہ سعادت و شرف بھی اسی خاندان کے حصہ میں آیا، جس کے فیض سے ہندوستان میں حدیث کا سرچشمہ جاری ہوا، یعنی شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خلف الصدق مولانا نورالحق شارح بخاری و مسلم نے شمائل ترمذی کی بھی ایک شرح لکھی، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ رام پور میں ہے۔ (۵)

۱۲- شرح حسن آقندی ۱۲۵۴ھ میں بولاق میں چھپی ہے (معجم المطبوعات کالم

(۷۵۵)

۱۳- خصائل نبوی ترجمہ اردو شمائل ترمذی مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۶۷، اس کے قلمی نسخے مصر اور پینڈہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، ملاحظہ ہو فہرست مصر ج اول ص ۳۶۰ و مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۲۷۱ (۲) فہرست کتب خانہ مصر ج ۱ ص ۳۸۲ (۳) ایضاً ص ۴۳۶ و مفتاح الکنوز ج ۲ ص ۵۳۳ (۴) مفتاح الکنوز ج ۱ ص ۲۷۱ (۵) فہرست رام پور

ص ۹۰۔

مظاہر العلوم، ترجمہ کے ساتھ احادیث کے متعلق مختلف قسم کے مفید معلومات اور مشکلات کا حل بھی ہے، یہ ترجمہ چھپ گیا ہے۔

شرحوں کے علاوہ شمائل کے متعدد حواشی بھی لکھے گئے، دو مشہور حواشی اور محشی کے نام یہ ہیں:

۱- مواہب لدنیہ شیخ ابراہیم بن محمد باجوری المتوفی ۱۲۷۶ھ یہ حاشیہ سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہو اور عام طور سے متداول ہے۔

۲- حاشیہ ابوالضیاء نور الدین علی بن علی شبر الہی شافعی المتوفی ۱۰۸۷ھ حاشیہ شمائل اور ابن حجر کی شرح شمائل دونوں پر ہے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیوہ میں ہے (۱)

**کتاب العلل:** امام ترمذی کی تیسری کتاب کتاب العلل ہے، یہ علل حدیث پر ایک مختصر لیکن مفید رسالہ ہے، حدیث کی صحت اور اس کے اسقام کی جانچ کے لیے جرح و تعدیل کے اصول و قواعد اور مستقل فنون ہیں لیکن بعض حدیثوں میں ایسے مخفی عیوب ہوتے ہیں جن کا علم ان اصولوں اور فنون سے نہیں ہوتا اور ایک روایت اصول و قواعد کے اعتبار سے بالکل صحیح ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی ایسی مخفی علت ہوتی ہے جس اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا، اس کے لیے حدیث پر بڑی وسیع اور دقیق نظر کی ضرورت ہے، ان عیوب کے معلوم کرنے کے لیے علل الحدیث ہے، حاکم لکھتے ہیں:

علوم حدیث میں ایک علم حدیث کی علتوں کے جاننے کا علم ہے، یہ صحیح، سقیم اور جرح و تعدیل کے علاوہ ایک مستقل علم ہے..... حدیث مختلف وجوہ سے معلل ہو جاتی ہے جس میں جرح و تعدیل کو کوئی دخل نہیں ہوتا، اس لیے کہ مجروح حدیث تو سرے سے ساقط اور ناقابل اعتبار ہے، اکثر ثقات کی حدیثوں میں ایسی علت ہوتی ہے جو ان کی نظر سے مخفی رہتی ہے اور حدیث معلل ہو جاتی ہے، اس کے علم کا ذریعہ صرف حفظ، فہم اور معرفت حدیث

(۱) فہرست عربی کتب خانہ خدیوہ ص ۳۳۲۔

ہے۔ (۱)

حاکم نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں، یہ ایسا دقیق علم ہے کہ اس کے لیے بڑی وسعت و دقت نظر کی ضرورت ہے، اس لیے بہت کم محدثین نے علل حدیث پر لکھا ہے جن لوگوں نے لکھنے کی ہمت کی، ان میں ایک امام ترمذی ہیں، ان کا یہ رسالہ جامع ترمذی کے آخر میں لگا ہوا ہے۔



(۱) معرفۃ علوم الحدیث حاکم ص ۱۱۲۔



## اہام حارث بن ابی اسامہؓ

(متونی ۲۸۲ھ)

نام و نسب: ابو محمد کنیت، حارث نام اور سلسلہ نسب یہ ہے: حارث بن محمد بن ابواسامہ بن یزید بن عدی بن سائب بن شماس بن حنظلہ بن عامر بن حارث بن مرثدہ بن مالک بن حنظلہ بن مالک بن زید مناة بن تمیم۔ (۱)

اپنے دادا کی نسبت سے مشہور ہو کر..... حارث بن ابواسامہ کہلاتے ہیں، ابواسامہ کا اصل نام داہر تھا۔ (۲)

خاندان: حارث عرب نژاد اور مشہور قبیلہ بنی تمیم سے تعلق رکھتے تھے، (۳) اسی لیے تمیمی کہے جاتے تھے۔

پیدائش اور وطن: ان کا وطن بغداد ہے (۴) اور غالباً وہ یہیں ماہ شوال ۱۸۶ھ میں پیدا ہوئے، (۵) وطن کی نسبت سے بغدادی بھی کہلاتے تھے۔

اساتذہ و شیوخ: حارث بن ابی اسامہ کو جن اکابر محدثین اور علمائے اسلام سے استفادہ کا موقع ملا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

اسحاق بن عیسیٰ بن طباع، اسود بن عامر شاذان، حسن بن موسیٰ اشیب، روح بن

(۱) تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۹ (۲) بستان الحدیث ص ۳۳ (۳) ایضاً (۴) ایضاً (۵) تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۸ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۳ و المنتظم ابن جوزی ج ۵ ص ۱۵۵۔

عبادہ، عبد اللہ بن بکر، عبد الوہاب بن عطا، عبید اللہ بن موسیٰ عیسیٰ، عفان بن مسلم، علی بن عاصم، محمد بن عمرو اقدی، محمد بن کناسہ، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، ہوزہ بن خلیفہ، یزید بن ہارون، ابوبدر سکونی، ابوعاصم نبیل وغیرہ۔  
**تلامذہ:** بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں:

احمد بن سلیمان نجاد، احمد عثمان بن آدمی، احمد بن معروف خشاب، اسماعیل بن علی خطمی، جعفر خلدی، عبدالصمد بن علی طستی، محمد بن احمد حکیمی، ابوجعفر محمد بن جریر طبری، محمد بن خلف بن مرزبان، محمد بن خلف وکیع، محمد بن خالد عطار، ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوبکر بن خلاد، ابوبکر شافعی، ابوعمر و بن ساک۔ (۱)

طلب حدیث کے لیے سفر: گوان کے سفر و سیاحت کی تصریح نہیں ملتی لیکن ان کے اساتذہ اور شیوخ کا تعلق مختلف ملکوں سے تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے علم حدیث کی تلاش و جستجو میں مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا تھا۔

**حافظہ:** تذکرہ نگاروں نے ان کو الحافظ کہا ہے، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے خصوصیت کے ساتھ ان کے حافظ کا تذکرہ کیا ہے۔

**ثقافت:** بیشتر محدثین اور علمائے جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ”ابوحاتم ابن حبان، ابراہیم حربی اور امام دارقطنی اور اسی پایہ کے دوسرے اکابر محدثین اور علمائے محققین نے ان کی توثیق کی ہے“ (۲) امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ وہ صدوق تھے، برقانی نے ان سے حارث کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ ان کے مرویات کو صحاح میں شامل کرو، ابراہیم حربی سے سوال کیا گیا کہ وہ معاوضہ لیتے ہیں، ایسی صورت میں کیا ان سے حدیثیں سنی جاسکتی ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ ہاں سنو وہ ثقہ ہیں، ابن حبان نے ان کو ثقافت میں شامل کیا ہے، ابوالعباس بناتی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، احمد بن کامل

(۱) تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۸ و ۲۱۹ (۲) بسن الحدیث ص ۳۳۔

تذکرۃ المحدثین.... گلستان حدیث کے مسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

361

کا بیان ہے کہ حارث ثقہ اور معتبر ہیں، ابن جوزی بھی ان کو ثقہ لکھتے ہیں، علامہ ذہبی نے تذکرہ، میزان اور عبر میں ان کی ثقاہت کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی بعض سندیں نہایت عالی ہیں اور ان کے متعلق خواہ مخواہ بلا دلیل و حجت شک و تردد کیا جاتا ہے، (۱)

کثرت روایت و معرفت حدیث: حارث کے حافظہ میں احادیث کا وافر ذخیرہ محفوظ تھا، ان کو کثیر الروایات اور کثیر الحدیث شمار کیا جاتا تھا، ابوالعباس بناتی کا بیان ہے راویۃ الاخبار کثیر الحدیث نیز وہ حدیثوں کے معاملہ میں بڑے واقف کار اور ان کی اچھی پرکھ رکھتے تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کان حافظا عارفا بالحدیث (۲)

عسرت و تنگدستی: ان کی زندگی بڑی عسرت اور تنگدستی کی تھی، کثیر العیالی کی بنا پر اکثر زیر بار رہتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ ”میرے چھ لڑکیاں تھیں، ناداری کی وجہ سے ان کی شادی نہیں کر سکتا اور غیروں میں شادی کرنے کو غیرت گوارا نہیں کرتی، بعض لوگوں نے شادی کا پیغام بھیجا لیکن وہ بھی میری ہی طرح فقیر اور محتاج تھے، ایسے لوگوں سے شادی کر کے مجھے اور بھی زیادہ زیر بار ہونا پڑتا، عسرت ہی کی بنا پر وہ تعلیم حدیث کا معاوضہ لینے پر مجبور تھے۔“

خودداری: اس عسرت و تنگدستی کے باوجود اپنے فقر وفاقہ کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ (۳)

وفات: چھیا نوے سال کی طویل عمر میں ۲۸۲ھ کو شب عرفہ میں انتقال کیا اور عرفہ کے دن چاشت کے وقت سپرد خاک کیے گئے۔ (۴)

مسند: ان کی تصنیفات میں صرف ایک مسند کا ذکر ملتا ہے، اس میں صحابہؓ کے بجائے شیوخ کی ترتیب پر حدیثیں لکھی گئی ہیں، اس قسم کی کتابوں کو اصطلاحاً معجم کہا جاتا ہے لیکن جس

(۱) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۰۵، بسن المیزان ج ۲ ص ۱۵۷، تذکرہ ج ۲ ص ۱۹۴ (۲) لسان

و میزان حوالہ مذکور (۳) بسن المحدثین ص ۳۳ (۴) تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۹۔

سنن ابوالحسن محمد شین ..... گلستان حدیث کے مہکتے گلابوں کا ایمان انفرادی تحقیقی تذکرہ

362

طرح بعض اور کتابیں بھی محدثین کی اصطلاح کے برخلاف مسند کہلاتی ہیں، اسی طرح یہ

کتاب بھی مجتم کے بجائے مسند کے نام سے مشہور ہے۔ (۱)

یہ سند طبع نہیں ہوئی، اس کا نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے، احمد بن ابوبکر

بوصیری متوفی ۸۴۰ھ نے ”اتحاف الخیرة بزوائد المسانید العشرة“ میں اس کی ان حدیثوں کو

جمع کیا ہے جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں۔ (۲)

حارث پر طعن و جرح: حدیث کی تعلیم کا معاوضہ لینے کی بنا پر بعض محدثین نے ان پر نقد کیا

ہے اور ان کو مجروح، ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں

کے نزدیک تعلیم حدیث کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے اور ایسے شخص کی حدیثیں ناقابل قبول

ہیں لیکن یہ اصول علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، اس کے بارے میں جواز و عدم جواز دونوں قسم کی

راہیں ملتی ہیں، علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ:

”امام احمد، اسحاق بن راہویہ اور ابو حاتم رازی کے نزدیک اس شخص کی حدیث

قبول نہیں کی جائے گی جو حدیث بیان کرنے کا معاوضہ لیتا ہو لیکن امام بخاری کے استاذ

ابو نعیم فضل بن دکین اور علی بن عبدالعزیز بنغوی اور بعض دوسرے علمائے اس کی اجازت دی

ہے، ابو اسحاق شیرازی کا فتویٰ یہ ہے کہ جو لوگ حدیث کی تعلیم و تدریس کی وجہ سے اپنے

متعلقین کی کفالت اور ان کی معیشت کا انتظام نہ کر سکیں، ان کے لیے اجرت و معاوضہ لینا

جائز ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یتیم کے مال میں سے ضرورت مسند اولیا اور سرپرستوں کو

بقدر کفالت لینے کی اجازت دی گئی ہے۔“ (۳)

خطیب نے دونوں قسم کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

”جو لوگ معاوضہ نہ لینے کے قائل ہیں ان کا مقصد راوی کو طعن اور سوء ظن سے

منزہ قرار دینا ہے کیوں کہ معاوضہ لینے کے بعد آدمی میں نرمی اور مدہدہنت پیدا ہو جاتی ہے

(۱) بستان الحدیثین ۳۲، ۳۳ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۳۳، ۱۶۴ (۳) تدریب الراوی ص ۱۲۴

363 رتذکرۃ المحمدین..... گلستان حدیث کے ہستے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

لیکن درحقیقت ان لوگوں کے نزدیک بھی محض مکروہ تنزیہی ہے، حرام و ناجائز نہیں اور اکثر سلف اس باب میں رخصت کے قائل ہیں۔ (۱)

اس لیے دونوں پہلو برابر ہیں خصوصاً جو لوگ تنگدستی کی بنا پر معاوضہ لینے پر مجبور ہیں ان کے لیے پوری گنجائش موجود ہے اور اس سے ان کی ثقاہت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، اس لیے امام حارثؒ پر محض اس بنا پر تنقید نہیں کی جاسکتی۔



## اما احمد بن ابی عاصم نبیل

(متوفی ۲۸۷ھ)

نام و نسب: احمد نام، ابو بکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، احمد بن عمرو بن ابو عاصم ضحاک بن مخلد۔ (۱)

ولادت: مورخین کے بیان کے مطابق وفات کے وقت اُن کی عمر ۹۰ سال تھی (۲) اس اعتبار سے وہ ۱۹۷ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

خاندان و وطن: عراق کے مشہور علمی مرکز بصرہ کو ان کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن انھوں نے اصہبان میں بود و باش اختیار کر لی تھی، قبیلہ شیبان سے ان کا نسبی تعلق ہے، اُن کے جد امجد ابو عاصم ضحاک کا جو انبیل کے لقب سے مشہور اور نامور محدث و فقیہ تھے، امام ابو حنیفہؒ کے ممتاز اصحاب میں شمار ہوتا ہے، بخاری جیسے امام حدیث ان کے دامن فیض سے وابستہ تھے، ابن ابی عاصم کے نانا ابو سلمہ موسیٰ بن اسماعیل بھی بلند پایہ محدث تھے اور ان سے ان کو روایت کرنے کا شرف بھی حاصل ہے۔

اساتذہ: اپنے نانا کے علاوہ امام بخاری، ابوالولید طلیسی، ہدبہ بن خالد اور ہشام بن عمار جیسے نامور علماء اور اکابر محدثین سے روایت حدیث کی ہے۔

تلامذہ: مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن یزید، احمد بن معید سمسار، ابو محمد بن حبان، ابو احمد غسال، عبدالرحمن بن محمد بن سنان، محمد بن احمد کسائی، وغیرہ۔

(۱) العبر فی خبر من غیر جلد ۳ ص ۷۹، البدایہ والنہایہ جلد ۱ ص ۸۳، (۲) تذکرۃ المحتاج ج ۲ ص ۲۱۳۔

سفر: علم کی تلاش و جستجو خصوصاً حدیث کی طلب کے لیے مختلف بلاد کا سفر کیا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ولّٰہ الرحلة الواسعة۔

حفظ و ثقاہت: حدیث میں آپ کا پایہ اتنا بلند تھا کہ امام و حافظ حدیث کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، تمام علمائے فن کو اُن کے ضبط و حفظ، عدالت و ثقاہت کا اعتراف ہے، ابن ابی حاتم نے صدوق اور ابن اعرابی نے حدیث و مسائل فقہ کا بڑا حافظ بتایا ہے، یادداشت کی قوت کا یہ حال تھا کہ ۵۰ ہزار سے زیادہ حدیثیں وہ زبانی بیان کرتے تھے، (۱)

فقہ: فقہ و اجتہاد میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے، علمائے طبقات نے فقہ میں اُن کے کمال کا اعتراف کیا ہے، ابن اعرابی کا بیان ہے کہ شفیق بلخی کے ایک ہزار مسائل ان کو زبانی یاد تھے۔ منصب قضا: اُن کے فقیہ و مجتہد ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ امام احمد کے صاحبزادے صالح کے بعد اصہبان کے قاضی مقرر کیے گئے اور سولہ سال تک اس منصب پر فائز رہے۔ (۲)

مذہب و مسلک: ابو نعیم اور بعض دوسرے علمائے طبقات نے ان کو ظاہری المذہب بتایا ہے (۳) لیکن صاحب شذرات نے اُن کی ایک کتاب الرّد علی داؤد لظاہری کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں ممکن ہے وہ ظاہری رہے ہوں لیکن بعد میں اس مسلک سے رجوع کر لیا ہوگا اور شوافع اور دوسرے اصحاب حدیث کی طرح ظواہر حدیث پر عمل اور اُن سے احکام و مسائل کا استنباط کرتے ہوں گے۔

زہد و ورع: علم کے ساتھ عمل کی دولت سے بھی سرفراز تھے، اصحاب طبقات و تراجم نے اُن کے زہد و ورع اور تدین و تقویٰ کا بھی ذکر کیا ہے، اُن کو تصوف اور صوفیا سے بھی تعلق تھا اور بزرگان دین کی خدمت میں استفادہ و اصلاح کے لیے جاتے تھے، ابو تراب نخشی سے خاص تعلق تھا، اُن کی بعض کرامتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔

**اجتہاد سنت و اجتناب بدعت:** بڑے تبع سنت تھے اور مبتدعین کو سخت ناپسند کرتے تھے،

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۳ (۲) ایضاً (۳) ایضاً۔

تذکرۃ الحمد شین ..... ہستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

366

فرماتے تھے ”مجھے پسند نہیں کہ میری مجلس میں کوئی مبتدع، مفتری، فحش گو، لعن و طعن کرنے والا، امام شافعی اور محدثین کے مسلک سے منحرف و بیزار شخص شریک ہو“ (۱)  
اعتراف کمال: محدثین ان کے کمالات کے معترف تھے، علامہ ذہبی نے ان کو صاحب مناقب اور کبیر القدر لکھا ہے، ابن عماد فرماتے ہیں:

جمع بین العلم والفہم والحفظ وہ علم وفہم، حفظ و اتقان، حدیث، زہد  
والزہد والعبادۃ والفقہ۔  
وعبادت اور فقہ واجتہاد کے جامع تھے۔

وقات: امام ابن عاصم نے ربیع الآخر ۲۸ھ میں انتقال کیا۔ (۲)  
تصانیف: وہ کثیر التصانیف تھے، زنگیوں کی شورش کے زمانہ میں ان کی اکثر کتابیں ضائع ہو گئیں، حسب ذیل تصانیف کے نام کتابوں میں ملتے ہیں:  
۱- الرد علی داؤد الظاہری: نام سے معلوم ہوتا ہے کہ امام داؤد ظاہری کے رد میں ہے۔

۲- کتاب السنۃ: یہ مسئلہ صفات کے متعلق احادیث کا ایک اہم مجموعہ تھا، اس کی تالیف کا انداز علمائے سلف کی کتابوں کے مطابق تھا۔ (۳)  
۳- مسند: یہ ضخیم اور اہم مسند، پچاس ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے، (۴) تمام قابل ذکر علماء و مصنفین نے اس کا تذکرہ کیا ہے، حافظ منذری کے قلم کا لکھا ہوا اس کا ایک مکمل نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ (۵)

۴- کتاب البیات: دیت و قصاص کے متعلق روایات کا یہ مجموعہ ۱۳۲۳ھ میں مصر سے ۸۴ صفحے میں شائع ہوا ہے۔

(۱) البدایہ ج ۱۱ ص ۸۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۳ (۳) البدایہ ج ۱۱ ص ۸۴۔ (۴) کشف الظنون

ج ۲ ص ۳۳ (۵) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵۔



## امام ابو بکر بزارؓ

(متوفی ۲۹۲ھ)

نام و نسب: ابو بکر کنیت، بزار لقب، اور احمد نام ہے، سلسلہ نسب صرف دادا تک معلوم ہے، یعنی احمد بن عمرو بن عبد الخالق۔

بعض اہل لغت کا بیان ہے کہ بزار تیلی کو کہتے ہیں لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

”کے راگو بند کہ تخم فروشی کند و آن کس را در لغت ہندی پنساری نامند“ (۱)

یعنی بزار تخم فروش کو کہا جاتا ہے جسے ہندوستانی زبان میں پنساری کہتے ہیں۔

خاندان و وطن: قبیلہ ازد کی ایک شاخ عتیک سے آپ کا خاندانی اور بصرہ سے وطنی تعلق تھا، اسی نسبت سے عتکی اور بصری مشہور ہوئے۔ (۲)

اساتذہ: بزار کے بعض اساتذہ کے نام یہ ہیں، ابراہیم بن سعید جوہری، اسماعیل بن سیف بندار، حسن بن علی بن راشد واسطی، عبدالاعلیٰ بن حماد، عبداللہ بن معاویہ جمی، عبدالرحمن بن فضیل، بن موفق، عمر بن موسیٰ، فلاس، محمد بن یحییٰ بن فیاض رمانی، ہدبہ بن خالد۔

تلامذہ: ان کے بعض تلامذہ اور مستفیدین کے نام درج ذیل ہیں:

ابو احمد عسال، ابو بکر بن سلم، ابو بکر بن مہندس، ابوالشیخ، ابوالقاسم طبرانی، ابوالحسن

(۱) لباب ج ۱ ص ۱۱۸ و تاج العروس ج ۳ ص ۴۱، و بستان المحدثین، ص ۳۲، (۲) کتاب الانساب و رقی

۳۸۳، و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۶۔

علی بن محمد مصری، حسن بن رشیق، عبدالباقی بن قانع، عبداللہ بن حسن، محمد بن ایوب بن صموت، محمد بن عباس بن نجیح۔

رحلت و سفر: ابتدائی تعلیم کے زمانہ کے سفر کا حال معلوم نہیں ہوتا، البتہ اس کا تذکرہ ملتا ہے کہ آخری زمانہ میں انھوں نے احادیث کی نشر و اشاعت کے لیے بغداد، اصفہان اور شام وغیرہ کے سفر کیے اور ایک عرصہ تک ان مقامات پر قیام کر کے یہاں کے طلبہ اور شائقین کو حدیث کی تعلیم دیتے رہے۔ (۱)

حفظ و ثقاہت: محدثین نے ان کے فضل و کمال اور حفظ و ثقاہت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

ابو الشیخ فرماتے ہیں کہ:

”حفاظ دنیا میں ایک وہ بھی تھے اور علی بن مدینی کے بعد کوئی شخص ان

سے زیادہ حدیثوں کا جاننے والا نہیں گذرا، بغداد کے حفاظ و محدثین ان کے گرو جمع

ہو کر ان سے روایتیں قلمبند کرتے تھے۔ (۲)

ابن قطان کا بیان ہے کہ ”وہ لوگوں میں حدیثوں کے سب سے بڑے حافظ تھے“؛ ابن یونس اور خطیب بغدادی نے بھی ان کے حافظہ کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، ابو یوسف یعقوب بن مبارک فرماتے ہیں کہ مسار أیت ابنل من البزار ولا احفظ خطیب ذہبی اور صاحب مغنی نے ان کو ثقہ و صدوق قرار دیا ہے اور امام دارقطنی نے ان کی توصیف و ستائش بھی کی ہے اور ان کو ثقہ بھی بتایا ہے، ابو عوانہ نے اپنی صحیح میں ان سے حدیث نقل کی ہے۔ (۳)

وقات: بزار نے ۲۹۲ھ میں شام کے مشہور شہر رملہ میں جہاں وہ حدیث کی تعلیم و اشاعت

(۱) تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۳۳۳ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶ (۲) بستان الحدیثین ص ۳۳ (۳) لسان

المیزان جلد ۱ ص ۲۳۸ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۹ و تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۳۳۳۔

کے لیے تشریف لے گئے تھے، انتقال کیا، ابن قانع نے ۲۹۱ھ سنہ وفات بتایا ہے، (۱) مگر پہلا قول صحیح ہے۔

اولاد: اُن کے ایک فرزند ابوالعباس محمد کا ذکر ملتا ہے جو نامور محدث تھے اور امام دارقطنی اور احمد بن حنبل جیسے مشاہیر فن نے ان سے کسب فیض کیا تھا۔ (۲)

مسند: فن حدیث میں بزار کے کمال کا ثبوت مسند کی جمع و تالیف ہے، مسند میں اُن کی دو کتابیں تھیں، المسند الکبیر المعلنل اس کا نام البحر الزاخر بھی ہے اور دوسری مسند صغیر، کبیر میں حدیثوں کے علل اور مخفی اسباب قادمہ کے متعلق بھی بحث و کلام کیا گیا ہے، اسی لیے اس کو کتب معلل میں شمار کیا جاتا ہے، محدثین کی اصطلاح میں معلل وہ کتابیں کہلاتی ہیں جن میں مصنف ان مخفی اسباب و علل کو بیان کرتا ہے جو صحت حدیث کے لیے موجب قرح ہیں، عراقی کا بیان ہے کہ بزار نے صحیح و غلط روایتوں سے کم اور رواۃ حدیث کے تفرّد و عدم متابعت سے زیادہ تعرض کیا ہے۔ (۳)

حافظ ابن حجر نے اس کے ان زوائد کی جو کتب ستہ اور مسند احمد میں نہیں پائے جاتے، اپنے استاذ ابوالحسن بیہقی کی کتاب سے تلخیص کی ہے، مسند کا ایک جامع و مکمل اور صحیح نسخہ حافظ بیہقی کے قلم کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے، یہی نسخہ حافظ ابن حجر کے استعمال میں رہا ہے۔ (۴)

بزار پر غلطی کا الزام: محدثین کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ بزار روایت حدیث میں غلطی کر جاتے تھے، امام دارقطنی اور حاکم کا بیان ہے کہ وہ متن و اسناد دونوں میں غلطی کرتے ہیں، امام نسائی نے بھی ان پر جرح کی ہے اور بعض لوگوں نے اُن کے تفرّد اور عدم متابعت کا بھی ذکر کیا ہے (۵) لیکن ان اعتراضات سے اُن کے فضل و کمال میں کوئی فرق

(۱) لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۳۸ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۹ و تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۳۳۲ (۲) تاریخ

العروس ج ۳ ص ۳ (۳) بستان الحدیث ص ۳۳ (۴) مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔ (۵) (اگلے صفحہ پر)

۳۷۰ متذکرۃ الحدیثین..... گلستان حدیث کے مہکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

نہیں آتا، حافظ ابن حجر نے بزار کے بعض تفردات ذکر کر کے ان کا جواب دیا ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اکثر میں وہ منفرد نہیں ہیں، دوسرے ان کے ثقہ و ثابت ہونے میں کسی کو کلام نہیں، خود ان ائمہ سے بھی جنہوں نے ان کی تضعیف کی ہے، توثیق منقول ہے، امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ ”وہ ثقہ ہیں اور ان سے غلطی بھی سرزد ہوتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ عموماً اپنے حافظ اور یادداشت پر اعتماد کرتے تھے اور روایت بیان کرتے وقت صحیح نسخہ کو پیش نظر نہیں رکھتے تھے۔“

اور مجرد غلطی راوی کے متروک و ساقط الروایت ہونے کی دلیل نہیں، اس پر پہلے مفصل بحث گزر چکی ہے۔

☆☆☆

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) (۵) لسان المیزان ج ۱ ص ۲۳۸ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۹۔

## امام ابو مسلم کشتی

(متوفی ۲۹۲ھ)

نام و نسب: ابراہیم نام، ابو مسلم کنیت، نسب نامہ یہ ہے، ابراہیم بن عبداللہ بن مسلم بن ماعز، (۱) خطیب نے ماعز کے بعد مہاجر اور سمعانی نے کش لکھا ہے۔ (۲)

ولادت: خطیب نے لکھا ہے کہ ”بیان کیا گیا ہے کہ وہ ۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے“ (۳) لیکن ذہبی نے اُن کی عمر ۱۰۰ سال کے لگ بھگ بتائی ہے اور اُن کا سنہ وفات ۲۹۲ھ ہے، اس لحاظ سے اُن کی پیدائش ۲۰۰ھ سے پہلے ہوئی ہوگی۔ (۴)

خاندان و وطن: وہ بصری اور کشتی کی نسبتوں سے زیادہ مشہور ہیں، بعض کا خیال ہے کہ بصرہ کے باشندہ تھے لیکن مقدسی کا بیان ہے کہ وہ بصرہ میں معماری کا کام کرتے تھے، اس لیے ان کو بصری کہا جاتا ہے، دوسری نسبت کشتی کی جانب ہے جو جر جان کے ایک گاؤں کا نام ہے لیکن سمعانی نے اُن کے جد اعلیٰ کا نام کش لکھا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کش فارسی لفظ کج (گج) کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے معنی چونے کے ہیں اور چون کہ وہ بصرہ میں معماری کا کام کرتے تھے اور اکثرہات الکج (چونالو) کہا کرتے تھے، اس لیے کجی لقب پڑ گیا تھا، محمد بن طاہر مقدسی اور علامہ ابن ندیم نے اسی کو ترجیح دی ہے، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ اُن کے باپ بصرہ میں منتقل ہو گئے تھے اور یہ وہاں معماری کرتے تھے اور اکثر مزدوروں

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۵ (۲) تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۱۴۰ و کتاب الانساب ورق ۶۷ (۳) تاریخ

بغداد ج ۶ ص ۱۲۱ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۶۔

سے کج کج کہا کرتے تھے، اس لیے اُن کو کجی کہا جاتا ہے“ حافظ ابو موسیٰ کے نزدیک کج خودستان کے ایک گاؤں کا نام ہے جس کو زیر کج کہا جاتا ہے، ابو مسلم اسی کی جانب منسوب ہیں، علامہ سمعانی نے ان کی ایک نسبت لیشی بھی بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نسبی تعلق بنو لیث سے تھا۔ (۱)

اساتذہ و شیوخ: امام ابو مسلم کشی نے جن نامور علماء و محدثین سے کسب فیض کیا تھا، ان کے نام یہ ہیں:

ابو عاصم نبیل، ابو الولید طیا سی، بدل بن مہر، حجاج بن نصیر فسطی، سلیمان بن حرب، عبد اللہ بن رجاہ غدانی، عبد اللہ بن مسلم قعنبنی، عبد الرحمن بن حماد شعبی، عبد الملک بن قریب اصمعی، عمرو بن مزروق، محمد بن عبد اللہ انصاری، محمد بن عرعرہ، مسلم بن ابراہیم، معاذ بن عبد اللہ عموزی وغیرہ۔

تلامذہ: ان سے جن لوگوں نے استفادہ کیا ہے، ان کی تعداد بے شمار ہے، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابو بکر شافعی، ابو بکر مالک بن قطیبی، ابو سہیل بن زیاد، ابو عمر بن سماک، ابو القاسم بغوی، ابو محمد بن ماسی، احمد بن سلیمان نجاد، اسماعیل خطیبی، اسماعیل بن محمد صفار، جعفر خالدی، حبیب فزار۔ عبد الباقی بن قالح، فاروق خطابی، محمد بن جعفر آدمی اور خود اُن کے صاحبزادے ابو الحسن محمد بن ابراہیم کشی وغیرہ۔ (۲)

سفر: اُن کے صرف بغداد جانے اور وہاں حدیثیں بیان کرنے کا ذکر ملتا ہے۔

حفظ و ثقاہت: امام ابو مسلم کے علم و فضل، حفظ و ضبط اور ثقاہت و اتقان پر علمائے فن کا اتفاق ہے، علمائے طبقات و سیر نے ان کو الحافظ کان محدثاً حافظاً اور من

(۱) کتاب الانساب ورق ۶۷۶، معجم البلدان ج ۲ ص ۲۵۴، الطهرست ص ۳۲۴، والرسلۃ المصطفیٰ ص ۳۱

(۲) تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۱۲۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۵۔

حفاظ الحدیث لکھا ہے، موسیٰ بن ہارون اور امام دارقطنی نے ان کو ثقہ صدوق قرار دیا ہے، محمد بن علی صوری کا بیان ہے کہ میں نے حافظ عبدالغنی بن سعید سے ابو مسلم کجی کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ ثقہ اور نہایت ذکی تھے، علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ وہ عالم، ثقہ اور حلیل القدر محدث تھے، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ وہ ان اجلہ محدثین میں تھے جن کی سندیں نہایت عالی ہوتی ہیں، علامہ سمعانی رقم طراز ہیں کہ وہ ثقہ اور اکابر محدثین میں تھے اور انھوں نے بے شمار حدیثیں بیان کیں، خطیب کا بیان ہے کہ وہ صاحب علم و فضل اور امین تھے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں، وہ احادیث کے واقف کار اور بقیۃ الشیوخ میں تھے، ابن عماد لکھتے ہیں، وہ صاحب سنن اور مسند وقت تھے۔ (۱)

مرجعیت و مقبولیت: ابو مسلم کے علم و فضل نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا، ان کے درس میں ہزاروں اشخاص شریک ہوتے تھے، مورخین کا بیان ہے کہ جب وہ بغداد شریف لائے تو تشنگان علم کا جم غفیر ان کے گرد اکٹھا ہو گیا تھا، غسان کے میدان میں جو بغداد کا سب سے وسیع اور کشادہ مقام تھا، جب ان کی مجلس درس آراستہ ہوئی تو سامعین کا بڑا اثر و دام تھا، حاضرین کا تخمینہ ۳۰-۵۰ ہزار لگایا گیا۔ (۲)

امارت و شکوہ اور جوہر و سخاوت: اللہ تعالیٰ نے علم و فضل اور عزت و شہرت کے ساتھ مال و دولت اور جاہ و حشمت سے بھی نوازا تھا، طبعاً بڑے فیاض تھے، مورخین نے ان کو صاف و کمالات کے ذکر میں، انھیں صاحب حشمت، کبیر الشان، ذی جاہ اور سخی و فیاض بتایا ہے، جب انھوں نے اپنی سنن کی جمع و تالیف کا کام ختم کر کے لوگوں کے سامنے اس کو پہلی مرتبہ پیش کیا اور پڑھا تو ایک ہزار درم فقرا و مساکین میں تقسیم کیے اور محدثین و ائمہ فن کے علاوہ

(۱) تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۱۲۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۵ و الفہرست ص ۳۲۳ و کتاب الانساب ورق ۶ ص ۳۷

و شذرات الذهب جلد ۲ ص ۲۱۰ (۲) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۱ و ۱۲۲ و الہدایہ ج ۱۱ ص ۹۹ و تذکرہ ج ۲

دوسرے اعیان و عمائد کی ایک پر تکلف دعوت کی اور اس میں تقریباً ایک ہزار دینار صرف کیے، خطیب کا بیان ہے کہ:

انہوں نے نذر مانی تھی کہ جب حدیث بیان کرنا شروع کریں گے تو دس ہزار دینار صدقہ کریں گے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب وہ دس ہزار حدیثیں بیان کر لیتے تو کچھ نہ کچھ صدقہ ضرور کرتے، جب پہلی مرتبہ حدیث بیان کی تو خود بھی صدقہ و خیرات کیا اور اپنے شریک تجارت کو بغداد خط لکھا کہ تم ساری کھجوریں صدقہ کر دو، اور اگر فروخت کر چکے ہو تو اُن کی قیمت غریبوں میں تقسیم کر دو۔ (۱)

پیشہ: شروع میں وہ معماری کا کام کرتے تھے، پھر تجارت کرنے لگے تھے اور بصرہ سے بغداد کھجوریں بھیجتے تھے، وہاں اُن کی طرف سے ایک وکیل تھا جو ان کو فروخت کرتا تھا، ابو مسلم بعض سرکاری مناصب پر بھی فائز رہے، اسی لیے مشہور شاعر سحتری نے اُن کی شان میں مدحیہ اشعار کہے ہیں۔ (۲)

وفات: تقریباً ایک سو سال کی عمر میں ۲۳ محرم الحرام ۲۹۲ھ بروز یکشنبہ بغداد میں انتقال کیا اور وہاں سے ان کی لاش بصرہ لائی گئی اور یہیں تجہیز و تکفین ہوئی۔ (۳)

تصنیفات: علامہ ابن ندیم نے ان کی دو کتابوں السنن والمسند کا ذکر کیا ہے، ان میں سنن زیادہ مشہور ہے، اس کی اکثر حدیثیں ثلاثی ہیں اور قلمی نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں پایا جاتا ہے۔ (۴)

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۱ و ۱۲۲ والبدایہ ج ۱ ص ۹۹ و تذکرہ ج ۲ ص ۱۹۶ (۲) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۲

(۳) ایضاً ص ۱۲۲ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۶ (۴) الطہرست ص ۳۲۲ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۶۔



## امام محمد بن نصر مروزی

(متوفی ۲۹۴ھ)

نام و نسب: نام محمد، ابو عبد اللہ کنیت، شیخ الاسلام لقب، نسب نامہ کتابوں میں مذکور نہیں ہے۔

ولادت، خاندان و وطن: ان کی زبانی منقول ہے کہ ”میں بغداد میں پیدا ہوا، میرے والد مروزی تھے، میری نشوونما نیشاپور میں ہوئی اور اب سمرقند میں رہتا ہوں۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا آبائی وطن خراسان کا مشہور شہر مرو ہے، اسی لیے وہ مروزی کی نسبت سے مشہور ہیں لیکن انھوں نے سمرقند میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ (۱)  
اساتذہ: محمد بن نصر کو جن اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن منذر خراسانی، ابو قدامہ سرخسی، اسحاق بن راہویہ، ربیع بن سلیمان، سعید بن عمر اشعثی، شیبان بن فروخ، صدقہ بن فضل، عبدان بن عثمان مروزی، عبید اللہ بن معاذ غنبری، علی بن بحر قطان، علی بن حجر، عمرو بن زرارہ، محمد بن بشار بندار، محمد بن عبد اللہ بن نمیر، محمد بن عبد الملک بن ابی الشوارب، ہدیہ بن خالد، ہشام بن عمار، یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری، یزید بن صالح، یونس بن عبد الاعلیٰ وغیرہ۔

(۱) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۵، تہذیب الحدیث ج ۹ ص ۲۸۹۔

تلامذہ: ان کے چند تلامذہ اور متسبین کے نام یہ ہیں:

ابو حامد بن شرقی، ابو العباس سراج، ابو عبد اللہ بن انزیم۔ ابو علی عبد اللہ ابن محمد بن علی بلخی، عثمان بن جعفر لبان، محمد بن منذر سکر، محمد بن یعقوب بن انزیم اور عزیزوں میں ان کے صاحبزادہ اسماعیل بن محمد کو ان سے روایت کرنے کا موقع ملا۔ (۱)

رحلت و سفر: ان کو علم و فن سے فطری ذوق تھا اور ہمیشہ علمی مسائل پر بحث و گفتگو کرتے تھے، عبد اللہ بن محمد ثقفی کا بیان ہے کہ ”میرے دادا جو ان کے ساتھ چار سال رہے، بیان کرتے ہیں کہ میں نے انھیں غیر علمی باتیں کرتے نہیں دیکھا، اس شوق کی تکمیل کے لیے انھوں نے طلب علم کے لیے مختلف شہروں کا سفر کیا، خطیب لکھتے ہیں: ”رحل الی سائر الامصار فی طلب العلم“ علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ انھوں نے طلب علم کے لیے مختلف شہروں کا سفر کیا اور خراسان، عراق، حجاز، شام و مصر کے علما سے استفادہ کیا۔ (۲)

حدیث میں درجہ: حدیث میں ان کی جلالت قدر کا اندازہ ان بیانات سے ہوگا، علامہ ذہبی نے ان کو برع فی هذا الشان اور رأساً فی الحدیث لکھا ہے، حاتم کا بیان ہے کہ ”وہ حدیث کے بحرِ خارا تھے“ اکابر علمائے جرح و تعدیل نے ان کے ضبط و ثقاہت اور حفظ و اتقان کا اعتراف کیا ہے، حافظ ابن حجر نے ان کو الحافظ، الثقف اور ابن حبان نے ثقاہت میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ان جامعین و مصنفین حدیث میں تھے جو مرتبہ امامت پر فائز تھے، ابو محمد بن حزم کا بیان ہے کہ وہ سنن کے جامع و ضابط صاحب علم اور احادیث کے مطالب کے حافظ اور مدافع تھے۔ (۳)

فقہ و خلافیات: فقہ و خلافیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، ان کے سوانح نگاروں نے ان کے نام کے ساتھ الفقیہ احدائمه الفقہا اور رأساً فی الفقہ وغیرہ لکھا ہے۔

(۱) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۹ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱ (۲) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۶ و المنعم ج ۶ ص ۶۳ (۳) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۳ و المنعم ج ۶ ص ۶۳۔

وہ نیشاپور کے مفتی سمجھے جاتے تھے، محمد بن یحییٰ سے جب کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو وہ اس کو ابو عبد اللہ مروزی کے پاس بھیج دیتے، خطیب بغدادی تحریر فرماتے ہیں کہ ان کو صحابہ اور مابعد کے علما کے اختلافات سے بڑی واقفیت تھی، ابو محمد بن حزم کا بیان ہے کہ وہ اجماع اور خلائیات کے بڑے عالم تھے۔ (۱)

مذہب و مسلک: امام شافعیؒ سے ان کو بڑا تعلق تھا، ان کے نامور تلامذہ سے فقہ کی تحصیل کی تھی اور اسی مسلک فقہ سے وابستہ تھے، ابن عماد کا بیان ہے کہ ان کے زمانہ کے شوافع میں کوئی شخص ان کا ہمسر نہیں تھا۔ (۲)

مقبولیت: ان کو بڑی مقبولیت حاصل تھی، عوام و خواص و امراد و حکام سب ان کا بڑا احترام کرتے تھے، امیر اسماعیل بن احمد کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ احتراماً کھڑا ہو جاتا تھا۔ (۳)

امامت: علمائے طبقات و تراجم نے ابو عبد اللہ مروزی کو ائمہ مسلمین میں شمار کیا ہے اور احد الاعلام، احد اعلام الامۃ، احد ائمة الاسلام اور الامام الجلیل وغیرہ القاب سے موسوم کیا ہے، سلیمانی اور ابو بکر ضعی نے ان کو امام بتایا ہے، محمد بن عبد اللہ بن عبد الحکم کا جوان کے استاذ الفقہ تھے، بیان ہے کہ جب وہ مصر میں، ہم لوگوں کے درمیان مرتبہ امامت پر فائز ہیں تو خراسان میں کسی کو ان کی امامت میں کلام ہو سکتا ہے، ابو بکر احمد ابن اسحاق کا بیان ہے کہ میں نے دو ائمہ مسلمین دیکھے، ابو حاکم رازی اور ابو عبد اللہ مروزی (۴)

زہد و عبادت: زہد و تقویٰ میں بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا، علمی اشتغال سے جو وقت بچتا، اس کو عبادت اور یاد الہی میں صرف کرتے تھے، نمازیں بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ

(۱) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۹، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۳، المنتظم ج ۶ ص ۶۳، و طبقات الشافعیین ج ۲ ص ۲۱

(۲) شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۱۷ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵

و طبقات الشافعیین ج ۲ ص ۲۲۱، و تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۷، و تہذیب المعجم ج ۹ ص ۳۹۰۔

پڑھتے تھے، ابو بکر صہبی کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بہتر کسی کی نماز نہیں دیکھی، ابن اہرم فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ان کی نماز کا حسن اور خشوع و خضوع دیکھ کر سخت متعجب ہوتے تھے، استفراق و محویت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ نماز میں بھڑنے ڈنک مار دیا اور جسم سے خون جاری ہو گیا، مگر انھوں نے کوئی حرکت اور جنبش نہیں کی، وہ جب نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تو ایک بے حس و حرکت لکڑی کی طرح معلوم ہوتے تھے، (۱) اس انہماک کی وجہ سے ان کا شمار اکابر صلیحا اور مشہور عباد و زبَاد میں ہوتا تھا (۲) ان کی بعض کرامتیں بھی بیان کی جاتی ہیں۔

ذریعہ معاش اور جو دو سخا: ان کی مستقل آمدنی بارہ ہزار سالانہ تھی، چار ہزار اسماعیل بن احمد امیر خراسان اور اسی قدر اس کے بھائی اسحاق اور اہل سمرقند کی جانب سے ان کو وظیفہ ملتا تھا لیکن ان کے مزاج میں بڑی سخاوت و فیاضی تھی، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

وقد كان من اكرم الناس      وہ بڑے کریم اور سخی تھے۔

واسخاهم نفسا۔ (۳)

اس لیے یہ کل رقم محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور جو کچھ بچتا اسی معمولی رقم میں گذر بسر کر لیتے، جب ناگہانی ضرورت کے لیے کچھ پس انداز کرنے کے لیے کہا جاتا تو کوئی توجہ نہ کرتے، اپنے ایک شریک کو مضاربت پر اپنا مال تجارت کے لیے بھی دیتے تھے۔ (۴)

اولاد: عرصہ تک لا ولد رہے، آخری عمر میں اولاد کی آرزو بہت بڑھ گئی تھی، اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے جو قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ایک صالح فرزند عطا کیا جب بچہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۲۱ و تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۷ و تہذیب

التہذیب ج ۹ ص ۳۹۰ (۲) صفحہ الصغوة ج ۳ ص ۱۲۳ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱ (۳) البدایہ والنہایہ

ج ۱ ص ۱۰۲ (۴) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۷ و ۳۱۸ و تذکرہ ج ۲ ص ۲۲۵۔

تذکرۃ الحدیثین ..... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

379

کے تولد کی ان کو اطلاع ہوئی تو بے ساختہ ان کی زبان سے دعائے ابراہیمی نکل گئی، الحمد للہ الذی وہب لی علی الکبر اسماعیل اس بچہ کا انھوں نے اسماعیل ہی نام بھی رکھا۔ (۱)

حلیہ: صورت نہایت حسین اور چہرہ گلاب کی طرح شاداب اور شگفتہ تھا، سپید دازھی نے چہرہ کو اور زیادہ نور بنا دیا تھا۔

وفات: محرم ۲۹۴ھ میں سمرقند میں وفات پائی۔ (۲)

تصنیفات: انھوں نے متعدد کتابیں تالیف کیں، خطیب کا بیان ہے کہ ”صاحب التصانیف الكثيرة والكتب الجمّة“ یعنی وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، ان کی کتابیں بڑی مفید اور بیش قیمت تھیں، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وصنف الكتب المفيدة الحافلة النافقة یعنی نہایت مفید کتابیں لکھیں۔

ان کی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

مسند: یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور کتاب ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدیوہ مصر میں عبدالقادر بن عبدالعزیز کے قلم کا لکھا ہوا ہے ۲۶۸، اوراق میں موجود ہے، سنہ کتابت ۲۵۶ھ ہے، اس کے شروع میں ایک باب نماز کا بھی ہے، اس کا عنوان ہے باب فی تعظیم قدر الصلوة وتفضيلها علی سائر الاعمال۔ (۳) جو بجائے خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، بعض علما نے اس کا مستقل تصنیف کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ”وصنف کتاباً عظيماً فی الصلوة“ (۴) (نماز پر ایک مہتمم بالشان کتاب لکھی)

کتاب القسامتہ: مروزی کی یہ دوسری اہم تصنیف ہے، ابو بکر صیر فی اس کے

(۱) الختظم ج ۶ ص ۶۳ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵، ۲۲۶، طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۲ (۳) فہرست

کتب خانہ خدیوہ مصر ج ۱ ص ۴۲۰ (۴) البدایہ ج ۱۱ ص ۱۰۲۔

بارے میں لکھتے ہیں کہ:

”اگر انھوں نے صرف یہی کتاب لکھی ہوتی تو بھی ان کے ایک بڑے

اور عظیم فقیہ ہونے کے لیے کافی تھی۔“ (۱)

علامہ ابن سبکی نے ان کی ایک اور کتاب کا ذکر کیا ہے، اس میں امام ابوحنیفہؒ نے حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے مسلک سے جن باتوں میں اختلاف کیا ہے اس کا ذکر ہے۔ (۲)

قیام اللیل اور کتاب رفع الیدین کے نام سے بھی دو رسالے لکھے تھے، جو طبع ہو چکے ہیں۔ (۳)



(۱) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۶ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱ (۳) خاترہ سیرۃ الامام البخاری ص ۲۶۔

## امام ابو محمد ابن جارودؒ

(متوفی ۲۹۹ھ)

نام و نسب: عبد اللہ نام، ابو محمد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عبد اللہ بن علی بن جارود۔  
وطن: سند ولادت اور خاندانی حالات معلوم نہیں ہو سکے، وطن نیشاپور ہے، مکہ میں مجاورت اختیار کر لی تھی۔

اساتذہ: چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوسعید بن اشج، احمد بن ازہر، احمد بن یوسف سلمی، اسحاق کوج، بحر بن نصر، زیاد بن ایوب، عبد اللہ بن ہاشم طوسی، عبد الرحمن بن بشر، علی بن خشرم، محمد بن ابی عبد الرحمن مقبری، محمد بن آدم، محمد بن عبد اللہ بن عبد الحکم، محمد بن عثمان بن کرامہ، محمد بن یحییٰ، یعقوب بن ابراہیم دورقی وغیرہ۔

تلامذہ: حافظ ذہبی نے اُن کے چار تلامذہ ابو حامد بن شرقی، دجیح بن سخری، محمد بن نافع مکی اور یحییٰ بن منصور کا نام تحریر کیا ہے۔

ضبط و اتقان: اور ان کے علم و فضل کے بارے میں لکھتے ہیں:

..... وہ حدیث کے حافظ، امام، ناقد.....

..... هو الحافظ الامام الناقد.....

..... ثقہ.....

..... كان من.....

..... وضابط اور جدید علمائے اسلام میں تھے

..... العلماء المتقنين المجودين۔

وفات: ان کا سنہ وفات ۳۰۷ھ ہے۔ (۱)

تصنیفات: ابن جارود کی کتاب "المنتقی" احکام و سنن سے متعلق روایات و احادیث کا ایک منتخب و مختار مجموعہ ہے جو ایک جلد میں اور تقریباً آٹھ سو حدیثوں پر مشتمل ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

"یہ کتاب گویا صحیح ابن خزیمہ پر مستخرج ہے لیکن اس میں صرف اس کے

اصول احادیث پر اکتفا کیا گیا ہے، اسی لیے اس کا نام منتقی ہے۔" (۲)

صاحب الرسالة المستطرفہ کتابی فرماتے ہیں کہ:

"اس کے استقصا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بہت کم حدیثوں میں

صحیحین سے تفرّد کیا گیا ہے۔" (۳)

ابن حزم کا بیان ہے کہ:

"صحیحین کے بعد ابن سکس، ابن جارود اور ابن اصغ کی کتابوں کا درجہ

ہے، اس کے بعد ابوداؤد و نسائی کی کتابوں کا نمبر آتا ہے۔" (۴)

منتقی ابن جارود پہلی مرتبہ حیدرآباد دکن سے ۵۰۴ صفحات میں شائع ہوئی ہے، شروع میں جن چھ طرق سے اس کی روایت کی گئی ہے، ان کا ذکر ہے، حواشی مختصر مگر مفید مطالب پر مشتمل ہیں، ہر حدیث کے سامنے حاشیہ میں اس کے ماخذ حروف تہجی کے ذریعہ ظاہر کیے گئے ہیں، مثلاً (ط) سے مؤطا، (حم) سے مسند احمد، (خ) سے بخاری، اور (م) سے مسلم وغیرہ۔

ابوعمر و اندلسی نے المرتقی فی شرح المنتقی کے نام سے اس کی شرح لکھی

تھی۔ (۵)

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۶ (۲) بیستان الحدیثین ص ۸۵ (۳) الرسالة المستطرفہ ص ۲۳ (۴) تدریب

الراوی ص ۳۲ (۵) الرسالة المستطرفہ ص ۲۳۔



## امام ابو عبد الرحمن نسائیؒ

(متوفی ۳۰۳ھ)

نام و نسب: احمد نام اور ابو عبد الرحمن کنیت تھی، سلسلہ نسب یہ ہے: احمد بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار۔ (۱)

پیدائش: عام مؤرخین کے بیان کے مطابق امام نسائیؒ ۲۱۴ھ یا ۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے لیکن بعض نے سنہ پیدائش ۲۲۵ھ لکھا ہے (۲) جو صحیح نہیں ہے۔

وطن: امام نسائیؒ نے بعد میں مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی لیکن ان کی پیدائش اور نشوونما خراسان کے مشہور شہر نساء میں ہوئی، (۳) قدیم زمانہ میں نساء علم و فن اور ارباب کمال کا مرکز رہ چکا ہے اور اس کی خاک سے بہت سے نامور علما و فضلا پیدا ہوئے، اسی کی نسبت سے وہ نسائی کہلاتے ہیں، نسوی سے بھی اسی کی جانب نسبت ہے، مگر وہ زیادہ مشہور نہیں، نساء خراسان میں ہے، اس لیے امام صاحب کو خراسانی بھی کہا جاتا ہے۔ (۴)

اساتذہ اور شیوخ: امام نسائیؒ کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، بعض مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابو یزید جرمی، احمد بن عبدہ، اسحاق بن راہویہ، حسین بن منصور، حمید بن سعدہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۲ و تہذیب الجہد ج ۱ ص ۳۲ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۳ (۲)

حسن المحاضرہ سیوطی ج ۱ ص ۱۴۷ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۳۰ (۳) کتاب الانساب ورق ۵۵۹ (۴)

ایضاً ووفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۶۔

سوید بن منصور، ابوالحسن علی بن حجر بن ایاس، علی بن حشرم، عمران بن موسیٰ، عمرو بن زرارہ عیسیٰ بن حماد، ابور جاتیہ بن سعید ثعلبی، مجاہد بن موسیٰ، محمد بن بشار، محمد بن رافع، ابوکریب محمد بن علاء، محمد بن نصر مروزی، ہشام بن عمار اور یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ افاضل اور اساطین حدیث سے احادیث نبوی کا سماع کیا اور احمد بن نصر نیشاپوری اور ابوشعبہ سوسی سے فن قرأت کی تحصیل کی۔

ائمہ صحاح میں امام بخاری اور امام ابوداؤد سے بھی ان کو شرف تلمذ حاصل ہے، (۱)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کے ناموں کا استقصا دشوار ہے، بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن محمد بن صالح، ابوبشر دولابی، ابوعلی حسین محمد نیشاپوری، ابوالقاسم طبرانی، ابوالقاسم حمزہ بن محمد کتھانی، ابوعلی حسن بن خضر سیوطی، ابوبکر احمد بن اسحاق السنی، محمد بن معاویہ، حسن بن رشیق، ابوالحسن محمد بن عبداللہ حیویہ، محمد بن قاسم اندلسی، ابوبکر احمد بن محمد، ابوعوانہ، ابوجعفر طحاوی، ابوبکر احمد بن حداد، ابوجعفر عقیلی، ابوعلی محمد بن ہارون اور آپ کے صاحبزادے عبدالکریم وغیرہ، ان میں سے اکثر حضرات نے آپ کی کتاب سنن کی روایت کی ہے۔ (۲)

تعلیم و تحصیل حدیث کے لیے سفر: امام نسائی کی ابتدائی تعلیم کے حالات نہیں ملے، مگر اتنا معلوم ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق انھوں نے مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا تھا، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ”دور دراز شہروں میں جا کر سماع حدیث میں مصروف رہے اور ان ائمہ فن اور مشائخ کبار سے ملے جن سے بالمشافہ انھوں نے روایت کی ہے۔“ علامہ بیوطی کا بیان ہے کہ ”رجال فی البلاد“ یعنی مختلف ملکوں کا سفر کیا، تذکرہ طبقات کی کتابوں

۱. طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۵۳ و تہذیب المعجم ج ۱ ص ۳۷ و الخط ص ۱۲۷ (۲) تہذیب المعجم

۱. اس و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۴۔

میں ان کے حجاز، عراق، مصر، شام، جزائر اور خراسان جانے اور وہاں کے ائمہ کمال سے استفادہ کرنے کی تصریح ملتی ہے، امام صاحب کا خود بیان ہے کہ ”وہ پندرہ سال کی عمر میں قتیہ کی خدمت میں حدیث سیکھنے کی غرض سے بغداد گئے اور ایک سال دو ماہ تک وہاں قیام کیا۔“ (۱)

علم حدیث میں امتیاز: علم حدیث کی تاریخ میں تیسری صدی ہجری کا زمانہ بڑی اہمیت اور خاص امتیاز رکھتا ہے، اس زمانہ میں ہر گھر میں علم حدیث کا چرچا تھا اور اسلامی ملکوں کا ہر بڑا شہر اس کا مرکز تھا، اس دور سے زیادہ بڑے محدثین اور کسی دور میں بھی نہیں پیدا ہوئے، امام نسائی بھی اسی دور کمال میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے قدرتی طور پر ان کی توجہ کا مرکز علم حدیث ہی قرار پایا اور اس میں ان کو جو تبحر اور کمال حاصل ہوا وہ ان کے دوسرے معاصرین کے حصہ میں نہیں آیا، امام دارقطنی کا بیان ہے کہ ”امام نسائی اپنے دور کے تمام علمائے حدیث میں یکتا اور سب سے زیادہ افضل و برتر تھے۔“

حفظ و ثقاہت: قدرت نے امام صاحب کو حفظ کی غیر معمولی قوت عطا کی تھی، ابن یونس صاحب تاریخ مصر کا بیان ہے کہ وہ احادیث کے ایک نامور حافظ تھے، علامہ ابن بسکی لکھتے ہیں کہ ”میں نے اپنے استاذ علامہ ذہبی سے دریافت کیا کہ حافظ کے لحاظ سے امام مسلم اور امام نسائی میں کون بڑھا ہوا تھا، انھوں نے نسائی کا نام لیا، میں نے اپنے والد سے اس کو بیان کیا تو انھوں نے بھی اس کی تائید کی، سیوطی نے الحافظ، احد الحفاظ المستقنین کے القاب سے ان کا ذکر کیا ہے، ان کی ثقاہت و اتقان پر بھی اتفاق ہے، ابن یونس کہتے ہیں ”وہ نہایت ثقہ و ثابت تھے“ (۲)

جرح و تعدیل: وہ فن جرح و تعدیل کے بھی ماہر تھے، ان کا شمار مشہور نقادان حدیث میں

(۱) تہذیب ج ۱ ص ۳۷ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۴ و البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۲۳ و حسن المحاضرہ ج ۱

ص ۱۲۷ (۲) ایضاً۔

ہے، اس لحاظ سے بعض محدثین نے ان کو امام بخاری و امام مسلم سے بھی فائق قرار دیا ہے، حافظ حدیث ابوعلی کا بیان ہے ”رجال کے باب میں امام نسائی کے شرائط امام مسلم سے بھی زیادہ سخت تھے“ ابن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ ”میں نے سعد بن علی زنجانی سے ایک شخص کے متعلق استفسار کیا تو انھوں نے اس کی توثیق کی، میں نے کہا امام نسائی تو تضعیف کرتے ہیں، یہ سن کر انھوں نے کہا ”صاحبزادے ابو عبد الرحمن کی رجال کے بارے میں امام بخاری اور امام مسلم سے بھی زیادہ سخت شرطیں ہیں، احادیث کے سقم و صحت میں ان کی بصیرت و معرفت کے بارے میں دارقطنی اور حاکم کی رائے یہ ہے کہ ”وہ اپنے معاصرین میں صحیح و سقیم روایات و آثار اور رجال کی معرفت و تمیز میں سب سے زیادہ واقف کار تھے“ ابو بکر حداد کثیر الحدیث ہونے کے باوجود امام نسائی کے علاوہ اور کسی سے روایت نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ میرے اور خدا کے درمیان حجت ہیں، مامون مصری کا بیان ہے کہ ”جب ہم طرسوس آئے اور حفاظ حدیث کی خدمت میں حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان سب نے امام نسائی کے انتخاب کے مطابق حدیثیں لکھی ہیں۔“ (۱)

فقہ و تفسیر: امام نسائی کا اصلی فن علم حدیث ہے لیکن دوسرے علوم دینیہ میں بھی ان کو درک تھا، قرأت و تفسیر میں ان کو پوری دستگاہ حاصل تھی اور فقہ و فقہی احکام کے استنباط میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا، امام دارقطنی اور حاکم صاحب مستدرک کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں مصر کے سب سے بڑے فقیہ تھے، ابن یونس اور دوسرے علما نے بھی ان کے فقیہ و مجتہد ہونے کا اعتراف کیا ہے، ان کی سنن سے بھی ان کے اس کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

عہدہ قضا: فقہ و اجتہاد میں ان کے کمال کی بنا پر حمص کے قضا و لایت کا منصب ان کو تفویض کیا گیا تھا۔

(۱) تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۸ و البدیۃ ج ۱ ص ۱۲۳ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۲ (۲) بستان الحدیث ص ۱۱۱

زہد و تقویٰ اور عبادت: امام نسائی کی عملی زندگی بھی نہایت پاکیزہ تھی، ان کا دل خشیت الہی سے لبریز قلب ذکر الہی سے معمور اور دماغ فکر عقبی میں مصروف رہتا تھا، وہ بڑے عبادت گذار، قبیح سنت اور صاحب ورع و تقویٰ تھے، رد بدعات و احیاء سنت ان کا خاص مشن اور نصب العین تھا، رات و دن کا بڑا حصہ خدا کی عبادت اور ذکر و فکر میں گذرتا تھا، تہجد کے پابند تھے، صوم داؤدی کے مطابق ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے، حج بھی اکثر کرتے تھے، جہاد کا ولولہ بھی تھا، ایک مرتبہ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں نکلے تو اتنی شجاعت و بہادری دکھائی کہ لوگوں کو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ (۱)

اخلاقی کمالات: صبر و رضا، ضبط و تحمل، شجاعت و بہادری اور عزم و استقلال وغیرہ اخلاقی فضائل سے بھی آراستہ تھے، طبیعت میں بڑا استغنا اور بے نیازی تھی، کبھی عزت نفس کا سودا نہیں کیا، امیر مصر کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے لیکن اس کی مجلس اور ہمنشینی سے ہمیشہ دور رہے، ایک مرتبہ اہل شام نے ان سے امیر معاویہؓ کے فضائل بیان کرنے کا مطالبہ کیا، انھوں نے انکار کر دیا، ان کے انکار پر ان کو بے دردی کے ساتھ پیٹا گیا، انھوں نے اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا، مگر ان کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا، احمد بن نصر کا بیان ہے کہ ”امام نسائی کی طرح کون صبر کر سکتا ہے، حالانکہ ان کے پاس امیر معاویہؓ کی فضیلت میں ابن لہیعہ کی حدیث موجود تھی لیکن انھوں نے اس کو نہیں بیان کیا، کیوں کہ وہ ابن لہیعہ کو ضعیف سمجھتے تھے۔“ (۲)

امامت و تقدم: ان کمالات کی بنا پر دوسرے اصحاب علم و کمال آپ کو مسلمانوں کا امام و مقتدا مانتے تھے، ابن عدی کا بیان ہے کہ میں نے منصور فقیہ اور احمد بن محمد طحاوی کی زبانی سنا کہ ”وہ مسلمانوں کے اماموں میں سے ایک ہیں“ حافظ ابوالحسین محمد بن مظفر فرماتے ہیں کہ ”میرے کانوں نے اپنے مصری اساتذہ کی زبان سے امام نسائی کے فضل و مرتبت اور امامت

(۱) تہذیب ج ۱ ص ۳۸ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸ و البدایہ ج ۱ ص ۱۲۳ (۲) ایضاً۔

تذکرہ الحمدین ..... گلستان حدیث کے مہکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

388

وتقدم کا اعتراف کرتے ہوئے سنا“ محمد بن سعد باوردی فرماتے ہیں کہ ”وہ مسلمانوں کے اماموں میں تھے، میں نے چار ائمہ حدیث دیکھے، ان میں سے ایک مصر کے امام نسائی بھی تھے۔“ (۱)

**فقہی مذہب:** علامہ ابن سبکی نے طبقات شافعیہ میں ان کا ذکر کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب اور نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی ان کو شافعی بتایا ہے لیکن بعض حنا بلہ نے ان کو حنبلی قرار دیا ہے، ہمارے خیال میں وہ کسی خاص فقہی مسلک کے پابند نہ تھے، بلکہ وہ خود فقہیہ و مجتہد تھے اور جزئیات مسائل میں محدثین کی طرح ظواہر احادیث کے مطابق عمل کرتے تھے اور جن ائمہ کے مسلک کو کتاب و سنت سے زیادہ قریب پاتے تھے اسی کی تائید فرماتے تھے۔

**عقیدہ:** امام نسائی اعتقاد میں اہل سنت والجماعت کے ہمنوا تھے لیکن ان پر شیعیت کا الزام لگایا جاتا ہے، عام مورخین اور اصحاب سیر نے اس الزام کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، اس کی شہرت غالباً ابن خلکان کے ایک بیان سے ہوئی ہے بعض دوسرے مورخین نے بھی ابن خلکان ہی کی روایت کو ماخذ بنایا ہے، اس لیے ان کے بیان کا جائزہ لیا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

|                         |                                            |
|-------------------------|--------------------------------------------|
| قال محمد بن اسحاق       | محمد بن اسحاق اصہبانی فرماتے ہیں کہ        |
| الاصبہانی سمعت مشائخنا  | میں نے مصر میں اپنے استادوں سے             |
| بمصر یذکرون ان ابا      | سنا کہ ابو عبدالرحمن نسائی آخر عمر میں مصر |
| عبدالرحمن فاروق مصر فی  | چھوڑ کر دمشق چلے گئے وہاں ان سے            |
| آخر عمرہ وخرج الی دمشق  | حضرت معاویہؓ اور ان کے فضائل کے            |
| فسئل عن معاویة وماروی   | متعلق روایات کے بارے میں پوچھا             |
| فی فضائلہ فقال اما یرضی | گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ کیا            |

(۱) تہذیب ج ۱ ص ۳۸ و تذکرہ ج ۲ ص ۳۶۸ والبدایہ ج ۱ ص ۱۲۳۔

معاویہ ان یخرج رأساً برأس  
 حتى یفضل وفى رواية  
 اخرى ما عرف له فضيلة الا  
 لاشبع الله بطنه وكان  
 يتشيع فما زالوا يدفعون فى  
 حصنه حتى اخرجوه من  
 المسجد وفى رواية اخرى  
 يدفعون فى خصيه. (۱)

معاویہؓ کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ  
 سر بر سر نجات پا جائیں، ان کے فضائل  
 کہاں ہیں جو بیان کیے جائیں، ایک  
 دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے  
 جواب دیا کہ میں ان کی کوئی فضیلت  
 اس کے علاوہ نہیں جانتا کہ ”اللہ اس کو  
 شکم میر نہ کرے، ان میں شیعیت تھی  
 لوگوں نے یہ جواب سن کر ان کی کمر اور  
 کونڈھ میں مارنا شروع کیا اور مسجد سے  
 نکال دیا، دوسری روایت میں ہے کہ  
 ان کے خصیتین میں مارنا شروع کیا تھا،

اس روایت کی صحت محل نظر ہے، متقدمین علماء میں سے کسی نے اس کو قابل اعتنا  
 نہیں سمجھا ہے اور نہ اس کی سند مسلسل ہے، ابن خلکان اور امام نسائی کے درمیان کئی صدیوں کا  
 فرق ہے، امام نسائی کا انتقال ۳۰۳ھ میں ہوا ہے اور ابن خلکان کا ۶۸۱ھ یعنی دونوں کے  
 درمیان تقریباً چار صدیوں کا فرق ہے، ایسی حالت میں امام نسائی کے بارے میں ابن خلکان  
 کی روایت بغیر کسی سند کے کیسے قبول کی جاسکتی ہے، اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے  
 صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ امام نسائی حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق اچھی رائے نہیں  
 رکھتے تھے، یا ان کو ان کے فضائل کی روایات کا علم نہ تھا اور حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت  
 امیر معاویہؓ کے فضائل کا انکار شیعیت نہیں ہے، بہت سے اکابر کا یہ مسلک رہا ہے، پھر ابن  
 خلکان نے تکان شیعیا نہیں بلکہ تکان یتشیع لکھا ہے، یعنی ان میں شیعیت کا اثر تھا۔

اس روایت کی صحت کی صورت میں واقعہ کی شکل یہ معلوم ہوتی ہے کہ شام بنی امیہ کا مرکز حکومت رہ چکا تھا اور وہ حضرت امیر معاویہؓ کا سب سے سنگین قلعہ تھا، یہاں کے تمام قبائل حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ان کے حامی و مداح تھے، اس لیے بنی امیہ کی حکومت مٹنے کے بعد بھی مدتوں یہ اثر قائم رہا اور حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلافات کی صدائے بازگشت یہاں صدیوں گونجتی رہی، امام نسائی کے زمانہ میں بھی یہی صورت حال رہی ہوگی، جیسا کہ خود اہل شام کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے، اس لیے امام موصوف نے اس کی اصلاح اور حضرت علیؓ سے شامیوں کا سوہن دور کرنے کے لیے یہ جواب دیا ہوگا مگر اہل شام کے دل و دماغ پر حضرت امیر معاویہؓ کا اتنا اثر تھا کہ وہ آمادہ پیکار ہو گئے اور امام صاحب کی توہین میں بھی باک نہیں کیا اور ان پر شیعیت کا الزام لگا دیا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

”امام نسائی کی موت کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ حضرت علیؓ کے مناقب لکھ کر فارغ ہوئے تو چاہا کہ جامع دمشق میں لوگوں کے سامنے اس کتاب کو بیان کریں تاکہ وہاں کے لوگ جو بنی امیہ کی مدت مدید تک شام میں سلطنت کے باعث نواصب کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے ہیں، ہدایت یافتہ ہو جائیں، اس کتاب کا تھوڑا ہی حصہ بیان کیا تھا کہ ایک شخص نے پوچھا کہ امیر المؤمنین معاویہؓ کے فضائل بھی آپ نے کچھ تحریر کیا ہے، امام نسائی نے کہا معاویہؓ کے لیے تو اتنا بس ہے کہ انھیں سر بسر نجات مل جائے، ان کے فضائل ہی کہاں ہیں بعض کہتے ہیں کہ آپ نے یہ بات بھی فرمائی تھی کہ میرے نزدیک ان کے مناقب میں کوئی صحیح روایت ثابت نہیں سوائے الا لاشیع اللہ بطنہ کے (یہیں سے) عوام الناس نے ان پر تشیع کا الزام جزدیا..... اور چند ضرر ہیں ان کے خصیتیں میں لگیں جن کی وجہ سے وہ نیم جان ہو گئے۔“ (۱)



ابن کثیر کا طرز بیان اس سے کسی قدر مختلف ہے، مگر ان کا دار و مدار بھی ابن خلکان ہی کی روایت پر ہے، لکھتے ہیں:

وقد قيل عنه: انه كان ينسب ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان  
اليه من التشيع. (۱) کی جانب کچھ شیعیت بھی منسوب ہے

اس کے بعد انھوں نے وہی ابن خلکان والی روایت نقل کی ہے مگر ”قيل“ کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ انتساب والزام ابن کثیر کے نزدیک مشکوک اور مشتبہ ہے، پھر ”كان ينسب اليه“ میں صیغہ مجہول کا استعمال بھی یہی بتاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ راوی کے نزدیک بھی یہ الزام مشتبہ ہے اور ”شئى من التشيع“ سے جس تقلیل کا اظہار ہوتا ہے وہ بھی قابل غور ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر امام نسائی کے شیعہ نہ ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ حضرت علیؑ سے فرط عقیدت کے باوجود دوسرے صحابہؓ کے فضائل و کمالات کے بھی قائل تھے اور مسائل میں ان کے عمل سے استفادہ کرتے تھے، شیعہ سب سے زیادہ شیخین (حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کو مطعون کرتے ہیں مگر امام نسائی ان کے آراء و اقوال سے حجت و استدلال کرتے ہیں، کتاب البیوع میں ابن ابی اوفیٰ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ”ہم رسول اللہ اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے زمانہ میں، گے ہوں، جو اور کھجور کی بیع سلم ان لوگوں سے کرتے تھے، جن کے متعلق ہم کو معلوم نہیں کہ یہ چیزیں ان کے پاس ہوتی تھیں یا نہیں، (۲) ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں ”ابوبکر و عمر نے یہ فیصلہ کیا۔“ (۳) ایک اور مقام پر یہ فرماتے ہیں کہ اس چیز کا ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمان رضی اللہ عنہم نے فیصلہ کیا ہے، (۴) خلفائے راشدین میں اسی ترتیب کے وہ بھی قائل تھے جو اہل سنت و الجماعت کا مسلک ہے، چنانچہ باب امامت اہل العلم والفضل میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ”جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو

(۱) البدایہ ج ۱ ص ۱۲۳ (۲) سنن نسائی ج ۲ ص ۲۶۶ (۳) ایضاً ص ۲۳۲ (۴) ایضاً ص ۲۳۳۔

انصار نے کہا ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم لوگوں (مہاجرین) میں سے، حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ کیا تم لوگوں کو نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ نماز پڑھائیں، ایسی صورت میں کون شخص یہ پسند کرے گا کہ وہ امامت اور خلافت میں ان سے سبقت لے جائے، انھوں نے جواب دیا کہ ہم ابوبکرؓ پر اپنے کو ترجیح دینے سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ (۱)

یہ مثالیں ان کی شیعیت کی تردید کے لیے کافی ہیں، البتہ دو باتیں قابل بحث ہیں، ایک حضرت علیؓ کی محبت و عقیدت میں غلو، دوسرے حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق سخت الفاظ کا استعمال، پہلے کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی محبت میں کوئی ایسا غلو ناپسندیدہ نہیں ہے جو شریعت کے خلاف نہ ہو، بلکہ اہل بیت کی محبت تو جزو ایمان ہے، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک تھا، امام احمدؒ کی حضرت علیؓ سے عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے شیخ ابوزہرہ مصری تحریر فرماتے ہیں:

”اس معاملہ میں ان کا وہی مسلک تھا جو ان کے استاذ امام شافعی کا تھا، امام شافعیؒ حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب میں روایت کرتے تھے اور ان سے بڑی عقیدت و محبت رکھتے تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ کے مقابلہ میں جب تفضیل کا سوال آتا تھا تو وہ حضرت ابوبکرؓ کو سب پر ترجیح دیتے تھے، ان کا قول ہے کہ ”معاملہ ہمارے جذبات کا تابع نہیں ہے۔“ (۲)

امام شافعیؒ ہی کی جانب یہ شعر بھی منسوب ہے:

ان كان رفضا حب آل محمدؐ فليشهد الثقلان اني رافض

(ترجمہ) اگر اہل بیت سے محبت کرنا شیعیت ہے تو جن و انس دونوں گواہ رہیں کہ

میں رافضی ہوں۔

(۱) سنن نسائی ج ۱ ص ۷۹ (۲) احمد بن حنبلؒ ترجمہ رئیس احمد جعفری ص ۲۳۳۔

حضرت امیر معاویہؓ کی شان میں امام نسائی کے الفاظ اور سخت ہیں، وہ بہر حال صحابی ہیں اور ان کے فضائل میں بھی روایتیں ہیں وراگر نہ بھی ہوتیں تو صحابیت کے عموم میں جو روایتیں ہیں ان کے بھی رو سے ان کی فضیلت مسلم ہے لیکن امام نسائی کے قول کی یہ توجیہ ہو سکتی ہے

۱- حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی فضیلت مسلم ہے، ان کو کسی حیثیت سے بھی حضرت علیؓ کے ہم پایہ قرار نہیں دیا جاسکتا، یہ جمہور امت کا متفقہ فیصلہ ہے، امام نسائی نے شام کے لوگوں کو اس کے برخلاف دیکھا، اس لیے جناب امیرؓ کے فضائل و مناقب بیان کرنے میں غلو سے کام لیا، ایسے حالات میں قدرتی طور پر تشدد اور غلو پیدا ہی ہو جاتا ہے، اس سلسلہ میں حضرت معاویہؓ کی شان میں ان سے بعض نامناسب الفاظ بھی نکل گئے۔

۲- امام نسائی کو حضرت علیؓ سے غیر معمولی محبت و عقیدت تھی مگر جب وہ شام گئے تو وہاں ان کے خلاف سوءظن کی عام فضا دیکھ کر ان کے فضائل و مناقب بیان کرنا شروع کر دیتے ہو بنی امیہ کے حامیوں کو ناگوار معلوم ہوئے اور انھوں نے امام نسائی سے امیر معاویہ کے فضائل بیان کرنے کی فرمائش کی، امام صاحب نے یہ سمجھا کہ جناب امیرؓ سے بدگمانی کا اصل سبب حضرت امیر معاویہؓ سے فرط عقیدت اور غیر معمولی شیفتگی ہے اس کو دور کرنے کے لیے انھوں نے ان کی شان میں مذکور بالا باتیں کہہ دیں، جن سے ان کا منشا امیر معاویہؓ کی مذمت نہ تھا بلکہ حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب کا پوری طرح اظہار اور امیر معاویہؓ کے مقابلہ میں ان کی اہمیت و عظمت کا اثبات میں تھا۔

۳- حافظ ابن حجر وغیرہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نسائی کے نزدیک حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں اس لیے انھوں نے لوگوں کے مطالبہ پر بھی ایسی کوئی حدیث نہیں بیان کی مگر جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو ان کو غصہ آ گیا اور ان کی زبان سے بعض سخت الفاظ نکل گئے لیکن غیظ و غضب کی حالت میں جو باتیں منہ

سے نکل جاتی ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

غذا اور لباس: امام نسائی بڑے خوش خوراک و خوش لباس تھے، رنگین اور قیمتی کپڑے پہنتے تھے اور کھانا نہایت پر تکلف کھاتے تھے، مرغ خرید کر پالتے تھے، جب خوب فر بہ ہو جاتے ذبح کراتے روزانہ مرغ کھانے کے بعد نیزہ حلال پیتے تھے، (۱) ان کا رہن سہن نہایت اعلیٰ اور معاشرتی زندگی بڑی پر شکوہ تھی۔

خاندانی وجاہت: امام صاحب کی معاشرت اور رکھ رکھاؤ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک معزز اور صاحب حیثیت گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ابن عماد کا بیان ہے کہ ”وہ نہایت نجیب و شریف، رئیس، خوش وضع اور عظیم المرتبت تھے۔ (۲)

وفات: امام نسائی کو شامیوں کی مار پیٹ سے اتنا صدمہ پہنچا کہ اسی کے اثر سے ۳۰۳ھ میں اٹھاسی سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا، جب ان کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو انھوں نے اپنے اصحاب و رفقا سے خواہش ظاہر کی کہ انھیں مکہ لے چلیں، بعض مورخین کا بیان ہے کہ راستہ میں مرو کے مقام میں ان کی وفات ہو گئی اور وہیں دفن کیے گئے لیکن بعض نے لکھا ہے کہ وفات مکہ میں ہوئی اور صفا و مروہ کے درمیان دفن کیے گئے۔ علامہ ابن کثیر نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ بیت المقدس میں دفن کیے گئے، مہینہ کی تعیین میں اختلاف ہے، بعض نے شعبان اور بعض نے صفر کا مہینہ لکھا ہے۔ (۳)

ازواج و اولاد: ان کے چار بیویاں اور دو لونڈیاں تھیں، (۴) حافظ ابن حجر نے ان کے تلامذہ کے تذکرہ میں ایک صاحبزادے عبدالکریم کا نام بھی تحریر کیا ہے۔

حلیہ: بڑے وجیہ و تکلیل تھے، چہرہ نہایت شاداب اور شمع کی طرح پر نور تھا، بڑھاپے میں بھی جسم اور چہرے کی تروتازگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ (۵)

(۱) تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۷ و البدایہ و النہایہ ج ۱۱ ص ۱۲۳ (۲) شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۳۹ (۳) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۶ و تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۹ و البدایہ ج ۱۱ ص ۱۲۳ (۴) ایضاً (۵) ایضاً۔

**تصنیفات:** امام نسائی کی جن تصنیفات کا علم ہو سکا وہ حسب ذیل ہیں:

۱- خصائص سیدنا علیؑ: اس رسالہ میں حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے ہیں، اس کی تالیف کا مقصد امام صاحب نے خود یہ بیان کیا ہے کہ ”میں جب دمشق آیا تو حضرت علیؑ سے لوگوں کو بیزار پایا، اس لیے یہ رسالہ تالیف کیا تاکہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ لوگوں کو ہدایت سے سرفراز کرے (۱) مگر لوگوں نے بدبختی سے اس کو سخت ناپسند کیا اور امام صاحب کو زد و کوب کر کے مسجد سے نکال دیا۔

۲- منذ علی، ۳- منذ مالک، ۴- کتاب الضعفاء والمترکین، اس میں ضعیف و مترک الحدیث رواۃ کا حروف تجہی کی ترتیب کے مطابق ذکر کیا گیا ہے۔  
یہ رسالہ امام بخاری کی التاریخ الصغیر اور کتاب الضعفاء الصغیر کے ساتھ مطبع انوار احمدی الہ آباد سے ۱۳۲۵ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

۵- کتاب الجمعہ، ۶- کتاب التمییز، ۷- کتاب المدلسین، ۸- فضائل الصحابہؓ۔  
السنن: امام صاحب نے سنن میں دو کتابیں لکھی تھیں، سنن کبریٰ اور سنن صغریٰ، آخر الذکر کتاب زیادہ مشہور اور صحاح ستہ میں شامل ہے اور یہ امام صاحب کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف اور ان کا سب سے بڑا اور اہم علمی و دینی کارنامہ ہے، اس لیے اس کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے۔

سنن صغریٰ کے دوسرے نام الجتبیٰ اور الجتبیٰ بھی ہیں کیونکہ امام صاحب جب سنن کبریٰ کی تالیف کا کام انجام دے چکے تو امیر رملہ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کی پوری کتاب صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے، آپ نے جواب دیا نہیں، امیر نے درخواست کیا کہ آپ میرے لیے اس میں سے اعلیٰ درجہ کی حدیثیں الگ کر دیجئے، اس درخواست پر امام صاحب نے یہ دوسری کتاب لکھی جس کا نام جتبیٰ رکھا اور اب یہی سنن نسائی کے نام سے (۱) بستان الحمدین ص ۱۱۱۔

مشہور ہے۔ (۱)

سنن کبریٰ کے راوی ابن الاحمر ابو بکر محمد بن معاویہ متوفی ۳۵۸ھ اور سنن صغریٰ کے راوی ابن السنی ابو بکر احمد بن محمد ۳۶۴ھ ہیں، علامہ ذہبی نے مجتبیٰ کو امام صاحب کے شاگرد ابن السنی ہی کا اختصار بتایا ہے لیکن خود امام صاحب نے اس کی تردید کی ہے۔

سنن نسائی کی اہمیت: کتب صحاح میں جو مقبولیت صحیحین کو حاصل ہوئی وہ دوسری کتابوں کو نصیب نہیں ہو سکی، اور عام طور پر سنن نسائی کو ابوداؤد اور ترمذی کے بعد جگہ دی گئی ہے، تاہم اس کا نام بھی ان دونوں کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، اس لیے قریب قریب یہ بھی ان کے ہم پایہ ہے اور اس کا صحاح ستہ میں شامل ہونا ہی اس کی اہمیت و عظمت کا ثبوت ہے اور جس طرح صحاح کی ہر کتاب بعض خصوصیات کے لحاظ سے دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے، اسی طرح نسائی کی بھی بعض خصوصیات سے دوسری کتابیں خالی ہیں۔

بعض علمائے فن نے صحیحین کے بعد اسی کا درجہ بتایا ہے، کیوں کہ اس میں سب سے کم ضعیف روایتیں ہیں اور اس کے رجال زیادہ قوی ہیں، قبول روایت کے معاملہ میں امام نسائی کے شرائط کی سختی اس قدر مشہور ہے کہ بعض علما کا خیال ہے کہ ان کے شرائط امام بخاری و امام مسلم سے بھی زیادہ شدید ہیں، (۲) ابوالحسن معافری کا بیان ہے کہ ”اگر عام محدثین اور امام نسائی کی احادیث کا موازنہ کیا جائے تو امام نسائی کی حدیثیں دوسروں کے مرویات کے مقابلہ میں صحت سے زیادہ قریب نظر آئیں گی“ علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ ”بعض مغاربہ کے نزدیک اس کو صحیح بخاری پر فوقیت حاصل ہے“ ابن احمر کا بیان ہے کہ ”اس فن کی جملہ تصنیفات میں سنن نسائی سب سے زیادہ افضل و اشرف ہے اور اسلام میں ایسی بے نظیر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی“ (۳) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ”فن رجال کے ماہرین کی

(۱) بستان الحدیث ص ۱۱۱ (۲) تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۸ و شروط الائمہ السنۃ (۳) مقدمہ زہر الرئی فتح المغنیث

ایک جماعت نے ان کو امام مسلم سے برتر قرار دیا ہے اور امام دارقطنی وغیرہ نے ان کو فن حدیث اور فن رجال میں امام الائمہ ابو بکر بن خزیمہ پر ترجیح دی ہے، ان اقوال کو اگر مبالغہ پر بھی محمول کیا جائے تو ان سے کم از کم اتنا ثابت ہوتا ہے کہ امام نسائی نے ضعیف و متروک اشخاص سے کوئی روایت نہیں لی ہے بلکہ امام بخاری اور امام مسلم کی طرح صحیح الاسناد حدیثیں درج کی ہیں اور اس اعتبار سے ان کی تصنیف ان دونوں بزرگوں کے طریقوں کی جامع ہے، ابو عبد اللہ بن رشید فرماتے ہیں کہ:

وهو جامع بين طريقتي سنن نسائي بخاري و مسلم دونوں کے  
البخاري و مسلم مع حظ كثير طريقتوں کی جامع ہے اور علل حدیث کا  
من بيان العلل۔ (۱) بیان اس پر مستزاد ہے۔

خود امام نسائی سے منقول ہے کہ ”کتاب السنن کا صحیح“ یعنی میری کتاب السنن تمام حدیثوں پر مشتمل ہے، امام صاحب نے اس کی تالیف میں جو اہتمام و احتیاط کی ہے، اس کا اندازہ ابو الحسن احمد بن محبوب ربلی کے اس بیان سے ظاہر ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ”میں نے خود امام صاحب سے سنا کہ وہ فرماتے ہیں جب میں نے سنن کی جمع و تالیف کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے بعض ایسے رواۃ کے متعلق استخارہ کیا جن کے بارے میں مجھ کو تھوڑا تر دقتھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ ان لوگوں سے میں روایت نہ کروں، اس طرح میں نے عالی سندوں کی حدیثیں ذکر کی ہیں“ (۲)

خصوصیات: ۱- سنن نسائی کی سب سے اہم خصوصیت اس کے شرائط ہیں، جن کے متعلق کہا گیا کہ ”ان لابی عبد الرحمن شرطاً اشد من شرط البخاری و مسلم“ یعنی امام نسائی کے شرائط امام بخاری و مسلم سے بھی سخت ہیں اور حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام نسائی نے نہ صرف بعض ان رواۃ کو نظر انداز کر دیا ہے جن سے امام

(۱) مقدمہ زہر الربی (۲) شروط الائمۃ ص ۸۱ و مقدمہ فتح الباری ص ۸۔

ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے بلکہ امام بخاری و مسلم تک کے راویوں کی ایک جماعت سے حدیث کی تخریج میں اجتناب کیا ہے۔

۲- علل حدیث کا بیان امام نسائی کا خاص وصف سمجھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جرح و تعدیل اور نقد و نظر کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا اور روایت کا سقم فوراً ان کی نگاہ کے سامنے آ جاتا تھا، علامہ ذہبی فرماتے ہیں ”امام نسائی حدیث، علل حدیث اور علم الرجال میں امام مسلم، ترمذی اور ابوداؤد سے زیادہ ماہر ہیں اور امام بخاری و ابوزرعہ کے ہمسر ہیں، ابن رشید کا یہ بیان گنڈر چکا ہے کہ سنن نسائی، بخاری و مسلم دونوں کے طریقہ کی جامع ہے، علاوہ ازیں اس میں علل حدیث کے بھی ایک خاص حصہ کا ذکر ہے (۱) رواۃ کے اسماء والقاب و کتیبوں کی تشریح، راوی کے شد و د و تفرد، حذف و اضافہ عدم متابعت، شک، سہو اور غلطی وغیرہ کا ذکر، دور راویوں کے اختلاف و تضاد، عدم سماع و عدم لقا، راویوں کی توثیق و تضعیف، موقوف و مرسل، مسند و مرفوع، صحیح و ضعیف روایات کی نشاندہی، اسناد کی قوت و ضعف، اختلاف و تعدد طرق کا بیان، غریب الفاظ اور مشکل و مبہم چیزوں کی توضیح جس قدر اس کتاب میں پائی جاتی ہے، اس سے دوسری کتابیں خالی ہیں، امام صاحب نے راویوں اور روایات کا موازنہ کر کے صحیح روایات کی بھی نشاندہی کی ہے۔

۳- متعدد فوائد کے پیش نظر ایک ہی روایت کو کئی جگہوں میں ذکر کیا ہے۔

۴- وہ بلند پایہ مجتہد و فقیہ بھی تھے اور ان کی سنن فقہ و اجتہاد اور نظر و استدلال کی حیثیت سے بھی نہایت جامع ہے، اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے، خمس کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ جان لو کہ جو غنیمت کا مال تم کو ملا ہے،

(۱) تذکرۃ الحدیث ج ۲ ص ۲۶۸ و مقدمہ زہر الربی۔



فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ  
وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ  
وَالْمَسَاكِينِ وَإِنَّ السَّبِيلِ الْخ  
اس کا پانچواں حصہ اللہ، رسول،  
قربانداروں، یتیموں، مسکینوں اور  
مسافروں کے لیے ہے۔

(توبہ)

اس آیت میں اللہ کا ذکر ابتدائے کلام کے لیے آیا ہے، کیوں کہ ساری چیزیں تو اللہ ہی کی ہیں، یا خدا نے فی اور خمس میں، اپنی ذات کو اس لیے شریک کیا ہے کہ درحقیقت یہ دونوں بہترین قسم کی کمائی ہیں اور صدقہ کو اپنی طرف اس لیے منسوب نہیں کیا کہ وہ اموال کی ناپاکی اور گندگی کا نام ہے، ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ غنیمت کا کچھ حصہ خانہ کعبہ پر خرچ کیا جائے گا اور اسی حصہ کو اللہ نے اپنا بتایا ہے، نبی کا حصہ امام وقت کی جانب منتقل کیا جائے گا اور وہ اس سے اسلحہ اور جنگی سامان خریدے گا، اس میں سے وہ ان لوگوں کو بھی دے سکتا ہے جن کو مناسب سمجھے مثلاً مسلمانوں کی فائدہ رسانی کے کاموں یا علم دین، فقہ وحدیث اور قرآن وغیرہ کی تحصیل میں صرف کرے گا اور ایک حصہ رسول اللہ کے قربانداروں یعنی بنو ہاشم اور بنو مطلب میں تقسیم کیا جائے گا، خواہ وہ امیر ہوں یا فقیر، ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ کے قربانداروں میں صرف فقرا یعنی یتیموں اور مسافروں وغیرہ ہی کو دیا جائے گا اور یہی قول میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے، واللہ اعلم، بڑے چھوٹے اور مرد و عورت کے درمیان برابر تقسیم کیا جائے گا کیوں کہ حدیث میں اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو کسی سے زیادہ دیا ہو اور اس بارے میں مجھ کو علما کے کسی اختلاف کا بھی علم نہیں ہے، کیوں کہ اگر کوئی شخص کسی کی اولاد کے حق میں اپنے تہائی مال کی وصیت کر دے تو ان میں سے مرد و عورت سب کو برابر حصہ ملے گا، اسی اصول پر ان تمام چیزوں کو قیاس کرنا چاہیے جو کسی کے قربانداروں اور خاندان والوں کے لیے متعین کر دی گئی ہو، الایہ کہ شارح نے اس سلسلہ میں کوئی واضح اور صریح حکم دیا ہو یا اس کی تخصیص کر دی ہو، اسی طرح

مسلمانوں کے تیموں، مسکینوں اور مسافروں کو ایک ایک حصہ دیا جائے گا اور مسکین و مسافر کا حصہ کسی دوسرے کو نہیں دیا جاسکتا، باقی خمس کے چار اور حصوں کو امام المسلمین ان بالغ مسلمانوں میں تقسیم کرے گا جو جنگ میں شریک رہے ہوں۔“ (۱)

امام نسائی نے بعض ابواب کے عنوانات اس طرح قائم کیے ہیں جن سے ان کا تفقہ و استدلال ظاہر ہوتا ہے اور بعض عنوانات سے وہ اپنے مخالف مسلک کی تردید بھی کرتے ہیں، ان کے فقہ و اجتہاد کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی حدیث کو متعدد ابواب میں نقل کر کے اس سے مختلف مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔

۵- ترتیب و تالیف میں حسن و موزونیت کے لحاظ سے بھی سنن کا پایہ بلند ہے، ابن رشید کا بیان ہے کہ ”یہ تمام کتب سنن میں تصنیف و ترتیب کے لحاظ سے زیادہ بہتر اور عمدہ ہے۔“ (۲)

شروح و تعلیقات: سنن نسائی کے ساتھ اُس قدر اعتنا نہیں کیا گیا جس کی وہ مستحق تھی، اس لیے دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کے شروح، حواشی اور تعلیقات کی تعداد کم ہے (۳) ذیل میں ان کے نام درج کیے جاتے ہیں:

شرح ابن ملقن: مشہور مصنف و شارح حدیث علامہ ابن ملقن (م ۸۰۴ھ) نے زوائد النسائی علی الاربعہ کے نام سے سنن نسائی کی شرح لکھی اور اس میں ان حدیثوں سے تعرض کیا جو بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد میں نہیں ہیں۔

زہر الربی: یہ علامہ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی تعلق اور شرح ہے جو نہایت مشہور و معروف ہے، اس میں متن کے مشکل مسائل اور دشوار مقامات کو نہایت خوبی سے حل کیا گیا ہے، ۱۳۱۲ھ میں مصر کے مطبع میمنہ سے سنن اور حاشیہ سندھی کے ساتھ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور غالباً الگ سے بھی چھپی ہے۔

(۱) سنن نسائی کتاب قسم الثی ص ۶۳۸، ۶۳۹ (۲) مقدمہ زہر الربی (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۔

حاشیہ سندھی: محمد بن عبد البہادی سندھی (م ۱۳۳۸ھ) نے جملہ کتب صحاح کی طرح امام نسائی کی سنن کا بھی حاشیہ اور تعلق تحریر کی جو بہت مقبول و متداول ہے، یہ حاشیہ سیوطی کی شرح سے زیادہ جامع اور مفصل ہے، اس میں متن کے ضروری اور اہم مقامات کو حل، اعراب کی تحقیق اور غریب الفاظ و مشکل لغات کی تشریح کی گئی ہے، یہ حاشیہ، سنن اور اس کی شرح زہر الربی کے ساتھ ۱۳۱۲ھ میں مطبع مینہ مصر سے شائع ہوا ہے۔

حافظ ابن کثیر کی تنقید: حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ”نسائی کے بعض رجال مجہول اور مجروح ہیں، ان کے یہاں ضعیف، معلل اور منکر حدیثیں بھی ہیں، (۱) لیکن امام نسائی کی حزم و احتیاط کے بارے میں جو اقوال نقل کیے گئے ہیں، وہ ابن کثیر کی تردید کے لیے کافی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ رجال و احادیث کی تمیز میں امام نسائی کو خاص کمال حاصل تھا، ان کی سختی اور شدت کا یہ حال تھا کہ امام بخاری، امام مسلم، امام مالک اور یحییٰ بن سعید القطان جیسے اکابر محدثین و ائمہ فن کے بعض رواۃ سے نقل و روایت میں بھی انہوں نے احتیاط ملحوظ رکھی ہے، ان کا خود بیان ہے کہ ”سنن کی جمع و تالیف کے سلسلہ میں جن مشائخ کے بارے میں میرے دل میں کچھ شک و تردد ہوا میں نے ان کو ترک کر دیا، عام محدثین کے نزدیک وہ اپنے عدم تساہل اور فرط احتیاط کے لیے نہایت مشہور مانے جاتے ہیں، اس کے باوجود ان کے یہاں ضعیف و منکر روایات کا سرے سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، جب کہ صحاح کی اہم ترین کتابوں کے بارے میں بھی مطلق اور مجرد صحت کے دعویٰ کو بعض علما نے تسلیم نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں ابن کثیر کا الزام اور بھی بے حقیقت ہو جاتا ہے، صحاح کو دوسرے مصنفین کے مقابلہ میں امام نسائی نے التزام صحت اور رجال کے متعلق زیادہ شدت اور احتیاط برتی ہے اور مجموعی حیثیت سے صحیحین کے بعد یہی زیادہ معتبر اور مستند کتاب مانی جاتی ہے، علامہ سیوطی اور شارح سندھی دونوں کا بیان ہے کہ ”فی الجملہ نسائی کی کتاب السنن میں صحیحین کے

(۱) اختصار علوم الحدیث والحدیث ص ۱۰۹ بحوالہ شرح الفیہ بقافی۔

بعد سب سے کم ضعیف روایتیں ہیں اور اس کے رجال بھی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ مجروح نہیں ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب اس اعتراض کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”میرے خیال میں ان کا مقصود سنن کبریٰ سے ہے کیوں کہ سنن صغریٰ میں تو امام نسائی نے صحیح ترین حدیثیں منتخب اور جمع کی ہیں اور ان روایتوں کو ترک کر دیا ہے جن کی سندوں میں کلام کیا گیا ہے چونکہ ابن کثیر سے امام نسائی اور ان کی سنن کی توثیق کے متعلق بھی اقوال منقول ہیں، اس لیے اس توجیہ کے بعد ان کی دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں رہ جاتا، حقیقت یہ ہے کہ صحاح ستہ میں صحیحین کے بعد صحت میں سب سے اہم اور مقدم امام نسائی کی سنن ہے۔“ (۱)



## امام ابو یعلیٰ موصلیؒ

(متوفی ۳۰۷ھ)

نام و نسب: احمد نام، ابو یعلیٰ کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن علی بن شئی بن یحییٰ بن عیسیٰ بن ہلال۔

ولادت، خاندان و وطن: مشہور روایت کے مطابق وہ ۲۰۷ھ میں اپنے وطن موصل میں پیدا ہوئے، حافظ ذہبی نے شوال ۲۱۰ھ کی روایت کی ہے، ان کا خاندانی تعلق قبیلہ بنی تمیم سے تھا، اس لیے تمیمی کہلاتے ہیں، ان کا وطن موصل، دجلہ و فرات کا درمیانی علاقہ جزیرہ تھا۔ (۱)  
اساتذہ: امام ابو یعلیٰ کے چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن حاتم طویل، احمد بن حنبل، شیبان بن فروخ، علی بن جعد، غسان بن لیث، محمد بن منہال ضریر یحییٰ حمانی اور یحییٰ بن معین وغیرہ۔  
تلامذہ: ان کے بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابن حبان، ابوبکر اسماعیلی، ابوبکر بن مقرئ، ابو حاتم، ابو علی نیشاپوری، ابو عمرو بن حمدان، حمزہ بن محمد کتانی، محمد بن نصر نخاس اور نصر بن احمد مرجی۔  
طلب علم کے لیے سفر: پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے طلب حدیث کے لیے سفر کیا اور قیاس ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق مختلف مراکز حدیث کے ارباب کمال سے استفادہ کیا ہوگا۔

(۱) کتاب الانساب ورق ۵۳۵ و تذکرۃ الصحاظ ج ۲ ص ۲۷۶ و معجم البلدان ج ۸ ص ۱۹۸۔

حفظ وثقاہت: حافظ ابو یعلیٰ مشہور حفاظ حدیث اور نامور محدثین اسلام میں شمار کیے جاتے ہیں، اپنے غیر معمولی حافظہ کی بنا پر، الحافظ اور الحافظ المشہور کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، ان کی عدالت وثقاہت میں بھی کوئی کلام نہیں کیا گیا ہے، حافظ ذہبی اور ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں ”وہ ثقہ و متقن تھے“ ابن حبان نے ان کو ائمہ ثقات میں ذکر کیا ہے، حاکم کا بیان ہے کہ ”وہ ثقہ و مامون تھے“ ابو یعلیٰ ان کے اتقان اور حفظ احادیث کے بڑے مداح و معترف تھے اور فرماتے تھے کہ ”ان سے بہت کم حدیثیں مخفی تھیں“ علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں ”وہ اپنے مرویات میں ثقہ و عادل اور احادیث میں حافظ و ضابط تھے۔“ (۱)

زہد و اتقاہ: امام ابو یعلیٰ تدین و تقویٰ میں عالی مرتبہ اور فضائل اخلاق سے آراستہ تھے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ”وہ صدق و دیانت، امانت، حلم، تقویٰ اور دوسرے تمام عمدہ اوصاف و کمالات کے جامع تھے“ ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ تدین و اتقان سے متصف تھے، حافظ ابن کثیر نے ان کو صاحب خیر اور صاحب شذرات نے صاحب صلاح بتایا ہے۔ (۲)

اخلاص: وہ زیادہ نمود کو برا سمجھتے تھے، ہر کام خالصۃً لوجہ اللہ کرتے تھے، مورخین کا بیان ہے کہ وہ تصنیف و تالیف، تعلیم حدیث اور تحصیل علوم میں محض حسبہ اللہ اور اخلاص کی بنا پر مشغول ہوئے تھے، ایک مرتبہ ابو عمر حیرمی نے ان کو حسن بن سفیان پر ترجیح دی، ایک شخص نے کہا یہ غلط ہے، حسن کی مسند ضخیم اور ان کے شیوخ اعلیٰ ہیں، حیرمی نے جواب دیا کہ ابو یعلیٰ حسبہ اللہ حدیث بیان کرتے تھے اور حسن کا یہ پیشہ تھا۔ (۳)

شہرت و مقبولیت: امام ابو یعلیٰ کو اپنے حسن نیت اور اخلاص کی برکت کی وجہ سے بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، ان کی ذات عوام و خواص کی عقیدت کا مرکز بن گئی، ان کے انتقال کے دن موصل کے بازار بند ہو گئے تھے اور لوگوں کا جم غفیر ان کے جنازہ میں شریک تھا۔

(۱) المعراج ص ۲۷۵ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۵۰ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۵ و البدایہ و النہایہ ج ۱۱

ص ۱۳۰ (۲) ایضاً (۳) بستان المحدثین ص ۳۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۵۔

**وفات:** تقریباً سو سال کی عمر میں ۳۰۷ھ میں اپنے وطن موصل میں انتقال کیا۔ (۱)

**تصنیفات:** امام ابو یعلیٰ صاحب تصنیف تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ عمدہ اور بہتر تصنیفات کے مالک تھے لیکن ان کی تین ہی کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں:

مجم: شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں ”انھوں نے ترتیب شیوخ پر ایک کتاب

لکھی تھی۔ (۲)

مسند کبیر و مسند صغیر: حافظ ابو یعلیٰ نے دو مسندیں لکھی تھیں، ایک کبیر، دوسری صغیر، مشہور مسند صغیر ہے جو ۳۶، اجزا پر مشتمل ہے، اس کو ترتیب ابواب کے لحاظ سے جامع بھی کہا جا سکتا ہے، (۳) یہ حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں سمجھی جاتی ہے، اس میں ثلاثی حدیثیں بھی ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں شامل کیا ہے، حافظ اسماعیل تمیمی فرماتے ہیں کہ میں نے کئی مسانید، مسند عدنی اور مسند ابن مند و غیرہ پڑھیں، ان کی حیثیت نہروں کی ہے اور مسند ابی یعلیٰ بحر خار کی طرح تمام نہروں کا سنگم ہے۔“ (۴)

اس کی اہمیت کی وجہ سے علمائے فن نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، حافظ ابن کثیر نے جامع المسانید و السنن میں اور محمد بن سلیمان (۱۰۹۳ھ) نے جمع الفوائد من جامع الاصول و مجمع الزوائد میں اس کی حدیثیں درج کی ہیں، نور الدین بیہقی نے اس کے زوائد مرتب کیے اور حافظ ابن حجر نے اتحاف المہرہ میں اور شہاب الدین بوسیری نے اطراف المسانید العشرۃ میں اس کے مرویات نقل کیے ہیں۔ (۵)

مسند ابی یعلیٰ کے قلمی نسخے حیدرآباد کے دائرۃ المعارف العثمانیہ اور کتب خانہ

آصفیہ کے علاوہ مکتبہ سندھیہ اور جرمنی کے کتب خانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ (۶)

(۱) بیان الحمدین ص ۳۵ (۲) ایضاً (۳) اِنْبَاءُ الرِّسَالَةِ الْمَسْطُورَةِ ص ۶۱ (۴) حِجَّةُ اللّٰهِ بِالْبَدْعِ ص ۱۰۷

وَتَذْكَرَةُ الْخِلَافَةِ ص ۲۶ (۵) مَقْدَمَةُ تَحْقِيقِ الْاِحْوَاذِ ص ۱۳۰ و الرِّسَالَةُ الْمَسْطُورَةُ ص ۱۳۳ و ۱۳۴

(۶) تَذْكَرَةُ النُّوَارِ ص ۳۹ و فہرست کتب خانہ آصفیہ ص ۶۷، ۶۷، ۶۷۔

# امام ابن خزمیہ

(متوفی ۳۱۱ھ)

نام و نسب: محمد نام، ابو بکر کنیت، شیخ الاسلام لقب اور نسب نامہ یہ ہے: محمد اسحاق بن خزمیہ بن مغیرہ بن صالح بن بکر۔

ولادت، خاندان و وطن: ماہ صفر ۲۲۳ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے، بھتر بن مزاحم سے ولادت کا تعلق تھا۔ (۱)

اساتذہ: شیوخ و اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابو قدامہ سرحسی، ابو بکر ریب، احمد بن منیع، اسحاق بن موسیٰ اعظمی، بشر بن معاذ عقدی، عبد الجبار بن علاء، عتبہ بن عبد اللہ محمدی، علی بن حجر، علی بن خشرم، محمد بن ابان مستملی، محمد بن اسلم زاہد، محمد بن حرب، محمد بن مہران، محمود بن غیاث، نصر بن علی جہضمی، یونس بن عبد الاعلیٰ۔

اسحاق بن راہویہ اور محمد بن حمید رازی سے بھی ان کو ملاقات اور سماع کا شرف حاصل ہوا، مگر اس وقت کم سن تھے، اس لیے احتیاط کی بنا پر ان بزرگوں سے حدیثیں نہیں بیان کرتے تھے۔ (۲)

تلامذہ: جن لوگوں سے ان کی روایات کا زیادہ حصہ منقول ہے، ان کے نام یہ ہیں:

ابو بکر احمد بن مہران مقری، ابو حامد احمد بن محمد بن مالویہ، ابو علی نیشاپوری،

(۱) المختصر، ابن جوزی ج ۶ ص ۱۸۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۸۷ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۰۔



ابوعمر و بن حمدان اسحاق بن سعید نسوی، محمد بن بصیر اور پوتے محمد بن فضل۔

ان کے تلامذہ میں ابراہیم بن ابی طالب اور ابو عمرو احمد بن مبارک مستملی بھی

تھے، جو عمر میں ان سے بڑے تھے۔ (۱)

رحلت و سفر: علم و فن کی تحصیل اور حدیث و فقہ کی تکمیل کے لیے انھوں نے مختلف مقامات کے سفر کیے، بچپن میں اپنے وطن کے علاوہ مشائخ سے استفادہ کیا، اس کے بعد رے، بغداد، بصرہ، کوفہ، شام، حجاز، عراق، مصر اور واسط وغیرہ تشریف لے گئے۔ (۲)

حفظ و ثقافت: علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ حدیثوں کے اسناد و متون کا ان سے بہتر کوئی حافظ میں نے نہیں دیکھا، ابو احمد دارمی نے خود ابن خزیمہ سے ان کے حافظہ کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ”میں جس چیز کو تحریر کرتا ہوں وہ مجھے زبانی یاد ہو جاتی ہے“ ابو علی نیشاپوری فرماتے ہیں کہ جس طرح قرآن کو قرآن کی سورتیں زبانی یاد ہوتی ہیں اسی طرح ابن خزیمہ کو فقہیات حدیث زبانی یاد ہیں، امام دارقطنی وغیرہ نے ان کو ثقہ و ثابت بھی قرار دیا ہے، ابن حبان فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر احادیث و سنن کے صحیح الفاظ اور زیادات کی یادداشت رکھنے والا ان کے مانند کوئی اور شخص نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنن و احادیث کا تمام ذخیرہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ (۳)

حدیث میں درجہ و مرتبہ: ابن خزیمہ کا شمار اکابر محدثین اور نامور ائمہ فن میں ہوتا ہے، احادیث پر ان کی نظر نہایت وسیع اور گہری تھی، وہ کم سن ہی میں امام اور حافظ حدیث کی حیثیت سے مشہور ہو گئے تھے، ایک دفعہ امام شافعیؒ کے نامور شاگرد اور فقہ شافعی کے جامع و مدون امام مزنی سے ایک عراقی شخص نے دریافت کیا کہ جب قرآن مجید نے نقل کی صرف دو ہی صورتیں بیان کی ہیں، عمد و خطا، تو آپ لوگ تیسری قسم شبہ عمد کو کس طرح مانتے ہیں،

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۸۷ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۰ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۳۹ و طبقات

الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۸۹ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱ و ۱۳۲۔

انہوں نے جواب میں ایک حدیث پیش کی، اس نے کہا کہ آپ علی بن زید بن جدعان کی روایت سے استدلال کرتے ہیں، یہ سن کر مزنی خاموش ہو گئے اور ابن خزیمہ نے جواب کہ شبہ عمد کی روایتیں دوسرے طرق سے بھی مروی ہیں، عراقی نے کہا اور کس کے واسطے سے مروی ہیں، امام ابن خزیمہ نے فرمایا ایوب سختیانی اور خالد حزا سے، اس نے ایک راوی عقبہ بن اولیس کے متعلق شک و تردد کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ ایک بصری شیخ ہیں اور ابن سیرین جیسے حلیل القدر بزرگ نے بھی ان سے روایت کی ہے، معترض نے امام مزنی سے عرض کیا کہ آپ مناظرہ کر رہے ہیں یا یہ؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ احادیث کے بارے میں مجھ سے زیادہ واقف کار ہیں، اس لیے جب حدیثوں پر گفتگو ہوتی ہے تو میں خاموش رہتا ہوں اور یہ بحث و مناظرہ میں حصہ لیتے ہیں۔ (۱)

امام ابن خزیمہ مسائل و فتاویٰ کا جواب بھی احادیث کی روشنی میں دیتے تھے، امیر اسماعیل بن احمد نے ایک مرتبہ فی وغنیمت کا فرق دریافت کیا تو انہوں نے سورہ انفال کی آیت **وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ الْخِ** پڑھنے کے بعد چند حدیثیں بیان کیں، پھر سورہ حشر کی آیت **مَا آفَاءَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِهِ الْخِ** پڑھ کر احادیث سے مسئلہ کی وضاحت کی، ابو زکریا یحییٰ بن محمد کا بیان ہے کہ اس موقع پر انہوں نے تقریباً ۱۷ حدیثیں بیان کی ہوں گی۔ (۲)

احادیث سے استنباط مسائل میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا، ابن سرتج کا بیان ہے کہ وہ بڑی چھان بین اور محنت سے احادیث کے نکات و مطالب کا استخراج کرتے تھے۔ (۳)

حدیث کی نقل و روایت میں ان کے فضل و امتیاز کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ **وكان مبرز في علم الحديث** یعنی وہ علم حدیث میں بہت

(۱) طبقات الفقہاء لابن اسحاق شیرازی ص ۸۷ (۲) طبقات الشافعیہ ص ۲۲ (۳) ایضاً ص ۱۳۲ و طبقات الفقہاء شیرازی ص ۸۷۔

ممتاز اور نہایت فاضل تھے۔ (۱)

انہوں نے سنن کی اشاعت و احیا کا مقدس فرض بھی انجام دیا، ایک مرتبہ ان کے ایک پڑوسی نے خواب دیکھا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شبیہ مبارک کو ہتھقل کر رہے ہیں، معمرین نے بتایا کہ ابن خزیمہ احیاء سنت اور اشاعت حدیث کا کام انجام دیں گے۔ (۲)

فقہ و اجتہاد: فقہ میں بھی ان کا درجہ نہایت بلند تھا، بویطی اور مزنی جیسے اساتذہ وقت سے اس کی تحصیل کی تھی لیکن فقہ کے عام مذاہب میں سے وہ کسی خاص مذہب سے وابستہ نہیں تھے بلکہ ان کا شمار مجتہدین مطلق میں ہوتا ہے، علامہ ابن سبکی نے ان کو المجتہد المطلق اور علامہ ابن کثیر نے وہومن المجتہدین فی دین الاسلام لکھا ہے، ان کا خود بیان ہے کہ سولہ سال کی عمر کے بعد میں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔

ابوزکریا یحییٰ بن محمد عنبری فرماتے ہیں کہ میں نے ابن خزیمہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح فرمان کی موجودگی میں کسی شخص کی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، (۳) بعض علما کا خیال ہے کہ وہ خود صاحب مذہب اور مستقل امام فقہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے فتاویٰ بھی ایک زمانہ میں بعض اسلامی ملکوں میں رائج تھے، ان کے بعض فقہی مسائل کتابوں میں ملتے ہیں مثلاً۔

وہ رفع یدین کو نماز کا اہم اور ضروری رکن سمجھتے تھے، صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والے کے لیے اعادہ لازمی سمجھتے تھے۔

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں کہ ”محمد بن اسحاق امام الائمہ کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، ان کے تبعین ان کے مذہب کی پیروی کرتے تھے، وہ مقلد کے بجائے خود امام مستقل اور صاحب مذہب تھے، بیہقی نے یحییٰ بن محمد عنبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اصحاب

(۱) ج ۶ ص ۱۸۲ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۹۴ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۳ (۳) ایضاً البدایہ ج ۱۱

ص ۱۳۹ و طبقات الفقہاء شیرازی ص ۸۷۔

حدیث کے پانچ طبقے ہیں، ۱- مالکیہ، ۲- شافعیہ، ۳- حنبلیہ، ۴- راہویہ اور ۵- خزیمیہ۔ (۱)

کلام و عقائد کے بعض مسائل: بدعات کو سخت ناپسند کرتے تھے اور عام محدثین کی طرح کلام و عقائد کے غیر ضروری مسائل میں بحث و تدریق احتیاط و تقویٰ کے منافی خیال کرتے تھے، اپنے تلامذہ اور متسبین کو سخت تاکید کر دی تھی کہ اس قسم کے مسائل میں پڑنے سے پرہیز کریں، بعض تلامذہ کے متعلق جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ ایسے مباحث ان کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں تو سخت برہمی ظاہر کی اور اعلان کر دیا کہ یہ لوگ میرے حوالہ سے جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ غلط ہے۔

عقائد و کلام کے متعلق انہوں نے جو کتابیں لکھی تھیں، ان میں اہل سنت والجماعت کے نقطہ نظر کی ترجمانی کی ہے، بعض مسائل میں عام اہل سنت سے بھی زیادہ تشدد تھے، چند مسائل کے متعلق ان کے آرا و خیالات طبقات و تراجم کی کتابوں سے نقل کیے جاتے ہیں۔

قرآن مجید خدا کا کلام ہے، اس کی وحی و تنزیل اور وہ خود غیر مخلوق ہے، وہ خدا کی صفات میں ایک ذاتی صفت اور مستقل بالذات ہے، اس کو مخلوق، محدث اور فعلی صفت سمجھنے والے جہمی، بدعتی اور گمراہ ہیں، بعض جاہل کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مکرر کلام نہیں کرتا، یہ لوگ کلام الہی سے نا آشنا اور اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں، اللہ نے کئی مقامات پر تخلیق آدم کا ذکر کیا ہے جو حضرت موسیٰ کا قصہ مکرر بیان کیا ہے، فَبِأَيِّ آيَةٍ رَبِّكُمْ أَنْتُمْ كَاذِبُونَ بار بار کہا گیا ہے، یہ کسی مسلمان کا عقیدہ نہیں ہو سکتا اور جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ ازل میں کلام کرنے کے بعد اللہ پھر کلام نہیں کرتا وہ جہمی ہے، اللہ عرش پر بلا کیف مستوی و متمکن ہے۔

ان مسائل میں وہ اتنے تشدد تھے کہ جمیہ وغیرہ کو کافر بھی کہہ دیتے تھے، فرماتے ہیں: اللہ ازل سے متکلم ہے، جو شخص یہ گمان کرے کہ اللہ ایک ہی بار کلام کرتا ہے وہ کافر

ہے، اسی طرح جو اس کا اقرار نہ کرے کہ اللہ عرش پر ساتویں آسمان کے اوپر متمکن ہے وہ کافر ہے، اس کا خون مباح اور مال حلال ہے، قرآن کو کلام الہی کے بجائے مخلوق سمجھنے والا کافر ہے، اس سے توبہ کرائی جائے گی اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے گا، اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا، جہمیہ اور کلامیہ ملعون اور اپنے عقائد و خیالات میں جھوٹے ہیں۔ (۱)

**فضل و کمال کا اعتراف:** ان کے معاصرین علما اور ارباب کمال ان کے علم و کمال کے معترف تھے، امام دارقطنی نے ان کو عدیم النظر اور علامہ ذہبی نے فرید العصر اور حافظ ابن کثیر نے بحر من بحور العلم لکھا ہے، ابوعلی نیشاپوری فرماتے ہیں کہ ”میں نے ان سے زیادہ صاحب کمالات آدمی نہیں دیکھا“ ان کے استاذ ربیع بن سلیمان کا بیان ہے کہ ”ابن خزیمہ نے ہم سے جتنا استفادہ کیا، ہم نے اس سے زیادہ ان سے استفادہ کیا“ علامہ ابن سبکی ان کی جامعیت و فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وہ مختلف علوم کے جامع اور مرتبہ کمال پر فائز تھے، نیشاپور میں جو علم و فن کا گہوارہ اور فضلا و ارباب کمال کا مرکز تھا، یکتائے روزگار تھے، ان کی علمی شان سب سے بالا و برتر تھی، ان کے گرد طلبا و مستفیدین کا ہجوم رہتا تھا، ان کے فتاویٰ تمام روئے زمین میں نقل ہوتے تھے، عقل و فطانت میں بے مثال تھے، بحث مناظرہ میں انھیں زیر نہیں کیا جاسکتا تھا، درحقیقت علم و فضل کا ایسا بحر زخار تھے جس سے تشنگان علوم سیراب ہوتے تھے، ان کی اس علمی ضیاء باری سے ایک عالم کو بصیرت حاصل ہوتی تھی، علما و اساطین فن بھی ان کی جانب رجوع کرتے تھے، ان کے فیض کا یہ حال تھا۔

کالبحر یقذف للقریب جواہرا کرما ویبعث للغریب صحابا (۲)

یعنی ابن خزیمہ ہمسند کی طرح اپنے قرہب کے لوگوں کو موتی اور

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۹۶ تا ۲۹۷ (۲) طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۲ ص ۱۳۰۔

جو اہرات سے مالا مال کرتے ہیں اور دور والوں کے لیے بارانِ رحمت کی طرح

سامان فیض کرتے ہیں۔“

اتباع سنت: اتباع سنت میں بڑا اہتمام تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی وہ سنت کا لحاظ رکھتے تھے، ایک مرتبہ ان سے حمام میں بال منڈانے کے لیے کہا گیا، تو فرمایا کہ میرے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حمام میں داخل ہو کر بال منڈانا ثابت نہیں ہے، ابو عمرو بن اسماعیل کا بیان ہے کہ میں ابن خزیمہ کے درس میں شریک ہوتا تھا اور وہ اکثر معمولی کاموں میں مدد لیا کرتے تھے، ایک دفعہ میرا داہنا ہاتھ روشنائی سے سیاہ ہو گیا تھا، اس لیے میں نے ان کو بائیں ہاتھ سے قلم دینا چاہا تو انھوں نے نہیں لیا، میرے رفقاء نے داہنے ہاتھ سے قلم دینے کے لیے کہا، جب میں نے داہنے ہاتھ سے دیا تو انھوں نے لے لیا۔ (۱)

بزرگی و کرامت: وہ صاحب کرامت بھی تھے، لوگ ان کی ذات کو نہایت بابرکت خیال کرتے تھے، ابو عثمان زاہد کا بیان ہے کہ ”اللہ تعالیٰ اہل نیشاپور کے مصائب و آلام ابن خزیمہ کی برکت سے دفع کر دے گا۔“

محمد بن ہارون طبری روایت کرتے ہیں کہ وہ اور محمد بن نصر مروزی، محمد بن علویہ وزان اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ چاروں آدمی تحصیل علم و سماع حدیث کے لیے ربیع بن سلمان کے پاس گئے، وہاں ہم لوگوں کا ساز و سامان ختم ہو گیا، جب تین دن اور تین رات تک فاقہ کرنا پڑا تو ہم نے آپس میں کہا ایسی حالت میں تو ہمارے لیے سوال کرنا جائز ہے لیکن ہر شخص سوال کرنے میں عار محسوس کرتا تھا، اس لیے قرعہ اندازی کی گئی، اتفاق سے قرعہ ابن خزیمہ کے نام نکلا، انھوں نے کہا، پہلے مجھے دو رکعت استخارہ کی نماز پڑھ لینے دو، ابھی وہ نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھولا گیا تو امیر مصر احمد بن طولون کا خادم اجازت لے کر اندر داخل ہوا اور سلام کر کے بیٹھ گیا، پھر ایک پرزہ نکال کر پوچھا کہ

محمد بن نصر کون صاحب ہیں؟ ہم لوگوں نے ان کی طرف اشارہ کر دیا، اس نے پچاس ہزار کی ایک تھیلی دی اور کہا، امیر نے سلام عرض کیا ہے اور آپ کے اخراجات کے لیے یہ رقم پیش کی ہے، ختم ہونے کے بعد مزید رقم پیش کی جائے گی، اسی طرح ہم چاروں کو تھیلیاں دے کر یہی پیغام پہنچایا، ہم لوگوں نے اس سے کہا، پہلے اس واقعہ کا سبب بتاؤ ورنہ ہم یہ تھیلیاں نہیں قبول کریں گے، اس نے کہا آج دو پہر میں امیر قیلو لہ کر رہے تھے کہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ کل خدا کے یہاں حاضر ہو کر کیا جواب دو گے جب وہ تم سے ان چاروں علما کے متعلق سوال کرے گا جو تین روز سے بھوکے ہیں، اس خواب سے امیر گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور آپ لوگوں کا نام لکھوا کر یہ تھیلیاں بھیجیں، میں اسی وقت سے آپ لوگوں کی تلاش میں تھا، اب جا کر آپ لوگ ملے ہیں“ (۱)

قناعت: زندگی بڑی سادہ و درویشانہ اور تکلف و آرائش سے بالکل پاک تھی، ایک معمولی رقم میں گذر بسر کر لیتے تھے، پنپنے کے لیے ہمیشہ ایک ہی قمیص ہوتی تھی، جب دوسری قمیص بنواتے تو پرانی کسی ضرورت مند کو دیدیتے تھے، لوگ درخواست کرتے کہ کچھ زیادہ کپڑے بنا لیجئے، فرماتے کہ مجھے اپنے نفس کے آرام و راحت کا کوئی خیال نہیں۔ (۲)

سخاوت: بڑے فیاض اور مہمان نواز تھے، ان کے پوتے محمد بن فضل کا بیان ہے کہ میرے دادا بخل سے نا آشنا اور مال پس انداز نہیں کرتے تھے، ان کا کل مال و دولت اہل علم اور ضرورت مندوں کے لیے وقف تھا، ایک مرتبہ بڑی پر تکلف دعوت کی، مختلف قسم کے لذیذ کھانوں اور حلوے، میوے اور فواکہ سے دسترخوان آراستہ تھا، امر و اعیان کے ساتھ اہل علم اور فقہاء و محدثین بھی مدعو تھے، ہر شخص نے شکم سیر ہو کر کھایا، لوگوں کا بیان ہے کہ ایسی شاندار دعوت اور اس کا اہتمام صرف سلطان ہی کر سکتا تھا۔ (۳)

(۱) المنتظم ابن جوزی ج ۶ ص ۱۸۵، ۱۸۶ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱ (۳) طبقات الشافعیہ ج ۲

تذکرۃ المحمدین... گلستان حدیث کے مہکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ 414

صاف گوئی: ان کے اخلاقی اوصاف میں سب سے نمایاں وصف صاف گوئی ہے، امرا و اعیان دولت کے سامنے بھی وہ اس میں باک نہ کرتے تھے، ایک دفعہ امیر اسماعیل بن احمد نے اپنے والد کے واسطے سے ایک حدیث بیان کی جس کی سند میں ان کو وہم ہو گیا تھا، ابن خزیمہ بھی وہاں موجود تھے، انھوں نے فوراً اس کی تصحیح کی جب واپس ہوئے تو قاضی ابو ذر نے بتایا کہ ہم لوگ بیس سال سے یہ غلط روایات سنتے تھے مگر تصحیح کی جرأت نہ ہوتی تھی، ابن خزیمہ نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں خطاً و تحریف جان کر خاموش رہنا گوارا نہیں کر سکتا۔ (۱)

امامت و شہرت: اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی مرجحیت اور شہرت عطا فرمائی تھی، امام الاممہ ان کے نام کا جز بن گیا تھا، اسنوی کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں خراسان کے امام تھے، امام دارقطنی نے ان کو اور ابن ابی حاتم نے امام و مقصد کہا ہے، (۲) مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ان سے استفادہ کرنے کے لیے علماء و طلبہ کا ہجوم لگا رہتا تھا، بڑے بڑے ارباب کمال دور دراز سے مشقتیں برداشت کر کے استفادہ کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مستفیدین کے قافلے ہر وقت خیمہ زن رہتے تھے، امرا و ارباب حشمت بھی ان کے اعزاز و اکرام کو ملحوظ رکھتے تھے، پہلی مرتبہ جب امیر اسماعیل بن احمد سے آپ کی ملاقات ہوئی تو اس نے ناواقفیت کی وجہ سے شایان شان التفات نہیں کیا، بعد میں جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ ابن خزیمہ ہیں تو اس نے بڑی معذرت اور شرمندگی کا اظہار کیا اور نہایت گرمجوشی کے ساتھ ملا۔ (۳)

وفات: ۲۰ ذی قعدہ ۳۱۱ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا، (۴) اور اپنے گھر کے ایک کمرہ میں دفن کیے گئے، بعد میں پورا گھر مقبرہ میں تبدیل ہو گیا تھا، علامہ ابن جوزی نے ۸ ذی قعدہ اور ابو اسحاق شیرازی نے ۲۱۲ھ سند و وفات بتایا ہے، (۵) ایک شاعر کے مرثیہ کے دو شعر یہ ہیں:

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۹۵ (۳) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۳

(۴) ایضاً تذکرۃ ج ۲ ص ۲۹۵ (۵) المستنظم ج ۶ ص ۱۸۶ و طبقات الفقہاء ص ۸۷۔



يا بن اسحاق قد مضيت حميدا فسقى قبرك السحاب الهتون

ما توليت لابل العلم ولي مادفناك بل هو المدفون (۱)

ترجمہ: اے ابن اسحاق آپ کی زندگی نہایت قابل ستائش تھی، آپ کی قبر کو ہمیشہ  
برسنے والے بادل سیراب کرتے رہیں، آپ دنیا سے رخصت نہیں بلکہ علم  
رخصت ہو گیا، ہم نے آپ کے بجائے علم کو دفن کیا ہے۔

**تصنیفات:** ابن خزیمہ نامور مصنف بھی تھے، ان کی تصنیفات کی تعداد حاکم نے ۱۴۰ سے  
زیادہ بتائی ہے، ان کے علاوہ ان کے مسائل کا مجموعہ بھی سوجزوں کے بقدر تھا، ابن کثیر کا  
بیان ہے فکتب الکثیر و صنف و جمع یعنی بے شمار کتابیں تصنیف کیں، ابن خزیمہ  
تصنیف شروع کرنے سے قبل استخارہ کی نماز پڑھتے تھے، اگر استخارہ نکل آتا تھا تب تصنیف  
کی ابتدا کرتے تھے، (۲) جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:  
فقہ حدیث بریرہ: یہ تین جزوں پر مشتمل ہے، اس میں ایک حدیث کی فقہت  
کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب التوحید والصفات: یہ بڑی اہم اور مشہور کتاب ہے اور کئی اجزا پر مشتمل  
ہے، اس کا موضوع کلام و عقائد ہے، امام رازی اس کو کتاب الاشرک کے نام سے موسوم  
کرتے تھے، یورپ کے بعض کتب خانوں میں اس کے نسخے پائے جاتے ہیں، ابو نعیم نے  
الستخرج علی التوحید لکھی تھی۔ (۳)

صحیح ابن خزیمہ: یہ علامہ ابن خزیمہ کی سب سے اہم کتاب ہے، اس کا شمار  
حدیث کی اہم اور معتبر کتابوں میں ہوتا ہے، مستند مصنفین اور ثقہ علماء اس کی حدیثوں سے اخذ  
و استناد کرتے ہیں، کتب صحاح کے علاوہ جن محدثین نے اپنی کتابوں میں صحت کا زیادہ

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۳ (۲) ایضاً ص ۱۳۳ و ۱۳۵ و تذکرۃ ج ۲ ص ۲۹۴ و البدایہ ج ۱۱ ص ۱۴۹

(۳) فوائد جامعہ ص ۱۴۲ و کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۰ و تذکرۃ النوادر ص ۶۴ و تدریب الراوی ص ۳۵۔

(متذکرۃ الحدیثین.... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ) 416

التزام کیا ہے، ان کے مجموعے صحیح کہلاتے ہیں، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں ”جن دیگر علمائے صحاح کے مجموعے لکھے ان میں ابن خزیمہ کی صحیح بعض حیثیتوں سے زیادہ مشہور ہے،“ اس کی اہمیت کا اندازہ ابن کثیر کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے:

من انفع الكتب واجلها (۱) یعنی صحیح ابن خزیمہ نہایت مفید اور اہم کتابوں میں ہے، علامہ سیوطی نے بخاری و مسلم کے بعد جن کتابوں کو زیادہ معتبر بتایا ہے، ان میں کتب صحاح کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ صحیح ابن خزیمہ کا پایہ صحیح ابن حبان سے زیادہ ہے، کیوں کہ ابن خزیمہ نے صحت کی جانب زیادہ توجہ کی ہے، وہ ادنیٰ شبہہ پر بھی توقف سے کام لیتے ہیں، چنانچہ اکثر ان صحیح الخبر وان ثبت وغیرہ قسم کے الفاظ لکھے ہیں، یہ صحت میں صحیح مسلم کے قریب قریب ہے، اس کے نسخے یورپ کے بعض کتب خانوں اور جرمنی میں موجود ہیں، حافظ ابن حجر نے صحیح ابن خزیمہ پر مفید حواشی بھی لکھے تھے۔ (۲)

☆☆☆

(۱) البدایہ و النجاشی ص ۱۳۹ و حواشی سعدی ص ۱۵ و تدریب الراوی ص ۳۱ (۲) مقدمہ تحفۃ الاخوان ص ۱۶۳۔

## امام ابو عوانہ اسفرائینیؒ

(متوفی ۵۳۱ھ)

نام و نسب: یعقوب نام، ابو عوانہ کنیت، اور سلسلہ نسب یہ ہے: یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم بن یزید۔ بعض اہل سیر نے یزید کے بجائے زید لکھا ہے۔ (۱)

وطن: وہ اسفرائن کے باشندہ تھے لیکن آخر عمر میں نیشاپور میں سکونت کر لی تھی، اس لیے اسفرائینی اور نیشاپوری دونوں نسبتوں سے مشہور ہیں، اسفرائین نواحی نیشاپور میں زرخیز اور شاداب شہر تھا، قدیم زمانہ میں اس کا نام مہر جان تھا، اس شہر کی جانب علما و اعیان کی ایک کثیر جماعت منسوب ہے، سمعانی کا بیان ہے کہ قدیم اور جدید ہر دور میں جملہ فنون کے ماہرین علما اور فضلا کی ایک جماعت یہاں پیدا ہوئی، ان میں ابو عوانہ بھی ہیں۔ (۲)

اساتذہ: ابو عوانہ کے شیوخ و اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، ان میں سے اکثر بڑے نامور اور کامل الفن ہیں، بعض شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابو حاتم، ابو زرعة، احمد بن ازہر، احمد بن سعید داری، اسماعیل بن محمد بن قیراط، حسن زعفرانی، سعد بن عبدالحکم، سعدان بن نصر، علی بن اسکاب، علی بن حرب، عمر بن شیبہ، محمد بن رجاہ سندی، محمد بن عبدالحکم، محمد بن یحییٰ ذہلی، مسلم بن حجاج قشیری، یزید بن محمد بن عبد الصمد، یعقوب بن سفیان اور یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ سے علم حدیث کی اور امام شافعیؒ

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۳۲۳ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۲۱ (۲) بستان الحدیث ص ۳۷، کتاب

الانساب ص ۳۴۔

کے ارشد تلامذہ ابو ابراہیم مزنی اور ربیع بن سلیمان سے فقہ میں تکمیل بہم پہنچائی۔  
تلامذہ: ان کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابو احمد علی، ابو بکر اسماعیلی، ابو علی نیشاپوری، ابوالولید فقیہ، احمد بن علی رازی، حسین بن علی، سلیمان طبرانی، عبداللہ بن عدی، عبدالملک بن حسن اسفرائینی (۱)، محمد بن ابوعوانہ (۲)، محمد بن یعقوب بن اسماعیل، یحییٰ بن منصور قاضی وغیرہ۔

طلب حدیث کے لیے سفر: ابوعوانہ نے علم حدیث کی طلب و جستجو میں متعدد مقامات کے سفر کیے، اس حیثیت سے بھی وہ دوسرے محدثین میں ممتاز ہیں، ان سے زیادہ کسی اور کے سفر کی تفصیل نہیں ملتی، علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ”ابوعوانہ نے طلب حدیث کے لیے سفر کیے اور اس کے جمع کرنے اور اس کی تحریر و کتابت میں بڑی مشقت اٹھائی“ حاکم کا بیان ہے کہ ”وہ کثیر الاسفار تھے اور انھوں نے احادیث کی تحصیل کے لیے روئے زمین کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا“ ابن خلکان کا بیان ہے کہ:

احد الحفاظ الجوالین وہ ان حفاظ اور محدثین میں تھے جنہوں  
والمحدثین المکثرین۔ (۳)  
نے بڑے سفر کیے اور بکثرت حدیثیں جمع کیں۔

مؤرخین اور اصحاب سیر کا بیان ہے کہ انھوں نے خراسان، عراق، یمن، حجاز، شام، جزیرہ، فارس، اصفہان، ثقفور، ری، واسط، بصرہ اور کوفہ وغیرہ مختلف ملکوں اور شہروں کا تحصیل علم اور طلب حدیث کے لیے سفر کیا۔

حفظ و ثقافت: ان کا حافظ بے مثال تھا، علمائے فن نے ان کو الحافظ الکبیر الجلیل،

(۱) یہ ابوعوانہ کے بھتیجے تھے، (۲) یہ ابوعوانہ کے فرزند تھے، (۳) کتاب الانساب ورق ۳۳۲ و فیات الاعیان ج ۲ ص ۳۳۵، مرآة الجنان ج ۲ ص ۲۷۰۔

احد الحفاظ، احد حفاظ الدنيا اور من اکابر حفاظ الحدیث لکھا ہے اور ثقہ جلیل اور ثقہ الکبیر وغیرہ کے الفاظ میں ان کی توثیق کی ہے۔

**اعتراف کمال:** دوسرے علماء محدثین ان کے کمالات کے معترف تھے، حاکم لکھتے ہیں کہ ”ابوعوانہ بلند پایہ محدثین اور اصحاب کمال میں تھے“ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ ”وہ نامور محدثین اور بلند ترین علمائے اسلام میں تھے۔“ (۱)

**فقہ واجتہاد:** فقہ میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، ذہبی کا بیان ہے کہ ”وہ حافظ و محدث ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ اور امام بھی تھے، ابن خلکان نے ان کے مزار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”اس مقام میں امام شافعی کے مذہب و مسلک سے تعلق رکھنے والے چالیس ایسے ائمہ مجتہدین اور فقہا مدفون ہیں جو اگر اپنی رائے واجتہاد سے فتویٰ دیتے تو بلاشبہ وہ اس کے مستحق تھے“

**مذہب و مسلک:** انھوں نے فقہ کی تعلیم شافعی مذہب کے ائمہ سے حاصل کی تھی، اس لیے ان کو اس مذہب سے بڑا تعلق تھا، مصر سے واپس آنے کے بعد انھوں نے شوافع کی کتابوں سے پہلی مرتبہ اسفرائن کے لوگوں کو روشناس کرایا اور انہی کی بدولت اسفرائن میں امام شافعی کے مذہب کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ (۲)

**زہد و اتقا:** زہد و تقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ تھے، علامہ سمعانی بیان کرتے ہیں کہ ”وہ زاہد، عبادت گزار، عقیف، پاکدامن اور کم خور تھے اور پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔“

**وفات:** اپنے وطن اسفرائن میں ۳۱۶ھ میں انتقال کیا، ایک روایت ۳۱۳ھ کی بھی ہے لیکن وہ ضعیف ہے۔

**تصنیفات:** امام ابو عوانہ کی تصنیفات میں ایک مسند صحیح ان کی یادگار ہے جو دراصل صحیح مسلم

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۳۴۵، تذکرہ ج ۳ ص ۲، طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۲۲ (۲) ایضاً۔

پر مستخرج ہے، محدثین کی اصطلاح میں مستخرج اس کتاب کو کہا جاتا ہے جس میں کسی دوسری کتاب کی حدیثوں کو اس کی ترتیب متون اور طرق اسناد کے مطابق نقل کیا جاتا ہے، مسند ابوعوانہ میں امام مسلم کے طرق و اسانید کے علاوہ دوسرے طرق اسناد اور بعض متون کا اضافہ بھی کیا گیا ہے، اس لیے اس کو صحیح بھی کہا جاتا ہے اور اس حیثیت سے دراصل یہ خود ایک مستقل تصنیف بن گئی ہے۔ (۱)

خصوصیات: ۱- اس کی پہلی خصوصیت تو یہی ہے کہ صحیح مسلم کی مستخرج ہونے کے باوجود اس میں بعض اضافے بھی ہیں، علامہ ذہبی کا بیان ہے:

صاحب الصحيح المسند      ابو عوانہ صاحب صحیح مسند ہیں، ان کی  
المخرج علی صحیح مسلم      کتاب امام مسلم کی صحیح پر تخریج کی گئی ہے  
وله فیہ زیادات عدة. (۲)      لیکن اس میں متعدد اضافے بھی ہیں۔

مثلاً باب الدلیل علی ایجاب الوضو میں تین حدیثیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:  
قال ابو عوانة من هنالم      یعنی یہاں سے جو روایتیں نقل کی  
یخرجہ اصحابنا.      جارہی ہیں ان کی ہمارے اصحاب نے  
تخریج نہیں کی ہے۔

اسی طرح آٹھ حدیثیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قال ابو عوانة الی هنا زدت      یعنی یہاں تک میں نے خود اضافہ کیا  
من عندی. (۳)      ہے۔

۲- مختلف اسانید اور متعدد احادیث تحویل نظر و شواہد کے ساتھ درج کیے ہیں

اور اختلاف متن کی بحث کرتے ہوئے ایسے اقوال اور صحیح مرویات جمع کیے ہیں جو دوسری متداول کتابوں میں نہیں ملتے۔

(۱) بستان الحدیثین ص ۳۶، ۳۵ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲ (۳) مسند ابوعوانہ ج ۱ ص ۲۳۷، ۲۳۸۔

۳- امام ابو عوانہ نے احادیث کے معنی کی صحیح تعبیر اور بلیغ تشریح بھی کی ہے۔

۴- فقہی ابواب پر مسند کو مرتب کرنے کے باوجود انہوں نے اس میں مختلف

فصول قائم کیے ہیں جو ان کی طباعی کا ثبوت ہے۔

اس مسند کو پہلی مرتبہ مولانا محمد ہاشم ندوی نے ایڈٹ کر کے دائرۃ المعارف

العثمانیہ حیدرآباد سے ۱۳۶۲ھ و ۱۳۶۳ھ میں دو جلدوں میں شائع کیا ہے اور مفید تعلیقات

اور مختصر حواشی بھی لکھے ہیں، دونوں جلدوں کے آخر میں ابواب و فصول کی مفصل فہرست،

اسماء و اعلام کی انڈکس اور پہلی جلد میں مصنف اور تصنیف کے متعلق مفید معلومات بھی درج

ہیں، مسند کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں (۱) اور علمائے فن نے اس کے

ساتھ اعتنا کیا ہے، علامہ ذہبی نے السنن فی کے نام سے اس کی ۲۳۰ حدیثوں کو منتخب کیا ہے

اور حافظ ابن حجر نے اتحاف المہرۃ باطراف العشرۃ میں مستخرج ابی عوانہ کی حدیثیں درج کی

ہیں۔ (۲)



(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۶۳ و تذکرۃ النواویر ص ۴۰ (۲) بستان المحمدین ص ۳۷ و ذیل طبقات الحفاظ

## امام ابو جعفر طحاویؒ

(متوفی ۳۲۱ھ)

نام و نسب: احمد نام، ابو جعفر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ بن سلیم بن سلیمان بن حباب۔ (۱)

ولادت: مشہور روایت کے مطابق وہ یکشنبہ کے دن ۱۰ ربیع الاول ۲۳۹ھ میں پیدا ہوئے، ۲۳۸ھ و ۲۳۸ھ بھی سند ولادت بیان کیا جاتا ہے۔ (۲)

خاندان و وطن: امام طحاوی کا خاندانی تعلق یمن کے مشہور قبیلہ ازد کی شاخ حجر سے تھا، اسلامی فتوحات کے بعد ان کے خاندان والوں نے مصر میں سکونت اختیار کر لی تھی اور یہیں ایک گاؤں طحا میں امام صاحب کی ولادت ہوئی۔ (۳) اس لیے وہ ازدی، حجری اور مصری و طحاوی کہلاتے ہیں، یا قوت کا بیان ہے کہ طحا کے قریب ہی طحلو ط نام کے ایک گاؤں کو ان کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے لیکن انھوں نے اس کے بجائے طحا کی جانب ہی اپنی نسبت کو پسند کیا، علامہ سیوطی نے بھی اسی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ (۴)

اساتذہ: ان کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، عبدالعزیز بن طاہر تمیمی نے ایک مستقل رسالہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، (۵) طحاوی کے اکثر شیوخ کو مشہور محدث ابن وہب

(۱) الجواہر المصیہ ج ۱ ص ۱۰۲ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۳ (۳)

ایضاً کتاب الانساب ورق ۱۵۷ و ۱۵۸ و الجواہر المصیہ ج ۱ ص ۱۰۲ (۴) انجم البلدان ج ۶ ص ۳۰ و الرسالة

المسطر فہ ص ۳۸ (۵) الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۶۔



اور سفیان بن عیینہ سے شرف تلمذ حاصل ہے، (۱) بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

بحیر بن نصر، سلیمان بن شعیب کیسانی، عبدالغنی بن رفاعہ، عیسیٰ بن معرود، محمد بن عبدالجلم، ہارون بن سعید ایللی، یونس بن عبدالاعلیٰ صدیقی وغیرہ۔

فقہ واجتہاد کی تحصیل کے لیے پہلے امام شافعی کے ممتاز ترین شاگرد اور فقہ شافعی کے جامع و مرتب امام مزنی کی جانب جو ان کے ماموں تھے متوجہ ہوئے لیکن بعد میں قاضی ابو حازم اور احمد بن عمران وغیرہ سے اس کی تکمیل کی۔ (۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، بعض علما نے ان پر مستقل رسالہ لکھا ہے، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن عبدالوارث زجاج، احمد بن قاسم خشاب، ابو محمد حسن بن قاسم مصری، ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی، ابوالقاسم عبداللہ بن علی داؤدی، ابوسعید عبدالرحمن بن احمد، ابو بکر محمد بن ابراہیم مصری، ابوالحسن محمد بن احمد غمگی، محمد بن بکر، محمد بن مظفر، یوسف بن قاسم میانجی۔ (۳)

طلب علم کے لیے سفر: مورخین نے صرف ۲۶۸ھ میں امام صاحب کے شام تشریف لے جانے کا ذکر کیا ہے، مگر ان کے اساتذہ میں مصر، یمن، کوفہ، بصرہ، حجاز، شام، خراسان اور مغرب وغیرہ مختلف اسلامی ملکوں کے ارباب کمال شامل ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان میں سے اکثر مقامات کا سفر بھی کیا ہوگا، ان کے شوق و جستجو کا یہ حال تھا کہ جب کوئی محدث یا صاحب کمال مصر آتا تو اس کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کی کوشش کرتے۔ (۴)

(۱) المعراج ص ۲۵۵ (۲) الجواہر ج ۱ ص ۱۰۳، ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ و حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۳۷ (۳) الجواہر المعیہ ج ۱ ص ۱۰۳، والمجاوی فی سیرۃ الامم، الطحاوی ص ۷ (۴) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۴ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰ و المجاوی ص ۱۹۱۸۔

**حفظ وثقاہت:** ابن یونس صاحب تاریخ مصر کا بیان ہے کہ ”امام طحاوی ثقہ و ثابت اور صاحب عقل و فراست تھے“ مسلمہ بن قاسم قرطبی فرماتے ہیں، ”وہ ثقہ اور نہایت جلیل القدر تھے“، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ”ثقہ و ثابت اور ماہر حفاظ حدیث میں ایک امام طحاوی بھی ہیں۔“ بدرالدین یعنی فرماتے ہیں کہ ”ان کی ثقاہت، دیانت، امانت اور فضیلت پر سب کا اتفاق ہے۔“ صاحب مرآة الزماں تحریر فرماتے ہیں کہ ”لوگ ان کے علم و فضل کی طرح ان کے صدق و ثقاہت کے بھی معترف ہیں۔“ (۱)

**اعتراف کمال:** تمام اکابر علماء و محدثین ان کے علمی کمالات کے معترف تھے، مورخین کا بیان ہے کہ ”ان کے بعد ان کا کوئی ہمسر اور جانشین نہیں پیدا ہو سکا۔“ ابن ندیم فرماتے ہیں کہ ”وہ علم و فضل میں بے مثال اور یکتائے روزگار تھے“ علامہ عینی کہتے ہیں کہ ”جن محدثین اور مورخین نے ان کا تذکرہ کیا ہے، وہ سب ان کی مدح و توصیف میں متفق ہیں، متقدمین میں طبرانی، خطیب، حمیدی اور متاخرین میں حافظ مزنی، ابن کثیر اور ذہبی وغیرہ نے ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کوئی واقف کار اور مصنف مزاج شخص ان کے علم و فضل اور اوصاف و کمالات کا منکر نہیں ہو سکتا۔“ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ”ان کی تصنیفات ان کی وسعت نظر اور علمی تبحر پر شاہد ہیں۔“ (۲)

**جامعیت:** امام طحاوی کو جملہ اسلامی علوم اور ان کے تعلقات میں مہارت حاصل تھی، مورخین اور علمائے سیر نے تفسیر، کلام، عربیت، ادب، لغت، نحو اور انساب وغیرہ میں ان کی ژرف نگاہی کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض علوم میں انھوں نے مستقل کتابیں لکھیں اور ان کی فقہی و حدیثی کتابوں میں بھی ان علوم پر بحثیں ہیں، حدیث و فقہ اور اصول و شروط کے خاص طور پر بڑے ماہر تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ”انھوں نے شروط میں کتاب لکھی اور

(۱) الجوہر المہینہ ج ۱ ص ۱۰۲ و کتاب الانساب ورق ۱۵۸، ۳۶۹ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۷۴ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ (۲) الفہرست ص ۲۹۲ و الحدادی ص ۱۲ و ۱۳ و بستان الحمد شین ص ۸۸۔

وہ اس فن میں ممتاز و ماہر تھے“ علامہ زاہد الکوثری فرماتے ہیں ”امام طحاوی فضائل و کمالات کے جامع تھے، حدیث اور اس کے متعلقہ علوم اور فقہ اور اس کے اصول و ضوابط میں علمائے امت میں بہت کم لوگ ان دونوں فنون میں ایسے جامع پیدا ہوئے، اس کا ان تمام لوگوں کو اعتراف ہے، جو اس سرچشمہ فیض سے سیراب ہوئے ہیں۔“ (۱)

زہد و اتقاء: زہد و اتقاء میں بھی ان کا درجہ نہایت بلند تھا، ابن ندیم فرماتے ہیں کہ وہ زہد دورع میں یکتائے زمانہ تھے، صاحب مرآة الزمان کا بیان ہے کہ ”ان کے زہد و تقویٰ پر لوگوں کا اتفاق ہے“ علامہ یعنی نے ان کی دیانت، ثقاہت، امانت اور راست بازی وغیرہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔ (۲)

فقہی مسلک: شروع میں وہ شافعی مذہب سے وابستہ تھے، پھر حنفی مذہب اختیار کر لیا اور اس سے ایسا مستحکم تعلق ہوا کہ اس کے اکابر فقہاء اور ائمہ مجتہدین میں شمار کیے جاتے ہیں، ان کے تمام سوانح نگاروں نے ابن یونس کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ مصر میں حنفی مذہب کی ریاست و سیادت ان پر تمام ہو گئی، حافظ ذہبی وغیرہ نے ان کو شیخ الحنفیہ لکھا ہے، (۳) گو اس مذہب میں بڑے بڑے جلیل القدر علما اور بکثرت ارباب کمال پیدا ہوئے لیکن ان سب میں امام طحاوی کو امتیازی درجہ حاصل ہے، انھوں نے اپنی تصنیفات سے اس مذہب کی بڑی اہم خدمات انجام دیں اور اس کی ترویج و اشاعت اور تائید و حمایت میں اپنی عمر صرف کر دی، جس کا اعتراف خود علمائے احناف کو بھی ہے، ابن قطلوبغا کا بیان ہے، وکان اماما فقیہا من الحنفیین (۴) حنفی مذہب سے شدید تعلق کے باوجود انھوں نے بعض مسائل میں اس سے اختلاف بھی کیا ہے اس لیے ان کو مجتہد منتسب وغیرہ کہا گیا ہے۔

(۱) العمر ج ۲ ص ۱۸۶، ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲، والبدایہ ج ۱ ص ۱۷۴، والحادی ص ۳ (۲) القمہ ص ۲۹۲

والحادی ص ۱۲ (۳) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۵۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰، والعمر ج ۲ ص ۱۸۶ (۴)

الجواہر المہینہ ج ۱ ص ۱۰۳، وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۳۷۔

شافعی مذہب ترک کرنے کا سبب: امام طحاویؒ کے شافعی مسلک چھوڑنے کے متعلق مورخین نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ”ابتدا میں وہ اپنے ماموں اسماعیل بن یحییٰ مزنی ۲۶۳ھ کے درس میں جو امام شافعیؒ کے ممتاز ترین شاگرد اور فقہ شافعی کے بانیوں میں تھے، شریک ہوتے تھے، ایک دن انھوں نے کوئی مسئلہ بیان کیا، جس کو طحاوی بار بار سمجھانے کے باوجود بھی نہیں سمجھ سکے، اس پر انھوں نے بلادت و غبات کا طعنہ دیا اور کہا کہ ”بخدا تم کو کچھ نہیں آسکتا“ امام طحاوی اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوئے کہ مزنی کے درس میں جانا ہی ترک کر دیا اور ابو جعفر احمد بن ابی عمران کے حلقہٴ درس میں جو مصر میں حنفی مذہب کے قاضی تھے، شریک ہونے لگے اور پوری محنت سے فقہ میں مشق و مہارت بہم پہنچائی اور مختصر تصنیف کر کے اپنے تمام معاصرین پر گوئے سبقت لے گئے، ایک روز وہ امام مزنی کی قبر سے گذرے تو فرمایا کہ خدا تعالیٰ ان پر رحم کرے اگر یہ زندہ ہوتے تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرتے۔“ (۱) علامہ ابن خلکان نے ایک دوسری وجہ یہ بھی تحریر کی ہے کہ محمد بن احمد شروطی نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اپنے ماموں کا مسلک کیوں ترک کیا تو فرمایا کہ میں نے خود ان کو دیکھا کہ وہ اکثر امام ابو حنیفہ کے مسلک کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی جانب مراجعت کرتے ہیں، اس لیے میں نے حنفیہ کا مذہب اختیار کر لیا اور اپنے ماموں اور استاذ کا مسلک ترک کر دیا۔ (۲)

وفات: پنجشنبہ کے دن غرہ ذوقعدہ ۳۲۱ھ کو مصر میں انتقال کیا اور قرآن میں امام شافعیؒ کے مزار کے متصل ہی دفن کیے گئے۔ (۳)

اولاد: ایک صاحبزادہ ابو الحسن علی اور پوتے ابو علی حسن بن علی کا نام ضمناً ملتا ہے۔

تصنیفات: امام طحاوی جلیل القدر عالم اور بلند پایہ مصنف تھے، ان کو ان کی تصنیفات اور اہم علمی خدمات کی بنا پر بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۱ و لسان المیزان ج ۱ ص ۲۷۵ (۲)

تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲ (۳) ایضاً ص ۳۳۔

ترتذکرۃ المحدثین ..... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ 427

”وہ نہایت مفید اور بیش بہا تصنیفات کے مالک تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ ”ان کی تصنیفات بڑی انوکھی ہیں“ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں ”انھوں نے متعدد مفید کتابیں لکھیں“ (۱) جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ حسب ذیل ہیں:

- ۱- کتاب الاشریہ، ۲- کتاب التاریخ الكبير، ۳- کتاب التسویہ
- بین حدثنا واخبرنا، ۴- رسالۃ حکم اراضی مکہ، ۵- رسالہ فی الرزیہ،
- ۶- کتاب الشروط الاوسط، ۷- کتاب العزل، ۸- کتاب الفرائض، ۹- قسم
- الفیء والغنائم، ۱۰- کتاب المحاضرہ والسجلات، ۱۱- کتاب الوصایا،
- ۱۲- مناقب ابی حنیفہ یا اخبار ابی حنیفہ واصحابہ، ۱۳- اختلاف
- الروایات علی مذهب الکوفیین (دو جڑوں میں) ۱۴- الرد علی عیسیٰ بن
- ابان (دو جڑوں میں)، ۱۵- النوادر الفقہیہ (دس جڑوں میں)، ۱۶- النوادر و
- الحکایات (بیس جڑوں میں)، ۱۷- کتاب فی النحل واحکامها (چالیس جڑوں میں)
- ۱۸- کتاب نقض کتاب المدلسین: ابوعلیٰ حسین بن علیٰ کراہیسی کی کتاب
- المدلسین کے رد و جواب میں ہے۔

- ۱۹- کتاب الرد علی ابی عبید: ایک جز پر مشتمل ہے، اس میں ابو عبید کی ان
- غلطیوں کی تردید کی گئی ہے جو انساب کے متعلق انھوں نے کی ہیں۔
- ۲۰- سنن شافعی: یہ ان حدیثوں پر مشتمل ہے جو امام مزنی کے واسطے سے امام شافعی
- سے مروی ہیں۔

- ۲۱- شرح الجامع الصغیر: امام محمد بن حسن کی مشہور و معرکہ الآراء کتاب الجامع الصغیر
- فی الفروع کی جو ۱۵۲۲ مسائل پر مشتمل ہے، شرح ہے۔

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۷۷۷ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲۔

۲۲- شرح الجامع الکبیر: یہ بھی امام محمد صاحب کی مشہور کتاب الجامع الکبیر فی الفروع کی شرح ہے۔

۲۳- کتاب الشروط الصغیر: اس کا نام مختصر الشروط بھی ہے، یہ پانچ جڑوں میں ہے اور مکتبہ شیخ الاسلام فیض اللہ میں موجود ہے۔

۲۴- کتاب الشروط الکبیر: چالیس اجزا پر مشتمل ہے، یورپ سے اس کا ایک جز چھپ چکا ہے اور بعض اجزا مکتبہ علی پاشا شہید اور استنبول کے مکتبہ ملا مراد میں ہیں۔ (۱)

۲۵- احکام القرآن: ۲۰ جڑوں پر مشتمل ہے، قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ تفسیر قرآن کے موضوع پر امام طحاوی نے ایک ہزار اوراق لکھے تھے، علامہ زاہد الکوثری کے خیال میں احکام القرآن ان ہی اوراق کا مجموعہ ہے لیکن بعض لوگوں کے نزدیک یہ دوسری اور مستقل کتاب ہے۔ (۱)

۲۶- بیان السنۃ والجماعۃ: اس کے مختلف نام ہیں اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، یہ رسالہ کئی بار چھپ چکا ہے، ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء میں قازان سے عربین اسحاق ہندی کی شرح کے ساتھ ۷۴ صفحات میں شائع ہوا تھا، (۲) مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اسی نسخہ کی مدد سے اس کا ایک ایڈیشن دیوبند سے عقیدۃ الطحاوی کے نام سے شائع کیا ہے، اس میں اہل سنت والجماعت کے عقائد، امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کے مذاہب، اصول اور معتقدات کی روشنی میں تحریر کئے گئے ہیں۔

۲۷- اختلاف العلماء: ۳۰ سے زیادہ اجزا پر مشتمل ہے، ابن ندیم نے اس کا نام کتاب الفقہاء لکھا ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ یہ نہایت ضخیم کتاب ہے، امام طحاوی اس کو مکمل (۱) دیکھتے الفہرست ابن ندیم ص ۲۹۲ والجواہر المعینہ ج ۱ ص ۱۰۲ وکشف الظنون باختلاف صفحات وفتاویٰ جامعہ برجلہ نافذہ ص ۷۹ والحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۳۵ تا ۳۷ (۲) الجواہر المعینہ ج ۱ ص ۱۰۲ والحاوی ص ۳۵ (۳) اکتفاء القواعد ص ۱۲۵ وجمع المطبوعات کاملہ ص ۱۲۳۔

نہیں کر سکے تھے، ابو بکر بھصام رازی متوفی ۳۷۰ھ نے اس کا مختصر لکھا تھا جو استنبول کے مکتبہ جارا اللہ ولی الدین میں موجود ہے، علامہ کوثری کی نظر سے یہ مختصر گذرا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ”اس میں ائمہ اربعہ کی طرح دوسرے قدیم مجتہدین اور فقہاء امصار مثلاً ابراہیم نخعی، عثمان بنی، امام اوزاعی، سفیان ثوری، لیث بن سعد، ابن شبرمہ، ابن ابی لیلیٰ اور حسن بن حی وغیرہ کے اقوال و مذاہب بھی نقل کئے گئے ہیں، (۱) اگر آج امام طحاوی کی اصل کتاب موجود ہوتی تو اکابر علمائے متقدمین اور فقہائے امصار کے مسالک معلوم کرنے میں بڑی آسانی بھی ہوتی اور یہ کتاب ان کے اقوال کا اچھا اور عمدہ ماخذ بھی ہوتی۔

۲۸- کتاب المختصر فی الفقہ یا مختصر الطحاوی: اس کو امام مزنی کی مختصر کے انداز پر مرتب کیا گیا ہے، یہ حنفی فقہ کے فروع و جزئیات پر ایک مختصر اور جامع متن ہے اور اس میں اس مذہب کے اکابر یعنی امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر اور حسن بن زیاد کے اقوال و آثار نقل کئے گئے ہیں۔ (۲) امام طحاوی نے اقوال مختلفہ کے درمیان ترجیح بھی دی ہے، ائمہ کے اختلاف کی صورت میں غیر جانبدارانہ طور پر کبھی امام ابو حنیفہ اور کبھی صاحبین اور کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک کے مسلک کو راجح قرار دیا ہے، بعض مواقع پر ان تینوں بزرگوں کے بجائے امام زفر یا حسن بن زیاد کے قول کی تائید کی ہے، اور چند مقامات پر ان سب بزرگوں کے قول کو مرجوح سمجھ کر اپنی رائے و اجتہاد کا ذکر بھی کیا ہے، جس مسئلہ میں ائمہ کے اقوال معلوم و منقول نہیں ہوتے تو اشارات نصوص اور دوسری دلائلوں سے ان کے اقوال مستنبط کرتے ہیں، اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کو علمائے مجتہدین میں شمار کیا جاتا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

”اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حنفی مذہب کے مقلد ہی نہ تھے بلکہ مجتہد نسب بھی تھے، چنانچہ انھوں نے حنفی مذہب کے خلاف بھی کچھ باتیں لکھی ہیں“ صاحب

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۶۳، المہر ست ص ۲۹۲، والطی دی ص ۳۵ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۰۰۔

دراسات الملیب کا بیان ہے ”امام طحاوی حنفی مذہب سے شغف رکھنے اور اس کے ماخذ مرفوع و موقوف کی تخریج کر سکے باوجود جب اس کو حدیث کے خلاف پاتے تو رد کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے تھے۔ (۱)

یہ مختصر متن حنفیہ کی صحیح و قوی روایات اور مفتی بہ و مرجع اقوال کا بڑا مستند ماخذ اور اتنے گوناگوں مسائل کا مجموعہ ہے جو دوسرے متون اور مطول کتابوں میں نہیں ملتے، علاوہ ازیں اس میں ترجیح کے وجوہ اور کتاب و سنت اور قیاس وغیرہ سے دلائل بھی فراہم کئے گئے ہیں، اس لیے اس کو ہمیشہ مقبول اور معتبر سمجھا گیا ہے، اس کتاب کی اہمیت اس لیے اور زیادہ ہے کہ علمائے احناف میں سب سے پہلے امام طحاوی کو مختصر لکھنے کا شرف حاصل ہوا، اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، جن کی تعداد گیارہ سے متجاوز ہے، یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدرآباد سے چھپ چکی ہے۔

**مشکل الآثار:** یہ امام طحاوی کی بڑی مشہور اور اہم کتاب ہے، اس کا مقصد تصنیف بیان کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:

”لقد وثابت رواة سے مروی مسند و مقبول حدیثوں کی معرفت وغیرہ کے متعلق لوگوں کی نادانیت دیکھ کر میں نے ان پر غور کیا، اس کے نتیجے میں جو مشکلات اور حدیثوں سے جو مسائل و احکام اور اہم نکات و حقائق مستطب ہوئے، ان کو بیان کر کے ان پر عائد ہونے والے اعتراضات و اشکالات کو اس میں دفع کرنے کی کوشش کی ہے“ (۲) اس کی ترتیب و تصنیف میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے ایک حدیث ذکر کر کے اس کے متابعات اور موید روایتیں نقل کی گئی ہیں، پھر اس کا صحیح مدلول و منشاء متعین کر کے اس پر عائد ہونے والے شکوک کا جواب یا دوسری حدیثوں سے اس کے اختلاف کی نوعیت وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، ثبوت و استدلال اور بحث و تحقیق میں قرآنی آیات، احادیث نبوی، آثار

(۱) بستان المحدثین ص ۸۸ و اتحاف العلماء المتعین ص ۱۹۲ (۲) مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۔



صحابہ و تابعین، ائمہ مجتہدین کے اقوال و آراء بیان کیے گئے ہیں اور نحوی و لغوی مسائل کی تحقیق بھی کی گئی ہے، اور کلام عرب سے بھی کہیں کہیں شواہد پیش کیے گئے ہیں، اسناد و متون اور رجال وغیرہ کے متعلق بھی مفید اور ضروری معلومات نقل کیے گئے ہیں، مشکل الآثار کے بعض اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

- ۱- اس کی سب سے اہم اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اصلاً مشکلات حدیث کا تعین کر کے ان کا محققانہ جواب دیا گیا ہے، جس سے مشکلات اور دقت طلب امور بھی حل ہو گئے ہیں اور شکوک و شبہات بھی دفع ہو گئے ہیں۔
- ۲- اس کتاب میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ احادیث کے اندر تضاد و تناقض نہیں ہوتا۔
- ۳- استدلال و تحقیق کی حیثیت سے بھی اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے، امام طحاوی تحقیق و تنقیح اور بحث و استدلال کا پورا حق ادا کر دیتے ہیں، اس کتاب میں جو اہم اور گونا گوں مسائل و مباحث بیان کیے گئے ہیں ان کے متعلق ماہرین فن اور ائمہ کے خیالات اور اہم کتابوں کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔

۴- فقہی و اجتہادی حیثیت سے بھی مشکل الآثار کا پایہ بہت بلند ہے، امام طحاوی نے فقہائے صحابہ و تابعین، ائمہ کبار اور مجتہدین اسلام کے اختلافات بھی بیان کیے ہیں اور ان کے درمیان توجیہ و تطبیق اور ترجیح بھی دی ہے، نیز وجوہ ترجیح بھی بیان کیے ہیں، ان کے تفہم و اجتہاد کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بعض مسائل میں ائمہ احناف کے اقوال سے اختلاف کیا ہے۔

۵- تفسیری مباحث اور قرآنی علوم مثلاً آیتوں کی تشریح، ان کے مفہوم و منشا کی توضیح، قرآن کے مشکل الفاظ و کلمات کی تحقیق اور بعض استعمالات کی توضیح، سبب نزول و شان نزول کی وضاحت اور تجوید و قرأت کے مسائل پر اس میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

۶- حدیث کی فنی بحثوں، اصول حدیث کے مباحث اور رجال و اسناد وغیرہ پر

بھی عالمانہ گفتگو کی گئی ہے، امام صاحب جب کوئی حدیث نقل کرتے ہیں تو پہلے یہ واضح کرتے ہیں کہ حدیث صحیح ہے یا غلط، اگر صحیح ہے تو اس کے اسباب اور غلط ہے تو اس کے وجوہ و علل بیان کرتے ہیں، اسی طرح حدیث منقطع ہے یا متصل، موقوف ہے یا مرفوع، مرسل ہے یا مسند، غریب و منکر ہے یا مقبول و مشہور، ضعیف اور فاسد الاسناد ہے یا قوی، حسن اور صحیح الاسناد، راوی ثقہ و ضابط ہے یا غیر ثقہ اور مجہول الحال، مدلس ہے یا غیر مدلس، شذوذ و تفرد سے اس نے کام لیا ہے یا دوسرے راویوں نے اس کی متابعت و موافقت کی ہے، اس کو وہم و شک ہوا ہے یا نہیں؟ نفس روایت کے اندر اس سے کیا سہو و خطا ہوئی ہے، راوی نے کوئی اضافہ یا کمی کی ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے، راوی کے ابہام، دوسرے راوی سے سماع و عدم سماع اور اسماء و اعلام کے متعلق وضاحتیں کرتے ہیں، ایک قسم کی متعدد حدیثیں اس لیے بیان کرتے ہیں کہ ان کا باہمی فرق و اختلاف اور کمی بیشی نمایاں ہو جائے۔

۷۔ حدیث کے مشکل و غریب الفاظ اور بعض اصطلاحی الفاظ پر ایک ماہر فن کی حیثیت سے داد تحقیق دی گئی ہے، نحو، بلاغت، معانی اور زبان کے استعمالات و اسالیب پر بھی بعض اچھی بحثیں کی گئی ہیں۔

مشکل الآثار کی سات جلدیں استنبول کے مکتبہ فیض اللہ میں موجود ہیں، دائرۃ المعارف حیدرآباد نے صرف ۴ جلدیں شائع کی ہیں جو تقریباً ۱۶۳۳ صفحات پر مشتمل ہیں، ہر جلد کے آخر میں فہرست مضامین ہے جس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۵۰ ہے، مرتبین نے مختصر حواشی بھی لکھے ہیں جو الفاظ و لغات کی تشریح اور اسماء و رواۃ کے متعلق معلومات پر مشتمل ہیں، اصل متن میں جو مختصر حدیثیں ہیں، ان کو حاشیہ میں مکمل درج کیا گیا ہے۔

محدث ابو الولید بن رشد مالکی نے اس کا مختصر تحریر کیا ہے، جو دائرۃ المعارف سے شائع ہوا ہے، اس میں امام طحاوی پر بعض اعتراضات بھی کئے گئے ہیں، اس کا قاضی القضاة جمال الدین یوسف بن موسیٰ المظنی نے المختصر من المختصر کے نام سے مختصر کیا ہے، یہ کتاب

ترتیب کے احکام... گلستان حدیث کے ہر حصے کے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ 433

بھی دائرۃ المعارف سے ۱۳۱۷ھ میں لمبی تقطیع کے ۳۶۷ صفحات میں شائع ہوئی ہے، چونکہ مشکل الآثار میں ترتیب و تہویب نہیں تھی، اس لیے ابن رشد نے اس کو ابواب پر مرتب کیا تھا، قاضی لمطی کے مختصر میں پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں اور اوصاف و خصوصیات کی حدیثیں ہیں، پھر معجزات اور سنہ وفات کی روایتیں ہیں، اس کے بعد احکام و شرائع کے ابواب جدا جدا عنوانات کے تحت ہیں، پھر تفسیر قرآن اور اسباب نزول کے ابواب ہیں، باجی کے اعتراضات کا اس میں جواب بھی دیا گیا ہے، پورے مجموعہ میں ۹۳۳ حدیثیں ہیں، صاحب معاصر نے طویل سندیں حذف کر دی ہیں، متعدد طرق و اسناد کی وہی حدیثیں نقل کی ہیں، جن میں نمایاں فرق و اختلاف تھا، دو مختلف روایتوں کے صرف اسی حصہ کو نقل کیا ہے، جس سے ان کے اصل مدلول اور روایت کا خاص فرق و تضاد ظاہر ہوتا ہے۔

**معانی الآثار:** اس کا نام شرح معانی الآثار بھی ہے، یہ امام صاحب کی سب سے اہم اور بلند پایہ کتاب سمجھی جاتی ہے، اس میں فقہ و حدیث دونوں قسم کے مباحث ہیں، اس کی اہمیت کا اندازہ علمائے فن کے ان اقوال سے ہوتا ہے۔

علامہ ابن حزم ظاہری نے اس کو سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے ہم پایہ قرار دیا ہے، (۱) شارح ہدایہ امیر اتقانی کا بیان ہے کہ اگر کسی شخص کو طحاوی کی عظمت و شان اور بلند پایگی میں کلام ہو تو اسے معانی الآثار کا مطالعہ کرنا چاہیے، حنفی مذہب کا کیا ذکر جملہ مذہب میں بھی ایسی بے مثال اور بے نظیر کتاب نہیں مل سکتی، (۲) علامہ یعنی فرماتے ہیں ”امام طحاوی کی جملہ تصنیفات نہایت عمدہ اور پراز منفعت ہیں، خصوصاً معانی الآثار کو اگر کوئی منصف مزاج شخص بغور دیکھے تو وہ اس کو حدیث کی اکثر مشہور و مقبول کتابوں سے برتر و راجح پائے گا، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ اور اس قسم کی دوسری کتابوں پر اس کی

(۱) مائیس الیہ الحدیث ص ۲۹ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۵۹ و ۲۶۰۔

فوقیت اور برتری بالکل عیاں ہے، کیوں کہ اس کے اندر وجوہ استنباط اور معارضات کی شکلیں بیان کی گئی ہیں اور ناسخ و منسوخ میں امتیاز کیا گیا ہے اور اس قسم کے بہت سے مباحث ہیں اور یہی چیزیں معرفت حدیث کی اصل بنیاد ہیں، بعض لوگ طحاوی کی مرجوحیت کا یہ سبب بتاتے ہیں کہ اس کے کچھ رجال ضعیف اور مرتبہ ثقاہت سے فروتر ہیں، حالانکہ سنن مذکورہ کا بھی یہی حال ہے بلکہ ان کی بعض روایات کو باطل اور موضوع بھی کہا جاتا ہے اور ضعیف حدیثوں کی تو کثرت ہے، سنن دارقطنی، بیہقی اور دارمی وغیرہ کا اس سے کوئی مقابلہ ہی نہیں، اس کتاب کی اہمیت و عظمت کے مخفی رہ جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ عام لوگوں میں مروج نہ تھی، اس لیے اس کے عجائب کا نہ تو استخراج کیا جاسکا اور نہ غرائب سے واقفیت حاصل کی گئی، یہ کتاب ایک طویل عرصہ تک گوشہ گمنامی میں پڑی رہی اور عام لوگ اس سے بے خبر تھے۔“ (۱) مولانا انور شاہ کشمیری کا بیان ہے کہ ”ہمارے نزدیک طحاوی کی مشہور کتاب معانی الآثار کا پایہ ابوداؤد کے قریب قریب ہے، کیوں کہ اس کے تمام رواۃ معروف و مشہور ہیں، گو بعض کے متعلق کلام بھی کیا گیا ہے، اس کے بعد ترمذی اور ابن ماجہ کا درجہ ہے۔“ (۲)

اس کا مقصد تالیف خود امام طحاوی نے یہ بیان کیا ہے:

”مجھ سے میرے بعض احباب نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احکامی روایات و آثار کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کی فرمائش کی تاکہ ناسخ و منسوخ اور واجب العمل روایات سے قلت و اقلت کی بنا پر ملحدین اور ضعیف الاسلام لوگوں کا یہ وہم دور ہو جائے کہ ان میں تضاد و اختلاف ہے، اس لیے اس کتاب میں ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید اور واجب العمل روایات نیز علما کی تاویل و توجیہ ان کے دلائل و شواہد اور مرجح و مختار مسلک کی تفصیل بیان کی گئی ہے، ترجیح کے دلائل و وجوہ بھی نقل کیے گئے ہیں اور ثبوت و تائید میں کتاب

(۱) مائیس الیہ الحدیث ص ۳۰ (۲) فیض الباری ج ۱ ص ۵۸، ۵۷۔

وسنت، صحابہؓ و تابعین کے آثار اور اجتماع وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔ (۱)

امام طحاوی نے اس کتاب میں مختلف حیثیتوں سے احادیث کا تضاد و اختلاف دور کیا ہے اور ان کے محمل کی ایسی تعیین کی ہے، جو روایات و قیاس کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے، طریقہ تصنیف یہ ہے کہ پہلے اختلافی امور و مسائل میں مرجوح مسلک کی موید روایات نقل کی ہیں، اس کے بعد اس سے مختلف اور راجح مسلک کی حدیثیں اور ان کے مویدات ذکر کر کے دونوں میں محاکمہ اور ہر مذہب کے دلائل و شواہد اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ روایات کا ظاہری اختلاف بھی رفع ہو گیا ہے اور ان میں مکمل تطبیق بھی ہو گئی ہے، انھوں نے توجیہ و توفیق کے مندرجہ ذیل اصول اختیار کیے ہیں۔

- ۱- دو قسم کی متضاد سمجھی جانے والی حدیثوں میں ایک قسم کو اولویت پر اور دوسری قسم کو غیر اولویت پر محمول کر کے فرق و تضاد کی نفی کی گئی ہے۔
- ۲- احادیث مختلفہ کو مطلق و مقید، مجمل و مفصل اور خاص و عام وغیرہ پر محمول کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں۔
- ۳- ناسخ و منسوخ روایات کی تعیین اور ان میں امتیاز کر کے تعارض کو دفع کیا گیا ہے۔

- ۴- اگر صحیح الاسناد اور قوی روایات ضعیف اور کمزور حدیثوں کے معارض ہوں تو پہلی قسم کی حدیثوں کو قابل اختیار سمجھا جائے گا اور دوسری قسم کی حدیثوں کی یا تو توجیہ کی جائے گی یا مناسب توجیہ نہ ہونے کے وقت ان کو رد کر دیا جائے گا۔
- ۵- اگر کوئی روایت کسی متواتر حدیث کے خلاف ہو تو متواتر کے مقابلہ میں غیر متواتر روایت کو ساقط قرار دیا جائے گا۔

۶- اصول و کلیات شرع کے معیار پر حدیثوں کا جائزہ لے کر ان کی ایسی توجیہ کی

گئی ہے کہ ظاہری اختلاف ختم ہو گیا ہے۔

معانی الآثار میں اکابر ائمہ احناف یعنی امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے آرا و مسلک کو نقل کرنے کا زیادہ التزام کیا گیا ہے اور ان بزرگوں کے اقوال کی حدیثوں سے مطابقت بھی دکھائی گئی ہے، تاہم دوسرے اکابر فقہاء امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری، ابن ابی لیلیٰ اور فقہائے احناف میں امام زفر کے مذاہب کی بھی کہیں کہیں تصریح کی گئی ہے، اور فقہائے صحابہ و تابعین کے مذاہب بھی نقل کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کی اہمیت کا سب سے اہم اور نمایاں پہلو اس کی تحقیقی و استدلالی شان اور فقہانہ و مجتہدانہ رنگ ہے، امام صاحب حنفی ہونے کے باوجود خود بھی مجتہد اور صاحب فقہ تھے، اس لیے انھوں نے مختلف فیہ امور و مسائل میں محاکمہ کر کے مرجع و مختار مسلک کی نشاندہی کی ہے اور عموماً نہایت تنقیح اور پوری تحقیق کے بعد ہی کسی مسلک کو مرجع قرار دیا ہے، یہاں تک کہ اپنے ائمہ سے بھی بعض مواقع پر اختلاف کیا ہے۔

روایات کی چھان بین اور تحقیق و تفتیش میں بھی بڑی دیدہ ریزی اور دقت نظر سے کام لیا گیا ہے، ان کے متون و طرق کی معرفت، اسناد کا جائزہ، رجال اور رواۃ کی تحقیق، رطب و یابس حدیثوں میں امتیاز، ارسال، انقطاع و وقف اور رفع و اتصال کی نشاندہی اور روایت کے علاوہ درایت کے لحاظ سے بھی حدیثوں کو پرکھا گیا ہے۔

معانی الآثار میں حدیث و فقہ کے علاوہ تفسیر و قرأت کی بعض لطیف بحثیں بھی ہیں، مشہور مفسرین صحابہ و تابعین اور ائمہ تفسیر و قرأت کے اقوال، مختار و مرجع قرأت و تفسیر کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور سنت و حدیث کی طرح قرآنی آیات سے استنباط مسائل کیا گیا ہے، سیر، انساب اور ایام و مشاہد کا بھی ایک حد تک حسب موقع ذکر ملتا ہے، ابواب کی ترتیب و مطالب کی افادیت اور انداز بیان کے لحاظ سے بھی یہ ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

خصوصیات: ۱- اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں احادیث و آثار کا تضاد

ثابت کیا گیا ہے اور جو حدیثیں بظاہر باہم مختلف و متناقض معلوم ہوتی ہیں، ان کی نہایت مناسب اور دلنشین توجیہ و تطبیق بیان کی گئی ہے۔

۲- گو واسطین احناف کے مسالک کے نقل کا زیادہ التزام کیا گیا ہے لیکن دوسرے فقہاء و مجتہدین کے اقوال اور خصوصاً صحابہ و تابعین کے آثار و فتاویٰ کی بھی صراحتاً نشاہد ہی کی گئی ہے۔

۳- اقوال مختلفہ میں تطبیق اور ان کے دلائل کی تشریح کر کے مرجع مسلک کی تعیین کی گئی ہے۔

۴- مختلف طرق، تعدد اسناد، روایت اور راوی کی قوت و ضعف کے اسباب، ناخ و منسوخ، مطلق و مقید اور خاص و عام کی وضاحت نیز علمائے جرح و تعدیل کے اقوال کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

۵- معانی الآثار کی بعض حدیثوں سے دوسری کتب احادیث خالی ہیں۔

۶- وضع و ترتیب کی خوبی، انداز بیان اور طرز ادا کا حسن و دلآویزی۔

معانی الآثار پر اعتراض اور اس کا جواب: معانی الآثار کی ان خصوصیات اور اہمیتوں کے باوجود اس پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور اعتراض امام بیہقی کا ہے کہ امام طحاوی نے ان حدیثوں کی جو عام محدثین کے نزدیک صحیح ہیں مگر احناف کے مسلک کے خلاف ہیں تضعیف اور ان روایتوں کی جو محدثین کے نزدیک صحیح ہیں مگر احناف کے مسلک کی موید ہیں، تصویب کی ہے لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس کا جواب پہلے گزر چکا ہے کہ امام طحاوی "حنفی ہونے کے باوجود مجتہد بھی تھے اور اپنی انصاف پسندی کی وجہ سے بعض مسائل میں احناف کے مسلک کو مخالف حدیث ہونے کی وجہ سے مرجوح سمجھتے ہیں اور اگر کہیں ایسا واقعی ہوا ہے تو اس کی مثالیں دوسرے مذاہب کے ائمہ کے یہاں بھی ملتی ہیں، اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے "امام بیہقی کی

اس امام عظیم کی شان میں جس پر اکابر علما و مشائخ نے اعتماد کیا ہے، یہ کھلی ہوئی زیادتی ہے“ حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں ”امام طحاوی کی شان سے یہ بعید اور ان کی عظمت کے منافی ہے، بخدا مجھ کو اس کتاب میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جو امام بیہقی نے اس کے بارے میں کہی ہے“ علامہ یعنی فرماتے ہیں کہ ”کسی عاقل و منصف مزاج شخص کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امام طحاوی نے قرآن و احادیث نبویہ سے استنباط احکام کیا ہے۔“ (۱)

امام بیہقی کی تردید میں علاؤ الدین ترکمانی نے الجواہر النقی والرد علی البیہقی کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ (۲)

معانی الآثار پر اعتراض کرنے والوں میں ایک ممتاز نام شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کا بھی ہے، ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ صحاح کے مقابلہ میں اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، اس سلسلہ میں مولانا عبداللہ لکھنوی کی یہ رائے نقل کر دینا کافی ہے کہ ”میں ابن تیمیہ کے متعلق وہی بات عرض کروں گا جو شیخ صالح نے حافظ ابن حجرؒ کے بارے میں کہی ہے کہ ”ان کا مؤطا اور صحیح بخاری میں تفریق اور مؤطا کی صحت سے انکار صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے مؤطا میں اُس امعان نظر سے کام نہیں لیا ہے، جس امعان نظر سے بخاری میں کام لیا ہے، ورنہ ان کو مؤطا کی اہمیت سے انکار نہ ہوتا، اسی طرح اگر امام ابن تیمیہ نے بھی صحاح ستہ کی طرح معانی الآثار پر گہری نظر ڈالی ہوتی تو وہ طحاوی اور ائمہ صحاح کے درمیان اس طرح تفریق روانہ رکھتے، بلکہ ابن حزم کی طرح جو اگرچہ اپنے تفت کے لیے مشہور ہیں اس کی عظمت کا اعتراف کرتے۔ (۳)

معانی الآثار کی صحت اور اس کے رجال وغیرہ کے بارے میں بعض لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے شارح ہدایہ امیر اتقانی لکھتے ہیں:

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۶۰ و تائیس الیہ الجلید ص ۳۰ و ۳۱ (۲) تفریق معانی الآثار ج ۲ ص ۵۔

(۳) تائیس الیہ الجلید ص ۳۱۔



”میرے نزدیک امام طحاوی پر ان لوگوں کے اعتراض و انکار کے کوئی معنی نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ معتمد و ثقہ ہیں اور متہم نہیں ہیں، اس کے علاوہ ان کا علمی پایہ بلند اور مرتبہ اجتہاد مسلم ہے، ورع و تقویٰ کے لحاظ سے بھی وہ فائق تھے اور مذاہب فقہ سے واقفیت میں بھی شرف و تقدم رکھتے تھے..... اگر تم کو ابو جعفر کے فضل و کمال میں شک ہو تو ان کی کتاب شرح معانی الآثار کا مطالعہ کرو، اس کی حنفی مذہب تو کجا کسی مذہب میں بھی کوئی نظیر اور مثال تم کو نظر نہ آئے گی۔“ (۱)

شروح و تلخیصات: معانی الآثار کی اہمیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علما نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، وہ نصاب درس میں شامل کی گئی، اس کے شروح و حواشی لکھے گئے اور تلخیص بھی کی گئی، ذیل میں اس کی شروح اور تلخیصات کی فہرست درج کی جاتی ہے۔

۱- علامہ بدرالدین عینی (۸۵۵ھ) کو اس کتاب سے بڑا شغف تھا، انھوں نے ایک عرصہ تک اس کا درس بھی دیا اور اس کی دو شرحیں مہانی الاخبار اور نخب الافکار کے نام سے لکھیں، دونوں کے نسخے دارالکتب المصریہ میں موجود ہیں، پہلی کتاب آٹھ جلدوں میں اور دوسری چھ جلدوں میں ہے، ان کے علاوہ انھوں نے طحاوی کے رجال پر بھی ایک مستقل کتاب معانی الاخبار فی رجال معانی الآثار دو جلدوں میں لکھی، اس کا ناقص نسخہ بھی دارالکتب المصریہ میں پایا جاتا ہے، (۲) زاہدی کا بیان ہے کہ عینی نے طحاوی پر بخاری سے کم کام نہیں کیا ہے۔ (۳)

۲- شیخ قاسم بن قطلوبغا حنفی (م ۶۷۹ھ) نے الاثیر بر رجال معانی الآثار لکھی جو طحاوی کے رجال پر نہایت مفید کتاب ہے۔ (۴)

۳- ابوالحسن محمد بن محمد باہلی مالکی (م ۳۲۱ھ) کی شرح تصحیح معانی الآثار جس

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۹۲ (۲) الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۳۲ و ۳۳ و فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۳۳ (۳) الحاوی ص ۳۳، ۳۴ (۴) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۶۰ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۹۲۔

کے متعلق بروکلیمان نے لکھا ہے کہ بنگاک میں محفوظ ہے۔ (۱)

۳- حافظ ابو محمد علی بن زکریا نجی مولف لباب (۶۹۸ھ) بھی اس کے مشہور

شارحین میں ہیں، ان کی شرح کا ایک جز آستانہ کے مکتبہ ایا صوفیا میں موجود ہے۔ (۲)

۵- حافظ عبدالقادر قرشی (۷۷۵ھ) نے الحادوی فی تخریج الاحادیث معانی

الآثار لکھی جو بڑی عمدہ اور مفید شرح ہے، اس میں مصنف نے طحاوی کی حدیثوں اور سندوں

کا صحاح، مشہور مسانید اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ سے تعلق اور نسبت ظاہر کی ہے، اس کا

ایک جز دارالکتب المصریہ میں موجود ہے۔ (۳)

۶- حافظ ابو عمر بن عبدالبر (۴۶۳ھ) نے جو طحاوی کے بڑے عظمت شناس

اور اکثر اپنی کتابوں میں ان کا حوالہ دیتے ہیں تلخیص کی ہے۔ (۴)

۷- حافظ ابو محمد عبداللہ بن یوسف زبلی صاحب نصب الراية (۷۶۲ھ) کی

تلخیص مکتبہ رواق اتراک اور مکتبہ کوبرلی میں محفوظ ہے۔ (۵)

۸- شیخ الاسلام حافظ ابن حجر (۸۵۲ھ) نے اتحاف المبرہ میں اس کے

اطراف کو جمع کیا ہے۔ (۶)

۹- شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب دہلوی نے عربی میں شرح امانی الاخبار فی

شرح معانی الآثار لکھی ہے، اس کی دو جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں۔

معانی الآثار کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے، ۱۳۰۲ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے اس کو

لمبی تقطیع کی دو جلدوں میں شائع کیا ہے، دونوں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۹۰۰ ہے،

مولانا وصی احمد دہلوی نے اس پر مختصر حواشی تحریر کیے ہیں، ان میں الفاظ و لغات کی تحقیق، اسما

و اعلام کی مختصر تشریح اور دوسرے نسخوں کے اختلاف کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۶۰ و مقدمہ تحفۃ الاحوزی ص ۹۲ (۲) الحادوی ص ۳۳ (۳) الحادوی ص ۳۱، ۳۲

و فہرست کتب خانہ خدیوہ مصر ج ۱ ص ۳۳۳ (۴) الحادوی ص ۳۳ (۵) ایضاً (۶) تیسرے ایہ الحادوی ص ۳۰، ۳۱

نَصَرَ اللَّهُ أَمْرًا سَمِعَ مِنَّا حَدِيثًا قَبْلَهُ (حدیث)

## تذکرۃ المحدثین

حصہ دوم

اس میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات زندگی و سوانح اور ان کی علمی و حدیثی خدمات کی روح پرور و دلآویز تفصیل بیان کی گئی ہے۔



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## دیباچہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِیْمِ

محمد، الامین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

صاحب تصانیف محدثین کرام کے حالات میں ایک کتاب کی تالیف عرصہ سے دارالمصنفین کے پیش نظر تھی، حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں دوسرے ضروری کاموں کی وجہ سے اس کا موقع نہ ملا، ان کے لائق جانشین مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے یہ خدمت مولوی ضیاء الدین اصلاحی کے ذمہ کی، اس کی پہلی جلد ان کی رہنمائی میں شائع ہوئی، اس میں ان کا فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے، دوسری جلد کا بھی زیادہ حصہ ان کی زندگی میں مرتب کیا جا چکا تھا اور انہوں نے اس کے بعض حصے معارف میں شائع بھی کیے تھے، اب جب کہ یہ جلد چھپ رہی ہے تو ان کی یاد برابر آ رہی ہے، یقیناً اس کی اشاعت سے وہ بہت خوش ہوتے۔

پہلے خیال تھا کہ دو جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل ہو جائے گا لیکن دوسری جلد کے بعد بھی کئی ممتاز محدثین کے تذکرے رہ گئے اور اب اندازہ ہے کہ تین جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل ہوگا اور مزید ایک اور جلد ہندوستان کے محدثین کے لئے مخصوص کرنی ہوگی، قدر دانوں کا اصرار ہے کہ پہلے ہی جلد مرتب کی جائے، ان کی خواہش کے مطابق آئندہ پہلے ہندوستانی

محدثین سے متعلق جلد کی تالیف عمل میں آئے گی، اس کے بعد انشاء اللہ بیرونی ممالک کے محدثین کے متعلق تیسری جلد شائع ہوگی۔

اس جلد میں چوتھی صدی سے آٹھویں صدی کی ابتدا تک کے صاحب تصانیف محدثین کے حالات تحریر کئے گئے ہیں، حدیث کی جمع و تدوین کی تاریخ میں تیسری صدی ہجری کو زریں عہد سمجھا جاتا ہے، صحاح ستہ کے مصنفین اسی دور میں گذرے ہیں لیکن اس کے بعد کی صدیاں بھی صاحب کمال محدثین سے خالی نہیں ہیں، حدیث کے بڑے بڑے شارحین ان ہی صدیوں میں پیدا ہوئے، ان کے اہم کارنامے فن حدیث کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، اس جلد میں ان میں سے اکثر کے تذکرے اور ان کی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اس میں جن محدثین کا ذکر ہے ان کے زمانے میں عقائد و احکام کی بنیاد پر مسلمانوں میں متعدد فرقے پیدا ہو گئے تھے، محدثین عموماً اہلسنت والجماعت کے ہمنوا تھے، وہ کوئی ایسی بات انگیز کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے جو بظاہر کتاب و سنت کے خلاف ہوتی، اس سلسلہ میں بعض کے یہاں شدت پسندی بھی آگئی تھی، جو نیک نیتی اور حق پسندی ہی کا نتیجہ تھی لیکن اس کی وجہ سے ان کو مخالفتوں اور آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا اور اعتراضات کا نشانہ بھی بننا پڑا، ان اعتراضات سے کہیں کہیں سرسری گزر جانا ممکن نہ تھا لیکن ان کے بارہ میں جو کچھ تحقیق سے درست معلوم ہوا ہے وہی لائق مرتب نے پیش کیا ہے اور جانبداری سے پرہیز کیا ہے۔

کاپی اور پروف کی تصحیح پر پوری توجہ صرف کی گئی ہے مگر اس کے بعد بھی کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی ناظرین اپنے ذوق سے خود تصحیح کر سکتے ہیں، اس کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ ہر محدث کے حالات نئے صفحے سے شروع کیے جائیں، مگر ایک جگہ آگے کے

تذکرۃ المحدثین..... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

445

صفحات چھپ جانے کی وجہ سے اس کا التزام نہیں ہو سکا اور مجبوراً یہ خامی انگیز کرنی پڑی (۱) لائق مرتب نے جس محنت و کاوش اور سلیقہ سے یہ کتاب مرتب کی ہے، اسے پڑھ کر ناظرین ضرور محظوظ ہوں گے، اس کی اشاعت سے دارالمصنفین کے سلسلہ مطبوعات میں ایک اچھی اور قابل قدر تصنیف کا اضافہ ہوا ہے، ناظرین دعا کریں کہ مرتب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپ کے اسوہ حسنہ پر عمل کی بیش از بیش توفیق نصیب ہو۔ آمین

سید صباح الدین عبدالرحمن

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

۷ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ، ۲۶ فروری ۱۹۷۷ء

(۱) الحمد للہ نئے ایڈیشن میں یہ خامی دور ہو گئی ہے اور کہیں کہیں جو تحقیقی فروگزاشیں ہو گئی تھیں ان کو بھی درست کر دیا گیا ہے۔ والعصمة لله وحده۔ (ض)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## امام عبدالباقی بن قانع

متوفی ۳۵۱ھ

نام و نسب: عبدالباقی نام، ابوالحسین کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، عبدالباقی بن قانع بن مرزوق بن واثق۔ (۱)

ولادت، خاندان اور وطن: خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ وہ ۲۵۰ھ/۲۵۰ھ و ۲۶۵ھ کو پیدا ہوئے، دوسرے مورخین نے بھی یہی سنہ تحریر کیا ہے مگر ایک روایت ۲۶۶ھ کی بھی ہے۔ (۲)

امام ابن قانع بنو امیہ کے موالی میں تھے اور بغداد ان کا وطن تھا، اس لیے اموی اور بغدادی کہلاتے تھے۔ (۳)

اساتذہ: ان کو جن اصحاب کمال اور ائمہ حدیث سے شرف تلمذ حاصل تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن احمد و کعبی، ابراہیم بن اسحاق حربی، ابراہیم بن یحییٰ بلدی، احمد بن اسحاق وزان، احمد بن علی خراز، احمد بن یحییٰ حلوانی، اسحاق بن حسن حربی، اسماعیل بن فضل بلخی، حارث بن ابی اسامہ، حسن بن عباس رازی، محمد بن مسلم واسطی، عبید بن شریک بزار،

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۸۷ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ (۲) لسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۴ (۳) تذکرۃ

الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ و تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۸۸۔



علی بن محمد بن ابی الشوارب وغیرہ۔

تلامذہ: ان کے چند ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن بن رزقویہ، ابوالحسن دارقطنی، ابوالحسین بن فضل قطان، احمد بن علی بادی، ابوعلی بن شاذان، ابوالقاسم بن بشران، عبدالعزیز بن محمد بن شبان اور مرزبانی وغیرہ۔ (۱)

رحلت و سفر: طلب علم کے لیے ان کے سفر کی تفصیلات تو معلوم نہیں ہو سکیں لیکن علامہ ذہبی لکھتے ہیں، وکان واسع الرحلة (کثیر الاسفار تھے) اور شاہ عبدالعزیز صاحب کا بیان ہے ”ورحلت بسیار کردہ۔“ (۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے متعدد مقامات کے علمی سفر کیے تھے۔

حفظ و ثقافت: امام ابن قانع بغداد کے مشہور حفاظ حدیث میں تھے، کثیر الحفظ ہونے کی وجہ سے الحافظ ان کا لقب پڑ گیا تھا، عام علمائے فن سے ان کی توثیق بھی منقول ہے، ابن ناصر الدین فرماتے ہیں کہ علما کی ایک جماعت سے ان کی توثیق منقول ہے، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ وہ حافظ، ثقہ اور امین تھے، علامہ خطیب کا بیان ہے کہ ہمارے عام اساتذہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، ابن جوزی، علامہ ذہبی اور دوسرے علمائے نے بھی ان کی ثقافت کا تذکرہ کیا ہے۔ (۳)

حدیث میں درجہ: وہ بڑے نامور علما اور مشہور حفاظ حدیث میں شمار کیے جاتے تھے، اس فن میں ان کی عظمت اور بلند پایگی کا اندازہ علامہ ذہبی کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ ابن قانع کثیر الحدیث تھے۔

روایت کی طرح درایت میں بھی امتیاز رکھتے تھے، خطیب لکھتے ہیں کہ وہ اہل علم اور اصحاب فہم و درایت میں تھے۔ (۴)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ و تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۸۸ (۲) تذکرۃ ج ۳ ص ۹۹ و بیسٹن الحدیث ص ۸۶ (۳) حوالہ مذکورہ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ و تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۸۸۔

رجال: حدیث کی طرح رجال پر بھی ان کی اچھی نظر تھی، اسماء الرجال کی کتابوں میں ان کے اقوال درج ہیں۔

فقہ وقضا: فقہ میں ان کا درجہ بلند تھا، اسی لیے قضا کے منصب پر فائز کیے گئے، احکام و مسائل پر ان کی وسعتِ نظر کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابو بکر بھاص رازی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں ان سے بے شمار روایتیں نقل کی ہیں۔ (۱)

مذہب و مسلک: مسلک حنفی تھے اور ان کا شمار فقہائے حنفیہ میں ہوتا ہے، حافظ ابن حجر نے بھی ان کے حنفی اور اصحابِ رائے میں ہونے کا ذکر کیا ہے اور عبدالقادر قرشی اور صاحب تاج التراجم نے ان کا طبقات الحنفیہ میں ذکر کیا ہے۔ (۲)

وفات: ۸۶ سال کی عمر میں اپنے وطن بغداد میں ۷۷۱ھ کو انتقال کیا، ابن ماکولانہ ۳۵۴ھ کی روایت کی ہے مگر حافظ ابن حجر نے اس کی تضعیف کی ہے۔ (۳) ان کے ازواج و اولاد اور دیگر اہل خاندان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے، عبدالقادر قرشی نے الجواہر میں ان کے ایک بھائی احمد کا ذکر کیا ہے جو نامور قاضی، ممتاز فقیہ اور علم الفرائض کے ماہر تھے۔

تصنیفات: حافظ ابن قانع بڑے صاحب علم تھے، اس کا ثبوت ان کی متعدد تصنیفات ہیں، مورخین نے ان کو کئی کتابوں کا مصنف بتایا ہے لیکن ان میں سے صرف ایک کا نام معلوم ہو سکا اور یہ معجم الصحابہ ہے جو حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہے، حافظ ابن حجر نے مجمع الموسس میں (۴) اور دوسرے علمائے سیر و تراجم نے بھی اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے، حافظ ذہبی اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کی ایک روایت نقل کی ہے جو یہ ہے:

عن كعب بن عياض قال

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم

(۱) الجواہر المفیہ ج ۱ ص ۲۹۳ (۲) ایضاً تاج التراجم فی طبقات الحنفیہ ص ۳۴ ولسان المیزان ج ۳

ص ۴۸۳ (۳) لسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۳ (۴) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۵۔

علیہ وسلم لكل امة فتنه  
 وفتنة امتی المال۔ (۱)  
 ہر امت کے لیے ایک نہ ایک چیز  
 موجب فتنہ ہوتی ہے اور میری امت  
 کے لیے مال باعثِ فتنہ ہے۔

مشہور فقیہ ابو یعلیٰ صدیقی نے اس معجم کی ان حدیثوں کی جو وہم و تصحیف پر مشتمل  
 ہیں وضاحت کے لیے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام الاعلام والتعريف مما لا بن  
 قانع فی معجمه من الاوهام والتصحيف تھا۔ (۲)  
 غالباً انھوں نے رجال پر بھی کوئی کتاب لکھی تھی کیوں کہ رجال کی تمام معتبر  
 کتابوں میں ان کے اقوال ملتے ہیں۔

ابن قانع پر بعض اعتراضات: عام علمائے فن نے ان کی توثیق کی ہے لیکن بعض علمائے  
 ان پر اعتراضات بھی کئے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱- ان کے مشہور شاگرد امام دارقطنی کا بیان ہے کہ ان کا حافظہ اگرچہ نہایت عمدہ  
 تھا لیکن وہ خطا بھی کرتے تھے اور بعض روایتوں میں ان سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ خطا پر  
 اصرار کرتے تھے، مشہور محدث برقانی کا بیان ہے کہ اہل بغداد ان کو ثبوت بتاتے ہیں لیکن  
 میرے نزدیک وہ ضعیف ہیں۔

۲- علامہ ابن حزم نے ان کو منکر الحدیث کہا ہے اور لکھا ہے کہ عام محدثین نے  
 ان سے روایت کرنے میں بالکل احتراز کیا ہے اور ابن فتحون سے منقول ہے کہ حافظ حدیث  
 میں ان سے زیادہ کثیر الاوہام اور منکر المتون شخص میں نے نہیں دیکھا، مگر اس کے باوجود جلیل  
 القدر اشخاص نے ان سے روایت کی ہے اور ان کے حافظ کی تعریف کی ہے مثلاً امام دارقطنی  
 وغیرہ، مگر یہ دونوں اعتراضات مطلقاً صحیح نہیں ہیں، اصل حقیقت یہ ہے جیسا کہ خطیب نے  
 ابوالحسن بن فرات سے نقل کیا ہے کہ وفات سے دو سال پہلے وہ سوء حفظ اور اختلال عقل

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ و بیستان الحدیث ص ۸۸، ۸۹ (۲) لسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۲۔

کے عوارض میں مبتلا ہو گئے تھے، اس لیے ہم لوگوں نے ان سے سماع و روایت کا سلسلہ موقوف کر دیا تھا لیکن بعض لوگوں نے اس وقت اس حالت میں بھی ان سے سماع جاری رکھا، خطیب برقانی کے اعتراض پر حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ برقانی کی تضعیف کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، ابن قانع اصحاب علم و فہم و روایت میں تھے اور ہمارے عام شیوخ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، البتہ آخر عمر میں وہ اختلال اور نسیان کے عوارض میں مبتلا ہو گئے تھے۔

علامہ ابن حزم کا اعتراض ناواقفیت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور اگر اس کو صحیح مانا جائے تو اس کا بھی وہی جواب ہے جو پہلے گذر چکا، حافظ بن حجر نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ آخر عمر میں اختلال میں مبتلا ہو گئے تھے، اس لیے لوگوں نے ان سے روایت کرنا ترک کر دیا تھا۔ (۱)

ان تفصیلات سے واضح ہو گیا کہ ابن قانع کی ثقاہت مسلم ہے، البتہ آخر عمر میں بعض عوارض میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے علمائے فن نے ان سے اس وقت روایت کرنے میں احتیاط برتا ہے، ابن جوزی کا بیان ہے:

وان كان من اهل العلم والفهم والثقة غير انه تغير في آخر عمره. (۲)

وہ اگرچہ صاحب علم و فہم اور ثقہ تھے لیکن آخر عمر میں متزلزل ہو گئے تھے۔

☆☆☆

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۸۹ و میزان الاعتدال ج ۲ ص ۹۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۹۹ و لسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۳، ۳۸۴ (۲) المختصر ج ۷ ص ۱۳۔

# امام سعید بن اسکن

متوفی ۳۵۳ھ

نام و نسب: سعید نام، ابوعلی کنیت اور نسب نامہ حسب ذیل ہے:

سعید بن عثمان بن سعید بن اسکن۔ (۱)

اپنے جد اعلیٰ کی نسبت سے ابن اسکن کہلاتے ہیں اور اسی نام سے مشہور ہیں۔

ولادت و وطن: ۲۹۳ھ ان کا سنہ ولادت ہے، اصلی وطن بغداد تھا لیکن مصر میں سکونت اختیار کر لی تھی، (۲) اسی لیے بغدادی اور مصری دونوں نسبتوں سے مشہور ہوئے، خاندانی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

اساتذہ و شیوخ: ان کے جن شیوخ کا نام معلوم ہو سکا وہ یہ ہیں:

ابن جوصا، ابو عمرو بہ حرائی، ابوالقاسم البغوی، سعید بن عبدالعزیز، حلبی، محمد بن محمد بن بدر باہلی اور محمد یوسف فربری۔

تلامذہ: بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابو جعفر بن عون، ابو عبد اللہ بن مندہ، عبد اللہ بن محمد بن اسد قرطبی، عبد الغنی بن

سعید، علی بن محمد دقاق، ابو عبد اللہ محمد بن یحییٰ بن مفرج۔ (۳)

طلب علم کے لیے سفر: علم کی تحصیل اور احادیث کی طلب کے لیے اس زمانہ کے مشہور مراکز حدیث کا سفر کیا علامہ ذہبی نے العصر میں عراق، شام، جزیرہ، خراسان اور ماوراء النہر

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۹ (۲) ایضاً حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۳۷ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۹۔

تذکرۃ الحمدین ..... گلستان حدیث کے بہتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ 452

کے علما سے اور تذکرہ میں جیچون سے فرات تک کے ارباب کمال سے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔ (۱)

حفظ وثقاہت: امام ابن السکن کا مشہور حفاظ اور معتبر محدثین میں شمار ہوتا ہے، مورخین نے ان کو الحافظ اور الحافظ الکبیر لکھا ہے اور ان کی عدالت وثقاہت پر بھی اتفاق ہے، ابن عماد نے ثقہ و حجت اور سیوطی نے الحافظ الحجہ لکھا ہے۔ (۲)

حدیث میں درجہ: علامہ سیوطی نے مصر کے اعلیٰ طبقہ کے محدثین اور نقادان فن میں ان کا تذکرہ کیا ہے، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ابن السکن نے فن حدیث کی جانب خاص توجہ کی اس میں کتابیں لکھیں اور حدیثیں جمع کیں، ان کی حدیث میں بصیرت اور ژرف نگاہی کا یہ حال تھا کہ اکثر علما اس باب میں ان کی جانب رجوع کرتے اور ان کی رایوں پر پورا اعتماد کرتے، ایک دفعہ کچھ محدثین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، انہوں نے کہا کہ ہمارے سامنے حدیث کی بہت سی کتابیں آگئی ہیں، آپ ان میں سے چند ایسی کتابوں کی نشاندہی کر دیں جن پر ہم اکتفا کر سکیں، وہ یہ سن کر گھر میں داخل ہوئے اور کتابوں کے چار بستے لا کر تلے اوپر رکھ دیے پھر فرمایا:

ہذہ قواعد الاسلام کتاب  
مسلم و کتاب البخاری و  
کتاب ابی داؤد و کتاب  
یہ اسلام کی بنیادیں ہیں یعنی صحیح مسلم،  
صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، اور سنن  
نسائی۔

النسائی۔ (۳)

امامت و شہرت: اپنے کمالات اور عظمت کی وجہ سے ان کا شمار ائمہ میں ہوتا ہے، علامہ ذہبی نے العمر میں احد الائمہ لکھا ہے اور تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں کہ ان کی شہرت کا دور دور چہ چا

(۱) تذکرۃ والعمر ج ۳ ص ۲۹۷۔ (۲) شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۲ و سنن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴ (۳)

شروط الائمہ ص ۸۔

تھا، ان کی کتاب الصحیح المنتقى اندلس میں پہنچ چکی تھی۔ (۱)  
 وقایع: ۵۹ سال کی عمر میں محرم ۳۵۳ھ میں انتقال کیا۔ (۲)  
 تصنیفات: اہل سیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں جو  
 معدوم ہیں صرف دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے۔

۱- مصنف: اس کا صاحب کشف الظنون اور صاحب تحفۃ الاحوذی نے ذکر کیا  
 ہے، (۳) مگر اور کسی قسم کے معلومات نہیں لکھے ہیں۔  
 ۲- الصحیح المنتقى: یہ احکامی احادیث و سنن کا مجموعہ ہے، گو ان کی سندیں مصنف  
 نے حذف کر دی ہیں تاہم اس میں صحت کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے، اسی لیے اس کا نام منتقى  
 رکھا ہے، اور اپنے خیال میں انھوں نے صرف صحیح روایتیں ہی اس میں شامل کی تھیں اور  
 ضروری مسائل و احکام کے ابواب قائم کر کے ان کے تحت حدیثیں درج کی ہیں، اس کتاب  
 کی حدیثوں کی تین نوعیتیں ہیں، میں نے اس کتاب میں جن حدیثوں کا جملہ بیان کیا ہے  
 یعنی ان کے صحت و سقم کی کوئی تشریح نہیں کی ہے وہ بالاتفاق صحیح ہیں، دوسرے نمبر پر ایسی  
 حدیثیں ہیں جو کسی نہ کسی امام کی مختار و معمول بہا ہیں لیکن بعض ایسی حدیثیں بھی نقل کی ہیں  
 جن کے ناقلین ان کی روایت میں منفرد ہیں مگر میں نے اس کی علت اور راوی کے افراد کا  
 ذکر کر دیا ہے، (۴) ابن حزم کا بیان ہے کہ صحیحین کے بعد اسی کتاب کا درجہ ہے۔ (تدریب  
 ص ۳۲)

(۱) العبر ج ۲ ص ۲۹۷ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۹، (۲) العبر ج ۲ ص ۲۹۷ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۹

(۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۵۱ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۶۔ (۴) الرسالة المسطرہ ص ۲۳ بحوالہ

شفاء القامبلی۔

## امام ابو بکر شافعیؒ

متوفی ۳۵۴ھ

نام و نسب: محمد نام، ابو بکر کنیت اور بزار لقب تھا، نسب نامہ حسب ذیل ہے،

محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ۔ (۱)

ولادت و وطن: امام ابو بکر شافعی کی ولادت ۲۶۰ھ میں واسط کے قریب ایک مقام جبل (جبل) میں ہوئی لیکن انھوں نے بغداد میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اسی لیے بغدادی

کی نسبت سے مشہور ہوئے، علمائے سیراسی بنا پر ان کو محدثین عراق میں لکھتے ہیں۔ (۲)

اساتذہ: ان کے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابو بکر بن ابی الدنیا، ابو قلابہ رقاشی، قاضی اسماعیل، عبداللہ بن روح مدائنی، محمد

بن جہم سمیری، محمد بن شداد سمعی، محمد بن فرج ازرق اور موسیٰ بن ہبل و شاد۔

موسیٰ بن ہبل و شاد نے اسماعیل بن علیہ جیسے عظیم محدث سے اور محمد بن شداد سمعی

نے یحییٰ بن قطان سے اکتساب فیض کیا تھا۔ (۳)

تلامذہ: ابو بکر کے حلقہ فیض سے وابستہ لوگوں میں بعض کے اسماء حسب ذیل ہیں:

ابو علی بن شاذان، احمد بن عبداللہ بن محاملی، امام دارقطنی، عبدالملک بن بشران،

(۱) تذکرۃ الحفاظ ۳ ص ۹۶ وستان المحدثین ص ۵ (۲) ایضاً کتاب الانساب ورق ۳۲۶ (۳) تذکرۃ

الحفاظ ج ۳ ص ۹۶۔



عمر بن شاہین، ابوالحسن محمد بن احمد، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حافظ اور ابوطالب محمد بن محمد بن ابراہیم بن غیلان۔ (۱)

حصول علم کے لیے سفر: انھوں نے ۲۱ سال کی عمر میں ۲۷۶ھ میں حدیث کی تحصیل شروع کی، اس کے بعد اس فن سے اس قدر اشتغال ہوا کہ متعدد مقامات کا سفر کیا، مصر و جزیرہ جانے کی تصریح ملتی ہے۔ (۲)

ضبط و ثقاہت: محدثین اور علمائے فن نے ان کی توثیق کی ہے، حافظ ذہبی نے الامام الحجۃ المفید اور خطیب نے ثقہ و ثبت لکھا ہے، امام دارقطنی کا بیان ہے کہ وہ ثقہ و مامون تھے، علامہ سمعانی لکھتے ہیں کہ وہ ایسے ثقہ و مامون تھے، جن کی نظر احادیث کے معاملہ میں کبھی نہیں چوکتی تھی، ان کے زمانہ میں ان سے زیادہ معتبر اور ثقہ آدمی کوئی نہیں تھا۔ (۳)

حدیث میں درجہ و مرتبہ: حدیث میں ان کا درجہ و مرتبہ اتنا بلند تھا کہ امام دارقطنی نے ان کو جہل حدیث اور ذہبی نے امام و محدث عراق کہا ہے، علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں کہ وہ حدیثوں کے عالم اور ان کی سندیں نہایت عالی ہوتی تھیں، علامہ سمعانی لکھتے ہیں۔

مارأیت لہ الا اصولا صحیحہ متقنۃ۔ (۴)  
میں نے ان کے اصول حدیث نہایت صحیح اور قوی پائے۔

مذہب و مسلک: ان کے فقہی مذہب کی باقاعدہ تصریح نہیں ملتی لیکن شافعییت کی نسبت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شافعی رہے ہوں گے۔

کارنامہ: امام ابوبکر بڑے صاحب عزیمت اور نہایت راسخ العقیدہ بزرگ تھے، ان کے زمانے میں شیعیت کا بڑا غلبہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ علی الاعلان صحابہ کے فضائل کی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶ (۲) بیان الحمد ثین ص ۵ (۳) تذکرہ ج ۳ ص ۹۶، العصر ج ۲ ص ۳۰۱ و کتاب الانساب ورق ۳۲۶ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶، ۹۷ و کمال ابن اثیر ج ۷ ص ۱۸۶ و کتاب الانساب ورق ۳۲۶۔

حدیثیں بیان کرتے تھے، علامہ ابن اثیر نے ۳۵۱ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ اہل دہلیم نے لوگوں کو فضائل صحابہ بیان کرنے سے روک دیا اور جامع اعظم اور دوسری مسجدوں کے صدر دروازوں پر تبر لکھوایا تو یہ اس وقت بھی علی الاعلان صحابہ کے فضائل بیان کرتے تھے اور جامع اعظم اور باب الشام میں حسبہ لہذا اس قسم کی روایات کا املا کرتے تھے۔ (۱)

وفات: انھوں نے ۹۵ سال کی طویل عمر میں ذی الحجہ ۳۵۴ھ میں انتقال کیا۔

پیشہ: ان کا ذریعہ معاش کپڑوں کی تجارت تھا، اسی لیے بزاز لقب پڑ گیا تھا۔ (۲)

تصنیفات: مورخین نے ان کو صاحب تصانیف لکھا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ ان کی تصنیفات نہایت عمدہ تھیں لیکن ان کے ایک ہی مجموعہ حدیث کا پتہ چلتا ہے جو فوائد ابو بکر یا غیلانیات اور اجزاء الغیلانیات کے نام سے مشہور ہے، اس مجموعہ کو غیلانیات اس لیے کہا جاتا ہے کہ امام ابو بکر کے مشہور شاگرد شیخ ابوطالب محمد بن محمد بن ابراہیم بن غیلان م نے اس کی ان سے روایت کی ہے، ان کے نام کی نسبت کی وجہ سے اس کو غیلانیات وغیرہ کہتے ہیں، یہ گیارہ اجزاء پر مشتمل ہے اس کی ترتیب ابواب و شیوخ پر ہے اور حدیث کی اعلیٰ واحسن کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، امام دارقطنی نے اس کی رباعی حدیثوں کی ایک مستقل رسالہ میں تخریج کی ہے، علامہ ذہبی اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کی ایک ایک حدیث نقل کی ہے۔ (۳)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶، ۹۷ و کامل ابن اثیر ج ۷ ص ۱۸۶، المنتظم ج ۷ ص ۳۲، البدایہ ج ۱۱

ص ۲۶۰ (۲) تذکرہ ج ۳ ص ۹۷ والعمیر ج ۲ ص ۳۰۱ (۳) بسنن ص ۷۴ و تذکرہ ج ۳ ص ۹۷ و کشف

## امام ابن حبان

متوفی ۳۵۳ھ

نام و نسب: محمد نام، ابو حاتم کنیت اور ابن حبان لقب تھا، سلسلہ نسب یہ ہے:

محمد بن حبان بن احمد بن حبان بن معاذ بن معبد بن شہید بن ہدبہ بن مرة بن سعد بن یزید بن مرة بن زید بن عبد اللہ بن دارم بن حظلہ بن مالک بن زید بن مناة بن تمیم۔ (۱)  
نسب نامہ میں قدرے اختلاف منقول ہے۔

خاندان: ابن حبان عربی النسل تھے، جیسا کہ نسب نامہ سے ظاہر ہے، عرب کے مشہور قبیلہ تمیم کی شاخ دارم سے ان کا نسب تعلق تھا، اسی لیے دارمی اور تمیمی کہلاتے ہیں۔

وطن: بست کو ان کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے، یہ سیستان میں غزنیں اور ہرات کے درمیان دریائے ہلمند کے کنارے واقع تھا، محبت الدین خطیب کا بیان ہے کہ غالب گمان یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد میں سے کوئی بزرگ مجاہدین اسلام کے اس دستہ میں شامل رہے ہوں گے جو پہلی صدی ہجری میں محمد بن قاسم ثقفی کی سرکردگی میں ہندوستان آیا تھا اور ملتان کی فتح کے بعد ان ہی علاقوں میں آباد ہو گئے ہوں گے، انہی کی نسل سے محمد بن حبان بست میں پیدا ہوئے، یہ اس زمانہ میں صوبہ بختان (سیستان) کا ایک اہم پر رونق اور سرسبز و شاداب مقام سمجھا جاتا تھا اور خرما اور انگور کی پیداوار کے لیے مشہور تھا، غالباً باغوں کی کثرت کی بنا پر اس کا نام بست پڑ گیا تھا، جو بوستاں یا بستان کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتا ہے، یہ شہر اسلامی فتوحات سے پہلے اور اس کے بعد بھی کئی صدیوں تک آباد رہا، یا قوت

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۳۔

تذکرۃ المحمدین..... گلستان حدیث کے ہر کتبے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

458

کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن حبان کے بعد تقریباً تین صدیوں تک یہ آباد رہا مگر چھٹی صدی کے آخر یا ساتویں صدی کے شروع میں ویران ہو گیا، اس کی خاک سے متعدد نامور محدثین اور اکابر علما پیدا ہوئے، عربی کا مشہور ادیب و شاعر ابو الفتح بہستی (متوفی ۴۰۱ھ) کا وطن یہی علاقہ ہے اور سنن ابی داؤد کے مشہور شارح اور عظیم محدث امام ابو سلیمان خطابی (م ۳۸۸ھ) کا تعلق بھی اسی مردم خیز سرزمین سے ہے۔ (۱) امام ابن حبان بست کے گل سرسبد تھے اور امام خطابی سے زیادہ کوئی باکمال شخصیت یہاں نہیں پیدا ہوئی۔

ولادت: مورخین نے ان کے سنہ ولادت کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن ذہبی کا بیان ہے کہ وفات (۳۵۳ھ) کے وقت ان کی عمر تقریباً اسی سال تھی، (۲) اسی لحاظ سے لگ بھگ ۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

شیوخ و اساتذہ: ابن حبان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، حافظ ذہبی اور علامہ ابن سبکی تحریر فرماتے ہیں:

وانما لایحصون من مصر  
و انما لایحصون من مصر  
الی خراسان۔  
سے ابن حبان نے کسب فیض کیا۔  
ان کا خود کا بیان ہے کہ:

لعلنا قد کتبنا عن الفی شیخ  
ما بین الشاس والاسکندریہ۔  
شاید ہم نے شاس و اسکندریہ کے  
درمیان کے دو ہزار بزرگوں سے  
حدیثیں لکھیں۔ (۳)

اگر ان کی مختلف علوم میں جامعیت اور رحلت و سفر کی کثرت کو مد نظر رکھا جائے تو اس بیان میں کوئی مبالغہ نہ معلوم ہوگا۔

(۱) کتاب الانساب ورق ۸۱، معجم البلدان ج ۳ ص ۱۷۰، ۱۷۱ و جغرافیہ خلافت مشرقی ص ۲۸۱ - ۵۱۹

(۲) العصر جلد ۲ ص ۳۰۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۳ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۱۔

بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر بن خزیمہ، ابوخلیفہ حمّی، ابو عبد الرحمن نسائی، ابو یعلیٰ موصلی، احمد بن حسن صوفی، قاضی ابوالاحد اسحاق بن ابراہیم ہستی جعفری، احمد مشقی، حسن بن سفیان شیبانی، حسین بن ادریسی ہروی، ابو یعلیٰ زکریا ساجی، عبد اللہ بن محمد بن عبد الرحمن بن شیروہ ازدی، ابوالقاسم عبد اللہ بن محمد بن عبد العزیز بغوی، عمر بن محمد، عمران بن موسیٰ بن مجاشع، محمد بن ابراہیم خلدی ہروی، محمد بن اسحاق بن ابراہیم سراج ثقفی، ابوالحسن محمد بن عبد اللہ بن جنید ہستی، محمد بن عثمان بن سعد دارمی، محمد بن یحییٰ مدینی، محمد بن یزید دورتی، ابو عوانہ یعقوب بن اسحاق وغیرہ۔

امام الامام ابو بکر بن خزیمہ سے غیر معمولی تعلق تھا، سفر ہو یا حضر ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے اور وہ جو کچھ فرماتے تھے اسے قلمبند کر لیتے تھے، فقہ، حدیث، اصول اور فرائض وغیرہ کی ان ہی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ (۱)

**تلامذہ:** ان کے تلامذہ کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی، چند مشہور شاگردوں کے نام ملاحظہ ہوں: ابو عبد اللہ حاکم، ابو عبد اللہ بن مندہ اصہبانی، جعفر بن شعیب بن محمد سمرقندی، حسن بن منصور، ابو عبد اللہ محمد بن احمد غنجاہ بخاری، ابو معاذ عبد الرحمن محمد بن رزق اللہ بختانی، محمد بن احمد بن منصور بوتانی، ابوالحسن محمد بن احمد بن ہارون عبدون زوزنی، ابوسلمہ محمد بن محمد بن داؤد شافعی، ابو علی منصور بن عبد اللہ خالد ذہلی وغیرہ۔ (۲)

طلب علم کے لیے سفر: امام ابن حبان نے علم و فن کی تحصیل کے لیے متعدد اسلامی ملکوں کا سفر کیا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ انھوں نے شاس واسیجاہ (مشرقی ترکستان) سے اسکندریہ (مصر) اور مصر سے خراسان کا چپہ چپہ چھان ڈالا تھا، علمائے سیر نے ان کے مرو، نیشاپور، اہواز، ابلہ، بصرہ، واسط، بغداد، کوفہ، مکہ، موصل، حلب، انطاکیہ، حمص، بخارا، لسا، ماوراء النہر، جرجان، عراق، حجاز، شام، مصر اور جزیرہ جانے کی تصریح کی ہے اور لکھا ہے کہ ان

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۳ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۱ (۲) ایضاً۔

میں سے بعض جگہ تو وہ متعدد بار تشریف لے گئے تھے۔ (۱)

حفظ وثقاہت: ان کو غیر معمولی ذکاوت اور بے نظیر حافظہ ملا تھا، ابوسعہدریسی صاحب تاریخ سمرقند فرماتے ہیں کہ ”وہ آثار و احادیث کے نامور حفاظ میں تھے“ حافظ ابن حجر نے ان کی غیر معمولی ذہانت اور قوتِ حافظہ کا اعتراف کیا ہے، دوسرے اصحاب سیر و تراجم نے بھی ان کو الحافظ الجلیل اور احد الحفاظ الکبار وغیرہ لکھا ہے۔

ان کی ثقاہت پر بھی ائمہ فن کا اتفاق ہے، تمام مورخین نے خطیب کے حوالہ سے ان کو ثقہ و متقن لکھا ہے، علامہ ابن عماد حنبلی فرماتے ہیں کہ وہ حافظ ثابت اور امام و حجت تھے۔ (۲)

حدیث میں بلند پایگی: حدیث میں ان کو زیادہ امتیاز اور برتری حاصل تھی اور وہ اس فن کے باکمال ائمہ میں شمار کئے جاتے ہیں، مورخین اور ارباب سیر نے ان کو حدیث میں مکمل اور معرفت حدیث میں امام قرار دیا ہے، متون و اسانید حدیث پر ان کی نظر وسیع اور گہری تھی، ماہرین فن کا بیان ہے کہ: وہ متون و اسانید کے عالم اور واقف کار تھے، حدیث میں ان کے کارنامے غیر معمولی ہیں، انھوں نے علوم حدیث کی حیرت انگیز خدمات انجام دی ہیں، حاکم فرماتے ہیں کہ ”حدیث میں ان سے بے نظیر کتابیں یادگار ہیں۔“ (۳) حدیث میں ان کی مہارت اور ژرف نگاہی کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ جرح و تعدیل کے امام تھے اور اس فن میں ان کی تصنیفات بڑی اہم خیال کی جاتی ہیں۔

فقہ: اپنے جامع کمالات استاذ امام ابن خزیمہ کی طرح وہ بھی فقہ و حدیث دونوں میں ممتاز تھے اور انھیں سے اس فن کی تکمیل و تحصیل کی تھی، علمائے سیر لکھتے ہیں کہ ”ابن حبان فقہ کے

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۱ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۵ و لسان المحدثین ص ۳۰ (۲) ایضاً و البدایہ

والنہایہ جلد ۱۱ ص ۲۵۹ و شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۶ (۳) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ و اعلام

ج ۳ ص ۸۸۰۔

عالم و عارف اور فقہائے دین میں ہیں، سرقند والوں میں فقہی ذوق پیدا کرنا ان ہی کا کارنامہ ہے، حاکم کا بیان ہے کہ ”وہ علم فقہ کا خزانہ تھے۔“ (۱)

دیگر علوم: دینی علوم کی طرح وہ اس زمانہ کے مروجہ علوم اور جدید فنون سے بھی اچھی طرح واقف تھے، حاکم کا بیان ہے کہ لغت، عربیت نحو و ادب کے علاوہ فلسفہ و کلام، طب و نجوم اور جغرافیہ میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

سوائے علم حدیث علوم دیگر ہم وہ علم حدیث کے علاوہ دوسرے علوم  
داشت فقہ و لغت و طب و نجوم فلک میں درک رکھتے تھے، فقہ و لغت  
و ہندسہ رانیک می دانست۔ (۲)  
و طب و نجوم، فلکیات و ہندسہ سے  
خوب واقف تھے۔

جامعیت: ان گوناگوں علوم سے واقفیت و معرفت ابن حبان کی جامعیت کا ثبوت ہے، اور یہی کا بیان ہے کہ ”وہ متعدد علوم میں جامع تھے“ حاکم فرماتے ہیں کہ ”وہ علوم و فنون کا خزانہ تھے۔“ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ انھوں نے ہر ہر فن میں کتابیں لکھی تھیں، علمائے اسلام میں ایسے جامع کمالات لوگ کم گزرے ہیں جن کو اتنے گوناگوں اور متنوع علوم میں اس قدر رسوخ اور ایسی مکمل مہارت حاصل رہی ہو، ان ہی کمالات اور جامعیت کی وجہ سے مورخین نے انھیں امام عصر، فاضل متقن، العالم البحر اور العلامة المتبحر وغیرہ لکھا ہے۔ (۳)

فہم و فراست: اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کی طرح ان کو فہم و فراست اور عقل و دانش سے بھی نوازا تھا، حاکم نے ان کو عقلائے رجال میں بتایا ہے اور خطیب نے بھی ان کی فہم و فراست کا اعتراف کیا ہے۔ (۴)

علم کا شوق و ذوق: ابن حبان کو علم و فن سے غیر معمولی شغف تھا، سفر کی زیادتی اسی دلچسپی کا

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۷ (۲) ایضاً و بستان المحدثین ص ۴۰ (۳)

تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴۔

نتیجہ تھی، وہ ابن خزیمہ کی خدمت میں رہ کر اپنی تعلیمی علم بجاتے تھے، علم سے تعلق اور دلچسپی کا یہ حال تھا کہ اپنے وطن بست میں ایک مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا تھا اور اپنی زندگی ہی میں اپنا مکان ان دونوں پر وقف کر دیا تھا، یہ مدرسہ اہل علم، محدثین اور فقہاء سے معمور رہتا تھا اور کتب خانہ کا نہایت معقول انتظام کیا گیا تھا، اس کی نگرانی باقاعدہ ایک شخص کے متعلق کر دی گئی تھی، اس کی کشش لوگوں کو دور دراز سے یہاں کھینچ لاتی تھی، ان کو قیام اور کتب خانہ سے استفادہ اور کتابوں کے نقل کی پوری سہولت بہم پہنچائی جاتی تھی، کتابوں کی حفاظت کا بھی معقول انتظام تھا، چنانچہ کتب خانہ سے باہر کتابیں لے جانے کی کسی کو اجازت نہیں دی جاتی تھی، اس مدرسہ اور کتب خانہ کا فیض ابن حبان کے بعد بھی جاری رہا۔ (۱)

منصب قضا: دینی علوم میں بصیرت اور پختگی کی وجہ سے انھیں قضا کا منصب تفویض کیا گیا تھا اور وہ ایک عرصہ تک سمرقند، نسا، نیشاپور اور خراسان کے بعض شہروں کے قاضی رہے۔ (۲)

مقبولیت و شہرت: ابن حبان کے علم و فضل اور جامعیت و کمال کی بنا پر چار دہائیوں تک عالم میں ان کی شہرت ہو گئی تھی، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ”شہروں اور ملکوں میں ان کی غیر معمولی شہرت تھی اور وہ بالاتفاق ائمہ امت میں شمار کئے جاتے تھے“ علامہ سمعانی نے ان کو امام العصر اور حافظ ذہبی نے ان کو ائمہ زمانہ میں محسوب کیا ہے، ان کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ جب سیر و سیاحت کے بعد اپنے وطن بست تشریف لائے تو ان کے گھر پر شائقین علم اور طالبین فیض کا ازدحام رہتا تھا اور ان کی تصنیفات بڑے شوق و ذوق سے پڑھی اور سنی جاتی تھیں۔ (۳)

فقہی مسلک: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شافعی المذہب تھے لیکن عام اصحاب طبقات

(۱) لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴ (۲) ایضاً تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ و کتاب الانساب ورق ۸۱ (۳)

تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ و کتاب الانساب ورق ۸۱۔



و تراجم نے اس باب میں سکوت اختیار کیا ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص مسلک فقہ سے وابستہ نہ تھے، بلکہ اپنے استاذ امام ابن خزیمہ کی طرح تقلید کے بجائے تفقہ و اجتہاد سے کام لیتے رہے ہوں گے حافظ ابن کثیر نے بھی ان کو مجتہدین میں شمار کیا ہے۔ (۱)

جرح و تعدیل: اوپر گزر چکا ہے کہ وہ حدیث کی طرح اس کے متعلقہ علوم کے بھی ماہر تھے، جرح و تعدیل ان کا خاص موضوع تھا، اس میں انھوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔

فکر و خیال میں جدت: امام صاحب کے بعض افکار و خیالات میں بڑی جدت اور ندرت پائی جاتی ہے اس قسم کی ایک عجیب اور دلچسپ رائے ذیل میں تحریر کی جاتی ہے:

حضرت انسؓ سے صوم وصال کی جو روایت منقول ہے، اس میں آپؐ کے اس

ارشاد مبارک:

انسی لست کاحدکم انی اطعم  
میں تم لوگوں کی طرح نہیں ہوں، مجھے  
واسقی۔ (خداوند کی طرف سے) کھلایا پلایا

جاتا ہے۔

کے متعلق اپنی صحیح میں لکھتے ہیں:

”اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حدیثیں صحیح نہیں ہیں جن میں آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم کے بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھ لینے کا ذکر ہے، دراصل

ان حدیثوں میں حجر (پتھر) کے بجائے حجر کا لفظ ہوگا، جس کے معنی طرف الازار

یعنی نیفہ ہے کیوں کہ جب اللہ تعالیٰ مسلسل روزہ رکھنے کی صورت میں بھی اپنے

رسول کو کھلاتا پلاتا تھا تو اس وقت بھلا وہ کیسے آپ کو بھوکا چھوڑ دیتا، جب آپ

روزے سے نہیں ہوتے تھے یہاں تک کہ آپ کو اپنے پیٹ پر پتھر رکھنا پڑتا تھا،

جب کہ واقعہ یہ ہے کہ بھوک میں پیٹ پر پتھر باندھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔“

علامہ ابن سبکی نے اس رائے پر جو ایراد کیا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:  
 ”علامہ کا یہ قول محل نظر ہے کیوں کہ خود انہوں نے اپنی اسی کتاب میں  
 چند درق پہلے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے واسطے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ  
 آپ نے ایک دفعہ فرمایا:

والذی نفسی بیدہ ما      قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ  
 اخرجنی الا الجوع۔ (۱)      میں میری جان ہے، میں بھی بھوک ہی  
 کی وجہ سے نکلا ہوں۔

اسی طرح متعدد روایتوں میں آپؐ کی بھوک کا ذکر ہے، درحقیقت بھوک  
 کو نقص اور عیب خیال کرنا ہی غلط ہے بلکہ اسی سے نبی کے درجات کی بلندی کا پتہ  
 چلتا ہے، ان حدیثوں اور وصال کی روایت میں تطبیق کی صورت بالکل واضح ہے،  
 اللہ کی مشیت اور مرضی سے نبی کے مختلف احوال ہوتے ہیں، کبھی وہ بھوکا ہوتا ہے،  
 کبھی روزے سے ہوتا ہے، اور کبھی یہ حال ہوتا ہے کہ روزے میں بھی اس کو  
 بھوک اور پیاس کی تکلیف کا مطلقاً احساس نہیں ہوتا اور یہ سب صورتیں اور مختلف  
 حالتیں اپنے اپنے محل اور وقت کے اعتبار سے بالکل موزوں اور مناسب ہوتی  
 ہیں۔“ (۲)

**اخلاق و عادات:** افسوس ہے کہ تذکرہ و تراجم کی کتابیں ابن حبان کے اخلاق کے ذکر  
 (۱) امام مالک نے اس روایت کی اس طرح تخریج کی ہے کہ آپؐ مسجد میں تشریف لے گئے وہاں حضرت  
 ابو بکرؓ و عمرؓ پہلے سے موجود تھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھوک سے بیقرار ہو کر اپنے گھروں  
 سے نکلے ہیں، آپؐ نے فرمایا (وانا اخرجنی الجوع) یعنی میں بھی اسی وجہ سے بے چین ہو کر  
 نکلا ہوں، چنانچہ حضرت ابوالہثم انصاری ان سب کو اپنے گھر لائے اور کھلایا پلایا۔ (موطا امام مالک  
 ص ۱۷۱، ۱۷۲، مطبوعہ احمدی پریس دہلی) (۲) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۲۔

سے خالی ہیں لیکن ان کی فیاضی اور سخاوت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں جب انہوں نے اپنے وطن میں مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا تو شائقین علم کے لئے ان کا گھر لنگر خانہ بنا ہوا تھا، دو دروازے لوگوں کے طعام کے مصارف وہی برداشت کرتے تھے۔ (۱)

الحاد اور بد عقیدگی کا الزام اور اس کا جواب: ابن حبان پر بد عقیدگی، الحاد اور زندقہ کا الزام عائد کیا گیا ہے اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جلاوطن کر دیئے گئے تھے، ذیل میں اس الزام کو نقل کر کے اس کی حقیقت واضح کی جاتی ہے۔

اس الزام کا دار و مدار ان دو روایتوں پر ہے جو مشہور صوفی ابواسامعیل عبداللہ بن محمد انصاری ہروی (متوفی ۳۸۱ھ) سے مروی ہیں، ان میں پہلی روایت یہ ہے:

|                           |                                           |
|---------------------------|-------------------------------------------|
| قال سألت يحيى بن عمار     | ابواسامعیل ہروی کا بیان ہے کہ میں نے      |
| عن ابي حاتم بن حبان       | یحییٰ بن عمار سے ابوحاتم بن حبان کے       |
| فقال رأيتُهُ ونحن اخرجناه | بارہ میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ    |
| من سجستان كان له علم      | میں نے انہیں دیکھا ہے اور ہم ہی           |
| كثير ولم يكن له دين كبير  | لوگوں نے ان کو سیستان سے جلاوطن           |
| قدم علينا فانكر الحد لله  | کیا تھا، وہ کثیر العلم ضرور تھے مگر ان کا |
| فاخرجناه. (۲)             | دینی پایہ زیادہ بلند نہ تھا، وہ ہمارے     |
|                           | پاس آئے اور اللہ کے بارے میں حد کا        |
|                           | انکار کیا تو ہم نے ان کو شہر بدر کر دیا۔  |

دوسری روایت ہے:

قال ابواسامعیل الانصاری

ابواسامعیل انصاری کہتے ہیں کہ میں

(۱) لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۳ و ۱۳۵ و میزان الاعتدال ج ۶ ص ۳۲

وطبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۱۳۱ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳۔

نے عبدالصمد سے اور انھوں نے اپنے والد محمد سے سنا کہ لوگوں نے ابن حبان کے قول (النبوة العلم والعمل یعنی نبوت علم و عمل ہے) (۱) کی وجہ سے ان پر تکبر کی ہے، الحادوزندقہ کا الزام لگایا اور ان سے قطع تعلق کر کے خلیفہ سے ان کی شکایت کی، خلیفہ نے ان کے قتل کا حکم دیا (ابو اسماعیل کہتے ہیں مگر) میں نے عبدالصمد کے علاوہ دوسرے شخص سے یہ سنا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جلاوطن کر کے سمرقند بھیج دیئے گئے تھے۔

سمعت عبدالصمد بن محمد  
يقول سمعت ابي يقول  
انكروا على ابن حبان قوله  
(النبوة العلم والعمل)  
وحكموا عليه بالزندقة  
وهجره وكتب فيه الى  
الخليفة فامر بقتله وسمعت  
غيره يقول لذلك اخرج الى  
سمرقند. (۲)

مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں عائد کردہ الزامات کی نوعیت مختلف ہے، پہلی روایت میں ابن حبان کی فضیلت و برتری میں کلام کیا گیا ہے اور دوسری روایت میں ان کے الحادوزندقہ کا ذکر ہے، اسی طرح دونوں روایتوں میں الزام کے اسباب اور وجہیں مختلف بتائی گئی ہیں، پہلی روایت میں صرف جلاوطنی کا تذکرہ ہے اور دوسری میں اس کے بجائے خلیفہ کی طرف سے قتل کے فرمان کا ذکر ہے، مگر اس سے پتہ نہیں چلتا کہ واقعہ وہ قتل کسے گئے تھے یا نہیں؟ (۳) پھر فرمان قتل کے بارہ میں خود راوی نے شک و تذبذب ظاہر کر کے

(۱) اس سے التباس ہوتا ہے کہ ابن حبان کے نزدیک نبوت علم و عمل کا نام ہے یعنی جس میں یہ اوصاف پائے جائیں وہ نبی ہو سکتا ہے گویا نبوت وہی نہیں کسی ہے (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵ و میرزا الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳ (۳) شاہ عبدالعزیز صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قتل نہیں کئے گئے تھے بلکہ بعض ثقہ محدثین نے درمیان میں پڑ کر اس کو رفع دفع کر دیا تھا۔

روایت کو مشکوک بنا دیا ہے، علاوہ ازیں اس سے اس کا سوائے حفظ اور نسیان بھی ثابت ہوتا ہے۔

ابو اسماعیل انصاری کا زہد و تقدس اور تصوف میں ان کا کمال مسلم ہے مگر روایت و درایت میں ضبط و تيقظ ثابت نہیں ہے، عموماً صوفیہ روایات کی صحت اور سندوں کی قوت کا زیادہ لحاظ نہیں کرتے علاوہ ازیں وہی تہا ان دونوں روایتوں کے راوی ہیں ان احتمالات کی موجودگی میں ابن حبان جیسے جلیل القدر محدث کے بارہ میں اتنے اہم اور سنگین الزام کو کیسے صحیح مانا جاسکتا ہے؟ ہروی کی پیدائش اور ابن حبان کی وفات کے درمیان چالیس بیالیس سال کا فرق ہے۔ (۱) اگر یہ الزام کچھ بھی وزنی ہوتا تو اس عرصہ میں پوری طرح مشہور ہو چکا ہوتا اور اس کو بیان کرنے والے متعدد افراد اور ابن حبان کے معاصرین بھی ہوتے کیوں کہ ان کا شمار ائمہ حدیث اور جرح و تعدیل کے ماہرین میں ہوتا ہے، اس لیے دوسرے ارباب فن محدثین اور رجال و اسناد کے ماہرین ان کے بارہ میں چھان بین ضرور کرتے لیکن اتنے اہم الزام کے بعد بھی ان کی شہرت و اہمیت و ثوق و اعتبار اور عظمت و بلند پایگی میں فرق نہ آتا اور ان کی ذات کا محدثین اور ائمہ فن کا مرکز توجہ بنا رہتا اور رجال کی کتابوں کا ان کے اقوال سے معمور ہونا اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ان پر یہ الزام ثابت و متحقق نہیں۔ (۲)

ان روایتوں کے ناقابل یقین ہونے ہی کی بنا پر ان کو بعض ارباب سیر و تذکرہ نے نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے اور جن مورخین نے ان کو نقل کیا ہے انھوں نے بھی ان پر نقد و تعقب کیا ہے۔

درحقیقت ایسے سنگین الزام محض مشکوک روایتوں کی بنیاد پر تسلیم نہیں کئے جاسکتے

(۱) طبقات ابن رجب ص ۳۹ (۲) اس سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں ابن حبان سے تعلقات اور روایات وغیرہ ترک کرنے کا جو ذکر ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے ممکن ہے ان کے بعض مخالفین نے ان سے روایت کرنا چھوڑ دیا ہو لیکن عام طور سے نقد اور معتبر سمجھے جاتے رہے۔

جب تک کہ متعدد افراد کے بیانات، معاصرین کی شہادتوں اور دوسرے قرآن سے ان کی پوری تصدیق نہ ہو جائے۔

دونوں روایتوں کے اختلاف واضطراب اور ان میں خطا و تحریف کے احتمالات کو نظر انداز کر کے اگر انھیں صحیح بھی مان لیا جائے تو ابن حبان پر الحاد اور بد عقیدگی کا الزام ثابت نہیں ہوتا اس کی تفصیل یہ ہے:

اوپر گزر چکا ہے کہ پہلی روایت میں الحاد اور بے دینی کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں محض ابن حبان کی دینی عظمت و جلالت کے بارہ میں کلام کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے حد و چیز کی نفی کرتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ کوئی الحاد اور بے دینی کی بات نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کو بلا حد و مکان ماننا ہی اسلامی عقائد کے مطابق اور صحیح نقطہ نظر ہے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں:

انظر ما اجهل هذا الجارح  
وليت شعري من المجروح  
مثبت الحد لله اونا فيه۔  
ذرا غور کرو کہ یہ جارحانہ الزام لگانے  
والا بھی کس قدر ناواقف ہے کاش میں  
بھی جانتا کہ دونوں میں قابل الزام  
کون ہے؟ آیادہ جو اللہ کے لیے حد کو  
مانتا اور ثابت کرتا ہے یادہ جو اس کی نفی  
کرتا ہے۔

حافظ صلاح الدین خلیل بن کیرکلدی کا بیان ہے:

بالله العجب من احق  
بالاخراج والتبديع وقلة  
الدين۔ (۱)  
بخدا سخت تعجب ہے آخر جلا وطنی کی سزا  
بدعت اور دین میں ضعف کے الزام کا  
کون زیادہ مستحق ہے؟

(۱) طبقات الشافعية الكبرى ج ۲ ص ۱۴۱، ۱۴۲۔

حافظ ابن حجر نے بڑے صریح الفاظ میں علامہ ابن حبان کے موقف کو صحیح قرار دیا ہے، ان کے بیان کا خلاصہ ہے:

”معرض کا یہ کہنا کہ ابن حبان سے کوئی ایسی لغزش سرزد ہو گئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں نے ان پر طعن کیا ہے اگر اس سے اس کی مراد پہلی روایت والا قصہ ہے جس میں ابن حبان کی جانب حد کی نفی کی نسبت کی گئی ہے تو دراصل اس میں کوئی لغزش نہیں ہے بلکہ انصاف کی بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابن حبان ہی کا موقف برحق ہے۔“ (۱)

ان اقوال سے ظاہر ہو گیا کہ حد کے مسئلہ میں علامہ ابن حبان کی رائے میں کوئی غلطی اور قابل اعتراض بات نہ تھی بلکہ ان ہی کا نقطہ نظر صحیح تھا، البتہ اس پر اس پہلو سے اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے خواہ مخواہ ایک غیر ضروری مسئلہ کو چھیڑا، کیوں کہ محتاط علما اس قسم کے کلامی مسائل میں غور و خوض کو پسند نہیں کرتے، ان کے نزدیک خدائے تعالیٰ کی صفات وغیرہ میں بحث و تدقیق فضول اور لایعنی بات ہے اور ان مباحث میں سکوت افضل اور سوال و تفتیش اور بحث و جستجو بدعت ہے، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

”ابن حبان کا اللہ کے لیے حد ہونے کا انکار کرنا اور تم لوگوں کا اس کے لیے حد کا ثابت کرنا دونوں ہی فضول باتیں ہیں، ان کے متعلق خاموشی افضل و اولیٰ ہے، اس لیے کہ نفی و اثبات کے بارہ میں کوئی نص وارد نہیں ہے اور اللہ کی شان یہ ہے کہ ”اس کے مانند کوئی چیز بھی نہیں“ پس جو شخص حد کا قائل ہے اس کا مخالف اس سے کہے گا کہ تم نے تو رائے و قیاس سے اللہ کے لیے حد بنائی ہے، اس کے لیے تمہارے پاس کوئی ثبوت اور نص نہیں ہے (نتیجہ کے اعتبار سے اس قول سے اللہ کا محدود ہونا ثابت ہوتا ہے، حالانکہ) محمد و مخلوق ہے اور اللہ

کی شان اس سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے مگر حد کو ماننے والا نہ ماننے والے سے یہ کہے گا کہ تم نے تو خداوند کو معدوم چیزوں کے برابر کر دیا ہے (۱) کیوں کہ معدوم چیزوں کے لیے کوئی حد نہیں ہوتی، پس ایسی حالت میں جو لوگ اللہ کو منزه سمجھتے اور ان امور کے بارہ میں خاموشی اختیار کرتے ہیں وہی سلف صالحین کے تابع ہیں اور انھیں کا طریقہ احتیاط اور سلامتی پر مبنی ہے۔“ (۲)

اس تقریر کا ما حاصل یہ ہے کہ حد کے مثبت و منکر دونوں نے ایک غیر ضروری اور بے سود مسئلہ کو موضوع بنا کر غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور ان دونوں کا طریقہ احتیاط و تورع کے منافی ہے، علامہ ذہبی دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”اثبات و انکار دونوں کے قائلین غلطی کرتے ہیں کیوں کہ حد کی نفی و ثبوت کے متعلق کوئی نص وارد نہیں ہے، اور آدمی کے حسن اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لایعنی باتیں چھوڑ دے۔“ (۳)

اوپر جو لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) حد کے بارہ میں ابن حبان کا موقف صحیح اور اسلامی عقائد کے مطابق تھا۔  
 (۲) ان کی غلطی اتنی ہے کہ انھوں نے ایک ایسے غیر ضروری اور لا طائل مسئلہ کو موضوع بحث بنایا جس میں سکوت افضل اور بہتر تھا لیکن اس کو عقیدہ کے بگاڑ اور دین میں فتور سے کوئی تعلق نہیں۔

مگر مزید غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن حبان نے بلا ضرورت اس مسئلہ میں کلام نہیں کیا تھا، ذیل میں اس کی توضیح کی جاتی ہے:

(۱) حافظ ابن حجر نے اس کی تردید میں لکھا ہے کہ یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے کیوں کہ اللہ کے وجود کے تحقق کے بعد اس کے لیے حد کی نفی اس کو معدوم اشیا کے برابر کر دینا نہیں ہو سکتا (۲) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵۔



بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ مسئلہ صفات میں غور و خوض نامناسب اور خلاف احتیاط ہے لیکن یہ اس صورت میں جب خواہ مخواہ اور بلا ضرورت غور و خوض اور بحث و کلام کیا جائے مگر ضرورت اور ناگزیر حالات میں خاموشی کے بجائے اظہار خیال ہی مناسب ہے، علامہ ابن حبان نے ضروری اور ناگزیر حالات ہی میں اس کے متعلق اظہار خیال فرمایا تھا، ان کے زمانہ میں یہ مسئلہ بحث و نظر کا موضوع بنا ہوا تھا اور کچھ لوگ شہود کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے حد و چیز ثابت کر رہے تھے، اس لیے انھوں نے اس مسئلہ میں اظہار خیال ضروری سمجھا اور وہ بات کہی جو عقائد صحیحہ کے مطابق تھی اس لیے انھوں نے کوئی خلاف احتیاط کام نہیں کیا، خلق قرآن کے مسئلہ میں امام احمد کے طرز عمل میں بھی اس کی مثال ملتی ہے، اس کے بارے میں علمائے حق کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اس میں بحث و تفتیش فضول، سوال و تجسس بدعت اور خاموشی افضل و اولیٰ ہے، چنانچہ امام بخاری سے جب اس کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے یہی جواب دیا اور خود امام احمد سے بھی جب لوگوں نے عام حالات میں اس کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے اس کو فضول اور لایعنی مشغلہ قرار دیا اور اس میں بحث اور کرید کرنے سے منع کیا۔ (۱) مگر جب معتزلہ کے استیلاء و تسلط اور خلفائے عباسیہ کے جبر و تشدد نے اس کو فتنہ کی شکل دیدی تو اس وقت خاموشی کے بجائے انھوں نے اظہار خیال کو ضروری سمجھا اور ابتلاء و آزمائش کی پرواہ کئے بغیر بڑی جرأت و بے باکی سے یہ اعلان کیا کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے، وہ کسی طرح بھی مخلوق نہیں ہو سکتا، اس کے نتیجے میں انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں اور سخت قسم کی جسمانی سزائیں برداشت کیں، ابن حبان نے اس سواہ پر عمل کیا۔

رہی دوسری روایت تو اس میں الحاد و زندقہ کا ضرور ذکر ہے مگر اس کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اس سے اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا، کفر و ایمان کا معاملہ نہایت نازک ہے، محققین اور علمائے حق کا معمول رہا ہے کہ وہ اس میں ہمیشہ توقف و تامل سے کام لیتے ہیں

اور پوری تحقیق کے بغیر الزام عائد نہیں کرتے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا توجیہ و تاویل سے کام لیتے تھے، محدثین اور نقادان فن نے ابن حبان کے بارہ میں بھی اس اصول کو مد نظر رکھا ہے، ان کی توجیہ و تاویل سے یہ الزام پوری طرح رفع ہو جاتا ہے، ذیل میں ان کے اقوال درج کیے جاتے ہیں۔

علامہ ذہبی رقمطراز ہیں:

”دوسرا اعتراض بھی درست نہیں ہے کیوں کہ اس کی عمدہ توجیہ ممکن ہے درحقیقت ابن حبان کی مراد مبتدا کو خبر میں محصور و محدود کرنا نہیں ہے جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد (الحج عرفۃ، یعنی حج عرفہ ہے) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حج کی ادائیگی کے لیے صرف عرفہ میں قیام کر لینا کافی ہے اور نہ تنہا عرفہ میں قیام سے حج کے تمام ارکان و مناسک ادا ہو جائیں گے، بلکہ آپ کا مقصد حج کے سب سے اہم، ضروری اور مقدم رکن کو بیان کرنا ہے، اسی طرح ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل یعنی نبوت علم و عمل ہے) کا منشا یہ ہے کہ نبوت کی اہم اور ضروری حقیقت علم و عمل میں نبی کا کمال و امتیاز ہے اور کوئی شخص ان میں درجہ کمال کو پہنچنے بغیر نبی نہیں ہو سکتا یہ صحیح ہے کہ نبوت وہ مخصوص موصفت الہی اور عطیہ ربانی ہے جس کے لیے اللہ اپنے علم و عمل والے بندے کا انتخاب کرتا ہے اس میں آدمی کے کسب اور حیلہ و تدبیر کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور نہ وہ ریاضت اور محنت شاقہ سے حاصل کی جاسکتی ہے، اسی سے علم نافع اور عمل صالح کا سرچشمہ چھوٹتا ہے اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ابن حبان کے مذکورہ بالا قول میں کوئی خرابی اور قباحت نظر نہیں آسکتی، البتہ مطلق شکل میں ان سے جو کچھ منقول ہے وہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک فلسفیانہ رائے و خیال کی ہے۔“ (۱)

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر دونوں نے یہ توجیہ بھی تحریر کی ہے:

”ابن حبان کے اس قول (النبوة العلم والعمل) کی ایک مناسب توجیہ یہ ہے کہ اگر ان کی مراد یہ ہو کہ نبوت کا دار و مدار علم و عمل پر ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نبوت و وحی سے اسی شخص کو سرفراز کرتا ہے جو ان دونوں اوصاف سے متصف ہو اور نبی وحی کی وجہ سے علم والا ہوتا ہے اور علم الہی عمل صالح کو مستلزم ہے تو اس اعتبار سے ان کا قول صحیح ہے کیوں کہ نبوت علم لدنی اور اعمال کا نام ہے جو قریت الہی کا ذریعہ ہیں، پس نبوت ان دونوں چیزوں کے تمام و کمال پائے جانے کا نام ہے اور وحی الہی کے بغیر ان دونوں کا بدرجہ کمال حصول نہیں ہو سکتا کیوں کہ وحی الہی ایسا یقینی علم ہے جس میں ظن و تخمین کو دخل نہیں ہوتا مگر غیر انبیاء کا علم یقینی کم اور ظنی زیادہ ہوتا ہے، پھر نبوت عصمت کو مستلزم ہے اور انبیاء کے علاوہ کسی شخص کے لیے عصمت نہیں خواہ وہ علم و عمل کے کتنے ہی اعلیٰ مدارج اور بلند مراتب کیوں نہ طے کرنے، دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی چیز کے بارے میں خبر دی جاتی ہے تو وہ اس کے ضروری مقاصد اور اہم اجزاء کے لحاظ سے دی جاتی ہے جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (الحج عرفۃ یعنی حج تو عرفہ ہے)

تاہم کسی کے لیے اس طرح کی بات مطلقاً اور بلا قرینہ کہنا درست نہیں ہے اور اگر ابن حبان کا مقصد حصر ہو یعنی نبوت صرف علم و عمل ہی کا نام ہے تو بلاشبہ یہ زندقہ اور فلسفیانہ موشگافی ہوگی۔“ (۱)

اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی تقریر بھی قابل ملاحظہ ہے

وہ فرماتے ہیں:

”مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ابن حبان کا یہ قول (النبوة العلم والعمل)

(۱) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳ و ۱۱۴۔

عقائد صحیحہ کے چنداں خلاف نہیں، کیوں کہ ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ نبوت کوئی کسی چیز ہے جو علم و عمل کی ریاضت سے حاصل ہو سکتی ہے جیسا کہ فلاسفہ کا مذہب ہے بلکہ ان کی غرض یہ ہے کہ نبوت کے لیے انسان میں اس نفس ناطقہ کا پایا جانا لازمی ہے جو علم و عمل میں نمایاں زیادتی رکھتا ہو، اس کے بعد ہی اس کو وہی طور پر نبوت عطا کی جاتی ہے، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

اللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ  
رِسَالَتَهُ. (انعام ۱۲۴)  
و نبوت سے کس کو سرفراز کرے۔

رہا یہ عقیدہ کہ انبیاء علیہم السلام کو علمی و عملی استعداد میں دوسرے افراد پر برتری حاصل نہیں ہوتی، بلکہ خدا تعالیٰ محض اپنے حکم و فیصلہ سے برابر برابر صلاحیت رکھنے والے لوگوں میں سے کسی ایک شخص کو زبردستی نبوت سے سرفراز کر دیتا ہے تو یہ بات ہرگز دین و شریعت سے ثابت نہیں ہے۔

یا ابن حبان کا مذہب بھی ہو سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو نبوت عطا کئے جانے کے بعد علم و عمل دونوں اعتبار سے فوقیت اور برتری حاصل ہو جاتی اس لیے وہ معصوم اور گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں تو یہ ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔“ (۱)

ان توجیہات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن حبان کے قول (النبوة العلم والعمل) میں بھی الزام و اعتراض اور الحاد و بدعتیگی کی کوئی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ اس کو سوائے تعبیر کہا جاسکتا ہے، البتہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے بڑے محدث اور ایسی جلیل القدر شخصیت پر محض سوائے تعبیر کی وجہ سے اتنا بڑا اور ناروا الزام کیوں عائد کیا گیا ہے؟ اس کے مختلف اسباب معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) بستان المحدثین ص ۴۰۔

۱- ایک سبب یہ ہے کہ ابن حبان علم و فن میں نہایت ممتاز اور بڑے ذہین و طباع شخص تھے، ان کے غیر معمولی کمالات نے بعض لوگوں میں ان کو محسود بنا دیا تھا اور وہ ان کو مطعون و مجہم کرنے کی فکر میں رہتے تھے، ان کے اس قول نے ان کے لیے اس کا موقع فراہم کر دیا اور انھوں نے ان کی تعبیری غلطی سے فائدہ اٹھا کر اور اس کو سیاق و سباق سے جدا کر کے اسے ان کا الحاد و زندقہ قرار دیا حاکم فرماتے ہیں:

”ابو حاتم نہایت عالی مرتبہ تھے، اس بنا پر ان سے حسد کیا جاتا تھا۔“ (۱)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

”بجز عناد و تعصب کے ان پر اس الزام کے عائد کرنے کی اور کوئی وجہ

نہیں ہو سکتی وہ یگانہ روزگار اور غیر معمولی ذہین و طباع تھے ان کا حافظہ بے مثال

تھا۔“ (۲)

۲- دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ فلسفہ و کلام کے ماہر اور فلسفیانہ و مشکمانہ مذاق رکھتے تھے اور فلسفہ و کلام میں انہماک بعض لوگوں کے عقائد و خیالات میں فساد پیدا کر دیتا ہے۔ اس بنا پر متشہف علما کو ابن حبان سے بدگمانی ہو گئی اور وہ ان پر طعن و تشنیع کرنے لگے، علامہ بیوطی کا بیان ہے کہ ”وہ فلسفہ و کلام وغیرہ کے بڑے واقف کار تھے، اس لیے ان پر الحاد و زندقہ کا الزام لگایا جاتا ہے“ حالانکہ فلسفہ و کلام سے فساد و عقیدہ ضروری نہیں ہے، ایسے بہت سے علما ہیں جو ان فنون سے غیر معمولی اشتغال رکھنے کے باوجود ذہنی حیثیت سے نہایت ممتاز اور بلند تھے، فلسفہ و کلام میں انہماک نے ان کے عقائد میں کوئی خرابی نہیں پیدا کی، اس لیے ابن حبان کے فلسفہ و کلام کی دلچسپی کو بھی ایمان و عقیدہ کے فساد اور بگاڑ کی دلیل نہیں بنایا جاسکتا تا آنکہ اس کا پورا ثبوت موجود نہ ہو۔

۳- ابن حبان پر اتہام و الزام کی روایت کرنے والے ابو اسامعیل انصاری

(۱) لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۵ (۲) ایضاً ص ۱۱۴۔

ہروی جلیل القدر صوفی اور عارف باللہ تھے، صوفیہ کا ان مسائل میں تشدد مشہور ہے اس لیے وہ ابن حبان سے ان کے فلسفہ و کلام میں اشتغال کی بنا پر خوش نہ رہے ہوں گے، اس فرد و گذشتہ نے ان کا رویہ اور سخت بنا دیا ہوگا اور انھوں نے ان پر الحاد و زندقہ کا الزام لگا دیا اس لیے یہ الزام درحقیقت ان کے غایت تورع اور تصوف میں غلو کا نتیجہ ہے جو حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔

وفات: ابن حبان نے جمعہ کا دن گذر کر ۲۴ شوال ۳۵۴ھ کی شب میں اپنے وطن بست میں انتقال کیا، انھوں نے اپنے مکان کے قریب ایک چبوترہ بنایا تھا، اسی میں دفن کئے گئے۔ (۱)

تصنیفات: امام ابن حبان ان علمائے اسلام میں تھے جن سے بیسٹار کتابیں یادگار ہیں، ان کی تصنیفات کیفیت و کسیت دونوں اعتبار سے اہم اور علمائے فن اور محدثین کا عمدہ ماخذ و مرجع ہیں، سمعانی اور حاکم کا بیان ہے کہ ”ابن حبان نے فن حدیث وغیرہ میں بیش قیمت اور عدیم الامثال کتابیں لکھی تھیں“ (۲) مگر افسوس کہ چند کے علاوہ اکثر تصنیفات اب ناپید ہیں، خطیب نے ان کی بربادی کا ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے:

”یہ عظیم الشان کتابیں اس لائق تھیں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ نقل و اشاعت ہوتی، اہل علم ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے، ان کی نقل و کتابت کرتے اور جلدوں میں باندھ کر محفوظ کر دیتے لیکن افسوس کہ امام صاحب کے اہل وطن ان کے مرتبہ فضل و کمال سے نا آشنا تھے اور وہ اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے ان کی اہم اور بلند پایہ تصنیفات کی اشاعت سے غافل رہے۔“ (۳)

جن کتابوں کا علم ہو سکا ہے ان کی فہرست اور بعض کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) لسان المیران ج ۵ ص ۱۱۳ و طبقات الشافعیہ لکبری ج ۲ ص ۱۴۱ (۲) کتاب الانساب سمعانی ورق ۸۱ و ۱۷۳ (۳) مقدمہ موارد التطمآن۔

- ۱- کتاب الصحابہ (۵ جز) ۲- کتاب التابعین (۱۲ جز) ۳- کتاب اتباع التابعین (۱۵ جز) ۴- کتاب تبع الاتباع (۷ جز) ۵- کتاب جاع التبع (۲۰ جز) ۶- کتاب الفضل بین النقیۃ (۱۰ جز) ۷- کتاب علل اوہام الزہری (۲۰ جز) ۸- کتاب علل حدیث مالک (۱۰ جز) ۹- کتاب علل اوہام اصحاب التوارخ (۱۰ جز) ۱۰- کتاب علل مناقب ابی حنیفہ ومثالبہ (۱۰ جز) ۱۱- کتاب علل ما استجد الیہ ابوحنیفہ (۱۰ جز) ۱۲- کتاب ماخالف الثوری شعبۃ (۳ جز) ۱۳- کتاب ما انفرد بہ اہل المدینہ من السنن (۱۰ جز) ۱۴- کتاب ما انفرد بہ اہل مکہ من السنن (۱۰ جز) ۱۵- کتاب ما عند شعبۃ عن قتادہ ولیس عند سعید عن قتادہ (۲۰ جز) ۱۶- کتاب غرائب الاخبار (۲۰ جز) ۱۷- کتاب ما اغرب الکوفیین عن البصریین (۱۰ جز) ۱۸- کتاب ما اغرب البصریون عن الکوفیین (۱۰ جز) ۱۹- کتاب اسامی من يعرف بالکنی (۳ جز) ۲۰- کتاب کنی من يعرف بالاسامی (۳ جز) ۲۱- کتاب الفصل والوصل (۱۰ جز) ۲۲- کتاب التمزین حدیث النصر الحدانی والنصر الخزار (۲ جز) ۲۳- کتاب الفصل بین حدیث اشعث بن مالک واشعث بن سوار (۲ جز) ۲۴- کتاب الفصل بین حدیث منصور بن معتمر ومنصور بن زاذان (۳ جز) ۲۵- کتاب الفصل بین مکحول الشامی والازدی (ایک جز) ۲۶- کتاب موقوف ماریع (۱۰ جز) ۲۷- کتاب آداب الرحلۃ (۲ جز) ۲۸- کتاب ما اسند جناہ عن عبادۃ (ایک جز) ۲۹- کتاب الفضل بین حدیث ثور بن یزید وثور بن زید (ایک جز) ۳۰- کتاب ما جعل عبد اللہ بن عمر عبد اللہ بن عمر (۲ جز) ۳۱- کتاب ما جعل شیبان سفیان وسفیان شیبان (۳ جز) ۳۲- کتاب مناقب مالک بن انس (۲ جز) ۳۳- کتاب مناقب الشافعی (۲ جز) ۳۴- کتاب المعجم علی المدن (۱۰ جز) ۳۵- کتاب المقلین من الحجازیین (۱۰ جز) ۳۶- کتاب المقلین من العراقیین (۲۰ جز) ۳۷- کتاب الابواب المسطرۃ (۳۰ جز) ۳۸- کتاب الجمع بین الاخبار المتصاۃ (۲ جز) ۳۹- کتاب وصف العدل والمعدل (۲ جز) ۴۰- کتاب الفصل بین حدیثنا واخرنا

ترتیباً الحمد شین.... گلستان حدیث کے ہر کتبے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

478

(ایک جز) ۴۱- کتاب وصف العلوم وانواعہا (۳۰ جز) ۴۲- کتاب الحجۃ المبتدئین ۴۳- کتاب حفظ اللسان ۴۴- کتاب مراعات العشرۃ ۴۵- کتاب اثقۃ باللہ ۴۶- کتاب التوکل ۴۷- کتاب مراعاة الاخوان ۴۸- الفصل بین الغنی والفقیر ۴۹- کتاب السخا والبذل ۵۰- کتاب صفۃ الصلوۃ (۱) ۵۱- کتاب شعب الایمان۔ اس موضوع پر امام بیہقی (۴۵۸ھ) کی کتاب زیادہ مشہور و متداول ہے لیکن ابن حبان کو اولیت اور تقدم کا شرف حاصل ہے۔ (۲) ۵۲- روضۃ العقلاء و نزہۃ الفضلاء، اسلام اور عربوں کے اخلاق و آداب پر یہ عمدہ کتاب ہے اس کا ایک حصہ قاہرہ سے ۱۳۲۸ھ میں شائع ہوا تھا، اس میں مصنف نے اپنی متعدد کتابوں کا ذکر اور حوالہ دیا ہے۔ (۳) ۵۳- کتاب التاریخ یہ ضخیم کتاب کئی حصوں میں ہے، اس کا پہلا حصہ مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے کتب خانہ میں موجود تھا اس حصہ میں ام ورقہ تک کے واقعات درج ہیں یہ حصہ ۱۲۹۴ھ کا لکھا ہوا ہے۔ (۴)

۵۴- کتاب الہدایۃ الی علم السنن، یہ حدیث وفقہ دونوں کی جامع اور عمدہ تصنیف ہے، اس میں ترجمۃ الباب کے بعد حدیث نقل کر کے اس کے اسناد کے تمام ناموں (صحابہ سے لے کر اپنے شیخ تک) کے عام حالات، فضل و کمال، نسبتوں، کتیبوں، قبائل، اوطان اور سنین ولادت و وفات وغیرہ تحریر کئے گئے ہیں، پھر حدیث کی حکیمانہ اور فقہی تشریح کی گئی ہے متضاد و متعارض حدیثوں میں جمع و تطبیق کی صورتیں اور روایات میں کمی بیشی اور فرق و اختلاف کی صراحت بھی کی گئی ہے۔ (۵)

۵۵- کتاب الجرح والتعدیل: اس کا نسخہ کتب خانہ ایا صوفیا میں ہے، بعض لوگوں نے اس کو اور کتاب الضعفاء کو جس کا ذکر آگے آ رہا ہے، ایک ہی کتاب قرار دیا ہے، اس میں رواۃ کے درجہ و مرتبہ کو واضح کرنے کے لیے وہ تمام اقوال درج کئے گئے ہیں جو ان

(۱) مقدمہ موارد الظمان ص ۱۵۱ تا ۱۸۶ اعلام ج ۳ ص ۸۸۰ (۲) ایضاً ص ۱۵ (۳) ایضاً ص ۱۷ (۴) ایضاً  
ومعارف اکتوبر ۱۹۲۹ء (۵) بحم البلدان ج ۲ ص ۱۷۵



تذکرۃ المحدثین.... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افزہ تحقیقی تذکرہ

479

کے ضعف و جرح یا ضبط و عدل کے بارہ میں اصحاب فن سے منقول ہیں، اس کو کتاب الثقات کا کلمہ بھی بتایا جاتا ہے، عبدالعزیز خولی کا بیان ہے کہ یہ دس جلدوں میں ہے، حافظ ابن حجر کی نظر سے یہ کتاب گذری تھی، لسان المیزان کے مقدمہ میں انھوں نے اس پر نقد بھی کیا ہے۔ (۱)

۵۶- کتاب الثقات: یہ رجال کی مبسوط، اہم اور شہرہ آفاق کتاب ہے، اس کی اہمیت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کے بعد رجال میں جو کتابیں لکھی گئیں ان سب میں اس کے حوالے ملتے ہیں، اس کی ابتدا میں سنت و اتباع سنت کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور مقدمہ میں حدیث کے راویوں کی بتیس ۳۲ قسمیں گنائی گئی ہیں، (۲) اس میں پہلے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا تذکرہ ہے اس کے بعد عام صحابہ، تابعین و تبع تابعین سے لے کر اپنے عہد تک کے علمائے حدیث و روایت کا حروف کی ترتیب کے مطابق ذکر کیا گیا ہے، مصنف نے اس میں صرف ثقات کا ذکر کیا ہے، مگر ان کے نزدیک اس میں قدرے وسعت ہے یعنی جو راوی منکر الحدیث، مجروح اور مدلس نہیں ہے، وہ ثقہ ہے وہ خود فرماتے ہیں:

”اس میں صرف انہی ثقات کا ذکر ہے جن کی روایتوں سے احتجاج جائز

ہے، جن راویوں کی بعض لوگوں نے تضعیف کی ہے وہ بھی اس میں شامل کئے گئے

ہیں بشرطے کہ وہ میرے معیار کے مطابق ثقہ ہوں، میں نے اپنے اصول

اور معیار کو کتاب الفصل بین الثقلین میں تحریر کیا ہے جو لوگ اس معیار و اصول کے

مطابق ضعیف ہیں یا جن کی روایت سے استدلال روا نہیں ہے، میں نے ان کو

اس میں شامل نہیں کیا ہے، ان لوگوں کا کتاب الضعفاء میں ذکر ہوگا۔“ (۳)

کتاب الثقات کے قلمی نسخے حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ اور سعید یہ اور مکتبہ

(۱) مقدمہ موارد الظمآن ص ۱۵۱ و مناقب السنہ ص ۱۵۲ و مقدمہ لسان المیزان ص ۶ (۲) کشف الظنون ج ۲

ص ۳۷۱ و ۳۷۲ و ۳۷۳ و ۳۷۴ و ۳۷۵ و ۳۷۶ و ۳۷۷ و ۳۷۸ و ۳۷۹ و ۳۸۰ و ۳۸۱ و ۳۸۲ و ۳۸۳ و ۳۸۴ و ۳۸۵ و ۳۸۶ و ۳۸۷ و ۳۸۸ و ۳۸۹ و ۳۹۰ و ۳۹۱۔

ایا صوفیہ اور مکتبہ سند یہ میں موجود ہیں۔ (۱)

۵۷۔ کتاب الضعفاء: یہ بھی رجال کی مشہور اور ضخیم کتاب سے اور اس کو حروف مجسم پر مرتب کیا گیا ہے، صاحب شرح الفیہ لکھتے ہیں کہ اس کے بمسوط مقدمہ میں حدیث کے راویوں کی بیس قسمیں بیان کی گئی ہیں، بعض لوگوں نے اس کو اور کتاب الثقات کو مصنف کی تاریخ کبیر کا خلاصہ بتایا ہے جو طلبہ اور معلمین کی سہولت کے لیے انھوں نے خود علاحدہ تیار کیا تھا۔

کتاب الضعفاء کا مختصر، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں مختصر اسماء البحر و صین کے نام سے موجود ہے۔ (۲)

۵۸۔ صحیح ابن حبان: اس کا نام التقاسیم والانواع بھی ہے، یہ پانچ جلدوں میں ہے، اس کو حدیث کی مشہور اور اہم کتاب خیال کیا جاتا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں اس کا بھی نام لیا ہے۔ (۳) اس کی بعض اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) صحیح ابن حبان کی سب سے اہم خصوصیت اس کی صحت ہے، صحیح میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ابن خزیمہ کی کتاب کے بعد اسی کا درجہ ہے، بعض محدثین نے اس کو سنن ابن ماجہ سے زیادہ صحیح روایتوں کا مجموعہ بتایا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ صحیحین کے بعد بہتر اور عمدہ مجموعے ابن خزیمہ اور ابن حبان کے ہیں۔

(۲) اس کو نہایت دلچسپ انداز اور نرالے ڈھنگ پر مرتب کیا گیا ہے یعنی فقہی ابواب اور مسانید پر احادیث مرتب کرنے کے مشہور اور مروج طریقوں کے بجائے اس کو اقسام و انواع پر مرتب کیا گیا ہے۔

(۱) تذکرۃ النوادر ص ۹۱ (۲) ایضاً و کشف الظنون ج ۲ ص ۸۲ و فہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۱ ص ۷۸۸

۷۸۹ و (۳) حجة اللہ الہدیہ ج ۱۔

(۳) ہر حدیث کے آخر میں رجال و اسناد کی تحقیق، حدیث کے مفہوم کی تعیین و وضاحت اور اسناد و متون کی فنی بحثیں اور دوسرے مفید و لطیف معلومات بیان کئے گئے ہیں۔

(۴) کتاب کے عنوانات سے ابن حبان کی فقہی بصیرت، عالمانہ ژرف نگاہی اور سنت و اثر سے مکمل واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ (۱)

مختصرات و زوائد: صحیح ابن حبان کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس کی جانب اعتنا کیا گیا اور اس کے زوائد، اطراف، حواشی اور مختصرات ترتیب دیئے گئے۔

۱- انواع و اقسام پر مرتب کئے جانے کی وجہ سے اس سے استفادہ مشکل اور دشوار تھا اس لیے امیر علماء الدین ابوالحسن علی فارسی (م ۷۳۷ھ) نے اس کو فقہی ابواب پر "الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان" کے نام سے مرتب کیا، اس میں اصل کی تمام خصوصیات کو برقرار رکھا گیا ہے اس کی پہلی جلد احمد محمد شاہ مرحوم کی تصحیح، تعلیقات اور مقدمہ کے ساتھ دارالمعارف قاہرہ سے بڑے اہتمام کے ساتھ دیدہ زیب نائپ اور عمدہ کاغذ پر ۳۱۵ صفحے میں شائع ہوئی ہے۔ (۲)

۲- حافظ ابن حجر نے اس پر مفید حواشی لکھے تھے۔ (۳)

۳- ابوالفضل عراقی نے اس کے اطراف لکھے۔

۴- سراج الدین عمر بن علی معروف بابن ملقن (۸۰۳ھ) نے اس کو مختصر ابواب پر مرتب کیا۔

۵- ابوالحسن نورالدین بیہقی نے موارد الظمان الی زوائد ابن حبان کے نام سے

(۱) اعلام ج ۳ ص ۸۸۰، شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۶، الرسالة المسطرز ص ۱۹ و مقدمہ موارد الظمان

ص ۱۳ و ۱۴ (۲) مقدمہ موارد الظمان ص ۱۳ (۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی، از مولانا عبد الرحمن صاحب مبارک

پوری ص ۱۶۳۔

اس کے زوائد لکھے، اس میں ان حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے جو صحیحین میں نہیں ہیں اس کا نسخہ مدینہ کے کتب خانہ میں تھا، اس کی مدد سے دارالحدیث مکہ کے مدیر شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ نے اس کو ایڈٹ کر کے مطبوعہ سلفیہ سے شائع کیا ہے، اس کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے، پیشی نے صحیحین کی بعض روایتوں سے اس کی عدم مطابقت و فرق اور حواشی میں حدیث کی بعض اور کتابوں سے اس کی روایتوں کی مطابقت دکھائی ہے اور کہیں کہیں راویوں کے ناموں کی تصحیح کی ہے۔

صحیح ابن حبان کے نسخے متعدد کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں اس کی ایک جلد مدینہ منورہ کے کتب خانہ محمودیہ میں بھی ہے، اس پر حافظ ابن حجر کے حواشی بھی ہیں۔ (۱) ایک شبہ کا جواب: اوپر جرح میں ابن حبان کے تشدد اور تعدیل میں نرمی کا ذکر کیا جا چکا ہے اسی بنا پر ان پر تساہل کا الزام عائد کیا گیا ہے، مگر یہ مطلق صورت میں قابل تسلیم نہیں ہے، اس لیے اس کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس شبہ اور الزام کی بنیاد ممتاز محدث علامہ نووی کے اس قول پر ہے:

|                       |                                  |
|-----------------------|----------------------------------|
| يقارب صحيح الحاكم في  | قريب صحيح حاكم بن                |
| حكمه صحيح ابى حاتم بن | ابو حاتم ابن حبان كى صحيح هبى هـ |

حبان۔ (۲)

عام محدثین کے نزدیک حاکم کا تساہل مشہور ہے اس لیے نووی کے اس بیان سے خیال ہوتا ہے کہ ابن حبان کے یہاں بھی اسی قسم کا تساہل پایا جاتا ہے جس کے لیے حاکم کو شہرت ہے لیکن ارباب فن نے اس قول کی وضاحت میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس شبہ کی تردید ہو جاتی ہے علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

”اس بیان سے بظاہر حاکم کی کتاب کی ترجیح معلوم ہوتی ہے مگر ایسا

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۲۳ (۲) تدریب الراوی ص ۳۲۳۔

واقعہ نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد حاکم کے تساہل میں ابن حبان کی قربت و مماثلت کا اظہار ہے ابن حبان کی جانب اس کی نسبت اس لیے صحیح نہیں ہے کہ وہ صرف حسن کو صحیح سے موسوم کر دیتے ہیں باقی جن شرطوں کو انھوں نے بیان کیا ہے ان کا پوری طرح لحاظ رکھا ہے اور حاکم کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔“ (۱)

حافظ ابن حجر رقمطراز ہیں:

”حاکم کے مقابلہ میں ان کا تساہل کم درجے کا ہے۔“

حازمی کا بیان ہے کہ:

”حاکم سے زیادہ ان کو حدیثوں میں درخور حاصل ہے، اگر ان کی جانب تساہل کی نسبت اس وجہ سے کی گئی ہے کہ ان کی کتاب میں حسن روایتیں موجود ہیں تو یہ بجا ہے کیوں کہ انھوں نے اس کو صحیح کے نام سے موسوم کیا ہے لیکن اگر اس سے شرطوں میں تخفیف و تساہل کی جانب اشارہ مقصود ہے تو یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ وہ اپنی صحیح میں انھیں ثقات اور غیر مدلس اشخاص کی حدیثیں بیان کرتے ہیں جنھوں نے اپنے شیوخ سے ان کو اور ان سے روایت کرنے والوں نے ان سے ان کا سماع کیا ہوا اور ان میں کسی قسم کا ارسال و انقطاع نہ ہو حقیقت یہ ہے کہ رداۃ کی ثقاہت کے متعلق ان کا ایک خاص نظریہ ہے، اسی کے مطابق کتاب الثقات مرتب کی گئی ہے لیکن اس اصول سے ناواقفیت کی بنا پر ان پر اعتراض کیا جاتا ہے۔“ (۲)

(۱) تدریب الراوی ص ۳۱ و ۳۲ (۲) مقدمہ موارد النظر ص ۱۳

## امام ابو بکر آجری

(متوفی ۳۶۰ھ مطابق ۹۷۰ء)

نام و نسب: محمد نام، ابو بکر کنیت اور سلسلہ نسب یہ ہے: محمد بن حسین بن عبد اللہ۔ (۱)  
ولادت و وطن: وہ بغداد میں پیدا ہوئے، سنہ پیدائش کا مورخین نے ذکر نہیں کیا ہے،  
آجری کی نسبت سے زیادہ مشہور ہیں، انساب کے ماہر علامہ سمعانی کے بیان سے معلوم  
ہوتا ہے کہ یہ پیشہ کی جانب نسبت ہے، یعنی وہ اینٹیں بناتے اور ان کو فروخت کرتے  
تھے۔ (۲) لیکن علامہ ابن خلکان نے اس نسبت کے سبب سے لاعلمی ظاہر کی ہے اور کتاب  
الصلہ کے حاشیہ کے حوالہ سے یہ تحریر فرمایا ہے کہ آجری بغداد کے ایک گاؤں کا نام تھا اور یہ اسی  
کی جانب نسبت ہے۔ (۳)

آخر عمر میں مکہ معظمہ میں آباد ہو گئے تھے اور ۳۰ سال تک جو بیت اللہ میں رہ کر  
حج بیت اللہ کو آنے والوں اور بلاد مغرب کے لوگوں کی تعلیمی علم بجاتے رہے، ابن خلکان اور  
ابن جوزی وغیرہ نے لکھا ہے کہ آجری جب مکہ معظمہ تشریف لائے تو یہ شہر انھیں بہت پسند آیا  
اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اس میں ایک سال تک قیام کرنے کی دعا کی، ہاتھ غیب نے  
صدی کہ ابو بکر ایک ہی سال کی تمنا کیوں کرتے ہو تم کو تیس سال تک یہاں قیام کرنے کا

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۸ (۲) کتاب الانساب ورق ۱۴ (۳) وفیات الامیاء ج ۳ ص ۲۹۱۔

موقع ملے گا، چنانچہ ان کی حیات مستعار کے بقیہ دن یہیں گزرے اور ۳۰ سال کے بعد جب داعی اجل کا پیام آیا تو وہ اسی کی خاک میں پیوند کئے گئے۔ (۱)

اساتذہ و شیوخ: ابو بکر آجری کے بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہے:

ابو شعیب حرائی، ابو مسلم ابراہیم بن عبداللہ کجی، احمد بن حسن بن عبد الجبار صوفی، احمد بن عمر بن زنجویہ قطان، احمد بن یحییٰ حلوانی، جعفر بن محمد فریادی، خلف بن عمرو عکمری، قاسم بن زکریا مطرز، مفضل بن محمد جندی، ہارون بن یوسف بن زیاد۔ (۲)

علامہ: بعض مشہور شاگردوں کے نام حسب ذیل ہیں:

حافظ ابو نعیم احمد بن عبداللہ اسمہانی، عبدالرحمن بن عمر بن نحاس، ابوالحسن علی بن محمد عبداللہ بشران سکری، ابوالحسن علی بن احمد بن عمر حمای مقری، (ان کے بھائی) ابوالقاسم عبدالملک محمد بن حسین بن فضل قطان، محمود بن عمرو عکمری۔ (۳)

حفظ و ضبط اور حدیث میں درجہ: مورخین اور علمائے فن نے بالاتفاق ان کی توثیق کی ہے اور حدیث میں ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے، حافظ ذہبی ان کو ”الامام المحدث القدوة“ لکھتے ہیں، علامہ ابن اثیر کا بیان ہے کہ ”طبرانی اور آجری کبار محدثین و حفاظ میں تھے“ خطیب، ابن جوزی اور ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ”وہ ثقہ تھے“ علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ”آجری ثقہ و صدوق تھے“ حافظ ذہبی اور ابن عماد کہتے ہیں کہ وہ ثقہ و ضابط محدث اور صاحب سنت تھے۔“ (۴)

فقہ: فقہ و اجتہاد میں بھی آجری کا درجہ بلند تھا اور وہ الفقہ کے لقب سے موسوم کئے جاتے تھے، اس فن میں کئی کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں۔

تدین و تقویٰ: علم و فضل کی طرح زہد و تقویٰ بھی ان کا شعار تھا، ابن ندیم کا بیان ہے کہ ”وہ

(۱) ذیقات الاعیان ج ۲ ص ۲۹۱ و ص ۲۶۶ (۲) تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۳۳ و تذکرۃ الحفاظ

ج ۳ ص ۱۴۸ (۳) ایضاً و کامل ابن الاثیر ص ۲۰۴ (۴) العصر ج ۲ ص ۲۱۸۔

تذکرۃ الحمدین.... گلستان حدیث کے مسکتے گا ایمان افزہ تحقیقی تذکرہ

صلحائے عباد میں تھے۔“ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ”وہ عالم باعمل، صاحب سنت اور متبع شریعت تھے۔“ مورخ خطیب اور علامہ سمعانی وغیرہ نے بھی ان کے صلاح و تدین کا اعتراف کیا ہے۔ (۱)

فقہی مسلک: گوان کے شافعی المذہب ہونے پر اتفاق ہے چنانچہ ابن ندیم لکھتے ہیں وکان علی مذهب الشافعی (وہ امام شافعی کے مسلک فقہ سے وابستہ تھے) لیکن ابن عماد حنبلی کا بیان ہے کہ:

كان حنبلياً وقيل شافعيًا      آجری حنبلی تھے مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ  
وبه جزم الاسنوي وابن      وہ شافعی تھے اور اسنوی وابن اہل نے  
الاهل۔ (۲)      اسی کو قطعی بتایا ہے۔

وفات: یکم محرم الحرام ۳۶۰ھ کو مکہ معظمہ میں وفات ہوئی اور یہیں سپرد خاک کئے گئے۔ (۳)

تصنیفات: امام ابو بکر آجری کثیر التصانیف تھے، فقہ، حدیث اور زہد و رقائق وغیرہ میں انھوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں مگر اب وہ سب نایاب اور معدوم ہیں جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

۱- کتاب احکام النساء، ۲- کتاب مختصر الفقہ، ۳- کتاب البصیحة: یہ تینوں کتابیں فقہ میں ہیں، ابن ندیم نے ان کا ذکر کیا ہے، ۴- کتاب الشریحة: یہ سنت و حدیث میں تھی، حاجی خلیفہ نے اس کا نام لکھا ہے۔

۵- کتاب الاربعین: یہ امام صاحب کی سب سے مشہور تصنیف ہے، شاہ

عبد العزیز صاحب کتب حدیث کے طبقات و اقسام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱) البہرہ ص ۳۰۱، ۳۰۲ تذکرۃ ج ۳ ص ۱۱۳۸ انساب ورق ۱۳۔ (۲) البہرہ ص ۳۰۲ و شذرات

الذہب ج ۳ ص ۳۵ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۱ تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۳۳۔



”اربعیاتی میں چالیس حدیثیں ایک باب یا مختلف ابواب میں ایک سند یا متعدد

سندوں سے جمع کی جاتی ہیں، اربعیاتی بیسار ہیں۔“ (۳)

حاجی خلیفہ لکھتے ہیں کہ ”اربعیاتی کی جمع و تالیف کے اغراض و مقاصد مختلف ہیں چنانچہ بعض میں توحید و اثبات صفات، بعض میں احکام و عبادات، بعض میں مواعظ و رقائق اور بعض میں فضائل و مناقب کے متعلق روایتیں درج ہوتی ہیں، اربعیاتی کے بعض مجموعے صحیح الاسناد اور طعن و قدح سے خالی اور بعض نہایت عالی سندوں اور طویل متن والی حدیثوں پر مشتمل ہیں۔“ (۱)

ابن سبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آجری کی اربعین کی سندیں عالی اور بلند تھیں، حاجی خلیفہ اور دوسرے اصحابِ فہارس نے اس موضوع کی اکثر کتابوں کے نام لکھے ہیں، اس فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ اربعیاتی میں سب سے قدیم مجموعہ یہی ہے (۲) گو اس کو نووی وغیرہ کی اربعین جیسی شہرت نہیں ملی تاہم قدامت اور اسناد کی قوت کے اعتبار سے اس کی اہمیت مسلم ہے۔



(۳) بستان الحدیثین۔ (۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۶۷ و اتحاف السلفاء السعیدین ص ۷۷ (۲) ایضاً و طبقات

الشافعیہ ج ۲ ص ۱۵۰۔

## امام ابوالقاسم طبرانی

(متوفی ۳۶۰ھ)

نام و نسب: سلیمان نام، ابوالقاسم کنیت اور سلسلہ نسب یہ ہے: سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر۔

ولادت: امام ابوالقاسم ماہ صفر ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ (۱)  
خاندان: ان کا قبیلہ نخم سے نسبی تعلق تھا، اس لیے نخمی کہلاتے تھے، نخم دراصل یمن کا ایک قبیلہ ہے، اس کی ایک شاخ شام میں آباد ہو گئی تھی، اس قبیلہ سے متعدد نامور لوگ منسوب ہیں، امام صاحب کے والد بزرگوار کو علم و فن سے بڑی دلچسپی تھی، اس لیے وہ اپنے فرزند کو بھی علم کی تحصیل و تکمیل کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

وطن: ان کا اصلی وطن طبر یہ ہے مگر آخر عمر میں انھوں نے اصہبان میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، طبر یہ اردن کے قریب واقع ہے ۱۳ھ میں شرحیل بن حسنہ نے اس کو اسلامی سلطنت کے زیر نگیں کیا تھا، اس کی نسبت سے وہ طبرانی کہلاتے ہیں، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ عکا میں پیدا ہوئے یہاں سے طبر یہ کی مسافت دور دراز میں طے ہوتی تھی۔ (۲)  
اساتذہ: امام طبرانی نے ایک ہزار سے زیادہ باکمال محدثین سے استفادہ کیا تھا، بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن ابی سفیان قیسرانی، ابراہیم بن محمد بن عرق حمصی، ابراہیم بن مویذ

(۱) تذکرۃ المحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۹۵، ۳۶۶، ابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۳، کتاب المختصر ج ۷ ص ۵۳ و معجم البلدان ج ۶ ص ۲۳۲۳۔

شیبانی، ابوزرعہ دمشقی، ابو عبد الرحمن نسائی، ابو مسلم کجی، احمد بن انس، احمد بن عبد الرحیم حوطی، احمد بن عبد القاہر، احمد بن معقل، احمد بن یحییٰ، ادریس بن جعفر عطاء، اسحاق بن ابراہیم دیری، ابوعلی اسماعیل بن محمد بن قیراط، بشر بن موسیٰ، حسن بن سہل، حسن بن عبد الاعلیٰ بوسی، حفص بن عمر، عبد اللہ بن محمد بن سعید بن ابی مریم، علی بن عبد العزیز بغوی، ابوخلیفہ فضل بن حباب جمحی ابوسعید بن ہاشم بن مرشد طبرانی اور یحییٰ بن ایوب علاف وغیرہ۔ (۱)

تلاذہ: ان کے تلاذہ و منتسبین کی تعداد بھی بے شمار ہے اور ان سے استفادہ کرنے والوں میں ان کے بعض شیوخ بھی شامل ہیں، بعض تلاذہ کے نام یہ ہیں:

ابن عقدہ، ابوبکر بن زبدہ، ابوبکر بن مردویہ، ابواحمد بن عبد اللہ بن عدی جرجانی، ابوالحسن بن قادیہ، ابو عمر محمد بن حسین بسطامی، حافظ ابو نعیم احمد بن عبد اللہ، احمد بن محمد صحاف، حسین بن احمد بن مرزبان، عبد الرحمن بن احمد صفا، ابوبکر عبد الرحمن بن علی ذکوانی، ابوالفضل محمد بن احمد جارودی، ابو عمر محمد بن حسین بسطامی، محمد بن عبید اللہ بن شہریار۔

امام طبرانی کے حلقہ فیض سے دو صاحب کمال و ذرا بھی وابستہ تھے، ان میں ابن عمید لغت و عربیت اور شعر و ادب میں سرآمد روزگار تھا، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دیلمی حکومت میں اس لیاقت و قابلیت کا کوئی اور روزی نہیں گذرا اور دوسرا وزیر صاحب بن عباد بھی ممتاز ادیب و دانش پرداز اور امام طبرانی کا شاگرد اور تربیت یافتہ تھا۔ (۲)

تحصیل علم کے لیے سفر: امام طبرانی ۲۷۳ھ میں علم و فن کی تحصیل میں مشغول ہوئے تھے، اس وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی، پہلے انھوں نے اپنے وطن طبریہ کے اصحاب کمال سے استفادہ کیا، ۲۷۴ھ میں قدس اور ۲۷۵ھ میں قیساریہ تشریف لے گئے، اس کے بعد انھوں نے دوسرے اسلامی ملکوں اہم مقامات اور مشہور مراکز حدیث کا رخ کیا اور حمص، جبلہ،

(۱) تذکرۃ الخطاط ج ۳ ص ۱۲۶ وغیرہ (۲) تذکرۃ الخطاط ج ۳ ص ۱۲۷ دبستان الہدیین ص ۵۵ و کتاب

مدائن، شام، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، یمن، مصر بغداد، کوفہ، بصرہ، جزیرہ، فارس اور اصہبان وغیرہ تشریف لے گئے، اصہبان کی مرکزیت کی وجہ سے یہیں بود و باش بھی اختیار کر لی تھی، علم کی تلاش و جستجو اور احادیث کی تحصیل میں ان کو سخت مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کے ذوق و شوق اور سرگرمی و انہماک میں کبھی کمی نہیں آئی شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

”۳۰ سال تک ان کو بستر پر سونا نصیب نہ ہوا مگر وہ آرام و آسائش کا

خیال کئے بغیر حدیث کی تحصیل میں مشغول اور بوریا پر سوتے رہے۔“ (۱)

**حفظ و ثقاہت:** حفظ و ضبط اور ثقاہت و اتقان میں ان کا مرتبہ بلند تھا، ان کے معاصرین فضلا اور ارباب کمال محدثین نے ان کے حافظ اور ثقاہت کا اعتراف کیا ہے، علمائے سیر و تراجم نے ان کو الحافظ الكبير، احد الحفاظ، الحافظ العلم، واسع الحفظ، الحجة اور من الثقات الاثبات المعدلین وغیرہ لکھا ہے، ابراہیم بن محمد بن حمزہ کا بیان ہے کہ ”میں نے ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں دیکھا۔“ ابن خلکان لکھتے کہ ”وہ اپنے عہد کے ممتاز حافظ تھے“ علامہ ابن جوزی رقمطراز ہیں کہ ”امام سلیمان کا حافظ نہایت قوی تھا، صاحب بن عباد ان کے حافظ کی قوت اور یادداشت کی زیادتی کے معترف تھے۔“ ان کے صدق و ثقاہت کے بارے میں بھی علمائے فن کا اتفاق ہے، حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ وہ ضبط و ثقاہت اور صدق و امانت کے ساتھ بڑے عظیم رتبہ اور شان کے محدث تھے، احمد بن منصور اور ابن ناصر الدین کہتے ہیں کہ ”وہ ثقہ تھے“ علامہ ابن حجر نے ان کو ثابت و ضابطہ لکھا ہے، یافعی اور ابن عماد تحریر فرماتے ہیں کہ طبرانی ثقہ و صدوق اور حدیثوں کے علل، رجال و ابواب کے اچھے واقف کار تھے۔ (۲)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۷ و بستان الحمد شین ص ۵۵ و کتاب الانساب ورق ۳۶۶ و المعجم ج ۲

ص ۳۱۶ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ و ۱۳۰، لسان المعجم ج ۳ ص ۷۳، مرآة البیان ج ۲ ص ۳۷۲

و شذرات الذہب ج ۲ ص ۳۰۔

حدیث میں درجہ: امام طبرانی علم و فضل کے جامع اور فن حدیث میں نہایت ممتاز تھے، علامہ ذہبی نے انھیں ”الامام العلامہ اور ”الدینیا“ اور یاقعی وابن عماد نے ”مسند العصر“ لکھا ہے، ابن ناصر الدین کہتے ہیں کہ وہ مسند الآفاق تھے، ایک دفعہ ابن عقدہ سے ایک اصحابی شخص نے کوئی مسئلہ دریافت کیا، انھوں نے پوچھا کہ تم نے سلیمان بن احمد نخعی سے سماع کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں ان سے واقف نہیں، ابن عقدہ نے حیرت سے سبحان اللہ کہا اور فرمایا کہ ان کے ہوتے ہوئے تم لوگ ان سے حدیثیں نہیں سنتے اور ہم لوگوں کو خواہ مخواہ دق کرتے ہو میں نے طبرانی کا کوئی مثیل اور نظیر نہیں دیکھا، ابو بکر بن علی کا بیان ہے کہ وہ بڑے وسیع العلم تھے، حدیث میں ان کی وسعت نظر اور کمال کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد بن منصور شیرازی نے ان کے تین لاکھ حدیثیں لکھی تھیں، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ حدیث کی کثرت اور علوے اسناد میں ان کی ذات نہایت ممتاز تھی اور حدیث میں ان کی بالغ نظری کا پوری دنیائے اسلام میں چرچا تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث میں وسعت اور کثرت روایت میں وہ یکتا اور منفرد تھے۔ (۱)

فقہی مذہب: قیاس ہے کہ امام طبرانی کا فقہی مسلک وہی رہا ہوگا جو محدثین اور ائمہ سنت کا ہے، مولانا عبدالحلیم چشتی نے انھیں شافعی بتایا ہے۔ (۲)

ابو بکر چغابی سے ایک دلچسپ مناظرہ: امام طبرانی کے علم و فضل اور حدیث میں عظمت و کمال کا اندازہ اس مناظرہ سے بھی ہوتا ہے جو ان کے اور ابو بکر چغابی کے درمیان ہوا تھا، صاحب بن عباد بیان کرتے ہیں۔

مجھے دنیا میں وزارت سے زیادہ کوئی چیز مرغوب اور عزیز نہ تھی اور میں اس سے زیادہ کسی منصب کو اعلیٰ اور برتر نہیں خیال کرتا تھا، کیوں کہ اسی کی بدولت مجھے ہر طرح کا اعزاز اور ہر طبقے میں مقبولیت حاصل تھی لیکن ایک روز میرے سامنے مشہور محدث ابو بکر

(۱) ایضاً دبستان الحدیث ص ۵۴ (۲) فوائد جامعہ برجلہ نافعہ ص ۱۸۰۔

چغابی اور ابوالقاسم طبرانی میں حدیث کے بارے میں ایک مباحثہ ہوا، حفظ و ضبط میں طبرانی اور ذہانت و فطانت میں چغابی فائق معلوم ہوتے تھے، یہ مباحثہ دیر تک ہوتا رہا، دونوں طرف سے بڑے جوش و خروش کا اظہار اور پر زور آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اسی اثنا میں چغابی نے کہا میرے پاس ایک حدیث ایسی ہے جو اور کسی کو معلوم نہیں، طبرانی نے اسے بیان کرنے کے لیے کہا تو انھوں نے فرمایا:

حدثنا ابو خلیفۃ قال حدثنا  
 سلیمان بن ایوب ابوالقاسم  
 ہم سے ابو خلیفہ نے حدیث بیان کی  
 انھوں نے کہا ہم سے سلیمان بن  
 ایوب ابوالقاسم نے روایت کی.....

طبرانی نے کہا حضرت! سلیمان بن ایوب تو میں ہی ہوں اور ابو خلیفہ میرے شاگرد ہیں اگر آپ اس حدیث کو میرے واسطے سے بیان کریں تو آپ کی سند زیادہ عالی ہوگی، اس سے بے چارے ابو بکر چغابی بہت نادم ہوئے، ان کی ندامت اور طبرانی کی فتح و مسرت دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ کاش میں طبرانی ہوتا تو آج وہی سرور و انبساط اور غلبہ و کامرانی جو انھیں حاصل ہوئی ہے، مجھے حاصل ہوتی، یہ منظر دیکھ کر میرے دل سے وزارت کی اہمیت جاتی رہی کیوں کہ علم و فضل کی بدولت اس سے کہیں بڑھ کر اعزاز و اکرام اور جاہ و مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ (۱)

بعض مورخین نے صاحب بن عباد کے بجائے ابن عمید کی نسبت سے یہ واقعہ تحریر کیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز نے اس پر کتنا دلچسپ اور بہتر تبصرہ فرمایا ہے وہ لکھتے ہیں:

ایں تمنا و آرزوے ہم از بقائے  
 صاحب بن عباد کا اس قسم کی آرزو و تمنا  
 وزارت و ریاست او بود والا علمائے  
 کرنا در حقیقت وزارت و ریاست ہی

ربانین را بسبب این غلبہ ہائے  
تغیرے نمی شود و نفس ایشان بحرکت  
نمی آید و لکن المرء یقیس علی نفسه۔  
ان کی طبیعتیں اس قسم کے واقعات سے  
متاثر ہوتی ہیں مگر آدمی دوسروں کو بھی

(۱).....

اپنے ہی اوپر قیاس کرتا ہے۔

دینی غیرت و حمیت: امام طبرانی میں بڑی دینی غیرت و حمیت تھی، ابن جوزی کا بیان ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں نہایت سخت تھے، (۲) ان کو صحابہ کرام سے غیر معمولی محبت و عقیدت تھی، اس لیے ان کی کوئی مذمت اور تنقیص گوارا نہیں کرتے تھے، بعض مصنفین کا بیان ہے کہ وہ پہلی دفعہ اصحاب تشریف لے گئے تو ابوعلی زینم نے جوڑکواہ و خراج کا عامل تھا، ان کی بڑی آؤ بھگت کی امام صاحب اس کے یہاں برابر تشریف لے جاتے تھے، اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکے نے امام صاحب کے لیے پانچ سو درہم ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا لیکن جب اس نے حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بارہ میں مخالفت نہ رویہ اختیار کیا تو امام طبرانی اس سے سخت آزرده ہو گئے یہاں تک کہ اس کے یہاں آمد و رفت بھی بند کر دی۔ (۳)

اس زمانہ میں قرامطہ اور فرقۃ اسماعیلیہ کا بڑا زور و اثر تھا، یہ لوگ محدثین سے بڑی کدورت اور سخت عناد رکھتے تھے، ان لوگوں نے امام صاحب کی دینی معاملات میں شدت پسندی کی وجہ سے ان پر سحر کر دیا تھا، اس کی وجہ سے ان کی آنکھوں کی بصارت ختم ہو گئی تھی۔ (۴)

(۱) بیسان الحدیثین ص ۵۵ (۲) المستطعم ج ۷ ص ۵۲ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۸، ۱۲۹ (۴) بیسان الحدیثین ص ۵۲۔

وقات: امام طبرانی نے بروز شنبہ ۲۸ رزق و قعدہ ۳۶۰ھ کو سو سال کی عمر میں انتقال کیا اور ایک صحابی حضرت حمدی کے مزار کے پہلو میں دفن کئے گئے، حافظ ابو نعیم اصبہانی نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ (۱)

تصنیفات: امام طبرانی کثیر التصانیف تھے لیکن قدیم مصنفین کی طرح ان کی بھی اکثر کتابیں محفوظ نہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام اور بعض کے متعلق مختصر معلومات درج ہیں۔

- ۱- کتاب الاوائل، ۲- کتاب التفسیر، ۳- کتاب المناک، ۴- کتاب عشرة النساء، ۵- کتاب السیة، ۶- کتاب الطوالات، ۷- کتاب النوادر، ۸- کتاب دلائل النبوة، ۹- کتاب مند شعبہ، ۱۰- کتاب مسند سفیان، ۱۱- کتاب حدیث الشامیین، ۱۲- کتاب الری، ۱۳- مسند العشرة، ۱۴- معرفۃ الصحابہ، ۱۵- فوائد معرفۃ الصحابہ، ۱۶- مسند ابی ہریرہ، ۱۷- مسند عائشہ، ۱۸- حدیث الاعمش، ۱۹- حدیث الاوزاعی، ۲۰- حدیث شیبان، ۲۱- حدیث ایوب، ۲۲- مسند ابی ذر، ۲۳- کتاب الرویة، ۲۴- کتاب الجود، ۲۵- العلم الاولیہ، ۲۶- فضل رمضان، ۲۷- کتاب الفرائض، ۲۸- کتاب الرد علی المعتزلہ، ۲۹- کتاب الرد علی الجہمیہ، ۳۰- مکارم اخلاق العزراء، ۳۱- الصلوٰۃ علی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، ۳۲- کتاب المامون، ۳۳- کتاب الغسل، ۳۴- کتاب فضل العلم، ۳۵- کتاب ذم الرای، ۳۶- کتاب تفسیر الحسن، ۳۷- کتاب الزہری عن انس، ۳۸- کتاب ابن المنکدر عن جابر، ۳۹- مسند ابی اسحاق السبعمی، ۴۰- حدیث یحییٰ بن کثیر، ۴۱- حدیث مالک بن دینار، ۴۲- کتاب ماروی الحسن عن انس، ۴۳- حدیث ربیعہ، ۴۴- حدیث حمزہ الزیاتی، ۴۵- حدیث مسعر، ۴۶- حدیث ابی سعد البقال، ۴۷- طرق حدیث من کذب علی، ۴۸- کتاب النوح، ۴۹- مسند ابی جنادہ، ۵۰- کتاب من اسمہ عطاء، ۵۱- کتاب من اسمہ شعبہ، ۵۲- کتاب اخبار عمر بن عبدالعزیز، ۵۳- کتاب اخبار عبدالعزیز بن رفیع، ۵۴- مسند

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۱ و ابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۳ و المنتظم ج ۷ ص ۵۴۔



روح ابن القاسم، ۵۵- کتاب فضل عکرمہ، ۵۶- کتاب امہات النبی، ۵۷- مسند عمارۃ بن غزیہ، ۵۸- مسند طلحہ بن مسرف وجماعۃ، ۵۹- مسند العبادلہ، ۶۰- احادیث ابی عمرو بن العلاء، ۶۱- کتاب غرائب مالک، ۶۲- جزو ابان بن تغلب، ۶۳- جزء حریث ابن ابی مطر، ۶۴- وصیۃ ابی ہریرۃ، ۶۵- مسند الحارث العسکلی، ۶۶- فضائل الاربعۃ الراشدین، ۶۷- مسند ابن عجلان، ۶۸- کتاب الاثریۃ، ۶۹- کتاب الطہارۃ، ۷۰- کتاب الامارۃ، ۷۱- مسند ابی ایوب الافریقی، ۷۲- مسند زیاد الجصاص، ۷۳- مسند زافر، ۷۴- حدیث شعبہ، ۷۵- کتاب من اسمہ عباد۔ (۱)

۷۶- کتاب الدعاء: یہ طبرانی کی مشہور اور ضخیم کتاب ہے، اس کی اہمیت و استناد اور ترتیب کی خوبی کا اندازہ ان کے اس بیان سے پوری طرح ہو جاتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

”میری یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا مجموعہ ہے، چون کہ میں نے دیکھا کہ اکثر لوگوں نے ان دعاؤں کو اختیار کر لیا ہے جو مسیح عبارتوں میں اور روزمرہ کے لیے وضع کی گئی ہیں، اور ان کو راتوں (واعظمین) نے جمع کیا ہے، یہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صحابی اور تابعی سے مروی نہیں ہیں بلکہ آپ سے دعا میں صحیح قافیہ بندی اور تعدی کی کراہت وارد ہے، اس لیے میں نے یہ کتاب تالیف کی جو ان دعاؤں پر مشتمل ہے جن کی سندیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، اس میں پہلے دعا کے فضائل و آداب بیان کئے گئے ہیں، پھر آپ جس حال میں جو دعائیں کرتے تھے ان کو علاحدہ علاحدہ ابواب میں درج کیا گیا ہے، اس کے آخری باب میں آیت کریمہ (ادعونی استجب لکم) کی تفسیر کی گئی ہے۔“ (۲)

(۱) ان رسائل کا ذکر متفرق کتابوں میں ملتا ہے، مولانا عبدالحمید چشتی نے مجلہ نافعہ کے فوائد میں ان کو جمع کر دیا ہے۔ (ص ۸۰ و ۸۱) (۲) بستان المحدثین ص ۵۳۔

**معاجم ثلاثہ:** امام طبرانی نے معجم میں تین کتابیں لکھیں، یہ ان کی مشہور اور اہم اور حدیث کی بلند پایہ کتابیں سمجھی جاتی ہیں، شاہ ولی اللہ دہلوی نے ان کو حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں شامل کیا ہے، ان کی بدولت امام طبرانی کو لازوال شہرت ملی۔

**معجم کی تعریف:** محدثین کی اصطلاح میں ان کتابوں کو معجم کہا جاتا ہے جن میں شیوخ کی ترتیب پر حدیثیں درج کی گئی ہیں، اس طرح کی بعض کتابوں میں شیوخ کی وفات اور بعض میں ان کے علم و تقویٰ کے تقدم کا لحاظ کیا گیا ہے لیکن عموماً حروفِ حجازی کی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے، شیوخ کے بجائے صحابہ یا بلاد و امصار کی ترتیب پر بھی معاجم مرتب کیے گئے ہیں۔

۷۷۔ **معجم کبیر:** یہ دراصل مسند ہے کیوں کہ اس میں صحابہ کی ترتیب پر ان کے مرویات شامل کئے گئے ہیں لیکن اس کی شہرت معجم کے نام سے ہوئی، مشہور اور کثیر الروایت صحابی حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیثیں اس میں شامل نہیں ہیں، طبرانی ان کے مرویات کو علاحدہ ایک کتاب میں جمع کرنا چاہتے تھے لیکن یا تو وہ اسے مرتب نہیں کر سکے یا مرتب کیا تو اس کی شہرت نہیں ہو سکی، ابن عابدین کا بیان ہے کہ یہ بارہ جلدوں میں ہے اور اس میں ساٹھ ہزار حدیثیں شامل ہیں، ابن دحیہ کا بیان ہے کہ کتب معاجم میں سب سے بڑی یہی ہے اور جب محدثین مطلق معجم کہتے ہیں تو ان کی مراد اسی کتاب سے ہوتی ہے لیکن محدثین میں اس کے زیادہ متداول نہ ہونے کی وجہ سے امیر علاء الدین علی بلبن (م ۷۳۱ھ) نے اس کی ازسرنو تہذیب و ترتیب کی تھی، حافظ ابوالحسن ہاشمی نے اس کے ان مرویات کو جو صحاح میں نہیں ہیں، تین جلدوں میں جمع کیا تھا، مکتبہ شریعہ دارالعلوم پشاور میں اس کا نسخہ موجود ہے۔ (۱)

۷۸۔ **معجم اوسط:** اس کو شیوخ کے ناموں پر مرتب کیا گیا ہے، اس میں طبرانی نے اپنے تقریباً ایک ہزار شیوخ کے افراد و غرائب جمع کیے ہیں، محدثین کے نزدیک افراد و غرائب

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۶۵، ۳۶۵، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳

ان حدیثوں کو کہا جاتا ہے جو ایک ہی شیخ کے پاس ہوں اور دوسرے شیوخ ان سے واقف نہ ہوں، یہی وجہ ہے کہ اس مجموعہ میں نفیس، عزیز اور منکر ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں لیکن اس کی ترتیب و تالیف میں امام طبرانی نے بڑی کاوش سے کام لیا تھا، ان کو خود بھی یہ کتاب بہت زیادہ عزیز تھی، اس سے حدیث میں ان کی فضیلت و کمال اور کثرت و اقیقت کا پتہ چلتا ہے، اس کے باب میں تفر و ثقہ کا ذکر ہے۔

یہ چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، ابوالحسن بیہمی نے اس کے زوائد بھی علاحدہ مرتب

کئے تھے۔ (۱)

۷۹۔ معجم صغیر: یہ سب معاجم میں مختصر ہونے کی وجہ سے زیادہ مقبول اور متداول ہے، اس کی ترتیب بھی شیوخ کے ناموں پر ہے اور اس میں انھوں نے حروفِ حبی کے مطابق ایک ہزار سے زیادہ شیوخ کی ایک حدیث درج کی ہے، آخر میں بعض خواتین کی بھی حدیثیں ہیں ان کی حدیثوں کی تعداد دو ہزار بتائی گئی ہے لیکن بعض نے ڈیڑھ ہزار بھی کہا ہے، اس کے زوائد بھی ابوالحسن بیہمی نے علاحدہ مرتب کئے تھے، معجم صغیر کے نسخے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں، ۱۳۱۱ھ میں یہ مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے، اس کی بعض خصوصیات ملاحظہ ہوں، اس میں روایت اور راوی کے متعلق مختلف قسم کی تصریحات کی گئی ہیں، مثلاً حدیث کے ضعف و قوت، رفع و اتصال، تفرّد، شہرت اور غرابت، راویوں کے ضبط و ثقاہت یا وہم و ضعف، کنیت، نسبت، نام، لقب، قبیلہ، وطن اور بعض کے نسب نامے اور روایتوں میں فرق و اختلاف اور کمی بیشی کی تصریح کی گئی ہے، جس سنہ اور مقام پر جو روایت سنی یا لکھی گئی ہے کہیں کہیں اس کی اور بعض راویوں کی صحابیت و تابعیت کا ذکر کیا گیا ہے، بعض روایتوں کے کسی خاص لفظ یا فقرہ کے متعلق یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ وہ صرف اسی حدیث میں مذکور ہے، بعض شیوخ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے فلاں شیخ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ ابستان الحدیثین ص ۵۵ و الرسالة المستطرد ص ۱۱۰۔

سے کتنی حدیثیں بیان کیں یا اس نے اور کن مشہور شیوخ سے سنیں یا اس سے کن مشہور اشخاص اور اہم راویوں نے حدیثیں روایت کی ہیں اسی طرح اکثر راویوں کے وہ نمایاں اوصاف بیان کئے گئے ہیں جن سے ان کی زیادہ شہرت ہے۔

۲- حدیث کے بارے میں اہل علم کے بیان کردہ مفہوم و منشاء کو ذکر کرنے کے علاوہ خود بھی کہیں کہیں اس کی مراد واضح کی ہے اور راوی نے حدیث کے بعض الفاظ کی جو وضاحت کی ہے، اس کو اور کہیں کہیں خود بھی مشکل اور غریب الفاظ کے معنی لکھے ہیں۔

۳- امام طبرانی نے ائمہ فقہ اور محدثین کے فقہی اقوال اور رائیں بھی نقل کی ہیں اور خود بعض روایتوں کی اس طرح تشریح کی ہے جن سے کسی خاص فقہی مسلک کی تائید اور وضاحت ہوتی ہے، مثلاً ایک حدیث ہے کہ:

|                             |                                        |
|-----------------------------|----------------------------------------|
| عن ابن عباس ان النبی        | حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ          |
| صلی اللہ علیہ وسلم قال یا   | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا |
| بنی عبد مناف یا بنی         | اے بنی عبد مناف، اے بنی                |
| عبدالمطلب ان ولیتم هذا      | عبدالمطلب اگر تم اس معاملہ کے ذمہ      |
| الامر فلا تمنعوا احداً طواف | دار ہونا تو خانہ کعبہ کا طواف کرنے     |
| بهذا البيت ان یصلی اية      | والے کسی شخص کو رات اور دن کے کسی      |
| ساعة شاء من لیل ونهار۔      | حصہ میں نماز پڑھنے سے منع نہ کرنا۔     |

امام طبرانی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

|                          |                                     |
|--------------------------|-------------------------------------|
| یعنی الرکعتین بعدا لطواف | آپؐ کی مراد سات پھیرے طواف کے       |
| السبع ان یصلی بعد صلاة   | بعد کی دو رکعتوں سے ہے کہ وہ فجر کی |
| الصبح قبل طلوع الشمس     | نماز کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے      |
| وبعد صلاة العصر قبل      | اور عصر کی نماز کے بعد غروب سے پہلے |

غروب الشمس و فی کل  
اور اسی طرح دن کے ہر حصہ میں پڑھی  
جاسکتی ہیں یعنی ممنوع و منعی عنہا  
اوقات میں بھی ان کو پڑھ لینے میں  
(مجموع صغیر ص ۱۲)  
حرج نہیں ہے۔

۴۔ انہوں نے بعض حدیثوں کے متعلق شبہات کے جواب دیئے ہیں، مثلاً  
ایک حدیث ہے کہ:

عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس  
نے چار کام کئے اس کو چار چیزیں عطا کی جاتی ہیں، اس کا ذکر کتاب اللہ میں بھی ہے۔  
۱۔ جس نے اللہ کو یاد کیا اللہ بھی اسے یاد کرتا ہے۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ۔ (بقرہ: ۱۵۲) سو مجھے یاد کرو تو میں تمہیں یاد کروں گا۔

۲۔ جس نے دعا کی اس کی دعا قبول کی جاتی ہے، اللہ کا ارشاد ہے:

أَدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن: ۶۰) مجھ سے مانگو تو میں تمہیں دوں گا

۳۔ شکر کرنے والے پر اللہ مزید فضل و انعام کرتا ہے:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ۔ اگر تم میرا شکر کرو گے تو میں تمہیں اور

زیادہ نوازوں گا۔ (ابراہیم: ۷)

۴۔ جو اللہ سے استغفار کرتا ہے، اللہ اس کی مغفرت کرتا ہے، اس کا فرمان ہے:

اسْتَفِירוْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ

اٰپنے خداوند سے مغفرت چاہو بلاشبہ  
غَفَّارًا۔ (نوح: ۱۰) وہ بہت بخشنے والا ہے۔

اس حدیث کے سلسلہ میں پہلے انہوں نے بعض لوگوں کے اس شبہہ کا ذکر کیا ہے

کہ ”ہم لوگ دعائیں کرتے ہیں مگر وہ قبول نہیں ہوتیں“ پھر اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:

”گو یا یہ اعتراض خدا پر ہے کیوں کہ اس نے کہا ہے اور یقیناً اس کی

بات برحق ہے کہ:

مجھے پکارو! میں تمہاری پکار کا جواب  
دوں گا۔

أَدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ  
(مومن: ۶۰)

نیز:

اور جب میرے بندے تم سے میرے  
متعلق پوچھیں تو (انہیں بتاؤ کہ) میں  
(ان کے) نزدیک ہوں اور پکارنے  
والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي  
قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا  
دَعَانِ (بقرہ: ۱۸۶)

مگر اس حقیقت اور مفہوم سے اہل علم اور ارباب بصیرت ہی واقف ہو سکتے ہیں،  
ایک اور حدیث میں بھی اس کی وضاحت کی گئی ہے، حضرت ابوسعید خدریؓ اور بعض دوسرے  
صحابہ سے مروی ہے کہ:

جو مسلمان بھی اللہ سے دعا کرتا ہے اس  
کی دعا قبول ہوتی ہے، اس کی تین  
صورتیں ہیں، یا تو دنیا ہی میں قبولیت  
عطا کی جاتی ہے، یا اس کی دعا آخرت  
کے لیے موخر کی جاتی ہے اور ذخیرہ بنتی  
ہے یا دعا مانگنے والے کی اس طرح کی  
کوئی مصیبت دفع کر دی جاتی ہے۔

مامن مسلم يدعو الله بدعوة  
الا استجاب له فهو من  
دعوته على احدى ثلاث اما  
ان يعجل له في الدنيا واما  
ان تدخر في الآخرة واما ان  
يدفع عنه من البلاء  
مثلاها. (۱)

مجم صغیر کے مطبوعہ ایڈیشن میں مختصر تشریحی حواشی بھی شامل ہیں جن میں نسخوں  
کے فرق و اختلاف متن کی تصحیح، راویوں کے ناموں کی تحقیق، اعراب کی تعیین، لغات کی

(۱) مجم صغیر ص ۲۱۲۔

تشریح، حدیث کے مشکل جملوں کی وضاحت، اختلافِ قرأت، ثلاثی حدیثوں کی نشاندہی اور دوسری کتب حدیث سے اس کی حدیثوں کی مطابقت اور غیر مطابقت اور دوسری بحشیں درج ہیں، شارح نے محدثین کے مسلک کی تائید کی ہے، مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

قال رسول اللہ ﷺ  
لا صلوة بعد الصبح حتى  
تطلع الشمس ولا بعد العصر  
حتى تغرب الشمس (۱)  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے  
کہ فجر اور عصر کے بعد طلوع وغروب  
آفتاب سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھنی  
چاہیے۔

اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

”یہ حکم بلا سبب پڑھی جانے والی نفل نمازوں کے بارے میں ہے لیکن فوت شدہ فرائض و نوافل یا کسی وجہ سے پڑھی جانے والی نفل نمازوں کو ان وقتوں میں بھی پڑھنا جائز ہے جیسا کہ متعدد حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے، اس کی تفصیل کے لیے مشہور محدث علامہ شمس الحق عظیم آبادی کے رسالہ اعلام اہل العصر باحکام رکعتی الفجر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔“ (۲)

اس مطبوعہ نسخہ کے آخر میں مندرجہ ذیل چار رسالے شامل ہیں۔

- ۱- غنیۃ اللمعی: صاحب عون المعبود مولانا ابوالطیب محمد شمس الحق عظیم آبادی نے اس میں اصول حدیث اور بعض فقہی مسائل کے بارے میں سوالات کا جواب قلمبند کیا ہے۔
- ۲- التحفۃ المرضیۃ فی حل بعض مشککات الحدیثیہ: یہ شیخ حسین بن محسن انصاری (م ۱۳۲۷ھ) کا رسالہ اور امام ترمذی کی بعض اصطلاحوں کی تحقیق پر مشتمل ہے۔

۳- رفع الیدین فی الدعاء: یہ علامہ محمد بن عبدالرحمن بن سلیمان بن یحییٰ زبیدی یمانی کی تالیف ہے، اس میں فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعائے تکبیر کو مدلل طور

(۱) بحجم میفرج حاشی م ۲۲ (۲) ایضاً حاشی م ۲۲۔

پر مسنون بتایا گیا ہے۔

۳- الکشف من مجاوزة ہذہ الامۃ الالف: یہ امام جلال الدین سیوطی کا رسالہ ہے، اس میں اس حدیث (ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لایمکت فی قبرہ الف سنۃ) کے متعلق گفتگو کر کے اس کو باطل قرار دیا گیا ہے۔

امام طبرانی پر بعض اعتراضات اور ان کا جواب: امام طبرانی کی عظمت و جلالت کے باوجود ان پر بعض اعتراضات کئے گئے ہیں، ذیل میں دو اعتراضات نقل کئے جاتے ہیں:

۱- پہلا اعتراض ان کے تفرّد کے بارے میں ہے، اسماعیل بن محمد بن فضل تمیمی نے ان کے افراد و غرائب پر مشتمل حدیثوں کو جمع کرنے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان حدیثوں میں نکارت پائی جاتی ہے اور یہ موضوع اور طعن و قدح سے خالی نہیں ہیں۔

۲- ان پر وہم و خطا اور نسیان کا بھی الزام مانا گیا ہے، اس کی مثال یہ دی گئی ہے کہ انھوں نے مغازی و سیر کے باب میں مصر کے احمد بن عبد اللہ بن عبد الرحیم برقی سے روایت کی ہے، اس نام میں ان کو وہم ہوا ہے، اصل میں راوی احمد کے بجائے ان کے بھائی عبد الرحیم ہیں کیوں کہ احمد طبرانی کے مصر جانے سے دس سال پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔

ابن مندہ نے بھی اس کی وجہ سے ان پر طعن کیا ہے اور ابو بکر بن مردویہ نے اسی بنا پر انھیں لین قرار دیا ہے، ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ طبرانی کی جانب سے صاف نہ تھے، ابن مردویہ کی جانب سے خفگی کی ایک وجہ یہ بھی منقول ہے کہ انھوں نے بغداد جا کر جب ان حدیثوں کی تحقیق و تفتیش کی جن کو ان سے طبرانی نے ادریس سے اور ادریس نے یزید بن ہارون سے اور انھوں نے روح بن عبادہ کے واسطے سے بیان کیا تھا تو انھیں، بہت کم حدیثوں کا پتہ چلا، علاوہ ازیں یہ معلوم ہوا کہ اہل بغداد کے نزدیک ادریس کا زیادہ پایہ بلند نہ تھا، اس لیے وہ ان سے زیادہ حدیثیں روایت نہیں کرتے تھے مگر امام طبرانی کے نزدیک ادریس معتتم لوگوں میں تھے۔



اسی نوعیت کا ایک اور اعتراض حاکم نے علوم الحدیث میں تحریر کیا ہے کہ ابوعلی نیشاپوری امام طبرانی کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، اس کا سبب یہ تھا کہ طبرانی نے شعبہ کی ایک حدیث بیان کی اور کہا کہ یہ ان کو غنڈر اور شباہہ کے واسطے سے ملی ہے، ابوعلی نے سوال کیا کہ آپ سے اس کی کس نے روایت کی ہے؟ انھوں نے کہا عبد اللہ بن احمد نے اپنے والد سے انھوں غنڈر اور شباہہ سے، حالانکہ یہ غنڈر کی حدیث نہ تھی۔ (۱)

ان اعتراضات کا نمبر وار جواب یہ ہے کہ:

۱- امام طبرانی کو طویل عمر ملی اور ان سے بیسٹار حدیثیں منقول ہیں، اس لیے ان کے یہاں تفرّد کی بھی کثرت ہے لیکن ارباب فن نے ان کے تفرّد کو منکر نہیں قرار دیا ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ کثرت روایت کی وجہ سے امام طبرانی کے تفرّد کو منکر نہیں قرار دیا جاتا، حافظ ابن حجر نے تہمی کے مذکورہ بالا اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

”افراد و غرائب جمع کرنے کا معاملہ صرف طبرانی کے ساتھ مخصوص نہیں

ہے، اکثر قدیم محدثین کا یہی حال تھا کہ وہ تفرّد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور اپنی ذمہ داری سے برأت کے لیے احادیث کو ان کی اصل سندوں کے ساتھ بیان کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔“

شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

”عجم اوسط افراد و غرائب کا مجموعہ ہے، محدثین کے نزدیک اس میں

بہت سی منکر روایتیں ہیں لیکن اس کی حقیقت اور نشا یہ ہے کہ غرابت اسی کی مقتضی

ہے ورنہ تفرّد ثقہ کا جس کو غریب صحیح کہا جاتا ہے، ایک علاحدہ باب ہے۔“ (۲)

۲- دوسرے اعتراض میں بعض ناموں کے بارے میں امام طبرانی کے سہو

(۱) لسان المیزان جلد ۳ ص ۷۳ (۲) میزان الاعتدال ج ۴ ص ۴۰ و لسان المیزان ج ۳ ص ۷۳ و بستان

المحدثین ص ۵۳۔

ونسیان کا ذکر ہے، اس کتاب میں یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ وہم و نسیان علمائے فن کے نزدیک مانع ثقاہت اور قابل اعتراض نہیں چنانچہ حافظ ذہبی اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

”یہ زیادہ اہم بات نہیں احمد بن منصور شیرازی فرماتے ہیں کہ ”میں نے ان سے تین لاکھ حدیثیں لکھیں، وہ ثقہ تھے، البتہ مصر کے ایک شیخ سے انھوں نے حدیث لکھی اور غلطی سے اس کو ان کے بجائے ان کے بھائی کی جانب منسوب کر دیا۔“ (۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن مردویہ نے جو روایت کی اس کی بنیاد پر بھی طبرانی کو مجروح اور قابل طعن قرار دینا زیادتی ہے، رہی یہ بات کہ وہ طبرانی کی جانب سے صاف نہ تھے تو یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیوں کہ وہ خود ان کے حلقہ رفیض سے وابستہ تھے اور ان سے حزم و احتیاط کے ساتھ حدیثیں بھی نقل کرتے تھے، چنانچہ حافظ ابو نعیم نے ان سے پوچھا کہ آپ نے طبرانی سے حدیثیں روایت کی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں میں ان سے احتیاط کے ساتھ روایت کرتا ہوں حافظ ضیاء کا بیان ہے کہ ابن مردویہ نے خود اپنی تاریخ میں طبرانی کا ذکر کیا ہے لیکن ان کی تضعیف نہیں کی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طبرانی ثقہ و ثابت تھے اور ابن مردویہ کے نزدیک بھی ان کی ثقاہت مسلم تھی۔ (۲)

لیکن اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ ابن مردویہ کو واقعی ان سے بدگمانی تھی تو تنہا ان کی ذاتی رائے کی وجہ سے طبرانی کو ضعیف اور غیر معتبر نہیں قرار دیا جاسکتا۔

ابوعلیٰ نیشاپوری کے بیان میں بھی وہم و نسیان کا ذکر ہے، اس کا جواب بھی مندرجہ بالا توضیح سے ہو گیا لیکن حافظ ابن حجر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۰ (۲) ایضاً۔

طبرانی کو کوئی وہم نہیں ہوا تھا، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

ابونعیم نے ابوعلی کا تعاقب کرتے ہوئے غندر کی حدیث کو ابوعلی بن صواف سے اور انھوں نے عبداللہ بن احمد سے اسی طرح بیان کیا ہے جس طرح طبرانی نے بیان کیا ہے، اس سے طبرانی کا بری الذمہ ہونا ظاہر ہوتا ہے، حافظ ضیاء نے طبرانی کے دفاع میں ایک رسالہ لکھا تھا، جس میں وہ اس اعتراض کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

لوکان کل من وہم فی      اگر اسی طرح ہر شخص کو محض ایک یا  
حدیث او حدیثین اتھم لکان      دو حدیثوں میں وہم کی وجہ سے مہم  
هذا لایسلم منه احد۔ (۱)      قرار دیا جائے تو کوئی شخص بھی الزام  
واعترض سے بچ نہیں سکتا۔

اس تفصیل سے ان اعتراضات کی حقیقت واضح ہو گئی اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ اگر یہ صحیح بھی ہوں تو ان سے ان کی عظمت و اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

☆☆☆

## امام ابو عمر و بن نجید

(المتوفی ۳۶۵ھ یا ۳۶۶ھ)

نام و نسب: اسماعیل نام، ابو عمر و کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: اسماعیل بن نجید بن احمد بن یوسف ابن خالد۔ (۱)

پیدائش، خاندان و وطن: ۲۷۲ یا ۲۷۳ھ میں پیدا ہوئے، عرب کے مشہور قبیلہ سلیم سے خاندانی تعلق تھا، اسی لیے سلمی کہا جاتا تھا۔

اساتذہ و شیوخ: امام ابو عمر و بن نجید نے ابراہیم بن ابوطالب، ابو مسلم ابراہیم بن عبد اللہ، عبد اللہ ابن احمد بن علی بن حسین بن جنید، ابو عبد اللہ محمد بن ابراہیم شحجی، محمد بن ایوب رازی وغیرہ سے حدیث روایت کی اور جنید بغدادی اور ابو عثمان جیسے اجل صوفیہ سے تصوف کی تعلیم حاصل کی۔

تلامذہ: جن لوگوں نے ان سے علم ظاہر و باطن کی تحصیل کی تھی ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابو حفص بن مسرور، ابو نصر احمد بن عبد الرحمن صفار، ابو عبد اللہ حاکم، صاعد بن محمد قاضی عبد القاہر بن طاہر فقیہ، ابو عبد الرحمن محمد بن حسین وغیرہ۔ (۲)

حدیث میں درجہ: ابو عمر بن نجید کا روایت و حدیث میں درجہ بلند تھا، علمائے سیر و طبقات نے ان کی کثرت روایت، احادیث میں انہماک و اشتغال اور ثقاہت کا اعتراف کیا ہے،

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۰۳ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۸۹ (۲) ایضاً۔

ابن جوزی، ابن کثیر، شعرانی اور مولانا جامی وغیرہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، حاکم صاحب مستدرک کا بیان ہے (اسند من بقی بخراسان فی الروایة) یعنی خراسان کے محدثین میں ابن نجید سب سے زیادہ بلند پایہ اور مستند ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں، در علو اسناد در خراسان مشہور و مشار الیہ آفاق۔

زہد و تصوف: وہ عمل، اخلاص اور زہد و تقویٰ میں نہایت کامل تھے، حدیث سے زیادہ ان کو تصوف میں اشتغال تھا اور اسی حیثیت سے زیادہ مشہور بھی ہیں، اس زمانہ کے مشائخ و کبار صوفیہ اور اوتاد و ابدال میں شمار کئے جاتے تھے، مورخین نے ان کو الزاہد العابد، شیخ الصوفیہ اور صاحب احوال و مناقب لکھا ہے، ابن نجید ابو عثمان حیری کے اجل خلفا میں تھے، انھیں خود اپنے مسترشد پر بڑا ناز تھا اور فرماتے تھے کہ ابو عمرو میرے جانشین ہیں، لوگ ان سے محبت کرنے پر میری ملامت کرتے ہیں، حالانکہ ان سے زیادہ کسی کو میرے طریقہ اور مشرب کا علم نہیں، گو وہ جنید ابو عثمان کے صحبت نشین اور فیض یافتہ تھے لیکن تصوف میں ان کا اپنا خاص طریقہ بھی تھا، مولانا جامی لکھتے ہیں:

”ویرا طریقہ خاص بود از تلمیس حال و نگاہ داشت وقت۔“ (۱)

انفاق فی سبیل اللہ: اللہ تعالیٰ نے ان کو علم ظاہر و علم باطن کی طرح دنیوی جاہ و حشمت سے بھی نوازا تھا لیکن ان میں بڑی بے نیازی اور استغنا تھا اور مال و دولت کی حرص و طمع سے ان کا دل پاک تھا، ان کو اپنے والد سے کافی مال و دولت وراثت میں ملا تھا لیکن خود کفاف پر بسر کرتے تھے اور باقی سب خدا کی راہ میں اور علما و مشائخ پر خرچ کر دیتے تھے۔

اخلاص: دنیا کے ارباب جاہ و حشمت کی طرح ان کو نام و نمود اور شہرت سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ ریا کاری کو سخت ناپسند کرتے تھے، ہر کام خالصتاً لوجہ اللہ کرتے، ان کا اخلاص بیمثال تھا، ایک روز ابو عثمان حیری کو سرحدوں پر مجاہدین کے اخراجات کے لیے کچھ رقم کی

ضرورت ہوئی لیکن حاضرین کی تہی دستی کی وجہ سے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، اس سے ان کا دل بھر آیا، وہ ضبط نہ کر سکے اور رو پڑے، رات میں عشاء کی نماز کے بعد ابو عمرو بن نجید نے دو ہزار درہم کی ایک تھیلی پیش کی، ابو عثمان بہت خوش ہوئے اور ان کے لیے دعائے خیر فرمائی، پھر انھوں نے مجلس میں یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ ابو عمرو کو جزائے خیر دے، انھوں نے دو ہزار درہم دے کر میری خواہش پوری کر دی، ابو عمرو نے اسی وقت فوراً مجمع میں کھڑے ہو کر کہا حضرات! میں جو رقم لایا تھا وہ میری ماں کی تھی وہ اسے دینے کے لیے راضی نہ تھیں، اس لیے تھیلی واپس کر دی جائے تاکہ میں اسے لے جا کر اپنی ماں کو دیدوں، چنانچہ ابو عثمان نے تھیلی مڑگا کر واپس کر دیا جب رات کا سنانا ہوا اور سارا مجمع منتشر ہو گیا تو ابو عمرو نے دوبارہ وہی رقم شیخ کی خدمت میں نذر کی اور کہا آپ اسے اس طور پر خرچ کریں کہ ہمارے علاوہ کسی اور شخص کو اس کی اطلاع نہ ہو، ابو عثمان آبدیدہ ہو گئے اور ان کی بڑی ستائش و تحسین کی۔ (۱)

حکیمانہ و صوفیانہ اقوال: ابو عمرو بن نجید سے بڑے حکیمانہ و صوفیانہ اقوال منقول ہیں، چند ملاحظہ ہوں۔

- ۱- بعض سکوت (خاموشی) گفتگو سے زیادہ بلیغ و موثر ہوتا ہے۔
- ۲- جو شخص اپنے نفس کو معزز و مکرم سمجھتا ہے اس کا دین اسے حقیر و ذلیل معلوم ہوتا ہے۔
- ۳- غیر اللہ سے انیسیت رکھنا اصلی وحشت ہے۔
- ۴- پوچھا گیا کس چیز سے بندہ کو چارہ نہیں، فرمایا سنت کے مطابق بندگی کا التزام اور ہمیشہ دل کی نگرانی و پاسبانی۔
- ۵- حال اگر علم کا نتیجہ نہ ہو تو صاحب حال کے لیے اس کا ضرر نفع سے زیادہ ہے۔

(۱) نجات الانس ج ۱ ص ۱۱۶ کتاب الانساب ورق ۳۰۳ کتاب المنتظم ج ۷ ص ۸۴ و ۸۵۔



- ۶- تصوف امر و نہی کے تحت صبر کرنے کا نام ہے۔  
 ۷- بندہ کے لیے سب سے بڑی آفت اس کا اپنے نفس سے مطمئن ہو جانا ہے۔  
 ۸- جس شخص کو دیکھنے کے بعد تمہاری اصلاح نہ ہو وہ شخص مصلح نہیں ہے۔  
 ۹- آدمی عبادت میں اسی وقت مخلص ہو سکتا ہے جب اس کو اپنے تمام افعال ریا اور تمام احوال و اقوال ادعا معلوم ہوں۔

۱۰- پوچھا گیا، ادعاء کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ فرمایا دھوکہ سے، اس کی ابتدا ہی بگاڑ سے ہوتی ہے، جس شخص کی ابتدا صحیح ہو اس کی انتہا بھی صحیح ہوتی ہے اور جس کی ابتدا فاسد ہو وہ کسی وقت ہلاک و برباد ہو سکتا ہے۔

۱۱- ملامتی (۱) میں کبھی ادعا نہیں ہوتا کیوں کہ اسے اپنے اندر کوئی چیز ادعا کی نظر نہیں آتی۔

۱۲- جب اللہ اپنے بندہ کی بھلائی چاہتا ہے تو اسے صلحا و اختیار کی خدمت و صحبت اور ان کے ارشادات قبول کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے اور اس کے لیے نیکیوں کی راہیں آسان کر دیتا ہے۔

۱۳- عام مسلمانوں کا احترام کرو اور غیر ممکن کام کے درپے نہ بنو، سب سے اپنے کو حقیر سمجھو جس قدر تمہارا تعلق لوگوں سے زیادہ ہوگا اسی قدر خدا کے احکام میں تمہارا حصہ کم ہوگا۔

۱۴- جو شخص نفع و ضرر نہ پہچاننے والے کے سامنے اپنے محاسن ظاہر کرتا ہے وہ دراصل جیل کا اظہار کرتا ہے۔

(۱) یہ صوفیہ کا اصطلاحی لفظ ہے، اس کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں، مولانا جامی لکھتے ہیں، الملامتی ہوالذی لا یظہر خیرا ولا یضر شرًا (نعمات الانس) یعنی ملامتی وہ شخص ہے جو اپنی نیکی کا اظہار اور برائی کو پوشیدہ نہیں رکھتا۔

تذکرۃ الحمد شین..... گلستان حدیث کے مسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

510

۱۵- جو شخص واقعہ درست ہو گیا، اسے کوئی بگاڑ نہیں سکتا اور جو کج ہو گیا اسے

کوئی سیدھا نہیں کر سکتا۔ (۱)

وفات: سند وفات میں اختلاف ہے، ربیع الاول ۳۶۵ھ اور ۳۶۶ھ کی روایتیں ملتی ہیں، صاحب الرسالۃ القشیر یہ نے تصریح کی ہے کہ مکہ معظمہ میں اور بعض مورخین کے بیان کے مطابق ۹۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ (۲)

اولاد و احفاد: اولاد و احفاد میں ایک نواسہ ابو عبد الرحمن محمد بن حسین بن محمد بن موسیٰ سلمیٰ کا در ملتا ہے جو بڑے صاحب کمال بزرگ اور بلند پایہ صوفی تھے، تصوف میں ان سے کئی کتابیں یادگار ہیں، ان کی سب سے مشہور کتاب طبقات الصوفیہ ہے، یہ صوفیہ کے حالات پر مشتمل اور قاہرہ سے چھپ چکی ہے، مولانا جامی کی نجات الانس کا اصل ماخذ یہی کتاب ہے، تفسیر میں بھی ایک کتاب لکھی تھی جس میں صوفیانہ نقطہ نگاہ سے قرآن کی تفسیر کی گئی ہے، حدیث سے بھی اشتغال تھا، مرو، نیشاپور، عراق و حجاز کے علما سے حدیثوں کی تحصیل کی تھی لیکن محدثین نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ یہ صوفیہ کی مفید مطلب حدیثیں وضع کرتے تھے، (۳) ۳ شعبان ۴۱۲ھ کو انتقال ہوا اور نیشاپور میں اپنی خانقاہ کے اندر دفن کئے گئے۔

تصنیفات: ان کی تصنیفات میں صرف جزء ابن نجید کا ذکر ملتا ہے لیکن اس کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا، جزء کتب حدیث کی ایک قسم ہے، محمود محمد خطاب سبکی لکھتے ہیں:

|                          |                                      |
|--------------------------|--------------------------------------|
| الجزء یطلق علی ما هو اعم | جزء کا اطلاق اس کتاب پر ہوتا ہے جو   |
| من الجامع والمسند وقد    | جامع اور مسند دونوں سے عام ہوتی      |
| یطلق علی ما الف فی نوع   | ہے اور کبھی اس پر بھی ہوتا ہے جو کسی |
| خاص۔                     | خاص موضوع پر تالیف کی جاتی ہے۔       |

(۱) الرسالۃ القشیر یہ ص ۳۴، طبقات شعرانی ص ۱۰۳، نجات الانس ص ۲۱۶ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۰۳  
المنتظم ج ۷ ص ۸۴، طبقات شعرانی ص ۱۰۳، الرسالۃ القشیر یہ ص ۳۴ (۳) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۶۔



شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”جزء حدیث کی اس کتاب کو کہا جاتا ہے جس میں صرف ایک خاص

شخص کی بیان کردہ حدیثوں کو جمع کیا جاتا ہے، چاہے وہ شخص صحابہ کے طبقہ سے ہو

یا ان کے بعد کے طبقہ سے مثلاً جزء حدیث ابو بکر و جزء حدیث مالک“

اس قسم کا بھی محدثین میں بڑا رواج ہے، کبھی ایسا کرتے ہیں کہ جامع میں مذکور

آٹھ موضوعوں (۱) میں کسی خاص موضوع کو اختیار کر لیتے ہیں اور اس پر ایک نہایت مبسوط

کتاب مرتب کرتے ہیں چنانچہ باب الدیۃ پر ابو بکر بن ابی الدنیانے ایک مبسوط کتاب لکھی

تھی، علی ہذا القیاس مذکورہ بالا آٹھ مطالب میں سے ہر ہر موضوع پر مستقل اور جداگانہ

رسالے لکھے گئے ہیں جن کا احاطہ شمارہ دشوار ہے، حافظ ابن حجر اور علامہ سیوطی کی تصانیف

میں رسالوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ (۲)

(۱) جوامع میں حسب ذیل موضوع سے متعلق احادیث ہوتی ہیں عقائد، احکام، رقائق، آداب، تفسیر،

تاریخ و سیر، فتن و ملاحم، فضائل و مناقب (۲) جلد ۱ نافع مع فوائد جامعہ ص ۱۰۳ و ۱۰۶۔

## امام ابو بکر اسماعیلی

(متوفی ۳۷۱ھ)

نام و نسب: احمد نام، ابو بکر کنیت، اسماعیلی نسبت اور سلسلہ نسب یہ ہے: احمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن عباس بن مرداس۔ (۱)

پیدائش، خاندان اور وطن: وہ امام بخاری کی وفات کے اکیس سال بعد ۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، ان کے بعد اس میں متعدد فضلا اور ارباب کمال گذرے، (۲) ان کا وطن جرجان تھا۔

شوق علم اور طلب حدیث کے لیے سفر: علم و فن سے ان کو فطری مناسبت تھی، بچپن میں لوگ عموماً پڑھنے لکھنے سے بیزار ہوتے ہیں لیکن اسماعیلی کو اسی زمانہ میں اس سے دلچسپی ہو گئی تھی، چھ سال کی عمر میں یعنی ۲۸۳ھ میں انھوں نے حدیثوں کی تحریر و کتابت شروع کر دی تھی، اور ۲۸۹ھ میں باقاعدہ اس فن کی تحصیل میں مشغول ہو گئے تھے، اسی زمانہ میں وہ اس مقدس اور مبارک علم کی تحصیل کے لیے اپنے وطن سے نکل جانا چاہتے تھے، مگر ان کی کمسنی کی وجہ سے ان کے اعزہ نے سفر کی اجازت نہیں دی اور جب ان کا شوق اور اصرار حد سے بڑھ جاتا تو وہ لوگ مختلف حیلوں اور بہانوں سے انھیں بازر کھنے کی کوشش کرتے، ایک دن ان کو اس زمانہ کے مشہور محدث محمد بن ایوب رازی کی موت کی اطلاع ملی تو ان کا عجیب حال ہو گیا، وہ گھر سے باہر آ کر رونے دھونے، چیخنے چلانے لگے کپڑے چاک کرنے اور سر پر

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۶، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۷۹ (۲) ایضاً

خاک ڈالنے لگے، یہ کیفیت دیکھ کر ان کے تمام اعزہ جمع ہو گئے اور اس کا سبب دریافت کیا، اسماعیلی نے کہا آج دنیا ایسے عظیم المرتبت اور صاحب کمال شخص سے خالی ہو گئی، آپ لوگوں کی بندشوں اور رکاوٹوں نے مجھے اس کے فیوض و برکات سے متمتع نہیں ہونے دیا، اعزہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، اب بھی خدا کے فضل سے بہت سارے نامور علماء و مشائخ اور اساطین فن موجود ہیں، یہ حالت دیکھ کر اب ان کو سفر سے مزید روکنا مشکل تھا، اس لیے ان کے ماموں کو ان کے ہمراہ کر دیا گیا، اس طرح وہ پہلی مرتبہ ۲۹۳ھ میں ابوالحسن بن سفیان کی خدمت میں ناسا تشریف لے گئے، ان کا خود بیان ہے کہ یہ سفر میں نے اس وقت کیا تھا جب نہ تو میری مسیں بھیگی تھیں اور نہ داڑھی کے بال نکلے تھے، ۲۹۶ھ میں بغداد گئے، اس سفر میں بھی ان کا کوئی عزیز ان کے ساتھ تھا، پھر حجاز، عراق، فارس، کوفہ، بصرہ، انبار، موصل، جزیرہ، نیشاپور وغیرہ تشریف لے گئے، نیشاپور کئی بار تشریف لے گئے۔ (۱)

اساتذہ و شیوخ: جس شخص کے شوق و جستجوئے علم کا یہ حال رہا ہو اس کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد دو شمار نہیں کی جاسکتی، بعض نامور محمدین اور ارباب کمال کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن زہیر حلوانی، ابراہیم بن عبداللہ محرمی، ابو یعلیٰ احمد بن علی بن شمیٰ موصلی، احمد بن محمد بن مسروق، بہلول بن اسحاق توخنی انباری، جعفر بن محمد فریابی، حسن بن سفیان شیبانی، حمزہ بن محمد بن عیسیٰ کا تب، عبداللہ بن ناجیہ، عبدان بن احمد عسکری، عمران بن موسیٰ سختیانی، ابو خلیفہ فضل بن حباب جمحی، ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ، محمد بن حسن بن ساعد، ابو جعفر محمد بن عبداللہ بن سلیمان حضرمی، محمد بن عثمان بن ابی شیبہ، شیخ زاہد محمد بن عثمان مقابری، محمد بن یحییٰ بن سلیمان مروزی، یحییٰ بن محمد حنائی، قاضی یوسف بن یعقوب۔ (۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں اس دور کے ائمہ اور نامور فضلا شامل تھے، بعض کے نام یہ ہیں:

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۶ و تذکرۃ الخطاط ج ۳ ص ۱۵۹ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۰ (۲) ایضاً۔

ابوالقاسم عبدری، ابوبکر بن محمد بن غالب برقانی، حسین بن محمد باسانی، حمزہ بن یوسف سہمی صاحب تاریخ جرجان، ابو عمرو عبدالرحمن بن (۱) محمد فارسی، عبدالواحد بن منیر معدل، ابو جعفر محمد بن احمد جاجی، ابوبکر محمد بن ادریس جرجانی، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم، ابو علی محمد بن علی بن سہل، ابوالحسن محمد بن علی طبری۔

**حفظ وضبط:** حفظ وضبط میں ممتاز اور مشہور حفاظ میں شمار کئے جاتے تھے، بہت ساری کتابیں ان کو زبانی یاد تھیں، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ میں ان کے کمال حفظ سے مبہوت ہو گیا اور میرا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ متقدمین کے علم و حافظہ کا متاخرین مقابلہ نہیں کر سکتے، ضبط و احتیاط کا یہ حال تھا کہ فن حدیث میں غیر معمولی امتیاز اور امام فن ہونے کے باوجود انہوں نے مستقل کتاب لکھنے کے بجائے مستخرج بخاری لکھنے پر اکتفا کیا، حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ وہ رفع اسناد اور علوے تفرّد میں ممتاز تھے، (۲) حاکم کا بیان ہے کہ ان کے ضبط و ثقاہت میں کوئی اختلاف نہیں کیا گیا ہے۔

**حدیث میں درجہ:** اسماعیلی منقولات کے تبحر عالم اور کامل الفن محدث تھے، وہ حدیث میں امام، مرجوع اور مستدلی کی حیثیت رکھتے تھے، حاکم نے ان کو شیخ المحدثین اور امام اہل جرجان کہا ہے، ان کی عظمت و بلند پایگی کا یہ عالم تھا کہ امام دارقطنی جیسے صاحب کماں اور جلیل القدر محدث نے کئی بار ان کی بارگاہ فضل و کمال میں حاضر ہونے کا قصد کیا لیکن مقدور نہ ہو سکا اور زندگی بھر اپنی اس محرومی پر حسرت و افسوس ظاہر کرتے رہے، حافظ حسن بن علی فرماتے ہیں کہ اسماعیلی اس پایہ کے محدث تھے کہ حدیث و سنن میں مستقل کتابیں لکھتے مگر انہوں نے مستخرج مرتب کرنے پر اکتفا کیا، ان کو اکثر کتابیں از بر تھیں اور اللہ تعالیٰ نے علم و فراور ذہن رسا سے نوازا تھا۔ (۳)

(۱) یہ اسماعیلی کے نواسے تھے، تذکرہ ج ۳ ص ۱۵۹ (۲) تذکرہ ج ۳ ص ۱۶۰ و ۱۶۱ (۳) تاریخ جرجان

ص ۷۰ و کتاب الانساب ورق ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ و ۱۶۰۔

ترتذکرۃ الحمدین ..... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

515

مسندِ درس: اسماعیلی کے حدیث میں کمال کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علم کی تکمیل کے بعد جب وہ مسندِ درس پر رونق افروز ہوئے تو ان کو بڑا عروج نصیب ہوا اور ان کے درس میں طلبہ و مستفیدین کا جم غفیر شریک ہوتا تھا، حمزہ سہمی اور علامہ سمعانی نے روزانہ کے شرکاء کی تعداد چالیس اور پچاس کے لگ بھگ بتائی ہے، یہ لوگ اسماعیلی کی زبان سے جو بات نکلتی تھی اس کو قلمبند کر لیتے تھے۔ (۱)

فقہ و اجتہاد: وہ فقہ و اجتہاد میں بھی صاحب کمال اور امام و مقتدی سمجھے جاتے تھے، علامہ سمعانی لکھتے ہیں کہ اسماعیلی اہل جرجان کے امام اور فقہ وحدیث میں مرجع تھے، حاکم نے انہیں شیخ الحمدین والقبہ کہا ہے، ان کے صاحبزادے ابوسعید اور بعض علمائے جرجان نے فقہ کی ان سے تحصیل کی تھی۔

قرأت: فن قرأت میں اسماعیلی کو مہارت اور اچھی دستگاہ تھی، ابوالحسن محمد بن مظفر نے قرأت میں ان کی جودت کا اعتراف کیا ہے، حمزہ سہمی فرماتے ہیں کہ وہ ہر مجلس میں پیش پیش رہتے تھے، ان کے سامنے کسی کو قرأت کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، ابوالقاسم بغوی کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بہتر قاری نہیں دیکھا۔ (۲)

تدین و اخلاق: اسماعیلی تدین اور ستودہ صفات تھے، حاکم نے ان کی مروت و سخاوت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور حمزہ سہمی کا بیان ہے کہ وہ اپنے والدین کے نہایت مطیع اور فرمانبردار تھے، ان کے طرز عمل سے ان کے والدین اس قدر خوش تھے کہ ہمیشہ ان کے لیے خیر و برکت کی دعا کرتے رہتے تھے۔ (۳)

دولت و ثروت: اللہ تعالیٰ نے ان کو علمی و دینی کمالات کی طرح مال و دولت کی فراوانی اور دنیوی جاہ و منزلت سے بھی نوازا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ وہ دینی و دنیاوی وجاہت اور

(۱) تاریخ جرجان ص ۷۰ و کتاب الانساب ورق ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ و ۱۶۰ (۲) ایضاً (۳) ایضاً۔

ہر قسم کی خوبیوں کے جامع تھے۔ (۱)

شہرت و مقبولیت: ان کو بڑی شہرت اور غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی، وہ امام اور مرجع خلافت تھے، درس میں حاضرین کی بڑی تعداد ہوتی تھی، جو نہایت عقیدت کے ساتھ ان کا ایک ایک لفظ نقل کرتے تھے، ابن فرات کا بیان ہے کہ:

لقد رزق من العلم والجاه ان کو علم و جاہ اور اچھی شہرت نصیب  
والصيت الحسن۔ ہوئی۔

بغداد میں جب ان کی موت کی خبر ہوئی تو اکابر محدثین اور فقہانے کئی دنوں تک جمع ہو کر ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔ (۲)

فقہی مسلک: اسماعیلی شافعی المذہب تھے اور شوافع کے ائمہ میں خیال کئے جاتے تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ وہ اپنے خطہ کے اکابر شافعیہ میں تھے۔ (۳)  
کلامی عقائد: وہ اہل سنت والجماعت اور محدثین کے ہموا تھے، اس لیے ان کے اعتقادات بھی وہی تھے، ان کے بعض کلامی عقائد یہ ہیں:

اہل حدیث کا مسلک یہ ہے کہ اللہ اس کے ملائکہ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کا اقرار کیا جائے، کتاب اللہ اور صحیح حدیثوں کے منطوق کو قبول کیا جائے اور ان سے انحراف نہ کیا جائے، محدثین کا عقیدہ ہے کہ اللہ کو اس کے اچھے ناموں سے پکارتا اور ان صفتوں سے متصف ماننا چاہیے جن سے اس نے اور اس کے رسول نے اس کو متصف کیا ہے، مثلاً اللہ نے آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اس کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں، وہ عرش پر متمکن ہے وغیرہ، ان ساری باتوں کو محض تسلیم کرنا ضروری ہے، ان کی حقیقت اور کیفیت معلوم کرنے کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔ (۴)

(۱) تاریخ جرجان ص ۷۰ و کتاب الانساب ورق ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ و ۱۶۰ (۲) تاریخ جرجان ص ۷۰ و ۷۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۶۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ (۴) تذکرۃ الحفاظ

**وفات:** عام مورخین کے بیان کے مطابق ۹۴ سال کی عمر میں سنچر کے دن غرہ رجب ۳۷۱ھ میں انتقال ہوا اور اتوار کو تدفین ہوئی، ان کے صاحبزادے ابونصر نے جنازہ کی نماز پڑھائی، ابن سبکی اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے کہ صفر ۳۷۱ھ میں وفات پائی۔ (۱)

**اولاد:** انتقال کے وقت پانچ اولادیں تھیں، تین لڑکیاں اور دو لڑکے، ایک لڑکے کا نام ابونصر محمد اور دوسرے کا ابوسعدا اسماعیلی تھا، دونوں علم و فضل میں اپنے والد کے جانشین تھے، ابونصر اپنے باپ کی موجودگی ہی میں مسند درس پر فروس ہو چکے تھے اور دوسرے صاحب زادے ابوسعدا اپنے زمانے کے ممتاز فقیہ اور صاحب علم خیال کئے جاتے تھے۔ (۲)

**تصنیفات:** امام اسماعیلی کی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

۱- مسند عمر: یہ دو جلدوں میں تھی اور حافظ ذہبی کی نظر سے گذری تھی، انھوں نے اس کی تعلق بھی لکھی تھی۔ (۳)

۲- مسند کبیر: یہ نہایت ضخیم کتاب اور تقریباً سو جلدوں پر مشتمل تھی، مگر اس کو زیادہ شہرت نہیں ملی۔

۳- مستخرج: اس کا نام صحیح اسماعیلی بھی ہے، یہ صحیح بخاری پر مستخرج ہے (۴) حافظ ابن کثیر کے اس بیان سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے صحیح بخاری پر مستخرج لکھا، یہ بی شمار فائدوں اور معلومات پر مشتمل ہے۔

حافظ ابن حجر نے اس کا انتخاب کیا تھا، جمعہ منشی ابن حجر کے نام سے مشہور ہے، اسماعیلی نے بخاری کی تعلیقات کو یکجا کر دیا تھا لیکن حافظ نے ان کا جدا جدا ذکر کیا ہے (۵)

۴- معجم: اسماعیلی کی یہ اہم تصنیف ہے، اس کے متعلق حافظ ابن حجر نے

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲ تاریخ جرجان ص ۶۹ کتاب الانساب ورق ۱۳۶ المنتظم ص ۱۰۸

طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۸۰ (۲) تاریخ جرجان ص ۴۷ (۳) بستان الحمد شین ص ۳۸ (۴) مستخرج کی تعریف کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ الحمد شین ج ۱ ص ۲۰۸ (۵) بستان الحمد شین ص ۳۷۔

مصنف کے حوالہ سے مجمع الموسوس میں یہ تصریح نقل کی ہے۔

میں نے جن شیوخ سے حدیثیں سنی اور لکھی ہیں یا جن کے سامنے قرأت کی ہے ان کے ناموں کے حصر اور حروف معجمہ پر تخریج کے متعلق اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا تاکہ طلبہ کو اس سے سہولت ہو اور ناموں میں التباس و اشکال کے وقت وہ اس کی جانب رجوع کر سکیں، ہر شیخ کی صرف ایک ہی حدیث نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے، اس کا مقصد فی الواقع مفید حدیثوں کو جمع کرنا ہے، جن راویوں کی طرف میرے خیال میں کذب و اتہام یا عام محدثین سے تفریق کی بنا پر ناپسندیدہ ہیں، ان کی حقیقت اس میں اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے لیکن جن لوگوں کا قدح و طعن بالکل واضح اور ظاہر ہے، ان کی حدیث کی تخریج کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، میں نے تیمنا و تبرکاً اس کو احمد کے نام سے شروع کیا ہے اور جمادی الاولیٰ ۳۶۱ھ میں اس کی جمع و تالیف کی ابتدا کی ہے۔ (۱)

☆☆☆



# امام ابوالحسن دارقطنی

متوفی ۳۸۵ھ

نام و نسب: ابوالحسن کنیت، علی نام اور نسب نامہ یہ ہے: علی بن عمر بن احمد بن مہدی بن مسعود بن نعمان بن دینار بن عبداللہ۔ (۱)

ولادت و وطن: صحیح روایت کے مطابق امام دارقطنی ۵ رذو قعدہ ۳۰۶ھ کو بغداد کے ایک محلہ دارقطن میں پیدا ہوئے، یہ محلہ کرخ اور نہر عیسیٰ بن علی کے درمیان واقع اور متعدد اکا بر کا مولد تھا لیکن بعد میں ویران ہو گیا، علامہ سمعانی کے بغداد تشریف لانے کے زمانہ میں یہ اجڑ چکا تھا۔ (۲)

اساتذہ: امام صاحب کے بعض مشہور شیوخ و اساتذہ کے نام یہ ہیں:

قاضی ابراہیم بن حماد، ابن درید، ابن زیاد نیشاپوری، ابن نیروز، ابوبکر بن ابی داؤد سجستانی، ابوحامد بن ہارون حضرمی، ابوسعید عدوی، ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز، ابوجعفر احمد بن اسحاق بن بہلول، احمد بن عیسیٰ بن مسکین بلدی، احمد بن قاسم قرظی، ابوطالب احمد بن نصر، عبداللہ بن ابی حبیہ، علی بن عبداللہ بن بشر، فضل بن احمد زبیدی، ابوعلی محمد بن سلیمان مالکی، محمد بن قاسم بخاری، محمد بن نوح چندیسابوری، ابوعمر محمد بن یوسف قاضی ازدی، یحییٰ بن محمد بن صاعد، یوسف بن یعقوب نیشاپوری۔ (۳)

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۳ کتاب الانساب ورق ۲۱۷، المختصر ج ۷ ص ۸۳ (۲) ایضاً تذکرۃ الحفاظ

ج ۳ ص ۱۹۹ (۳) ایضاً۔

تلامذہ: ان کے بعض مشہور تلامذہ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابوبکر احمد بن محمد برقانی، ابوبکر بن بشران، ابوحامد اسفرائینی، ابوالحسن بن الآبوسی، ابوالحسین ابن مہدی باللہ، ابوذر عبد ابن احمد ہروی، ابوطالب بن عمار، ابوطاہر بن عبد الرحیم، قاضی ابوالطیب طبری ابوالقاسم بن بشران، ابوالقاسم بن محسن، ابو محمد جوہری، ابو محمد خلل، ابو نعیم اصفہانی صاحب حلۃ الاولیاء، ابوالقاسم ازہری، تمام رازی صاحب فوائد مشہورہ، ابو عبد اللہ حاکم صاحب المستدرک، ابوالقاسم حمزہ بن محمد طاہر، ابوالقاسم حمزہ بن یوسف سہمی، ابوالقاسم عبدالصمد بن مامون ہاشمی، عبدالعزیز ازہری، حافظ عبدالغنی ازہری منذری صاحب ترغیب وترہیب، ابو عبد الرحمن محمد بن حسین سلمی۔ (۱)

طلب حدیث کے لیے سفر: امام دارقطنی کو علم و فن خصوصاً احادیث نبوی سے غیر معمولی شغف تھا، وہ نہایت کسبی میں اس فن کی تحصیل میں مشغول ہو گئے تھے، ابو یوسف قواس کا بیان ہے کہ ”جب ہم بغوی کے پاس جاتے تھے تو دارقطنی بہت چھوٹے تھے، ان کے ہاتھ میں روٹی اور سالن ہوتا تھا“ امام صاحب کے زمانہ میں بغداد علمی حیثیت سے نہایت ممتاز اور نامور علما و محدثین کا مرکز تھا، مگر وہ اپنی تشنگی علم کو بھانے کے لیے بغداد کے علاوہ کوفہ، بصرہ، واسط، شام اور مصر وغیرہ متعدد مقامات میں تشریف لے گئے۔ (۲)

حفظ و ذکاوت: امام دارقطنی کا حافظہ غیر معمولی اور بے نظیر تھا، نہ صرف احادیث بلکہ دوسرے علوم کا بھی ان کا سینہ مخزن تھا، بعض شعرا کے دواوین ان کو ازبر تھے، قدیم عربوں کی طرح وہ تحریر و کتابت کے بجائے اکثر اپنے حافظہ ہی سے کام لیتے تھے، اپنے تلامذہ کو کتابیں زبانی املا کرتے تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کو الحافظ الکبیر، الحافظ المشہور، کان عالماً حافظاً وغیرہ لکھا ہے، ذہبی نے ان کو حافظ الزمان کہا ہے، حاکم فرماتے ہیں کہ ”وہ حافظہ میں

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۳۲ کتاب الانساب ورق ۲۱۷ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۹۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ

یکٹائے روزگار تھے، ‘سمعانی کا بیان ہے کہ ‘دارقطنی کا حافظہ ضرب المثل تھا‘ علامہ ابن جوزی رقمطراز ہیں کہ ‘وہ حافظہ میں منفرد اور یگانہ عصر تھے‘، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ‘بچپن ہی سے دارقطنی اپنے نمایاں اور غیر معمولی حافظہ کے لیے مشہور تھے‘ ابوالطیب طاہری کا بیان ہے کہ ‘بغداد میں جو بھی حافظ حدیث آتا وہ امام دارقطنی کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور اس کے بعد اس کے لیے ان کی علمی بلند پائیگی اور حافظہ میں برتری اور تقدم کا اعتراف کرنا لازمی ہو جاتا تھا‘ ان کے حافظہ اور ذہانت کا یہ حال تھا کہ ایک ہی نشست میں ایک ہی روایت کی بیس بیس سندیں برجستہ بیان کر دیتے تھے، حافظ ذہبی نے اس طرح کے ایک واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کو دیکھ کر دارقطنی کی بے پناہ ذہانت، قوت حفظ اور غیر معمولی فہم و معرفت کے سامنے سرنگوں ہو جانا پڑتا ہے، شباب کے زمانہ میں ایک روز وہ اسماعیل صفار کے درس میں شریک ہوئے، وہ کچھ حدیثیں املا کر رہے تھے، امام دارقطنی کے پاس کوئی مجموعہ حدیث تھا، یہ بیک وقت اس کو نقل بھی کرتے جاتے تھے اور صفار سے حدیثیں بھی سن رہے تھے، اس پر کسی شریک مجلس نے ان کو ٹوکا اور کہا تمہارا سماع صحیح اور معتبر نہیں ہو سکتا، کیوں کہ تم لکھنے میں مشغول ہو اور شیخ کی مرویات کو ٹھیک سے سمجھنے اور سننے کی کوشش نہیں کرتے، امام دارقطنی نے جواب دیا کہ املا کو سمجھنے میں میرا طریقہ آپ سے مختلف ہے، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت شیخ نے اب تک کتنی حدیثیں املا کرائی ہیں؟ اس شخص نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ اب تک اٹھارہ حدیثیں املا کرائی ہیں، شمار کرنے پر وہ واقعی اٹھارہ ہی نکلیں، پھر آپ نے ایک ایک حدیث کو بے تکلف بیان کر دیا اور اسناد و متون میں وہی ترتیب بھی قائم رکھی جو شیخ نے بیان کی تھی، پورا مجمع اس حیرت انگیز ذہانت اور غیر معمولی حافظہ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

بعض مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شریک مجلس کے بجائے خود شیخ اسماعیل صفار نے ان کو تنبیہ فرمائی تھی۔

ابوبکر برقانی کا بیان ہے کہ میں اکثر ابو مسلم بن مہران کے سامنے دارقطنی کی تعریف کیا کرتا تھا، ایک دن انھوں نے کہا تم دارقطنی کی تعریف میں افراط اور غلو سے کام لیتے ہو، ذرا ان سے رضراض کی وہ حدیث دریافت کرو جو ابن مسعود سے مروی ہے میرے دریافت کرنے پر امام صاحب نے نہ صرف وہ حدیث بلکہ اس کے اختلاف وجوہ اور امام بخاری کی اس روایت کے بارے میں خطا بھی واضح کر دی اور میں نے اس کو بھی علل میں شامل کر لیا۔ (۱)

**ثقافت:** حافظہ کی طرح ان کی ثقافت بھی مسلم ہے، خطیب نے ان کے مناقب میں راست بازی، امانت اور عدالت کا ذکر کیا ہے، صاحب مشکوٰۃ نے اپنے دیباچہ میں امام دارقطنی کو اکابر محمد شین اور ائمہ متقنین میں شمار کیا ہے۔

**علل و اسماء الرجال:** وہ روایت کی طرح درایت کے بھی ماہر اور جرح و تعدیل کے فن میں امام تھے، ان کا شمار مشہور نقادان حدیث میں کیا جاتا ہے، ممتاز محمد شین اور ائمہ فن نے ان کے اس کمال کا اعتراف کیا ہے، رجال کی تمام معتبر و متداول کتابوں میں ان کے نقد و جرح کے اقوال موجود ہیں، حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ”امام کی عظمت و براعتِ شان دیکھنی ہو تو ان کی علل کا مطالعہ کرو، تم مبہوت ہو جاؤ گے“ سعد بن علی زبانی سے چارہم عصر محمد شین، بغداد کے دارقطنی، مصر کے عبدالغنی بن سعید، اصہبان کے ابو عبد اللہ بن مندہ اور نیشاپور کے ابو عبد اللہ حاکم کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ”دارقطنی علل سے واقفیت میں ان سب سے فائق ہیں۔“ خطیب کا بیان ہے کہ ”احادیث و آثار، علل حدیث، اسماء الرجال اور احوال و رواۃ کا علم ان پر ختم ہو گیا، حافظ ابن جوزی کا ارشاد ہے کہ ”امام دارقطنی کی علم حدیث، اسماء الرجال اور علل حدیث میں معرفت مسلم ہے“ حافظ ابن کثیر نے نہایت شاندار الفاظ میں ان کی نائیدانہ بصیرت و ذرف نگاہی کا اعتراف کیا ہے، فرماتے ہیں

(۱) تاریخ بغداد صفحات ۳۶-۳۸ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۹۹-۲۰۱ و بستان المحدثین ص ۳۶۔

”احادیث پر نظر اور علل و انتقاد کے اعتبار سے وہ نہایت عمدہ تھے، اپنے دور میں فن اسماء الرجال، علل اور جرح و تعدیل کے امام اور فن درایت میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔“ ان کے معاصر و شاگرد حاکم کا بیان ہے کہ ”میں قیام بغداد کے زمانہ میں اکثر ان کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا، یہ واقعہ ہے کہ میں نے ان کی جس قدر تعریفیں سنی تھیں ان سے بڑھ کر ان کو پایا، میں ان سے شیوخ، رواۃ اور علل حدیث کے متعلق سوالات کرتا تھا اور وہ ان کا جواب دیتے تھے، میری شہادت ہے کہ روئے زمین پر ان کی کوئی نظیر موجود نہیں۔“ (۱) شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ ”فقہی احکام و مسائل اور حلال و حرام کی معرفت میں جو حیثیت مالک، سفیان ثوری، اوزاعی اور شافعی وغیرہ ائمہ فقہ کی رایوں اور اقوال کی ہے وہی حیثیت رجال اور صحیح و ضعیف احادیث کے بارے میں یحییٰ بن معین، بخاری، مسلم، ابو حاتم، ابوزرعہ، نسائی، ابن عدی اور امام دارقطنی وغیرہ جہادہ محدثین و نقادان فن کے کلام کی ہے۔“ (۲) ان کی عظمت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علل میں ان کی تصنیف سب سے بہتر اور جامع خیال کی جاتی ہے اور اس فن میں ان کے بعض اولیات بھی ہیں، مثلاً مذبح (روایت اقران) کی ایجاد کا فخر ان ہی کو حاصل ہے، عراقی کا بیان ہے کہ ”میرے علم کے بموجب دارقطنی نے سب سے پہلے اس اصطلاح کو وضع کیا ہے۔“ (۳)

ازہری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ کسی حدیث کی علت یا کسی راوی کے متعلق محمد بن ابی الفوارس کو جواب دیتے ہوئے فرمایا: ”اے ابوالفتح! مشرق و مغرب کے درمیان اس فن کا جاننے والا میرے سوا کوئی نہیں۔“ حمزہ بن محمد بن طاہر دقاق نے مندرجہ ذیل شعروں میں ان کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے:

(۱) تدریب الراوی ص ۲۷۷ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۷۷ تذکرہ ج ۳ ص ۲۰۰ کتاب الانساب ورق ۲۱۷،  
المنظوم ج ۷ ص ۱۸۳ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ (۲) الرد علی البہری ص ۱۳ (۳) تدریب الراوی

جعلناک فیما بیننا ورسولنا ☆ وسیطافلم تظلم ولم تتحرب

فانت الذی لولاک لم یعرف الوری ☆ ولو جهد واما صادق من مکذب

ترجمہ: اے امام حدیث! آپ ہمارے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان بہترین

اور عمدہ واسطہ ہیں اگر آپ کی پر کمالات ذات نہ ہوتی تو لوگ انتہائی کوششوں کے

باوجود بھی سچے اور جھوٹے راویوں اور صحیح و غلط حدیثوں میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔“

حدیث و اسماء الرجال سے ان کی گہری واقفیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ

اگر کوئی شخص ان کے جملوں میں معمولی غلطی بھی کرتا تو وہ فوراً اس کو تاز جاتے اور بروقت اس

کی اصلاح کر دیتے تھے، ایک مرتبہ خلال نے یہ حدیث پڑھی: اللهم انک عفو تحب

العفو فاعف عنی، اس میں انھوں نے عفو کو مخفف پڑھا تو امام صاحب نے فوراً نوکا کہ عفو

مشدد ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں ”علل حدیث ورجال کی معرفت میں یگانہ

روزگار اور عدیم المثال تھے،“ حاکم اور اس فن کے دوسرے ممتاز ائمہ نے اس کا اعتراف کیا

ہے۔ (۱)

حدیث میں وجہ: امام دارقطنی کو اصل شہرت حدیث میں امتیاز کی بنا پر حاصل ہے، ان

کے حفظ و ضبط، ثقاہت و اتقان، روایت و درایت میں مہارت اور علل کی معرفت وغیرہ کے

متعلق جو کچھ لکھا گیا، اس سے بھی ان کے حدیث میں کمال، بلند پایگی اور تبحر کا پوری طرح

اندازہ ہو جاتا ہے، ائمہ فن اور نامور محدثین نے ان کے عظیم المرتبت اور صاحب کمال محدث

ہونے کا اعتراف کیا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ ”احادیث و آثار کا علم ان پر ختم ہو گیا، وہ

حدیث میں یکتائے روزگار، عجوبہ دہر اور امام فن تھے،“ امام بخاری کی طرح امام دارقطنی کو

بھی ان کے زمانہ میں امیر المؤمنین فی الحدیث (اقلیم حدیث کے تاجدار) کا خطاب ملا تھا،

عبدالغنی بن سعید کا بیان ہے کہ ”حدیث پر بحث و گفتگو میں تین اشخاص اپنے اپنے زمانہ

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۸، ۳۹، تذکرہ ج ۳ ص ۲۰۱ وستان الحدیث ص ۳۶۔

ترتیب ذکرۃ المحدثین..... گلستان حدیث کے مہکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

525

میں نہایت ممتاز تھے، علی بن مدینی، موسیٰ بن ہارون اور علی بن عمر در قطنی، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں، ”وہ علم حدیث میں منفرد اور امام تھے، ان کے معاصرین میں کوئی اس رتبہ اور پایہ کا شخص نہیں گذرا، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں، روایت کی وسعت و کثرت کے اعتبار سے وہ امام دہر تھے، ابن عماد حنبلی کہتے ہیں ”حدیث اور اس کے متعلق فنون میں وہ منتہی تھے اور اس میں امیر المؤمنین کہلاتے تھے، ابو بکر بن ہبہ اللہ صاحب طبقات الشافعیہ..... لکھتے ہیں کہ ”وہ اپنے دور میں حدیث کے امام تھے، ابو الطیب طبری کا بیان ہے کہ امام صاحب کی مجلس میں ایک روز مس ذکر کی حدیث پڑھی جا رہی تھی، امام صاحب نے اس کے بے شمار طرق جمع کر کے اس کے فوائد پر عمدہ تقریر کی اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر امام احمد بھی اس وقت موجود ہوتے تو وہ اس معاملہ میں مجھ سے استفادہ کرتے۔“ (۱)

امام صاحب کے اس فن میں مقام و مرتبہ کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صحاح ستہ کے مصنفین کے بعد جن مصنفین کو معتبر اور جن کی تصنیفات کو مستند اور زیادہ پر منفعت خیال کیا گیا ہے، ان میں ان کا نام نامی بھی ہے، ابن صلاح، نووی، صاحب مشکوٰۃ اور علامہ سیوطی نے اس حیثیت سے ان کا ذکر و اعتراف کیا ہے۔ (۲)

**فقہ و خلافیات:** امام صاحب فقہ میں ممتاز فقہاء کے مذاہب و مسالک کے نہایت واقف کار اور خلافیات کے بڑے ماہر تھے، ان کی سنن بھی اس پر شاہد ہے، خطیب لکھتے ہیں کہ ”حدیث کے علاوہ مذاہب فقہاء کی معرفت میں بھی ان کا درجہ نہایت بلند ہے“ کتاب السنن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو فقہ سے بڑا اعتنا و اشتغال تھا، کیوں کہ کتاب کے محتویات و شمولات کو وہی شخص جمع اور مرتب کر سکتا ہے جس کو احکام و مسائل اور فقہاء کے

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۳، ۳۶، ۳۸، ابن خلکان ج ۲ ص ۵، والبدایہ ج ۱ ص ۳۱۷، طبقات الشافعیہ

لابی بکر ص ۳۳، شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۱۶، کتاب الانساب ورق ۲۱۷ (۲) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲

تدریب الراوی ص ۲۶۰ مقدمہ کمال ص ۱۷۔

اختلافات سے اچھی اور پوری طرح واقفیت ہو، اس فن کو انھوں نے ابو سعید اصطخری اور ایک روایت کے مطابق ان کے کسی خاص شاگرد سے حاصل کیا تھا، مورخین اور سوانح نگاروں کا متفقہ بیان ہے کہ: وکان عارفا باختلاف الفقهاء (۱)

فقہی مذہب: اگرچہ امام دارقطنی شافعی المذہب تھے لیکن ان کا شمار اس مذہب کے صاحب وجوہ فقہاء میں ہوتا ہے، صاحب وجوہ وہ فقہاء کہلاتے ہیں جنھوں نے اپنے ائمہ کے مذاہب کی تکمیل اور ان سے منسوب مختلف روایتوں کے درمیان تطبیق و ترجیح اور ان کے وجوہ و علل واضح کئے ہیں اور جن مسائل کے متعلق ان کے ائمہ کی تصریحات موجود نہیں تھیں، ان کو ان کے اصول و علل پر قیاس کر کے فتویٰ دیا ہے۔ "ابن خلکان نے دارقطنی کو فقہاً علی مذہب الشافعی اور یافعی نے صاحب الوجوہ فی المذہب لکھا ہے۔ (۲)

نحو، تفسیر، قرأت و تجوید: امام صاحب کو علم نحو، فن قرأت و تجوید میں ید طولیٰ حاصل تھا اور تفسیری و قرآنی علوم سے بڑا شغف تھا، ابوالفدا کا بیان ہے کہ "وہ قرآنیات کے امام تھے،" حاکم کہتے ہیں کہ وہ حنّاء و قراء کے امام اور تجوید و قرأت میں بلند پایہ تھے، انھوں نے حروف و مخارج کی تصحیح و ادائیگی کا علم بیچین میں ابوبکر بن مجاہد سے سیکھا اور محمد بن حسین نقاش طبری، احمد بن محمد دیباجی ابو سعید قزاز وغیرہ ماہرین فن سے اس کی باقاعدہ تکمیل کی اور آخر عمر میں خود اس فن میں مرتبہ امامت و اجتہاد پر فائز ہو گئے اور اس میں ایک رسالہ بھی لکھا، اس میں قدیم قراء سے مختلف ایک نیا طرز انھوں نے ایجاد کیا تھا، یہ طرز بعد میں مقبول ہوا اور لوگوں نے اسے اختیار کیا۔ (۳)

شعر و ادب: امام دارقطنی شعر و ادب کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے، بعض شعرا کے دواوین ان کو زبانی یاد تھے، عربی زبان و ادب پر ان کو اس قدر قدرت اور کامل عبور تھا کہ ایک دفعہ مصر

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۵ التاج المکمل ص ۴۵ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۵ و مرآة البیان ج ۲ ص ۴۲۵ (۳) تاریخ ابوالفدا ج ۲ ص ۱۳۰ و تذکرۃ الخطاط ج ۳ ص ۲۰۰ و ۲۰۱ تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۳ و ۳۵۔



تشریف لے گئے تو وہاں علوی خاندان کے ایک شخص مسلم بن عبداللہ موجود تھے، یہ ادب، فصاحت و بلاغت اور زبان دانی کے بڑے ماہر تھے، ان کے پاس زبیر بن بکار کی کتاب الانساب تھی جس کو حضرت بن داؤد نے ان سے روایت کیا تھا اور جو انساب کے علاوہ اشعار اور ادبی نکاہات و لطائف کا بھی بہترین مجموعہ تھی، لوگوں نے امام دارقطنی سے اس کی قرأت کی فرمائش کی، امام صاحب نے سب کے شدید اصرار کی وجہ سے اس کو منظور کر لیا، چنانچہ اس تقریب کے لیے ایک مجلس کا اہتمام کیا گیا، اس میں مصر کے نامور علماء و فضلاء اور اساطین شعر و ادب بھی شریک ہوئے تاکہ امام دارقطنی کی غلطیوں کی گرفت کر سکیں لیکن ان لوگوں کو ناکامی ہوئی، امام کے حیرت انگیز کمال کو دیکھ کر سب دنگ رہ گئے، خود مسلم کو بھی ان کے ادبی مذاق کی چنگلی و بلندی اور عربی زبان پر غیر معمولی قدرت اور دسترس کا اعتراف کرنا پڑا۔ (۱)

جامعیت: ان گونا گوں کمالات سے ان کی جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے، گوان کو اصل شہرت حدیث میں امتیاز کی وجہ سے ہے تاہم وہ کسی فن میں بھی عاجز و قاصر نہ تھے، خطیب کا بیان ہے کہ ”حدیث کے علاوہ بھی متعدد علوم و فنون میں ان کو درک و مہارت تھی۔“ از ہری کا بیان ہے کہ امام دارقطنی بڑے ذہین و طباع تھے، ان کے سامنے کسی علم کا بھی تذکرہ کیا جاتا تو اس کے متعلق معلومات کا بیشمار ذخیرہ ان کے پاس ہوتا، محمد بن طلحہ بغالی ایک روز ان کے ساتھ کسی دعوت میں شریک تھے، جب کھانے پر گفتگو چھڑی تو دارقطنی نے اس کے اتنے واقعات و حکایات اور نوادرو عجائب بیان کئے کہ رات کا اکثر حصہ ختم ہو گیا، حاکم سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ نے دارقطنی کی طرح کوئی جامع کمالات شخص دیکھا ہے، تو انہوں نے نفی میں جواب دیا، ابوالفدا کا بیان ہے کہ وہ متعدد علوم میں جامع تھے۔ (۲)

**فہم و دانش:** اللہ تعالیٰ نے ان کو فہم و دانش سے بھی سرفراز کیا، تاہم حاکم کا بیان ہے کہ امام

(۱) تذکرۃ الحفاظ و تاریخ بغداد حوالہ مذکورہ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۰

دارقطنی اس حیثیت سے بھی یکتائے روزگار تھے، خطیب نے ان کے فقہ و فہم کی تعریف کی ہے۔ (۱)

ورع و تقویٰ: حاکم کا بیان ہے کہ وہ ورع و تقویٰ میں بے مثال تھے، خلال کا بیان ہے ایک روز میں اپنے ایک استاد کے یہاں گیا وہاں ابوالحسین بن مظفر، قاضی ابوالحسن جراحی اور امام دارقطنی وغیرہ ائمہ فن و اصحاب کمال موجود تھے، جب نماز کا وقت ہوا تو دارقطنی نے امامت کی، حالانکہ اس مجلس میں ان سے زیادہ معمر مشائخ موجود تھے، امام صاحب دین کے معاملہ میں کسی مصلحت، نرمی اور مہارت کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کے زمانہ میں شیعیت کا زور تھا لیکن انھوں نے شیعوں کے علی الرغم حضرت عثمان کو حضرت علیؑ سے افضل قرار دیا۔ (۲)

شہرت و مقبولیت: امام صاحب اپنے بے شمار کمالات کی وجہ سے نہایت مقبول و محترم سمجھے جاتے تھے، امام اور شیخ الاسلام ان کے نام کا جز ہو گیا تھا، جب مسند درس پر رونق افروز ہوتے تو تشنگان علوم کا جھوم ارد گرد رہتا تھا، آپ کی مجلس درس نہایت باوقار اور پرہیزگاری تھی، نامور محدثین کو بھی احترام کی وجہ سے لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی تھی، ابن شاہین ایک مرتبہ ان کے درس میں شریک ہوئے تو ان پر اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ ایک کلمہ بھی زبان پر نہ لاسکے کہ مبادا کوئی غلطی ہو جائے، آپ کے تلامذہ ہمیشہ آپ کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیتے تھے، عبدالغنی جو خود بھی نامور اور صاحب کمال محدث تھے اور بقول برقانی دارقطنی کے بعد میں نے ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں دیکھا لیکن جب کبھی وہ دارقطنی کے حوالہ سے کوئی بات بیان کرتے تو قال استاذی سمعت استاذی وغیرہ ضرور کہتے، اس کا سبب دریافت کیا گیا تو نہایت فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا کہ ہم نے یہ جو دو چار حروف سیکھے ہیں وہ ان ہی امام دارقطنی کا فیض ہے۔ (۳)

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۳ و تذکرہ حوالہ مذکورہ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۸ (۳) تاریخ بغداد ج ۱۲

لطائف و ظرائف: امام صاحب بڑے پر مذاق اور شگفتہ مزاج تھے، اس لیے لطف و تفریح مزاج و تفسن اور دلچسپی کی باتیں بھی کرتے تھے، ایک روز ابو الحسن بیضاوی آپ کی خدمت میں ایک شخص کو لے کر آئے اور آپ سے کچھ حدیثیں املا کرانے کی فرمائش کی، امام صاحب نے پہلے معذرت کی اور کہا مجھے فرصت نہیں ہے لیکن بیضاوی نے اصرار کیا اور کہا کہ یہ مسافر ہیں اور دور دراز سے محض حدیث کی تلاش و تحصیل کے لیے آئے ہیں، امام صاحب نے اسی وقت اپنی یادداشت سے ایک حدیث بیس طرق اور سندوں سے بیان کی، سب کا متن یہ تھا نعم الشی الہدیۃ امام الحاجۃ۔ یعنی حاجت اور غرض پیش کرنے سے پہلے ہدیہ کرنا بہت عمدہ بات ہے، جب دوسرے دن یہ صاحب پھر تشریف لائے تو اپنے ساتھ کچھ مناسب ہدیہ بھی لائے، امام دارقطنی نے ان کو اپنے قریب بیٹھایا اور ایک حدیث سترہ طرق سے زبانی املا کرائی جس کا متن یہ تھا:

اذا اتاکم کریم قوم فلا کرموہ جب کسی قوم کا سردار یا شریف آدمی  
تمہارے پاس آئے تو اس کی تعظیم کرو۔

ان کی شگفتگی مزاج کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک دن نفل پڑھ رہے تھے، اتفاقاً ان کے پاس ہی ایک شخص کسی مجموعہ حدیث کے مطالعہ میں مشغول تھا، اس نے ایک راوی نسیر (بنون وسین مصغر) کو بشیر (بائے موحده وشین معجمہ) پڑھا، امام دارقطنی نے نماز ہی میں ان کو متنبہ کرنے کے لیے سبحان اللہ کہا وہ سمجھ گئے لیکن دوبارہ بھی غلط ہی پڑھا اور نسیر کہنے کے بجائے یسیر (بضم یا وسین مصغر) کہا، امام صاحب نے دیکھا کہ اب بھی وہ صحیح نہیں پڑھ رہا ہے تو یہ آیت تلاوت کی: (ن والقلم وما یسطرون) تب قاری نے سمجھا کہ یہ نسیر ہے۔ (۱)

(۱) امام دارقطنی شافعی المذہب تھے، شوافع کے یہاں نماز میں اس طور پر تلقین کرنا جائز ہے مگر امام ابوحنیفہ کے یہاں جائز نہیں ہے۔

اسی قسم کا ایک لطیفہ اور بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ نفل ادا کر رہے تھے کہ ابو عبد اللہ کا تب نے عمرو بن شعیب کا نام غلطی سے عمرو بن سعید پڑھا، امام دارقطنی نے سبحان اللہ کہا قاری سمجھ گیا کہ میں نے غلط پڑھا ہے، اس لیے سند ہرا کر خاموش ہو گیا، امام صاحب نے اس کی تصحیح کے لیے یہ آیت پڑھی (يَا شُعَيْبُ أَصْلُوكُنْكَ تَأْمُرُكَ) (۱)

یہ واقعات محض لطائف ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے امام صاحب کی ذہانت، قوتِ حفظ، استحضارِ علم اور حدیث میں بالغ نظری اور مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

اخلاق و عادات: امام صاحب کے اخلاق و عادات کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا لیکن بعض واقعات اور مورخین کے ضمنی بیانات سے ان کی طبعی شرافت اور حسن اخلاق کا پتہ چلتا ہے، مثلاً وہ فضول باتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے اور خاموشی کو پسند کرتے تھے، طبیعت میں نرمی اور انکساری تھی، لوگوں کی دلآزاری سے پرہیز کرتے تھے، طلبہ کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے، ان کی علمی امداد و اعانت بھی کرتے، امام صاحب کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سخی سے بھی ان کے حسن اخلاق کا پتہ چلتا ہے۔

عقائد: وہ بڑے صحیح العقیدہ تھے، مذہبی و اعتقادی مسائل میں ان کا مسلک وہی تھا جو اہلسنت والجماعت کا ہے، مورخ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ فہم و فراست، حفظ و ذکاوت، صدق و امانت اور ثقاہت و عدالت وغیرہ اوصاف کی طرح صحتِ اعتقاد اور سلامتیِ مذہب سے بھی متصف تھے، (۲) دوسرے مورخین نے بھی ان کے عقیدہ کی صحت و درستگی کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان پر شیعیت کا الزام عائد کیا جاتا ہے، اس پر آگے بحث کی جائے گی۔

وفات: مشہور روایت کے مطابق ان کا انتقال ۸ رذو قعدہ ۳۸۵ھ کو ہوا، مشہور فقیہ ابو حامد اسفرائینی نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور مشہور بزرگ معروف کرنفی کے مزار کے متصل باب

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۹، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۱، بستان الحمدین ص ۳۶ و تحف العلماء الصالحین

ص ۳۱۷ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۲۔

حرب میں سپرد خاک کئے گئے، ابونصر بن ماکولا کا بیان ہے کہ میں نے رمضان کی ایک رات میں خواب دیکھا کہ کسی سے امام دارقطنی کے اخروی انجام کے بارے میں سوال کر رہا ہوں اور وہ یہ جواب دے رہے ہیں کہ جنت میں دارقطنی امام کہلاتے ہیں۔ (۱)

امام دارقطنی پر بعض اعتراضات: امام دارقطنی کی عظمتِ شان اور زہد و اتقا میں امتیاز کے باوجود ان پر چند اعتراضات کئے گئے ہیں اس لیے ذیل میں ان کو نقل کر کے ان کا جواب تحریر کیا جاتا ہے۔

**شیعیت کا الزام:** ان پر سب سے بڑا الزام شیعیت کا لگایا گیا ہے لیکن اس کی حقیقت صرف اس قدر بیان کی جاتی ہے کہ ان کو مشہور شیعہ شاعر سید حمیری (۲) کا دیوان زبانی یاد تھا، چنانچہ خطیب لکھتے ہیں کہ ”میں نے حمزہ بن محمد بن طاہر دقاق کو یہ کہتے سنا کہ ابوالحسن دارقطنی کو منجملہ اور دو اوین کے سید حمیری کا دیوان بھی زبانی یاد تھا، اسی وجہ سے ان کی طرف شیعیت کی نسبت کی جاتی ہے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ ان کو جن عرب شعرا کے دو اوین یاد تھے ان میں سید حمیری کا دیوان بھی تھا، اسی لیے ان پر شیعیت کا الزام لگایا گیا ہے، (۳) دوسرے مورخین نے بھی اسی چیز کو نقل کیا ہے اس کے علاوہ امام صاحب کی شیعیت کا اور کوئی

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰، ابن خلکان ج ۲ ص ۶۵ و (۲) اس کا نام اسماعیل، کنیت ابوالہاشم اور نسب نامہ یہ ہے: اسماعیل بن محمد بن یزید بن ربیعہ بن مضر حمیری، اس کی ماں قبیلہ ازد کی تھی، یہ بڑا مشہور اور باکمال پر گوشاعر تھا لیکن نہایت دریدہ دامن، بد زبان اور غالی شیعہ تھا، جو گوئی کے لیے مشہور تھا، زیاد کی جو کبھی تو اس کے لڑکے عبید اللہ نے اس کو قید کر لیا اور سخت سزائیں دیں لیکن حضرت معاویہؓ نے اسے آزاد کر دیا، صحابہ کرامؓ اور اراج مطہرات کی شان میں طعن و تشنیع، سب و شتم اور گستاخی و دریدہ ذہنی اس کا شعار بن گیا تھا، اللہ کی شان دیکھئے کہ اس کے کمالات کے باوجود اس کی یادہ گوئی اور دریدہ ذہنی کی وجہ سے اس کا نام و نشان اور کلام سب مٹ گیا (کتاب الاغانی ج ۲ ص ۲) (۳) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۵ و تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۶۔

ثبوت نہیں بیان کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے محض اتنی سی بات پر امام صاحب کو شیعیت سے متہم کرنا غلط اور سراسر خلاف انصاف ہے، یہ پہلے گذر چکا ہے کہ ان کو زبان و ادب اور شعر و سخن کا عمدہ ذوق تھا، اپنے اس ذوق کی تسکین کے لیے وہ ادب و محاضرات کی کتابوں اور شعرا کے دواوین کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے، ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، اس لیے اکثر چیزیں ان کے لوحِ قلب پر نقش ہو جاتی تھیں، سید حمیری یادہ گو اور شیعہ ہونے کے باوجود ایک باکمال شاعر تھا، اس کا کلام ادبی لطائف و رعنائی سے معمور ہوتا تھا، اس کی خوبیوں اور لطیف زبان کی وجہ سے امام صاحب کو اس سے دلچسپی رہی ہوگی اور یہ ان کو زبانی یاد ہو گیا ہوگا لیکن اس کا شیعیت سے کیا تعلق؟ یہ تو درحقیقت فن اور اہل علم کی قدر دانی ہے لیکن تاریخ اسلام میں جس طرح بے شمار مقدس اور برگزیدہ علمائے اسلام کو بے بنیاد اعتراضات اور بے سرو پا الزامات کا نشانہ بنایا گیا ہے، اسی طرح امام صاحب پر بھی یہ الزام عائد کر دیا گیا اور اکابر پر ممکن ہے اس قسم کے الزامات کے کچھ وجوہ رہے ہوں لیکن امام دارقطنی کو شیعیت سے متہم کرنے کی معمولی وجہ بھی موجود نہیں ہے، چنانچہ حافظ ذہبی نے اس الزام کا ذکر کرنے کے فوراً بعد ہی اس کی پرزور تردید بھی کی ہے ما بعد من التشیع یعنی ان کا شیعیت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ (تذکرہ ج ۳ ص ۲۰۰)

امام صاحب کے حالات و واقعات زندگی سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے، کیوں کہ بعض ایسے صریح قرآن اور واضح شواہد موجود ہیں جن سے امام صاحب کی شیعیت سے بیزاری کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً:

ابن ظاہر کا بیان ہے کہ بغداد میں ایک بار تفضیل علی کے متعلق اختلاف ہوا لوگ امام دارقطنی کی خدمت میں استفسار کے لیے آئے، انھوں نے پہلے تو خاموشی اختیار کی مگر پھر فوراً ان کو خیال ہوا کہ یہ ایک مذہبی و اعتقادی مسئلہ ہے اس میں مصالح کو دخل دینا

اور کتمانِ حق سے کام لینا نامناسب ہوگا، اس لیے بلا جھجک یہ فرمایا کہ حضرت عثمانؓ افضل ہیں کیوں کہ صحابہ کا اس پر فی الجملہ اتفاق ہے اور یہی اہلسنت والجماعت کا مسلک ہے، (۱) ایسے زمانہ میں جب شیعیت کا اس قدر غلبہ رہا ہو اس قسم کی بات کہنا حق گوئی، جرأت اور بیباکی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

امام دارقطنی کے اساتذہ میں ایک شخص کا نام ابو العباس احمد بن محمد بن سعید کوفی الملقب بابن عقدہ ہے، یہ اگرچہ جلیل القدر محدث ہیں لیکن ان کا شیعیت کی جانب رجحان تھا، اس لیے امام صاحب ان کو ناپسند کرتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر ان کے متعلق فرمایا:

حافظ محدث ولم یکن فی      وہ حافظ و محدث تھے لیکن دین میں  
الذین بقوی لازید فیہ علی      زیادہ قوی نہیں تھے، اس سے زیادہ میں  
هذا۔      ان کے بارے میں اور کچھ نہیں کہوں گا

لیکن حمزہ بن محمد بن طاہر فرماتے ہیں کہ امام دارقطنی نے ان کے بارے میں کسی قدر سخت الفاظ بھی کہے ہیں حافظ ذہبی لکھتے ہیں کانہ یشیر الی الرفض (۲) (گویا اس سے ان کی شیعیت کی طرف اشارہ تھا)

ان واضح اور صریح واقعات کی موجودگی میں یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ان کا شیعیت سے ادنیٰ تعلق بھی رہا ہوگا، ان کے فضل و کمال تدریس و تقویٰ اور عقیدہ میں صحت و پختگی کا پہلے جو ذکر ہو چکا ہے اس کے بعد ان کے متعلق اس قسم کے الزام کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

تدلیس: دوسرا اعتراض تدلیس کا ہے، ذہبی نے اس کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے بغوی سے جو روایتیں نہیں سنی ہیں ان کو اس طرح بیان کرتے تھے 'قرء البغوی ابی القاسم حدثکم فلان۔' اس اعتراض کی بنیاد اس امر پر ہے کہ بغوی کی وفات

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۲ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۲ و ۵۹ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۶۵۔

کے وقت امام صاحب کمسن تھے، ابو یوسف تو اس کا پیمان ہے کہ ”ہم لوگ بغوی کے پاس جاتے تھے تو دارقطنی بھی ہمارے پیچھے پیچھے جاتے تھے، یہ اس وقت اتنے چھوٹے تھے کہ ان کے ہاتھ میں روٹی اور سائین ہوتا تھا لیکن اس بیان سے خود دارقطنی کی بغوی سے ملاقات اور سماع کا ثبوت ملتا ہے کیوں کہ مشہور روایت کے مطابق امام دارقطنی ۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے اور ابو القاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز بغوی نے ۳۱۷ھ میں انتقال کیا، دوسرے ان دونوں بزرگوں کا وطن بغداد تھا، اس اعتبار سے گیارہ سال کی عمر میں اپنے وطن کے شیخ سے سماع و استفادہ میں دشواری کی کوئی بات معلوم نہیں ہوتی رہا تہ لیس کا معاملہ تو اس کا ذہبی کے علاوہ کسی اور نے ذکر نہیں کیا ہے اگر تنہا ذہبی کی حکایت صحیح مان لی جائے تو بھی محض نفس تدلیس ثقاہت کے لیے مانع نہیں ہے۔

خود ستائی: امام دارقطنی نے بعض مواقع پر خود اپنی ہی زبان سے اپنی تعریف کی ہے، اس کو پہلے لکھا جا چکا ہے مگر اس کا جائزہ لینے کے لیے اس کو دوبارہ نقل کرنا ضروری ہے۔

ایک موقع پر آپ نے اپنے کو سب سے جامع اور افضل قرار دیا، ایک موقع پر کچھ حدیثوں کا املا کرانے اور ان کے فوائد پر تقریر کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر امام احمد بھی موجود ہوتے تو استفادہ کرتے، اسی طرح ایک دفعہ ایک حدیث کی علت کے متعلق سوال کا جواب دیتے ہوئے ابن ابی الفوارس سے یہ کہا کہ ”شرق و غرب میں اس فن کا مجھ سے بہتر کوئی جاننے والا نہیں۔“

بلاشبہ اپنی تعریف خود ہی کرنا معیوب ضرور ہے لیکن اگر یہ خلاف واقعہ نہ ہو تو بعض حالات جیسے تحدیث نعمت، طلبہ کی ترغیب و تشویق اور لوگوں کی خواہش و اصرار یا اور کسی ضرورت و مجبوری کی بنا پر اس میں قباحت نہیں رہ جاتی ہے، دوسرے یہ کوئی ایسی معصیت نہیں ہے جس کی کسی حال میں بھی گنجائش نہ ہو، امام صاحب کے جو اوصاف و کمالات پہلے بیان کیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی جانب کوئی خلاف واقعہ بات



منسوب نہیں کی ہے اور آپ کی عظمت و بلند پایگی اور شان زہد و ورع سے یہ بعید بھی ہے کہ بلا کسی خاص ضرورت اور وجہ کے خود ستائی سے آپ کی زبان آلودہ ہوئی ہو چنانچہ اپنی جامعیت کا تذکرہ کرنے سے پہلے آپ نے سوال کو ٹالنے کی پوری کوشش کی، یہاں تک کہ قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:

فَلَا تَزْكُوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ  
سَوَّم (بہت) اپنی پاکیزگی (جتایا) نہ  
بِمَنِ اتَّقَى. (۱) (نجم-۲)  
کرد پرہیزگاروں کو وہی خوب  
جانتا ہے۔

لیکن اس پر بھی سائل خاموش نہ ہوا اور مصلحت داعی ہوئی تو آپ نے مناسب اور جائز وصف کا تذکرہ کیا، اسی پر دوسرے مواقع کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔  
یافعی کا اعتراض: امام دارقطنی طلبہ کی حوصلہ افزائی اور اہل علم کے علمی و تصنیفی کاموں میں ان کی امداد کرتے تھے، ان کے شاگرد عبدالغنی کی کتاب المومئین و المختلف در حقیقت ان ہی سے استفادہ کا نتیجہ تھی، اسی طرح کافور اشیدی کے وزیر ابو الفضل جعفر المعروف بابن خزائبہ کے بارے میں آپ کو معلوم ہوا کہ وہ مسند تالیف کرنا چاہتے ہیں تو بغداد سے مصر تشریف لے گئے اور مسند کی تالیف تک وہاں قیام پذیر رہ کر اس کی امداد فرماتے رہے، ابو الفضل نے آپ کی خوب پذیرائی اور بڑا اعزاز و اکرام کیا اور واپسی کے وقت اس قدر مال و دولت آپ کے ہمراہ کیا کہ آپ کو ایک حد تک فراغت میسر آگئی۔ (۲)

بظاہر اس واقعہ میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت امام صاحب کی علم دوستی کا ثبوت ہے لیکن یافعی صاحب مرآة الجنان نے اس کو ان کی شان کے منافی اور خلاف اولیٰ قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ”امام صاحب نے اگرچہ ابن خزائبہ کو مسند کی

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۵ و تذکرہ ج ۳ ص ۲۰۱، ابن خلکان ج ۲ ص ۵۔ (۲) یہ واقعہ تمام کتابوں میں

ذکور ہے۔

تخریج میں مدد پہنچانے کے لئے یہ سفر کیا تھا لیکن علمائے متدینین کے لئے میں اس کو مناسب نہیں سمجھتا، اگر اس قسم کا معاملہ وزرا و امرا کے بجائے اصحابِ علم و دین کے ساتھ کیا گیا ہوتا اور اس میں حصولِ دنیا کی کوئی آرزو شامل نہ ہوتی تو البتہ یہ ایک اچھی بات ہوتی اور اس کو اشاعتِ علم اور اعانتِ فی الخیر پر محمول کیا جاتا۔ (۱)

اس اعتراض کا تجزیہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے مسند کی تالیف میں مدد پہنچا کر وزیر سے اپنے علم و فن کا معاوضہ قبول کیا، حالانکہ اولاً تو معاوضہ قبول کرنے کی اکثر علما کے یہاں گنجائش ہے، دوسرے یہ معاملہ سرے سے معاوضہ میں داخل ہی نہیں ہے کیوں کہ امام صاحب نے پہلے سے اس قسم کا کوئی مطالبہ یا معاملہ نہیں کیا تھا بلکہ اس نے خود اور بلا طلب آپ کی امداد کی تھی، امام صاحب کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی، اس لیے آپ نے اس کے انعام و اکرام سے مستفید ہونا قبول کر لیا، کہیں اس قسم کی کوئی تصریح موجود نہیں ہے کہ آپ نے حرم و لالچ کی وجہ سے یہ سفر کیا تھا۔

تعصب: امام دارقطنی پر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ وہ متعصب تھے، شافعی مذہب میں ان کو غیر معمولی غلو تھا اور اس کے برعکس وہ حنفی مذہب سے سخت عناد رکھتے تھے، پہلی بات کے ثبوت میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے مصر کے لوگوں کی فرمائش پر ایک رسالہ تحریر کیا، اس میں انھوں نے جبری نمازوں میں زور سے بسم اللہ پڑھنے کے متعلق حدیثیں جمع کی تھیں لیکن جب ان سے ان حدیثوں کی صحت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے اعتراف کیا کہ ”جبر بالبسملة کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے، البتہ صحابہ کرام سے اس کے متعلق صحیح اور ضعیف دونوں قسم کی روایتیں ملتی ہیں۔ (۲)

اس واقعہ سے امام دارقطنی پر دو شبہات عائد ہوتے ہیں:

۱- انھوں نے جان بوجھ کر ضعیف اور غیر ثابت حدیثیں جمع کیں۔

(۱) مرآة البیان ج ۲ ص ۲۲ (۲) فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۷ ص ۷۷ و نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۵۸، ۳۵۹، کبیری ص ۳۶

(۲) اس علم و واقفیت کے باوجود بھی کہ صحیح حدیثوں سے جہر بالبسملہ کی تائید نہیں ہوتی، انھوں نے اس سے رجوع نہیں کیا۔

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ امام صاحب کا مقصد اس باب کی تمام احادیث کا استقصا اور ایک جامع رسالہ تالیف کرنا تھا، اس لیے انھوں نے اس میں ضعیف حدیثیں بھی درج کر دی ہیں چنانچہ سنن میں تحریر فرماتے ہیں:

”ان لوگوں کے علاوہ جن کا یہاں ہم نے نام لیا ہے، صحابہ کرام اور ازواج مطہرات کی ایک جماعت نے جہر بالبسملہ کی حدیثیں بیان کی ہیں، ان کی اس نوعیت کی حدیثوں کو ہم مستقلاً کتاب الجہر میں لکھ چکے ہیں، یہاں اختصار کی وجہ سے ان ہی چند لوگوں کی روایتوں پر اکتفا کیا گیا ہے، اس رسالہ میں ان صحابہ و تابعین کے مرویات بھی جمع کئے گئے ہیں جو بسم اللہ زور سے پڑھنے کے قائل ہیں اور ان کے بھی جو ان کے مخالف یعنی آہستہ سے پڑھنے کے قائل ہیں۔“ (۱)

اس کا جماعتی عصبيت سے کوئی تعلق نہیں، اگر امام دارقطنی کے پیش نظر جماعتی عصبيت ہوتی تو وہ اس میں اور سنن میں صرف جہر کی موید حدیثیں ہی شامل کرتے لیکن انھوں نے موید کے ساتھ مخالف حدیثیں بھی درج کر کے درحقیقت انصاف اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے، اس معاملہ میں انھوں نے مصر کے جو شوافع کا مرکز تھا لوگوں کی خواہش اور مرضی کی بھی کوئی پروا نہ کی، جو چاہتے تھے کہ امام صاحب صرف جہر کی موید حدیثیں جمع کریں، مگر امام صاحب نے استقصاء و جامعیت کے پیش نظر ہر قسم کی حدیثیں جمع کیں اور لوگوں کے سوال پر صاف صاف اقرار بھی کر لیا کہ جہر کے متعلق کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں، اسی طرح سنن میں بھی اس نوعیت کی بعض حدیثوں کے ضعف و دہن کی وضاحت کی ہے۔

رہا رجوع کا معاملہ تو وہ خالی از امکان نہیں، کیوں کہ امام صاحب نے جس وقت

یہ رسالہ تالیف کیا تھا، ممکن ہے اس وقت زیر بحث مسئلہ ان کی نگاہ میں منع نہ رہا ہو لیکن بعد میں جب رسالہ کے بارے میں سوالات کئے گئے اور امام صاحب کو اس معاملہ میں زیادہ توجہ سے غور کرنے کا موقع ملا تو اس وقت یہ مسئلہ ان کی نگاہ میں منع ہو گیا، جیسا کہ ان کے جواب سے معلوم ہوتا ہے، اس نتیجے کے بعد ممکن ہے، انھوں نے رجوع بھی کر لیا ہو لیکن اس کی کوئی تصریح موجود نہیں ہے، اس لیے محض امکان و قیاس کی بنیاد پر اس کو تسلیم کرنا محال ہے لیکن رجوع نہ کرنے سے یہ خیال کرنا کہ ان کی رائے ضد اور عصیت پر مبنی ہے صحیح نہیں کیوں کہ امام صاحب اور ان لوگوں کے جو جہری نمازوں میں زور سے بسم اللہ پڑھنے کے قائل ہیں، متعدد دلائل موجود ہیں، ان سے تعرض کرنے کا یہ محل نہیں ہے، فقہی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے، ان دلائل سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف لیکن ان کی گنجائش سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ امام صاحب کے غلو اور بے جا عصیت کا اس واقعہ سے کوئی پتہ نہیں چلتا، ان کا شافعی مذہب کی طرف میلان ضرور تھا لیکن وہ مجتہد فی المذہب تھے، مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

”امام دارقطنی شافعی مذہب کی طرف مائل تھے، مگر وہ مجتہدین اور ائمہ

حدیث و سنت میں تھے، ان کا حال اپنے مابعد کے اکابر محمد شین کی طرح نہیں جو

سوائے چند گئے چنے مسائل کے عموماً تقلید کو لازمی سمجھتے تھے، امام دارقطنی فقہ

واجبتاد اور علم میں لوگوں سے فائق و برتر تھے۔“ (۱)

اعتراف کے دوسرے جز یعنی حنفی مذہب سے تعصب و عناد کے سلسلہ میں یہ کہا

جاتا ہے کہ انھوں نے امام ابو حنیفہؒ پر طعن کیا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے سنن میں امام

صاحب پر حدیث میں ضعف، تفرقہ اور ثقہ راویوں کی مخالفت و عدم متابعت کا الزام لگایا ہے۔

(۱) مقدمہ فتح البیہم شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۰۱ بحوالہ توجیہ النظر۔

بلاشبہ امام دارقطنی کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ کا پایہ فقہ و اجتہاد کی طرح روایت حدیث میں زیادہ بلند نہیں تھا اور انھوں نے سنن میں ان کو ضعیف بھی کہا ہے اور مشہور حدیث (مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَقَرَأَ الْإِمَامَ قِرَاءَةً لَهُ) کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ تمام معتبر وثقہ راویوں نے حضرت جابرؓ کا نام لیے بغیر اس کو مرسل روایت کیا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ نے اس کو مسند بیان کیا ہے اور اس کے سلسلہ اسناد میں حضرت جابرؓ کا بھی ذکر کیا ہے۔ (۱)

اسی طرح دوسری جگہ وہ کہتے ہیں کہ وضو میں حضرت خالد بن علقمہ کے واسطے سے تین دفعہ مسح کرنے کو صرف امام ابوحنیفہؒ نے بیان کیا ہے، جب کہ دوسرے ثقہ راویوں نے خالد بن علقمہ ہی کے واسطے سے اس میں صرف ایک دفعہ مسح کرنے کو بیان کیا ہے۔

اس موقع پر امام دارقطنی نے امام صاحب پر ایک اعتراض اور کیا ہے اور وہ یہ کہ تین دفعہ مسح کرنے کی روایت بیان کرنے کے باوجود وہ ایک ہی دفعہ مسح کرنے کو مسنون سمجھتے ہیں۔ (۲)

لیکن ان سب اعتراضات میں امام دارقطنی منفرذ نہیں ہیں، بعض اور محدثین کا بھی یہی خیال ہے اور وہ بھی امام صاحب کو ضعیف الحدیث سمجھتے تھے اور مذکورہ بالا حدیثوں کے سلسلہ میں انھوں نے بھی امام صاحب پر ثقہ راویوں کی مخالفت کا الزام لگایا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کو ضعیف الحدیث سمجھنا غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے مگر ان غلط فہمیوں کے بعض وجوہ و اسباب بھی تھے جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے، اس لیے محدثین کو ان اسباب کی بنا پر معذرت سمجھنا چاہیے، وہ کسی غلط جذبہ، بد نیتی، مخالفت اور تعصب کی وجہ سے امام صاحب سے سوئے ظن نہیں رکھتے تھے، بلکہ ایک اعتبار سے درحقیقت اس سے ان لوگوں کی صاف گوئی اور حق پسندی کا پتہ چلتا ہے کہ بڑے بڑے ائمہ کا علم و فضل اور زہد و اتقا بھی ان کی حق پسندی میں مانع نہ ہوا اور انھوں نے اس رائے کو جسے وہ صحیح سمجھتے تھے، دیانت داری کے ساتھ ظاہر کر دیا۔

(۱) سنن دارقطنی ج ۱ ص ۱۲۳ (۲) سنن دارقطنی ج ۱ ص ۱۲۳۔

لیکن امام ابوحنیفہؒ کو ضعیف الحدیث قرار دینے والے محدثین بہت تھوڑے ہیں، اکثر ائمہ فن سے ان کی تعریف و توثیق منقول ہے، علامہ ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کو ثقہ قرار دینے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ (۱)

رہیں وہ حدیثیں جن کے سلسلہ میں امام صاحب پر عدم متابعت اور ثقہ راویوں کی مخالفت کا الزام لگایا گیا ہے تو چوں کہ ان کی ثقاہت محدثین کی ایک بڑی جماعت کے نزدیک مسلم ہے، اس لیے ان کا اضافہ مقبول و معتبر ہوگا۔

پہلی حدیث (من كان له امام الخ) کے سلسلہ میں امام صاحب کی جانب سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ اس کو محمد بن منبج نے اپنی مسند اور امام محمد نے مؤطا اور کتاب الآثار میں مسند بیان کیا ہے اور ابن ہمام کا بیان ہے کہ ان کی سندیں صحیحین کے شرائط کے مطابق صحیح ہیں اور محمد بن منبج کی روایت میں سفیان و شریک نے جو صحیحین کے رجال میں ہیں حضرت جابرؓ کا نام لینے اور حدیث کو مسند بیان کرنے میں امام ابوحنیفہؒ کی متابعت کی ہے۔ (۲)

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو حضرت جابرؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم نے بھی روایت کیا ہے اور گویا بعض کے طرق میں ضعف بھی ہے تاہم صحیح اور تعدد و کثرت طرق نے اس کو قوی کر دیا ہے۔ (۳)

تسلیمت مسح کے متعلق بھی امام ابوحنیفہؒ کی زیادتی کو ثقہ کی زیادتی سمجھ کر قبول کیا جائے گا، دوسرے اس حدیث کے بھی شواہد و متابعات موجود ہیں اور ان میں سے بعض کو خود امام دارقطنی نے بھی بیان کیا ہے، اس لیے اس کے بارے میں بھی امام دارقطنی کا اعتراض

(۱) حواشی سنن دارقطنی ج ۱ ص ۲۳ (۲) حاشیہ نصب الرایہ ج ۲ ص ۸۰، حاشیہ معانی الآثار لمحمود ج ۱ ص ۱۲۸ و فیض الباری ج ۲ ص ۷۷، ۷۸، ۷۹ (۳) نصب الرایہ۔

بے معنی معلوم ہوتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ امام ابوحنفیہؒ نے جب خود ہی تین دفعہ سر کا مسح کرنے کی روایت کی ہے تو ان کے نزدیک ایک دفعہ مسح کرنا کیوں مسنون ہے، گو امام دارقطنی کا یہ اعتراض صحیح ہے لیکن کسی چیز کی روایت کر دینے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ خود راوی کا اس کے مطابق عمل اور فتویٰ بھی ہو، امام دارقطنی اور دوسرے محدثین نے کتنی ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جن کے مطابق ان کا عمل نہیں ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ امام دارقطنی کو امام ابوحنفیہؒ سے کوئی عناد اور تعصب نہ تھا، انھوں نے نہایت فراخ دلی سے حنفی مذہب کے ایک اہم رکن امام محمد کو ثقہ محدثین میں شمار کیا ہے، (۱) البتہ بعض اور اکابر محدثین کی طرح وہ امام صاحب کا پایہ حدیث میں زیادہ بلند نہیں سمجھتے تھے اور اپنی حق پسندی کی وجہ سے انھوں نے امام صاحب کی عظمت و جلالت کے باوجود اپنی اس رائے کو جسے وہ صحیح سمجھتے تھے، بیان بھی کر دیا، یہ الگ بات ہے کہ ان کی رائے غلط فہمی پر مبنی ہے لیکن اس میں وہ معذور تھے اور ان کی عظمتِ شان سے اس قسم کا تعصب بعید ہے جو بیان کیا جاتا ہے۔

تصنیفات: امام دارقطنی نے بے شمار کتابیں یادگار چھوڑیں جو سب مفید، بلند پایہ اور حسن تالیف کا نمونہ ہیں (۲) ان میں سے اکثر حدیث، اصول حدیث اور رجال کے موضوع پر لکھی گئی تھیں، مگر اب زیادہ تر نایاب ہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام اور بعض کے بارے میں مختصر معلومات تحریر کئے جاتے ہیں۔

۱- کتاب الریحیۃ (پانچ جڑوں میں)، ۲- کتاب الاستجاد، ۳- کتاب معرفۃ مذاہب الفقہاء (۳) - ۴- غریب اللغۃ: محمد بن طاہر مقدسی المعروف بابن القیسرانی (م ۵۷۰ھ)

(۱) امام ابن ماجہ اور علم حدیث از عبد الرشید نعمانی بحوالہ غرائب مالک دارقطنی (۲) تذکرۃ المحاظج ۳

ص ۲۰۰ والبدایہ ج ۱ ص ۳۱۷ (۳) کشف الظنون ج ۲۔

نے اس کے اطراف لکھے تھے۔ (۱)

۵- اختلاف الموطآت: اس میں موطا امام مالکؒ کی روایتوں اور اس کے مختلف

سخنوں پر بحث کی گئی ہے۔ (۲)

۶- غرائب مالک: اس میں امام مالکؒ کی ان غریب حدیثوں کا ذکر ہے جو موطا

میں شامل نہیں ہیں ممکن ہے یہ وہی کتاب ہو جو امام دارقطنی کی جانب کتاب الغرائب کے نام سے منسوب ہے، ابن عبد البہادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضخیم کتاب تھی۔ (۳)

۷- الاربعین: نام سے ظاہر ہے کہ اس میں چہل حدیثیں درج ہوں گی، یہ اس

فن کی قدیم کتابوں میں ہے۔ (۴)

۸- کتاب الضعفاء: یہ دراصل امام دارقطنی کے ان حواشی پر مشتمل ہے جو علامہ

ابن حبان کی کتاب الضعفاء پر انھوں نے لکھے تھے، (۵) اس میں ضعیف راویوں کا حال اور ان کی معرفت کا ذکر ہے، رجال کی اکثر کتابوں میں امام دارقطنی کے جو اقوال درج ہیں وہ غالباً اسی سے ماخوذ ہوں گے، اس لحاظ سے یہ اہم کتاب ہے۔

۹- اسماء المدلسین: اس موضوع پر امام حسین بن علی کراہیسی (م ۲۳۵ھ)

اور امام نسائی (م ۳۰۳ھ) نے پہلے کتابیں لکھی تھیں، یہ غالباً اس فن کی تیسری مشہور کتاب ہے۔ (۶)

۱۰- اسئلة الحاكم: اس میں ان سوالات کا جواب دیا گیا ہے جو غالباً حاکم

صاحب مستدرک نے دارقطنی سے حدیث و رجال وغیرہ کے بارے میں کئے ہوں گے، زین الدین قاسم بن قطلوبغا حنفی (م ۸۷۷ھ) نے اس کو جمع کیا تھا۔ (۷)

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۵۸ (۲) حیات امام مالک مولانا سید سلیمان ندوی ص ۱۰۴ (۳) الرسالة

المسطر فہ ص ۹۵، ۹۴ (۴) کشف الظنون ج ۸ ص ۷۸ (۵) تدریب الراوی ص ۲۶۱، والرسالة المستطرف

ص ۱۱۸، ۱۱۹ (۶) کشف الظنون ج ۸ ص ۹۸ (۷) کشف الظنون ج ۸ ص ۱۰۰



۱۱- باب القضا بالیسین مع الشاہد: حدیث کی بعض کتابوں میں صرف ایک ہی باب کی روایتیں شامل ہوتی ہیں، یہ کتاب اسی قسم کی ہے اور اس میں صرف ایک ہی باب کی حدیثیں درج ہیں۔ (۱)

۱۲- کتاب الحجر: یہ بھی اسی نوعیت کی کتاب ہے، اس میں نماز میں بسم اللہ کو زور اور آہستہ سے پڑھنے کے بارے میں حدیثیں اور آثار درج ہیں۔ (۲)

۱۳- رسالہ قرأت: فن قرأت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ ہے، اس کے شروع میں اس فن کے اصول و قاعدے اور پھر فنی بحثیں تحریر کی گئی ہیں، اس کی ترتیب و تہویب اور طریقہ تالیف کو اتنا پسند کیا گیا کہ بعد کے مولفین نے اسی ڈھنگ پر اپنی کتابیں مرتب کیں، ابن الجزری طبقات القراء میں لکھتے ہیں کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ (۳)

۱۴- الرباعیات: اس میں مشہور محدث ابو بکر محمد بن عبداللہ بن ابراہیم المعروف بزار (م ۳۵۴ھ) کی تصنیف رباعیات کی جو غیلانیات کے نام سے مشہور ہے تخریج کی گئی ہے اور امام بخاری کی رباعیات کو علاحدہ ایک رسالہ میں مرتب کیا گیا ہے، یہ ایک زمانہ میں بہت متداول تھی۔ (۴)

۱۵- کتاب المجتبی من السنن الماثورہ: یہ غالباً امام دارقطنی کی شہرہ آفاق سنن کا انتخاب ہے، کتب خانہ خدیوہ مصر میں اس کی دوسری جلد کا قلمی نسخہ موجود ہے جو کتاب الزکوٰۃ سے آخر تک کے ابواب پر مشتمل ہے، کاتب کا نام عبداللہ بن محمد بن حسن موصلی المعروف بابن ترکیہ اور سنہ کتابت ۶۳۸ھ ہے۔ (۵)

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۵۳، الرسالۃ المسطر ذہ ص ۴۲ (۲) سنن دارقطنی ص ۱۱۷ (۳) تاریخ بغداد

ج ۱۲ ص ۲۳، ۳۵، ۳۴ وحاشیہ العمر ج ۳ ص ۲۹ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۵۳۳ (۵) الاعلام ج ۲ ص ۶۲۳

دفہرست کتب خانہ خدیوہ مصر ج ۱ ص ۳۹۸۔

رتذکرۃ الحمد شین ..... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

544

۱۶- کتاب الاخوان (۱): اس فن میں امام دارقطنی سے پہلے اور ان کے بعد متعدد کتابتیں لکھی گئیں، اس کو اہم اور مفید کتابوں میں خیال کیا جاتا ہے۔

۱۷- کتاب الافراد (۲): یہ کتاب بڑی جامع اور سوا جزا پر مشتمل ہے، ابو الفضل بن طاہر نے اس کے اطراف لکھے تھے۔ (۳)

۱۸- کتاب الصحیف (۴): اس فن میں یہ ایک مفید اور جامع کتاب ہے، علامہ سیوطی کا بیان ہے:

|                            |                                         |
|----------------------------|-----------------------------------------|
| اور الدار قطنی فی کتاب     | امام دارقطنی نے کتاب الصحیف میں ان      |
| التصحیف کل تصحیف وقع       | سب تصحیفات کا ذکر کیا ہے جو علما کو پیش |
| للعلماء حتی فی القرآن۔ (۵) | آئی ہیں، یہاں تک کہ حدیث کے علاوہ       |
|                            | قرآن کی تصحیف بھی بیان کی ہے۔           |

(۱) اس فن میں علی بن مدینی، امام نسائی اور ابوالعباس سراج وغیرہ متقدمین کی کتابیں اہم ہیں، اس کو ضبط کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دو شخصوں کی ولدیت میں اشتراک کی وجہ سے ان کو یعنی بھائی نہ خیال کیا جائے (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۵۵ و تدریب الراوی ص ۲۱۸) (۲) یہ بڑا اہم اور مشکل موضوع ہے، اس لیے اس میں ماہر محدثین ہی نے کتابیں لکھی ہیں، ارباب فن کے نزدیک فرد کی دو قسمیں ہیں، مطلق اور نسبی، اول الذکر میں ایک شخص تمام رواۃ سے تفرد کرتا ہے، مؤخر الذکر میں کسی خاص پہلو اور حیثیت سے تفرد ہوتا ہے جیسے کسی روایت میں کسی خاص مقام کے راویوں کا تفرد (مقدمہ ابن صلاح ص ۴۱ و ۴۲) (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ و الرسالة المسطر ذ ص ۹۵ (۴) تصحیف و خطا سے محفوظ رہنا بہت مشکل ہے امام احمد فرماتے ہیں کہ اس سے کون بچ سکتا ہے، یہ اسناد و متون دونوں میں ہوتی ہے، اسناد کی مثال یہ ہے کہ یحییٰ بن معین نے عوام بن مرجم (بالرؤا الجیم) کو مزاحم کر دیا اور متن کی مثال یہ ہے کہ ابن لمیعہ نے ان نبی صلی اللہ علیہ وسلم حجر فی المسجد میں حجر کو اجم کر دیا (تدریب الراوی ص ۱۹۶) (۵) تدریب الراوی ص ۱۹۶۔

## ۱۹- کتاب المؤلف والمختلف (۱): اس فن میں ابن ماکولا کی کتاب

الاکمال زیادہ اہم اور مشہور ہے تاہم دارقطنی کی کتاب بھی جامع اور پراز معلومات ہے، سیوطی کا خیال ہے کہ اس موضوع پر پہلی کتاب دارقطنی کے شاگرد عبدالغنی بن سعید نے لکھی اور امام دارقطنی کی کتاب اس کے بعد لکھی گئی لیکن نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں کہ ”ابو عبداللہ محمد بن علی کا بیان ہے کہ عبدالغنی نے المؤلف والمختلف لکھنے کے بعد جب اس کو امام دارقطنی کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے عبدالغنی سے پڑھنے کے لیے کہا، عبدالغنی نے کہا ”میں اسے کیا پڑھوں، میں نے تو اس کو آپ ہی سے استفادہ کر کے لکھا ہے۔“ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالغنی کی تصنیف درحقیقت امام دارقطنی کے اقادات پر مشتمل ہے، اس لحاظ سے گویا اس فن میں تقدم واولیت کا شرف انہی کو ہے، امام دارقطنی کی کتاب کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے اکثر کی اساس و بنیاد اسی پر ہے، علاوہ ازیں اس کے مختلف ذیول و استدراک بھی لکھے گئے ہیں (۲)

## ۲۰- کتاب العلل (۳): یہ کتاب اس موضوع پر متقدمین کی کتابوں کا نچوڑ

اور بڑی جامع ہے، ابو عبداللہ حمید اندلسی کا بیان ہے کہ فن حدیث کی تین اہم چیزوں میں ایک العلل بھی ہے اور اس میں سب سے عمدہ کتاب امام دارقطنی کی ہے، (۴) ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ”اس میں صحیح و غلط، متصل، مرسل اور منقطع و معطل وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے۔“ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علل کے طرق کی کثرت و تعدد کو جمع کیا

(۱) اگر راویوں کے نام تحریر و کتاب میں یکساں اور ہم شکل ہوں لیکن تلفظ و نطق میں مختلف ہوں تو اسے اصطلاح میں مؤتلف و مختلف کہا جاتا ہے (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۷۲) (۲) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۷۲ (۳) معطل ان مسند حدیثوں کو کہا جاتا ہے جن کے متن یا اسناد میں کوئی ایسی پوشیدہ علت اور مخفی عیب ہوتا ہے جس کی صحت باسانی نہ ہو سکے تا وقتیکہ تمام سندوں اور صحیح متن کا ٹھیک طور پر پتہ نہ ہو (تدریب راوی ص ۸۹) (۴) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۰۔

گیا ہے، یہ مسانید کی ترتیب پر ہے، امام دارقطنی نے اس کا اظہار کیا تھا اور ان کے شاگرد ابو بکر برقانی نے اس کو جمع و ترتیب دیا تھا۔ (۱)

حافظ ابن حجر کے ہاتھ کا لکھا ہوا، اس کا ایک قلمی نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے (۲) اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی اس کا مخطوطہ ہے، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے، (۳) ہر جلد کے متعلق علاحدہ علاحدہ مندرجہ ذیل تعارفی نوٹ درج ہیں:

**المجلد الثانی:** اس میں مسند احادیث کی خامیوں اور نقائص کو بتایا گیا ہے، یہ حدیثیں اکابر صحابہ یعنی حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ، طلحہ، زبیر، عبدالرحمن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل اور حضرت ابو ذر (رضوان اللہ علیہم اجمعین) وغیرہ سے منسوب ہیں اور تھوڑی حدیثیں جو حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کردہ ہیں ان میں بھی کچھ نقائص وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ قلمی نسخہ بہت نایاب ہے اور کسی کتب خانہ کی فہرست میں نہیں دیکھا گیا، خط نسخ میں خوش خط لکھا ہوا ہے، اس پر کوئی تاریخ وغیرہ نہیں ہے مگر آٹھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

**المجلد الثالث:** یہ علل الحدیث کی تیسری جلد ہے، باقی ماندہ اسناد حدیث جو حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہیں، ان کی خامیوں اور نقائص پر بحث کی گئی ہے، ۱۳۰۹ھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔

**المجلد الخامس:** کتاب علل الحدیث کا یہ آخری حصہ ہے، اس میں ان مسند حدیثوں پر تنقید کی گئی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اصحاب و صحابیات سے مروی ہیں، کاتب نے اس نسخہ کے آخر میں تحریر کیا ہے کہ یہ نسخہ اس نے ۱۳۰۹ھ کے ایک مکتوبہ نسخے سے نقل کیا ہے، مگر اپنا نام نہیں لکھا ہے، یہ نسخہ اور اس کے اور سب حصے جن کا ذکر ہو چکا ہے،

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۳۱۷ والنسخہ ج ۷ ص ۸۳ و تدریب الراوی ص ۸۸ و ۸۹ و ۹۱ و رسالہ مطرفہ

ص ۱۲۲ (۲) مقدمہ نسخۃ الاحوذی ص ۱۶۶ (۳) فہرست خدا بخش خان لائبریری ص ۵۵۔

ایک ہی کاتب کے تحریر کردہ معلوم ہوتے ہیں، (۱) تیسری اور پانچویں جلدوں کے مخطوطے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں بھی پائے جاتے ہیں، تیسری جلد ۱۳۱ھ کی لکھی ہوئی ہے، (۲) اسی طرح مکتبہ سندھ میں بھی علی کا نسخہ ہے۔

۲۱- کتاب الاختیاء: اس میں جو دو سخاوت کی فضیلت اور اسخیا کے محامد و محاسن کے متعلق حدیثیں اور بعض واقعات سند بیان کئے گئے ہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ ۶۰۰ھ کا نسخہ میں لکھا ہوا خدا بخش لاہوری میں موجود تھا، (۳) ۱۹۳۴ء میں مولانا سید وجاہت حسین صاحب استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ نے اس کو تصحیح و مقابلہ کے بعد حواشی و مقدمہ کے ساتھ ایشیا نیک سوسائٹی بنگال سے شائع کیا ہے، مقدمہ میں امام دارقطنی کے حالات و کمالات اور اس کتاب کے بارے میں مفید معلومات لکھے گئے ہیں۔

۲۲ و ۲۳- کتاب الاثرامات والتعجیب: صحیح کی اہمیت و مقبولیت مسلم ہے لیکن بعض حیثیتوں سے ان پر محدثین کی ایک جماعت نے کچھ ایرادات بھی کئے ہیں، ان لوگوں میں امام دارقطنی کا نام زیادہ ممتاز ہے، ان کی علی حدیث سے گہری واقفیت اور وقت نظر کا اہل فن کو اعتراف ہے، ان کے اعتراضات اور شکوک و طرح کے ہیں، پہلے کو انھوں نے کتاب الاثرامات میں ذکر کیا ہے، اس کے متعلق وہ خود تحریر فرماتے ہیں:

|                          |                                    |
|--------------------------|------------------------------------|
| مما اخرجہ البخاری و مسلم | امام بخاری و مسلم دونوں یا ان میں  |
| او احدہما من حدیث بعض    | سے ایک بزرگ نے کسی تابعی کی        |
| التابعین و ترکا من حدیثہ | ایک حدیث کی تخریج کی ہے اور اسی    |
| شبیہا بہ ولم یخرجہ او من | تابعی کی دوسری حدیث کو چھوڑ دیا یا |
| حدیث نظیر لہ من التابعین | بعض ایسی حدیثوں کی تخریج نہیں کی   |

(۱) نوادر خدا بخش لاہوری ج ۱ ص ۹۳-۹۵۔ (۲) فہرست کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ج ۱ ص ۶۶

و ۶۴۔ (۳) فہرست کتب خانہ خدا بخش لاہوری جلد اول ص ۳۹۔

ہے جو ثقہ تابعین سے مروی تھیں، حالانکہ ان حضرات کے اصول و شرائط کے مطابق ان کی تخریج لازمی تھی، انشاء اللہ آگے ہم اس پر گفتگو کریں گے۔

الثقات يلزم اخراجہ علی شرطہما ومذہبہما فیما نذکرہ انشاء اللہ۔ (۱)

علامہ نووی لکھتے ہیں:

امام دارقطنی نے امام بخاری و امام مسلم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے بہت سی ایسی حدیثیں چھوڑ دی ہیں جن کے راویوں کی سندوں سے خود انھوں نے صحیحین میں روایت کی ہے، امام دارقطنی وغیرہ کا بیان ہے کہ ان حضرات نے ایسی حدیثیں بھی نظر انداز کی ہیں جن کو صحابہ کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہے اور جو بعد میں صحیح طریقوں سے بیان کی گئی ہیں اور ان کے راویوں میں کسی قسم کا کوئی طعن بھی نہیں پایا جاتا حالانکہ ان لوگوں کے اصول و مذہب کے مطابق ان کی

الزم الامام الحافظ ابوالحسن علی بن عمر الدارقطنی رحمہ اللہ وغیرہ البخاری و مسلم رضی اللہ عنہما اخراج احادیث ترکا اخراجہا مع ان اسانیدھا اسانید قد اخرج لرواتها فی صحیحہما بها و ذکر الدار قطنی وغیرہ ان جماعة من الصحابة رضی اللہ عنہم روا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و رویت احادیثہم من وجوہ محاح لامطعن فی ناقلیہا ولم

(۱) دیباچہ کتاب الایمانات۔

يخرجها من احاديثهم شيئاً  
فليلز مهما اخراجها على  
مذهبيهما. (۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام دارقطنی نے اپنے اس رسالہ میں ان صحیح حدیثوں کو جمع کیا ہے جو صحیحین کی شرطوں کے مطابق ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں ہیں، اس حیثیت سے اس کی وہی نوعیت ہے جو حاکم کی المسند رک کی ہے۔ دوسرے رسالہ التبع میں امام بخاری و مسلم پر نقد و تعقب کیا گیا ہے، صاحب کشف الظنون کا بیان ہے:

وهو ما اخرج فسى  
الصحيحين وله علة. (۲)  
یہ رسالہ صحیحین کی ان حدیثوں کا مجموعہ ہے جن کے اندر علت پائی جاتی ہے۔

یعنی اس میں امام بخاری و مسلم کے اوہام و علل پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، حافظ ابن حجر نے ان حدیثوں کی جن کو امام دارقطنی نے موضوع بحث بنایا ہے، تعداد ایک سو دس بتائی ہے، ان میں بیس حدیثیں متفق علیہ ہیں اور اٹھتر صرف صحیح بخاری کی ہیں۔

عام طور سے علمائے فن نے امام دارقطنی کے اعتراضات کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ میں کتاب التبع کی ہر ہر حدیث پر مفصل اور محققانہ بحث کر کے امام دارقطنی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے، امام نووی نے بھی شرح مسلم اور شرح بخاری کے مقدمہ میں ان شبہات کا ازالہ کیا ہے جن کو امام دارقطنی نے تحریر کیا ہے، اسی طرح علامہ عینی اور قسطلانی کی شروع بخاری میں بھی دارقطنی کے الزامات کا جواب دیا گیا ہے، ان محققین کے جوابات کا ما حاصل یہ ہے کہ امام بخاری و مسلم کی کتابوں کو صحیح حدیثوں کا مجموعہ اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کی سب حدیثیں صحیح اور منہج ہیں، باقی جو صحیح

(۱) مقدمہ مسلم نووی ص ۲۳ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۸۔

روایتیں ان میں شامل نہیں ہیں، اس کی وجہ سے ان پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا کیوں کہ ان دونوں کتابوں کا مقصد تمام صحیح حدیثوں کا حصر نہیں ہے۔

لیکن یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ ان حضرات نے امام دارقطنی کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ تمام تر درست ہی ہے اور ان کے سارے اعتراضات بالکل ہی بے معنی ہیں، کیوں کہ جواب میں بعض جگہ تکلف سے بھی کام لیا گیا ہے، مولانا انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

”امام دارقطنی نے سو سے زیادہ مقامات میں امام بخاری پر تعاقب کیا ہے لیکن ان کا نقد و کلام محض اسانید کے وصل و ارسال تک محدود ہے، سوائے ایک جگہ یعنی (اذا جاء احدکم والامام یخطب فلیصل رکعتین ولیتجوز فیہما) کے، یہاں انھوں نے حدیث کے متن پر بھی کلام کیا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ دارقطنی محدثین کے مرتب قاعدوں پر چلنے کے عادی ہیں اور اسی حیثیت سے وہ اعتراض کرتے ہیں لیکن امام بخاری کی شان اس سے بہت بلند ہے، وہ اپنی بصیرت، اجتہاد اور وجدان پر اعتماد کرتے ہیں، قاعدے تو نادانانہ اور عوام کے لئے بنائے گئے ہیں تاکہ غیر محدود و محدود کو محدود کیا جاسکے اور امام بخاری و مسلم کا مرتبہ سب سے بڑھ کر ہے۔“ (۱)

امام دارقطنی کی ایرادات کے بے نتیجہ اور بلا وزن نہ ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کی بنا پر صحیحین کی اس قسم کی حدیثوں کا قطعی الصحت ہونا محتمل قرار دیا گیا ہے، چنانچہ علامہ ابن صلاح لکھتے ہیں:

|                          |                                         |
|--------------------------|-----------------------------------------|
| القول بان ما انفرد به    | امام بخاری یا امام مسلم نے تنہا جن      |
| البخاری او مسلم مندرج فی | حدیثوں کو بیان کیا ہے وہ بھی قطعی الصحت |

(۱) مقدمہ فیض الباری ص ۵۷۔



قبیل مایقطع بصحته لتلقى  
 الامة كل واحد من کتابیہما  
 بالقبول علی الوجه الذی  
 فصلناه عن حالہما فیما  
 سبق سوی احرف یسیرة  
 تکلم فیہا بعض اهل النقد  
 من الحفاظ کالدار قطنی و  
 غیرہ وہی معروفة عند اهل

حدیثوں میں شامل ہیں کیوں کہ  
 امت میں ان دونوں کتابوں کو تلقی  
 بالقبول حاصل ہے جیسا کہ پہلے اس کی  
 تفصیل گزر چکی ہے، بجز ان چند  
 حدیثوں کے جن پر نقادان فن اور ائمہ  
 حدیث جیسے دارقطنی وغیرہ نے کلام کیا  
 ہے اور یہ حدیثیں ماہرین فن کے  
 نزدیک مشہور و معروف ہیں۔

هذا الشأن والله اعلم۔ (۱)

درحقیقت امام دارقطنی کے اعتراضات کی وہی حیثیت ہے جو حاکم صاحب  
 مستدرک کے استدرکات کی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۴۵ اور علامہ ابن صلاح کے اس بیان کے پہلے حصہ یعنی بخاری یا مسلم کی  
 حدیثوں کا قطعی الصحیح ہونا جمہور کے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہے، چنانچہ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ ”جمہور  
 علمائے محققین نے ابن صلاح کے قول سے اختلاف کیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اگر حدیث متواتر نہ ہو تو  
 اس سے قطعیت کے بجائے صرف ظن کا فائدہ حاصل ہوگا۔“ البتہ حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن حجر اور مولانا  
 انور شاہ کشمیری علامہ ابن صلاح کے ہمنوا ہیں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

واختلفوا فی ان احادیث  
 الصحیحین جعل تفید القطع ام  
 لا فالجمہور الی انہا لتفید  
 القطع وذهب الحافظ الی انہا

صحیحین کی حدیثوں کے مفید قطعی ہونے  
 میں اختلاف ہے جمہور ان کو مفید قطعی نہیں  
 مانتے لیکن حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان  
 سے قطعیت کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، خفیہ  
 (بقیہ اگلے صفحہ پر)

وہ ایک حیثیت سے صحیح اور دوسری حیثیت سے غلط ہیں، (۱) صحیح اس حیثیت سے ہیں کہ امام دارقطنی کی حدیثیں شیخین کے رجال اور شرائط کے مطابق ہیں لیکن غلط اس بنا پر ہیں کہ شیخین اسی حدیث کو ذکر کرتے ہیں جس کی صحت پر بحث مباحثے کے بعد ان کے شیوخ کا اجماع ہو گیا ہے اور مشائخ و ائمہ حدیث نے اس کی صحت تسلیم کر لی ہے، پس صحیحین کی خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف قاعدہ اور اصولوں سے حدیث کی صحت تسلیم نہیں کرتے بلکہ ہر ہر حدیث کے وصل و انقطاع، رفع و ارسال، شذوذ و نکارت وغیرہ پر مستقل طور سے بحث کر کے صحت کا فیصلہ صادر کرتے ہیں اور انہی حدیثوں کو صحیحین میں نقل کرتے ہیں جن کی صحت پر پہلے کے محدثین نے تحقیقات کے بعد اتفاق کر لیا ہے لیکن امام دارقطنی وغیرہ محض اصول و قواعد ہی کی بنا پر حدیث کو صحیح قرار دے دیتے ہیں۔

امام دارقطنی کے اعتراضات اہم ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی دقت نظر، کثرت تدبر اور اخلاص و نیک نیتی کا ثبوت ضرور ہیں، امام بخاری کے ایک بڑے مداح مولانا عبدالسلام (حاشیہ گزشتہ صفحہ کا بقیہ)

میں امام سرخسی اور حنابلہ میں حافظ ابن تیمیہ نیز شیخ عمرو بن صلاح کارحمان اسی جانب ہے، ان لوگوں کی تعداد اگرچہ کم ہے لیکن یہی رائے صحیح ہے..... پھر حافظ ابن حجر نے تصریح کی ہے کہ یہ مفید قطعی نظری ہوتی ہیں۔

تفید القطع والیہ جنح شمس  
الاتمة السرخسی من الحنفیة  
والحافظ ابن تیمیة من الحنابلة  
والشیخ عمرو بن صلاح وهؤلاء  
وان كانوا اقل عددا الا ان رأيهم  
هو الراي ..... ثم صرح الحافظ  
رضی اللہ عنہ ان افادتها القطع  
نظری (مقدمہ فیض الباری ص ۳۵)

حاشیہ صفحہ ۱۰۶ (۱) حجة الله بالقرآن ۱۰۶-۱۰۷

مبارک پوری لکھتے ہیں:

”امام دارقطنی بڑے پایہ کے ناقد تسلیم کئے گئے ہیں، انھوں نے صحیح کو بلا تقلید احد حرفاً و جانچا اور بلا تردد دل کھول کر لیکن دیانت سے جو شکوک ان کے ذہن میں آئے سب کو رسالہ کی صورت میں جمع کیا، خواہ وہ شکوک متن سے لگاؤ رکھتے ہوں، سلسلہ اسناد سے یا راویوں سے۔“ (۱)

امام دارقطنی کے یہ دونوں رسالے کیاب تھے اور عموماً ان کو ایک ہی کتاب خیال کیا جاتا ہے، حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ اور بہار شریف کے مکتبہ علم و حکمت میں ان کے قلمی نسخے موجود ہیں، مولانا ابوسلمہ شفیق احمد بہاری استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ کی مہربانی سے بہار شریف کے نسخہ کی نقل دارالمصنفین کے کتب خانہ میں بھی ہے، یہ خود مولانا کے قلم سے شعبان المعظم ۱۳۵۶ھ میں نقل ہوا ہے لیکن اصل نسخہ کا سنہ تحریر معلوم نہیں ہو سکا، پہلا رسالہ بڑی تقطیع کے آٹھ اور دوسرا ۳۸۳/۳۸۴ صفحے پر مشتمل ہے، آخر میں ۱۳ صفحے کا ایک اور رسالہ بھی ان کے ساتھ شامل ہے، یہ امام دارقطنی کے معاصر ابوسعود محمد بن ابراہیم بن عبید اللہ دمشقی (۲۰۱ھ) کی تالیف ہے، انھوں نے امام دارقطنی کے بعض تعقیبات کو صحیح تسلیم کیا ہے لیکن اکثر کو غلط اور بعض کو غور و فکر کی کمی کا نتیجہ قرار دیا ہے، ایک حدیث کے بارے میں امام دارقطنی نے لکھا ہے کہ اس کی امام مسلم نے تخریج کی ہے لیکن دمشقی کا بیان ہے کہ ان کی امام مسلم نے سرے سے تخریج ہی نہیں کی ہے، (۲) تلاش کے بعد دمشقی کا بیان صحیح معلوم ہوا۔

۲۳- سنن دارقطنی: یہ امام دارقطنی کی سب سے اہم اور شہرہ آفاق تصنیف

ہے، ذیل میں اس کی اہمیت اور خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سنن کی اہمیت اور کتب حدیث میں اس کا درجہ: صحاح ستہ کے بعد جو کتابیں شہرت و قبول اور وثوق و اعتبار کے لحاظ سے ممتاز اور اہم مانی جاتی ہیں ان میں سنن دارقطنی بھی

(۱) سیرت البخاری ص ۹۶ (۲) رسالہ دمشقی قلمی ص ۵۵۔

ہے۔ بعض اہل علم نے اس کو تقریباً صحاح ستہ ہی کے ہم پایہ قرار دیا ہے، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

”فن حدیث میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں مگر علمائے سلف و خلف کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ صحیح اور معتبر کتاب صحیح بخاری ہے، پھر صحیح مسلم اور مؤطا امام مالک ہیں، ان کے بعد امام ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارقطنی کی کتابوں اور مشہور مسانید کا درجہ ہے۔“ (۱)

صحاح ستہ میں تمام صحیح حدیثوں کا حصر و استقصا نہیں ہے، ان کے علاوہ جو کتابیں صحیح اور مستند حدیثوں کے لیے مشہور خیال کی جاتی ہیں ان میں سنن دارقطنی کا نام سرفہرست ہے، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں:

”صحیحین پر وہ صحیح اضافے مقبول ہیں جن کو امام ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن خزیمہ اور دارقطنی وغیرہ میں سے کسی نے اپنی مشہور و معتبر کتاب میں بیان کیا ہو اور اس کی صحت کی تصریح کی ہو۔“ (۲)

یہی خیال علامہ نووی اور سیوطی کا بھی ہے، (۳) سیوطی اور امام بغوی نے اپنی کتابوں میں صحاح اور مستند کتب حدیث کی طرح سنن دارقطنی کی حدیثوں کی بھی تخریج کی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ سنن دارقطنی کا درجہ صحاح سے کمتر ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے اس کو حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں شمار کیا ہے، (۴) البتہ اس طبقہ کی کتابوں میں اس کو ایک گونہ خصوصیت ضرور ہے، چنانچہ ابن صلاح، نووی اور سیوطی نے مصنفین صحاح کے بعد کے جن سات نامور محدثین کی تصنیفات کو عمدہ اور زیادہ نفع بخش بتایا ہے ان سب میں امام دارقطنی کا نام سرفہرست گنایا ہے، (۵) دراصل حدیثوں کی جمع

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۴۲۶ (۲) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱ (۳) تدریب الراوی ص ۳۰ و ۳۱ (۴) بحالہ نافع مع فوائد جامعہ ص ۵ (۵) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲ و تدریب الراوی ص ۲۶۰۔

و ترتیب کا زیادہ اہم اور مبارک زمانہ تیسری صدی ہجری کا ہے، اس عہد میں روایات کی چھان بین اور راویوں کے نقد و تحقیق کا جو اعلیٰ اور بلند معیار قائم کیا گیا، اس کی مثال بعد کے دور میں نہیں ملتی لیکن تیسری صدی ہجری کا یہ امتیاز مجموعی اعتبار سے ہے کیوں کہ اس کے بعد بھی حدیث کے ایسے مجموعے تیار کئے گئے جو صحاح ستہ سے کمتر ہونے کے باوجود اس دور کی دوسری کتابوں کے برابر یا ان سے بڑھ کر ہیں، سنن دارقطنی چوتھی صدی ہجری کی ایسی ہی اہم اور مشہور کتاب ہے جو بعض حیثیتوں سے صحاح کے بعد حدیث کی سب سے اہم کتاب ہے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں ”دارقطنی کی یہ مشہور کتاب اس فن کی بہترین کتابوں میں ہے۔“ (۱)

خصوصیات: سنن کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱- امام دارقطنی کو کثرت و تعدد طرق میں بڑا کمال حاصل تھا، سنن میں اسانید و طرق کا انہوں نے استقصا کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ امام صاحب نے سنن کے شروع میں قلعین والی حدیث کے طرق و اسانید میں مبالغہ سے کام لیا ہے، چنانچہ اس کی چون سنندیس بیان کی ہیں، اس سے ان کی قوت و حفظ اور وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔ (۲)

اسی طرح دباغ مینہ کے سلسلے میں ستائیس<sup>۲</sup> اور ماہ بحر کے متعلق سولہ<sup>۱</sup> سندوں اور طرق سے حدیث بیان کی ہے۔ (۳)

۲- وہ فن جرح و تعدیل کے امام تھے، علل اور رجال حدیث پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، اس لیے سنن نقد و جرح کے اقوال کا عمدہ اور مفید ذخیرہ ہے، امام دارقطنی نے حدیثوں کے اکثر طرق و اسانید بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر مفصل کلام کر کے ان کی قوت و ضعف کا فیصلہ، حدیث کے درجہ و مرتبہ کی تعیین، اس کے صحیح، مرفوع و مسند یا ضعیف، سقیم، موقوف، مرسل، غریب اور منکر ہونے کی تصریح اور ایک قسم کی متعدد حدیثوں میں مرجح

(۱) البدایہ و النہایہ ج ۱ ص ۳۱۷ (۲) بستان المحدثین ص ۴۵ (۳) سنن دارقطنی ص ۱۵ تا ۱۷ و ۱۳ و ۱۴۔

اور اصح مافی الباب کی نشاندہی کی ہے، راویوں اور حدیثوں کے بیان کے فرق و اختلاف، کمی بیشی، متابعت و عدم متابعت اور راوی کے متروک، مجہول، منکر، غیر ثابت، واضح، کذاب، سی الحفظ، مضطرب الحدیث اور ناقابل حجت ہونے یا ثقہ و ثابت، قوی و حجت اور عادل و ضابط ہونے کی تصریح، ان کے تفرد، دوسرے سے عدم ملاقات و عدم سماع، شک، اضطراب، اختلاف اور حدیث کے متن یا سند میں وہم و خطا پر مفصل کلام کیا ہے اور اس بارے میں اہل علم اور ارباب فن کے اقوال بھی بیان کئے ہیں، اس طرح سنن ترمذی کی طرح اس سے بھی حدیث کا صحیح، حسن اور ضعیف ہونا معلوم ہو جاتا ہے، علامہ ابن صلاح نے اس کی اس خصوصیت کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

ونص الدارقطنی فی سننہ امام دارقطنی نے سنن میں اکثر  
 علی کثیر من ذالک. (۱) حدیثوں کے حسن یا ضعیف ہونے کو  
 واضح کر دیا ہے

۳- امام دارقطنی فقہ و خلاف کے ماہر تھے، اس لیے اس کتاب سے فقہی آراء و مذاہب اور اجتہادی مسائل بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔

۴- راوی کے نام و کنیت، وطن و مسکن اور بعض مشکل و غریب الفاظ کی مختصر وضاحت اور تفسیری بحثیں بھی کی گئی ہیں۔

۵- روایت کے حسن و قبح کے ضمن میں بعض واقعات اور تاریخی حالات بھی زیر بحث آگئے ہیں، مثلاً ایک جگہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے لیلۃ الجن میں شریک نہ ہونے کا ذکر ہے۔ (۲)

۶- سنن دارقطنی چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر کی تصنیف ہے، اس لیے اس کی سب سے اعلیٰ اور عمدہ سند خماسی ہے۔ (۳)

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۸ (۲) سنن دارقطنی ص ۲۸ (۳) بستان الحمدین ص ۳۵۔

سنن کے نسخے: امام دارقطنی سے جن لوگوں نے سنن کی روایت کی تھی ان کے نام یہ ہیں:

- ۱- ابو بکر محمد بن عبد الملک بن بشران، ۲- ابو طاہر محمد بن احمد بن محمد بن عبد الرحیم کاتب، ۳- ابو منصور محمد بن محمد توفانی، ۴- ابو بکر محمد بن احمد بن غالب برقانی (م ۳۲۵ھ)، ۵- ابو طیب طاہر بن عبد اللہ بن طاہر طبری (م ۳۴۵ھ)، ۶- شریف ابو الحسن محمد بن علی بن عبد اللہ بن عبد الصمد بن مہدی باللہ (۱) (م ۳۶۵ھ)

اس طرح سنن کے چھ نسخے تھے مگر اول الذکر تین اشخاص کے نسخے زیادہ مقبول ہوئے، ہندوستان میں ابن بشران کا نسخہ متداول ہے، متداول نسخوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ معمولی ہے، یعنی تقدیم و تاخیر یا بعض راویوں کے نسب و نسبت کی کمی و بیشی کا، کہیں کہیں الفاظ میں بھی قدرے اختلاف ہے لیکن نفس حدیث میں فرق و اختلاف نہیں ہے، ابن عبد الرحیم کے نسخہ میں کتاب السبق درج نہیں ہے۔ (۲)

سنن کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، ۱۳۱۰ھ میں دہلی کے مطبع انصاری سے یہ ۵۵۴ صفحات میں شائع ہوئی ہے، متن کے ساتھ حاشیہ میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی صاحب غایۃ المقصود عون المجدود کی تعلیقات بھی ہیں اور آخر میں مولانا حسین بن محسن انصاری یمانی کے دو مختصر رسالے ہیں، ایک میں شاذ و معطل حدیثوں کی تحقیق اور ان کے درمیان فرق کی وضاحت اور دوسرے میں صرف داہنے ہاتھ سے مصافحہ کرنے کو مسنون ثابت کیا گیا ہے۔

سنن کے حواشی، تعلیقات اور زوائد: سنن دارقطنی کے ساتھ علمائے فن کے شغف و اعتنا سے بھی اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

۱- علامہ بخوی اور حافظ سیوطی نے اس کی حدیثوں کی تخریج کی ہے۔

(۱) مقدمہ حاشیہ سنن دارقطنی از مولانا شمس الحق عظیم آبادی م ۳۱۳ (۲) بستان الحدیثین م ۳۵ و ۳۶

۲- حافظ ابن حجر نے اتحاف المہرۃ باطراف العشرۃ میں اس کے اطراف لکھے ہیں۔

۳- ابو الفضل بن طاہر نے سنن کے غرائب و افراد کے اطراف حروف معجم کی ترتیب پر لکھے ہیں۔

۴- علامہ ابن ملقن اور عراقی نے اس کے رجال کی بحث و تحقیق کی ہے۔

۵- شیخ زین الدین قاسم بن قطلوبغا حنفی نے ایک جلد میں اس کے زوائد جمع کئے ہیں۔ (۱)

۶- مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے سنن کی مختصر شرح اور تعلیق لکھی ہے جو سنن کے ساتھ حاشیہ میں چھپی ہے، اس میں حدیثوں کی تحقیق و تنقید، ان کے علل، مصالح، مطالب اور بعض مشکل مقامات کو حل کیا گیا ہے اور ائمہ فقہ و اجتہاد کے مذاہب و مسالک، راوی کے ناموں، کتبوں اور بلاد و اماکن کی وضاحت اور لغوی و تفسیری مباحث پر بھی ان فنون کی اہم کتابوں کے حوالہ سے بقدر ضرورت گفتگو کی گئی ہے، حواشی کی ابتدا میں سنن و صاحب سنن کا تعارف، اس کے نسخوں اور مؤلف کتاب تک اپنی سند کا سلسلہ بیان کیا گیا ہے۔ سنن پر اعتراض: اوپر سنن کی اہمیت اور بلند پائیگی پر مختصر اظہار خیال کیا گیا ہے، آخر میں اس پر ایک اعتراض کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔

سنن دارقطنی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ضعیف، غریب، موضوع اور منکر حدیثیں بھی شامل ہیں، علامہ ابن عبدالبہادی کا بیان ہے:

|                           |                                   |
|---------------------------|-----------------------------------|
| الدارقطنی یجمع فی کتابہ   | امام دارقطنی نے اپنی سنن میں غریب |
| غرائب السنن ویكثر فیہ من  | حدیثیں اور ضعیف و منکر بلکہ موضوع |
| روایۃ الاحادیث الضعیفۃ و  | روایتیں تک بھی کثرت سے جمع کی     |
| المنکرۃ بل والموضوعۃ. (۲) | ہیں۔                              |

(۱) تدریب الراوی ص ۲۹، والرسالۃ لمسطرفہ ص ۱۳۹ و ۱۴۱ (۲) الصارم الحنفی فی الرد علی السیسی ص ۱۲ طبع مصر۔



علامہ عینی لکھتے ہیں:

وقد روی فی مسندہ احادیث  
سقیمۃ ومعلولۃ ومنکرۃ و  
غریبۃ وموضوعۃ۔ (۱)

انہوں نے اپنی مسند (۲) میں سقیم،  
معلل، منکر، غریب اور موضوع  
حدیثیں بیان کی ہیں۔

اسی خیال کو علامہ زلیعی نے بھی نصب الرایہ میں نقل کیا ہے۔ (۳)

لیکن یہ اعتراض اس وقت صحیح ہوتا جب سنن دارقطنی کو تمام صحیح، منتخب اور مستند  
حدیثوں کا مجموعہ مانا جاتا مگر اس کا دعویٰ تو خود امام دارقطنی نے بھی نہیں کیا ہے، بلکہ انہوں  
نے جا بجا سنن کے اندر احادیث کی نوعیت اور اس کی صحت و سقم کی حقیقت واضح کر دی ہے،  
نیز علمائے فن نے بھی اس کو صحاح ستہ سے کمتر اور تیسرے طبقہ کی کتابوں میں شامل کیا ہے،  
اس طبقہ کی کتابوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلوی نے تحریر فرمایا ہے کہ  
یہ صحیح، حسن، ضعیف، معروف، منکر، غریب، شاذہ خطا و صواب، ثابت و مقلوب ہر قسم کی  
حدیثوں پر مشتمل ہیں۔ (۴)

نیز شاہ عبدالعزیز صاحب ”لکھتے ہیں“ اس طبقہ کے مصنفین نے دوسرے طبقہ کے  
مصنفین کی جیسی صحت کا التزام نہیں کیا ہے اور نہ ان کی کتابیں شہرت و قبول اور وثوق و اعتبار  
کے لحاظ سے دوسرے طبقہ کی کتابوں کے برابر ہیں، تاہم دارقطنی علوم حدیث میں تبحر، ضبط  
و وثوق اور ثقاہت و عدالت سے متصف تھے لیکن ان کی کتابوں میں صحیح، حسن، ضعیف اور  
موضوع ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں اور ان کے کچھ رجال تو عدالت سے متصف ہیں لیکن  
بعض مستور و مجہول ہیں۔“ (۵)

(۱) البانیہ فی شرح الہدایہ ج ۱ ص ۷۰۹ (۲) امام دارقطنی کی کتاب سنن کے نام سے مشہور ہے، معلوم نہیں  
علامہ عینی نے اس کو مسند کیوں لکھا ہے، (۳) نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۴۰ و ۳۵۶ (۴) حجۃ اللہ الہالباق ج ۱  
ص ۱۰۷ (۵) مجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۵۔

متذکرۃ الحدیثین..... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان انفرادی تحقیقی تذکرہ

560

انصاف کی بات یہ ہے کہ خود صحاح ستہ بھی ضعیف حدیثوں سے خالی نہیں ہیں، اس لیے یہ اعتراض امام دارقطنی کی طرح دوسروں پر بھی عائد ہو سکتا ہے، علاوہ ازیں انہوں نے کثرتِ اسناد و تعددِ طرق اور شواہد و متابعات وغیرہ کے خیال سے ہر طرح کی حدیثیں نقل کی ہیں مگر ان کی نوعیت و حقیقت بھی واضح کر دی ہے، شواہد و متابعات وغیرہ کے لحاظ سے امام مسلم اور اباب صحاح نے بھی ضعیف اور غریب حدیثیں نقل کی ہیں۔

رہا یہ شبہ کہ اس طرح کی حدیثوں کی سنن دارقطنی میں زیادتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حدیثوں کا ضخیم مجموعہ ہے اور امام صاحب نے کثرت و تعددِ طرق اور متابعات و شواہد کو درج کرنے کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے، اس لیے اس میں ضعیف و غریب حدیثوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہو گئی ہے، پھر بھی صحیح حدیثوں کے مقابلہ میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔

اس توجیہ کے بعد نہ اس اعتراض کی کوئی اہمیت رہ جاتی ہے اور نہ سنن کے مرتبہ میں کوئی فرق آتا ہے۔



## امام ابو سلیمان حمد خطابی

(متوفی ۳۸۸ھ)

نام و نسب: حمد نام، ابو سلیمان کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: حمد بن محمد بن ابراہیم بن خطاب۔ (۱)  
بعض ارباب سیر و تذکرہ نے ان کا نام احمد لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے، علامہ ذہبی نے اس کو وہم قرار دیا ہے اور علامہ مقدسی و ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ”ابو سلیمان کا نام احمد بھی بیان کیا گیا ہے لیکن صحیح حمد ہے، حاکم نے ابوالقاسم ظفر بن طاہر بن محمد ہستی فقیہ سے اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے خود خطابی سے سنا ہے کہ میرا اصلی نام حمد ہے لیکن بعض لوگ احمد بھی کہتے ہیں، میں نے ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا۔ (۲)

ولادت و وطن: وہ ماہ رجب ۳۱۹ھ میں کابل کے مشہور شہر بست میں جو غزنین اور ہرات کے درمیان واقع ہے پیدا ہوئے۔ (۳)

نسبتیں: امام ابو سلیمان اپنے وطن کی نسبت سے ہستی کہلاتے ہیں لیکن ان کی مشہور نسبت خطابی ہے، جو ان کے پردادا خطاب کے نام کی طرف ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام صاحب کا خاندانی تعلق خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے بھائی زید بن خطاب سے ہے اور یہ نسبت اسی کی جانب ہے، مگر اکثر لوگوں کے نزدیک پہلا قول صحیح ہے۔ (۴)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۳ (۲) ایضاً و کتاب الانساب مقدسی ص ۳۹ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹۷

(۳) ایضاً و کتاب الانساب سمعانی ورق ۸۱ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۳ و تاریخ ابن خلکان ج ۱

ص ۲۹۷ و کتاب الانساب سمعانی ورق ۸۱۔

اساتذہ: ان کے اساتذہ و شیوخ کی تعداد زیادہ ہے، حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ انھوں نے بیشمار لوگوں سے حدیثیں سنیں لیکن متداول تذکروں میں چند ہی اساتذہ کا نام مذکور ہے۔

ابوبکر بن داسہ، ابوسعید بن اعرابی اور ابوالعباس اصم سے علم حدیث، ابوعلی بن ابی ہریرہ اور قتال شامی سے فقہ و افتاء اور ابو جعفر رزاد، ابوعلی اسماعیل صفار اور ابو عمر زاہد وغیرہ سے لغت و عربیت کی تحصیل کی۔

تلامذہ: امام خطابی کے بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابو حامد اسفراتی، ابو عبد اللہ حاکم، ابو مسعود حسین بن محمد کراہیسی، ابو ذر عبد بن احمد ہروی، ابو عبید ہروی، عبدالغفار (۱) بن محمد فارسی، ابوالقاسم عبدالوہاب بن ابی اسہل خطابی، ابونصر محمد ابن احمد بن سلیمان الجنی، ابو عمرو محمد بن عبد اللہ زرجانی۔ (۲)

رحلت و سفر: امام خطابی کے زمانہ میں عراق، حجاز، خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ دینی علوم خصوصاً حدیث و روایت کا مرکز تھے، انھوں نے علم و فن کی تکمیل اور احادیث کی تحصیل کے لیے ان سب مراکز کا سفر کیا، نیشاپور میں طویل عرصہ تک قیام کر کے وہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے اور طلبہ و شائقین علوم کو فیض یاب بھی کیا۔ (۳)

جامعیت: امام خطابی بڑے جامع کمالات تھے، ان کو اپنے زمانہ کے تمام علوم میں کامل دستگاہ حاصل تھی، مورخین کا بیان ہے کہ وہ جامعیت کے اعتبار سے ابوسعید قاسم بن سلام کی طرح تھے، دونوں علم و ادب، زہد و ورع، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں ممتاز تھے، علاوہ ازیں امام خطابی کو یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ وہ اچھے شاعر تھے۔ (۴)

اعتراف کمالات: مورخین نے ان کی جامعیت، وفور علم اور کمالات کا پوری طرح

(۱) بعض مورخین نے ان کا نام عبدالغافر لکھا ہے (۲) کتاب الاصاب سمعانی ورق ۸۱ و تاریخ ابن

خلکان ج ۱ ص ۳۹۶ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸ (۳) کتاب الاصاب ورق ۲۰۳ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳

ص ۲۲۳ (۴) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹۷۔

رتزکرۃ الحمد شین ..... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ 563

اعتراف کیا ہے۔ علامہ ذہبی نے ان کو علامہ، محقق اور علم کا خزانہ، سمعانی نے فاضل، کبیر الشان اور جلیل القدر لکھا ہے، حافظ ابن جوزی کا بیان ہے کہ ان کا علم نہایت وافر تھا اور ابن سمعانی کا بیان ہے کہ وہ علم میں عظیم حیثیت اور بلند مرتبہ کے مالک تھے، ابن عماد نے ان کو ان کے تمام معاصرین سے فائق قرار دیا ہے۔

حدیث میں درجہ: گو امام خطابی کو گونا گوں علوم میں کمال حاصل تھا لیکن ان کا اصلی اور امتیازی فن علم حدیث ہے، ان کا شمار اس فن کے ائمہ اور نامور محدثین میں کیا جاتا ہے، حفظ و ضبط، عدل و اتقان اور فہم و درایت میں ان کا درجہ بلند تھا، علامہ ذہبی نے ان کو ثقہ و ثبت، سمعانی نے حجت و صدوق اور علامہ ابن سبکی نے امام حدیث لکھا ہے۔ (۱)

فقہ: فقہ و اجتہاد کی معرفت میں بھی بے نظیر تھے، مورخین نے ان کو فقیہ لکھا ہے اور حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ ”وہ فقہائے مجتہدین میں تھے۔“

لغت و عربیت: لغت و عربیت، نحو و ادب اور معانی وغیرہ میں بھی صاحب کمال تھے، حافظ ابن جوزی نے لغت و معانی میں ان کی معرفت کا اور دوسرے مورخین نے ادب و عربیت میں مہارت کا ذکر کیا ہے۔ (۲) اسی لیے ادب و نحاۃ اور اہل لغت کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی امام خطابی کا تذکرہ موجود ہے۔

شعر و سخن: ان کو شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی اور وہ خود مشق سخن بھی کر۔ نہ تھے، چند اشعار درج ذیل ہیں:

کم معشر سلمو الم یوذہم سبع ومانری بشر الم یوذہ بشر

کتنے لوگ درندوں کے ضرر سے محفوظ رہتے ہیں، لیکن ہم نے آدمی کو

آدمی کی اذیت سے محفوظ نہیں دیکھا۔

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹۷ و کتاب الانساب ورق ۱۸۱، تذکرۃ الخطاط ج ۳ ص ۲۲۳ و البحر ج ۳ ص ۳۹ و المنتظم ج ۶ ص ۳۹۷ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸ (۲) ایضاً۔

وماغمة الانسان في شقة النوى      ولكنها والله في عدم الشكل  
وانى غريب بين بست واهلها      وان كان فيها اسرتى وبها اهل  
انسان کی کلفت و پریشانی مسافرت اور غریب الوطنی میں نہیں ہے بلکہ  
ہم مذاق اور ہم جنسوں کے نہ ہونے میں ہے، اسی لیے میں بست اور اہل بست  
کے درمیان رہ کر بھی غریب الوطن ہوں، حالانکہ یہ میرا وطن ہے اور یہاں  
میرے اہل و عیال اور اعزہ و اقارب موجود ہیں۔

لعمرك ما الحياة وان حرصنا      عليها غير ربح مستعارة  
وما للريح دائمة هبوب      ولكن تارة تجرى وتارة  
زندگی جس پر ہم اس قدر رنجھے ہوئے ہیں، بخدا اس مستعار ہوا کی طرح ہے جو  
ہمیشہ نہیں چلتی بلکہ کبھی کبھی چلتی ہے۔

تغنم سکون الحادثات فانها      وان سكنت عما قليل تحرك  
وبادر بايام السلامة انها.      رهون وهل للرهن عندك مترك  
حوادث کے رکنے کو غنیمت سمجھو کیوں کہ یہ جلد ہی متحرک بھی ہو جاتے  
ہیں اور سکون و سلامتی کے دنوں کو غنیمت سمجھو کیوں کہ یہ تمہارے پاس رہن ہیں  
اور جو چیز رہن ہو وہ تمہارے پاس چھوڑی نہیں جاسکتی۔

تسامح ولا تستوف حقلك كله      وابق فلم يستقص قط كريم  
ولا تغل في شيء من الامر واقتصد      كلا طرفى قصدا لامور ذميم (1)  
نرمی اور آسانی سے کام لو اور اپنا حق پورا لینے کے بجائے کچھ باقی رکھو کیوں  
کہ شریف آدمی کبھی آخری حد کو نہیں پہنچتا، کسی معاملہ میں غلو سے کام نہ لو بلکہ میانہ  
روی اختیار کرو کیوں کہ اعتدال کے دونوں سروں (افراط و تفریط) پر ذمہ ہوتا ہے۔

ارض للناس جميعا      مثل ماتر ضیٰ لنفسك  
انما الناس جميعا      كلهم ابناء جنسك  
فلهم نفس كنفسك      ولهم حس كحسك (۱)

اپنے لیے جو کچھ پسند کرتے ہو وہی سب لوگوں کے لیے بھی پسند کرو، تمام لوگ

تمہاری ہی جنس کے ہیں، تمہاری طرح وہ بھی صاحب نفس و احساس ہیں۔

زہد و اتقا: علمی کمالات کی طرح ورع و تقویٰ میں بھی ممتاز تھے، مورخین نے ان کے زہد و اتقا کا ذکر کیا ہے۔

امامت و مرجعیت: ان گونا گوں کمالات اور مختلف النوع خصوصیات کی وجہ سے ان کی ذات لوگوں کا مرکز بن گئی تھی اور وہ امام و مقتدی کہلاتے تھے، ابن سمعانی لکھتے ہیں کہ وہ لائق اقتدا اور ائمہ سنت و حدیث میں تھے۔ (۲)

مسلك: امام خطابی گو خود اجتہادی بصیرت اور فقیہی ژرف نگاہی میں ممتاز تھے تاہم وہ امام شافعی کے مسلك پر کار بند تھے۔

اخلاق و عادات: ان کے اخلاق و عادات کے ذکر سے کتابیں خاموش ہیں مگر ان کی سخاوت و فیاضی اور فہم و دانش کا اعتراف کیا گیا ہے، وہ اپنی کمائی کا بیشتر حصہ اپنے دوستوں اور نیک لوگوں پر خرچ کر ڈالتے تھے، ان سے متعدد حکیمانہ اقوال بھی منسوب ہیں اور ان کے شعروں میں بھی حکمت و اخلاق اور فہم و دانائی کی باتیں ملتی ہیں۔

پیشہ: امام خطابی تجارت پیشہ تھے اور اپنے زہد و ورع کی وجہ سے ہمیشہ حلال اور طیب رزق کھاتے تھے۔

انتقال: مشہور اور صحیح قول کے مطابق بروز شنبہ ۶ ربیع الآخر ۳۸۸ھ کو وفات پائی، بعض مورخین نے ۱۶ ربیع الآخر اور بعض نے ربیع الاول کا مہینہ لکھا ہے، ایک قول کے مطابق ان

(۱) مقدمہ معالم السنن ص ۱۹ (۲) کتاب الانساب ورق ۲۰۳ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸۔

کی وفات ۳۸۶ھ میں ہوئی۔ (۱)

**تصنیفات:** امام خطابی کو تصنیف و تالیف کا بڑا عمدہ ذوق تھا اور چوں کہ ان کو گونا گوں علوم سے مناسبت اور اشتغال تھا، اس لیے ان کتابوں کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے، ان سے بیسار کتابیں یادگار ہیں اور ان میں اکثر کتابیں بیش قیمت اور حسن تالیف اور دلکش طرز تصنیف کا نمونہ ہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کی فہرست اور بعض کے متعلق مختصر معلومات پیش کئے جاتے ہیں:

۱- کتاب البہاد، ۲- کتاب شان الدعا یا بیان الدعاء، ۳- کتاب الشجاء یا کتاب النجاء، ۴- کتاب شرح الادعیۃ الماثورہ، ۵- کتاب شرح دعوات لابی خزیمہ، ۶- کتاب العروس، ۷- کتاب العزله، ۸- کتاب الغنیۃ عن الکلام وابلہ، ۹- کتاب اصلاح الغلط (بعض نے اس کا نام اصلاح غلط الحمدین لکھا ہے)

۱۰- کتاب تفسیر اسامی الرب عزوجل: غالباً شرح الاسماء الحسنیٰ اور شرح اسماء اللہ الحسنیٰ بھی اسی کتاب کے نام ہیں، اس موضوع پر علمائے اسلام کی متعدد تصنیفات کی فہرست صاحب کشف الظنون نے تحریر کی ہے، امام خطابی کی تصنیف اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

۱۱- اعلام السنن: اسی کا نام اعلام الحدیث اور شرح البخاری بھی ہے، اس میں بخاری شریف کی حدیثوں کی شرح کی گئی ہے، امام صاحب جب سنن ابی داؤد کی شرح لکھ چکے تو اہل بلخ کی فرمائش پر انھوں نے بخاری شریف کی بھی ایک جلد میں شرح لکھی جو لطیف نکات اور مفید مطالب پر مشتمل ہے لیکن یہ معالم السنن کی طرح طویل نہیں ہے بلکہ اس میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، امام محمد تمیمی اور ابو جعفر احمد بن سعید داؤدی نے اپنی شرحوں میں

(۱) کتاب الانساب ورق ۲۰۳ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۲ و بیان

الحمدین ص ۱۲۳۔



ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کو امام خطابی نے نظر انداز کر دیا ہے، ان کتابوں میں خطابی کے بعض مسامحات کا بھی ذکر ہے۔

اعلام السنن کا ایک نسخہ موصل کے جامع سلطان اولیس میں ہے، داؤد حلیمی نے مخطوطات موصل کے ص ۹۴ پر اس کا ذکر کیا ہے، حلب کے مکتبہ شیخ محمد سلطان مرحوم میں اس کتاب کا نصف آخر موجود ہے جو ۴۸۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔

۱۲- غریب الحدیث: اس کا شمار امام خطابی کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہوتا ہے، ان سے پہلے اور بعد میں اس فن میں متعدد کتابیں لکھی گئیں جن میں ابو عبید، ابن قتیبہ اور امام خطابی کی کتابیں بہت اہم اور بہتر خیال کی جاتی ہیں، بعض علماء کا خیال ہے کہ امام خطابی کی کتاب کا پایہ ان سب میں بلند ہے، انھوں نے ابن قتیبہ کی کتاب کا ذیل بھی لکھا ہے اور ان کی غلطیوں اور اوہام کی نشاندہی بھی کی ہے، ابوالحسن عبدالغافر نے ان سے اس کتاب کی روایت کی تھی، غالباً یہ بیش قیمت اور اہم کتاب اب معدوم ہے۔

۱۳- معالم السنن: یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور کتاب ہے، اس میں سنن ابی داؤد کی حدیثوں کی شرح، اس کے اہم مطالب کی توضیح اور اس کے مشکلات کو نہایت عالمانہ اور محققانہ انداز اور دلنشین و دلکش پیرایہ میں حل کیا گیا ہے، اس کی چار جلدیں اعلام النبلاء کے فاضل مصنف محمد راغب طباطبائی نے بعض مخطوطہ نسخوں کی مدد سے ایڈٹ کر کے مطبع علمیہ حلب سے ۱۳۵۱ھ و ۱۳۵۳ھ میں شائع کیا تھا اور اس کے شروع میں امام ابوداؤد اور امام خطابی کے حالات و کمالات بھی تحریر کئے ہیں، ان چاروں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار ہے، شہاب الدین ابو محمود احمد بن محمد بن ابراہیم مقدسی (م ۷۶۹ھ) نے بحالۃ العالم من کتاب المعالم کے نام سے اس کی تلخیص کی تھی، (۱) اس شرح کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں: (۲)

(۱) کشف الظنون (۲) اس شرح کی خصوصیات پر ائمہ نے معارف کے تین نمبروں (دسمبر ۶۹ء تا فروری ۷۰ء) میں ایک مفصل مضمون لکھا ہے۔

۱- یہ سنن ابوداؤد کی سب سے اہم، مستند اور قدیم شرح ہے، اس کے بعد جو شرحیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی سے ماخوذ ہیں۔

۲- احادیث کی تشریح و تفسیر اور بحث و تحقیق کا معیار نہایت بلند اور طرز استدلال بہت دلکش اور دلنشین ہے، جن چیزوں سے عموماً لوگ سرسری طور پر گذر جاتے ہیں، امام صاحب نے ان سے بڑے دقیق مسائل، گہرے معانی و حقائق اور دلچسپ نتائج و نکات مستنبط کئے ہیں اس ضمن میں احادیث کے اندر پیدا ہونے والے شکوک و اعتراضات کا بھی بہت مفصل اور عالمانہ جواب دیا گیا ہے۔

۳- امام خطابی کا شمار ان علمائے اسلام میں ہوتا ہے جو شرعی احکام کے علل و مصالح بیان کرنے میں زیادہ ممتاز سمجھے جاتے ہیں، اس لیے انھوں نے معالم السنن میں حدیثوں کے اسرار و حکم بیان کرنے پر خاص توجہ کی ہے۔

۴- حدیثوں کے باہمی اختلاف و تضاد کو رفع کرنے اور ان میں جمع و تطبیق دینے کی پوری کوشش کی ہے۔

۵- امام خطابی کا پایہ جرح و تعدیل میں بھی نہایت بلند تھا، اس لیے معالم السنن میں حدیث کی فنی بحثوں اور اصول حدیث پر بڑی ماہرانہ گفتگو کی گئی ہے۔

۶- معالم السنن فقہی حیثیت سے بھی نہایت اہم کتاب خیال کی جاتی ہے، امام صاحب فقہ و خلاف میں ممتاز اور خود بھی صاحب تفقہ و اجتہاد تھے، چنانچہ اس میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور اس زمانہ تک کے تمام ائمہ و مجتہدین کے آرا و مسالک کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور مختلف اقوال میں محاکمہ کر کے مزج قول کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، علاوہ ازیں بعض مسائل سے امام صاحب کی فقہی ژرف نگاہی اور اجتہادی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

۷- وہ لغت و عربیت میں بھی ممتاز تھے، اس لیے لغوی، نحوی و صرفی بحثیں کلام کی



بلاغت، طرز اد اور اسلوب بیان کی بھی اس میں وضاحت کی گئی ہے۔

غرض حدیثوں کی تفسیر، ان کے مواقع استنباط، وجوہ معانی کی دلالت، مشکل الفاظ، دقیق متون کی شرح، فقہی مباحث، احکام و مسائل کے استنباط اور علما کے اقوال و اختلافات کی تفصیل وغیرہ کے لحاظ سے یہ بے نظیر اور متعدد گونا گوں فوائد، مختلف النوع مباحث اور حدیث سے متعلق اہم تحقیقات پر مشتمل نہایت جامع و مدلل کتاب ہے۔

www.KitaboSunnat.com



## امام ابن جمیع

(متوفی ۳۰۲ھ)

نام و نسب: محمد نام، ابو الحسنین کنیت، نسب نامہ یہ ہے: محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن عبد الرحمن بن یحییٰ بن جمیع (۱)، اپنے جد امجد جمیع کے نام پر ابن جمیع کے لقب سے مشہور ہوئے۔

ولادت، خاندان و وطن: امام ابن جمیع کا قبیلہ ازد کی مشہور شاخ غسان سے جو شام میں آباد تھی، خاندانی تعلق تھا اور وطن شام کا ایک شہر صیدا ہے، یہیں ۳۰۵ھ میں وہ پیدا ہوئے، علامہ سمعانی نے سنہ ولادت ۳۰۶ھ لکھا ہے۔ (۲)

وطن کی نسبت سے صیداوی اور صیدانی اور خاندان کی نسبت سے غسانی کہلاتے تھے۔ رحلت و سفر: اس عہد کے دستور کے مطابق امام ابن جمیع نے علم کی تحصیل اور احادیث کی طلب کے لیے مختلف اسلامی ملکوں اور شہروں جیسے دمشق، بغداد، مکہ، بصرہ، کوفہ، عراق، مصر اور فارس وغیرہ کا سفر کیا اور ان مرکزی مقامات کے علماء و محدثین سے اکتساب فن کیا، کثرت سفر کی وجہ سے ابن جمیع ”الجوال“ اور ”ذوالرحلۃ الکثیر“، یعنی بہت بڑے سیاح کہلاتے تھے۔ (۳)

اساتذہ: ابن جمیع کے چند نامور شیوخ کے نام یہ ہیں:

(۱) بستان الحدیث ص ۸۶ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۵۸ (۳) ایضاً و بستان الحدیث ص ۸۶۔

ابوسعید بن الاعرابی، ابو العباس بن عقدہ، ابو عبد اللہ محمد بن علی، ابوردق ہزانی۔

تلازمہ: بعض ممتاز شاگردوں کے نام یہ ہیں:

حافظ عبد الغنی بن سعید، تمام رازی (صاحب فوائد) محمد بن علی صوری، ابوسعید احمد بن محمد بن عبد اللہ مالینی، ابونصر عبد الرحمن بن ابی عقیل الصوری، ابونصر حسین بن محمد بن احمد خطیب دمشقی اور حسن بن جمیع وغیرہ۔ (۱)

حفظ وضبط اور حدیث میں درجہ و مرتبہ: ابن جمیع کے حفظ وضبط، عدالت و ثقاہت اور حدیث میں بلند پایگی کے علمائے فن اور محدثین معترف ہیں، الحافظ ان کا لقب تھا اور خطیب بغدادی وغیرہ نے ان کی توثیق و تعدیل کی ہے، خطیب کا بیان ہے کہ ہو اسند من بقی من الشام۔ حدیث میں ان کے کمال اور رسوخ کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسند

الشام و محدثہ یعنی شام کے محدث و مسند کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے۔ (۲)

مداومت عمل اور ذوق عبادت: ابن جمیع کے عام حالات و واقعات معلوم نہیں ہو سکے، اس لیے ان کی سیرت و کردار اور عام اوصاف و خصائل کے متعلق بھی کچھ نہیں لکھا جاسکتا، تاہم ان کے ذوق بندگی، کثرت عبادت اور معمولات وغیرہ میں اہتمام اور پابندی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر سے انھوں نے مسلسل روزہ رکھنا شروع کیا تو کبھی عمر

بھران کے روزے فوت نہ ہوئے اور نہ اس معمول میں کوئی فرق آیا۔ (۳)

وفات: ۹۷ سال کی عمر میں ماہ رجب ۴۰۲ھ کو انتقال کیا (۴) لیکن علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ۳۷۴ھ کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ (۵)

مسند یا معجم: ابن جمیع کی صرف ایک تصنیف کا پتہ چلتا ہے، بعض لوگوں نے اس کا نام مسند اور بعض نے معجم بتایا ہے، غالباً اس میں مسند و معجم دونوں کی خصوصیات موجود تھیں، اس کا مکمل

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۵۸، بیستان الحدیث ص ۸۶ (۲) ایضاً، والعمر ج ۳ ص ۸۰ (۳) العمر ج ۳

ص ۸۰، بیستان الحدیث ص ۸۶ (۴) ایضاً (۵) کتاب الانساب ورق ۳۵۸۔

متذکرۃ الحمد تین..... گلستان حدیث کے مہکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ 572

قلمی نسخہ حافظ ابن حجر کے ہاتھ کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے اور ان کے قلم سے اس پر مفید حواشی بھی تحریر ہیں۔ (۱) اس معجم کے ایک قدیم مستند اور نایاب نسخے کا ایک جز جو سات حدیثوں پر مشتمل ہے، خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی ہے، اس کے خاتمہ کے ایک نوشتہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس اصل نسخہ سے یہ نسخہ نقل کیا گیا ہے، اس سے بعد میں عبارت لفظ بلفظ ملا کر دیکھ لی گئی ہے، ایک اور کرم خوردہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس نسخہ کا چند محدثین نے اپنے نسخوں سے بھی موازنہ کیا ہے یہ جز ۶۰۶ھ یا اس سے قبل کا نوشتہ ہے۔ (۲)



(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵ (۲) نوادر خدا بخش لائبریری، ص ۹۷ و ۹۸۔

## امام ابو عبد اللہ حاکم

(متوفی ۴۰۵ھ)

نام و نسب: محمد نام، ابو عبد اللہ اور ابن بیع کنیت اور حاکم لقب ہے، پورا نسب نامہ یہ ہے:

محمد بن عبد اللہ بن محمد بن حمدویہ بن نعیم بن حکم۔ (۱)

امام ابو عبد اللہ کے اجداد میں کوئی بزرگ تجارتی کاروبار کرنے کی بنا پر بیع (بیوپاری)

کہلاتے تھے، اس نسبت سے امام صاحب کو ابن بیع کہا جاتا ہے، منصب قضا پر فائز ہونے کی وجہ سے حاکم کے لقب سے ملقب کئے گئے، (۲) ابوالفدا نے ابن الحاکم لقب تحریر کیا ہے، (۳) یہ غالباً اس لیے کہ ان کے جد امجد کا نام حکم تھا ممکن ہے بعد میں ابن حذف ہو کر صرف حاکم رہ گیا ہو۔

ولادت: امام صاحب دوشنبہ ۳ ربيع الاول ۳۲۱ھ کو نیشاپور میں پیدا ہوئے۔ (۴)

خاندان و وطن: امام صاحب کے مرزبوم ہونے کا فخر عراق عجم کے مشہور مردم خیز شہر نیشاپور کو حاصل ہے، اس لیے وہ نیشاپوری کہلاتے ہیں لیکن ضمی اور طہمانی کی نسبتوں سے ان کا عربی قبائل سے خاندانی تعلق ظاہر ہوتا ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ”حاکم کی دادی سبطہ عیسیٰ بن عبد الرحمن ضمی کی صاحبزادی تھیں، طہمانی کی نسبت ابراہیم بن طہمان کی جانب ہے جو

(۱) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۷۳ و ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۳ و المنتظم ج ۷ ص ۲۷۳ و تبیین کذب المفتری

ص ۳۲۷ و الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۲ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ و بستان المحدثین ص ۴۲

(۳) تاریخ ابوالفدا ج ۲ ص ۳۳ (۴) الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۲ و تبیین کذب المفتری ص ۲۲۰۔

صاحب فضل و کمال تھے۔ (۱)

امام صاحب ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، ان کے والد اور ماموں علم و فن کے دلدادہ تھے، ان دونوں بزرگوں کے فیض توجہ سے وہ بچپن ہی میں علم و فن کی تحصیل میں مشغول ہو گئے تھے اور سب سے پہلے اپنے والد ماجد سے اکتساب فیض کیا، ان کے والد بزرگوار کو امام مسلم کو دیکھنے کا شرف بھی حاصل ہے۔ (۲)

اساتذہ: مورخین کا بیان ہے کہ امام صاحب کو تقریباً دو ہزار فضلاء اور محدثین سے استفادہ کرنے کا موقع ملا تھا، خاص نیشاپور کے اساتذہ کی تعداد ایک ہزار بتائی جاتی ہے، اپنے والد کے علاوہ جن ممتاز محدثین سے انھوں نے حدیثوں کی روایت کی ہے ان کے نام یہ ہیں:

ابن ابی سبرہ، ابن درستویہ، ابو حامد بن حسنویہ مرقی، ابوہل بن زیاد، ابو بکر احمد بن سلمان نجاد، حسن بن یعقوب بخاری، ابوعلی حسین بن علی الحافظ نیشاپوری، ابوصالح خلف بن محمد بن اسماعیل خیام، ابو محمود دعلج بن احمد سجری، ابو محمد عبدالرحمن بن حمدان جلاب، ابو عمرو عثمان بن محمد بن سماک، علی بن محمد بن عقبہ شیبانی، ابو العباس محمد بن احمد بن محبوب التاجر محبوبی، ابو جعفر محمد بن صالح بن ہانی، محمد بن عبداللہ صفار اصہبانی، ابو جعفر محمد بن علی بن رحم شیبانی، محمد بن علی بن عمر، ابو نصر محمد بن محمد بن یوسف، ابو العباس محمد بن یعقوب الاصم، ابو عبداللہ محمد بن یعقوب بن الاخرم شیبانی۔

فقہ کی تحصیل اس زمانہ کے مشہور فقہاء، ابوہل محمد بن سلیمان صلحوی، ابوعلی بن ابی ہریرہ ابو الولید حسان بن محمد اور ابو بکر احمد بن اسحاق ضمی وغیرہ سے کی، قرأت کا فن محمد بن ابو منصور صرام ابن امام، علی بن علی نقار کوفی اور ابو عیسیٰ بکار بغدادی وغیرہ قراء سے سیکھا اور تصوف و اسرار دین کی تکمیل کے لیے ابو عمرو بن نجید، ابو الحسن بوشنجی، ابو سعید احمد بن یعقوب ثقفی، ابو نصر صفار، ابو القاسم رازی جعفر بن نصیر، ابو عمرو الزجاجی، جعفر بن ابراہیم خدا شیخ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۶۶ (۲) ایضاً، الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵۔



ابو عثمان مغربی اور ابو عمر بن محمد بن جعفر خلدی وغیرہ مشائخ و صوفیہ کی صحبت اختیار کی۔ (۱)  
تلامذہ: امام حاکم کے بعض مشہور تلامذہ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابو ذرہروی، ابوصالح موزن، ابویعلیٰ خلیلی، ابوبکر احمد بن حسین بیہقی، ابوبکر احمد بن علی بن خلف شیرازی، ابو عثمان اسماعیل بن عبدالرحمن صابونی، زکی عبدالحمید بحیری، ابوالقاسم بن عبداللہ ابن احمد ازہری، ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری، عثمان بن محمد جلی، ابوالفتح محمد بن احمد بن ابی الفوارس، محمد بن احمد بن یعقوب، ابوبکر محمد بن علی بن اسماعیل تفال شاسی اور ابوالعلاء محمد بن یعقوب واسطی۔ (۲)

ان کے شیوخ میں امام ابوالحسن دارقطنی، احمد بن ابو عثمان حیری اور ابواسحاق مزکی نے بھی ان سے سماع کیا تھا، امام دارقطنی سے ان کی برابر مصاحبت اور ہم نشینی رہتی تھی، خطیب بغدادی ایک واسطہ سے حاکم کے شاگرد ہیں۔

شوق علم: امام حاکم بچپن ہی میں تعلیم و تعلم میں مشغول ہو گئے تھے اور نو سال کی عمر میں باقاعدہ حدیث کا سماع کیا، علم سے شغف کا یہ حال تھا کہ ان کو اپنے سے کمتر اور کم سن لوگوں سے بھی روایت کرنے میں کسی طرح کا عار نہ ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے۔

رحلت و سفر: اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے انھوں نے سب سے پہلے اپنے وطن نیشاپور کے جو اس وقت علمائے فن اور محدثین کا مرکز بنا ہوا تھا، ارباب کمال کی جانب رجوع کیا، بیس سال کے ہوئے تو دوسرے علمی شہروں اور مراکز حدیث کا رخ کیا اور عراق، بغداد، مکہ، کوفہ، مرو، بخاری، ماوراء النہر، ہمدان اور اصہبان وغیرہ تشریف لے گئے، اسفار کی کثرت کی وجہ سے مورخین ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ طاف الآفاق، رمل الکثیر، بغداد دو بار گئے

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۲، الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵ و کتاب الانساب ورق ۱۰۰، کذب المغتری ص ۲۲۹ (۲) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۷۳۔

تھے پہلی بار عین شباب کے زمانہ میں اور دوسری دفعہ گئے تو ان کا سن زیادہ ہو چکا تھا۔ (۱)

حدیث و روایت میں کمال و امتیاز: علم حدیث میں غیر معمولی کمال و امتیاز کی بنا پر وہ الحافظ الکبیر اور امام الحدیثین وغیرہ القاب سے یاد کئے جاتے تھے، ابو حازم عبدوی کا بیان ہے کہ ”حاکم اپنے زمانہ میں محدثین کے امام تھے“ یا فنی لکھتے ہیں ”حدیث اور اس کے متعلق علوم کی معرفت میں ان کو بڑی مہارت حاصل تھی“، علامہ ذہبی فرماتے ہیں ”نہ صرف خراسان بلکہ ساری دنیا میں اقلیم حدیث کی تاجداروں کی ان پر ختم ہو گئی“، علامہ ابن صلاح اور حافظ نووی نے صحاح ستہ کے مصنفین کے بعد جن سات محدثین کو نہایت صاحب کمال قرار دیا ہے، ان میں امام دارقطنی کے بعد دوسرا نام حاکم ہی کا بتایا ہے، ان کے زمانہ کے جن چار محدثین کو خصوصیت سے سرآمد روزگار سمجھا جاتا تھا، ان میں ایک یہ بھی تھے، عبدالغافر کہتے ہیں وہ اپنے زمانہ میں اہل حدیث کے امام اور فن حدیث سے بخوبی واقف تھے۔

حفظ و ثقاہت: حدیث میں ان کے کمال کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے حفظ و ضبط اور ثقاہت و عدالت پر تمام ائمہ فن اور محدثین کا اتفاق ہے، اہل سیر نے الحافظ الکبیر من اہل الحفظ اور من اکابر حفاظ الحدیث وغیرہ کہہ کر ان کے حافظہ کی توثیق کی ہے، ابو عبد الرحمن سلمی کا بیان ہے کہ میں نے امام دارقطنی سے حاکم اور ابن مندہ کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ابن بیع حافظ میں زیادہ مستند اور اتقن ہیں۔

کلامی مذہب: کلام و عقائد میں اشاعرہ کے ہمنوا تھے، ابن سبکی نے ان کے اشعری اہم مذہب ہونے کی تصریح کی ہے اور علامہ ابن عساکر نے تبیین میں اشاعرہ کے دوسرے طبقہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اس طبقہ میں ان لوگوں کے ترجمے درج ہیں جو امام ابوالحسن اشعری کے تلامذہ کے صحبت یافتہ اور ان کے اصول پر کاربند تھے۔

تدین و تقویٰ: وہ زہد و اتقا اور دیانت و امانت میں ممتاز تھے، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ

”حاکم متدین، امین، صاحبِ حزم و ورع اور اللہ کی جانب مائل و متوجہ رہتے تھے۔“ (۱) حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، تصوف سے اشتغال اور اکابرِ صوفیہ و مشائخ سے وابستگی بھی ان کے تدین کا ثبوت ہے۔

سیاسی و اجتماعی مشاغل: پہلے گذر چکا ہے کہ امام صاحب عہدہ قضا پر متمکن ہونے کی بنا پر حاکم کہلاتے تھے، بعض مورخین نے ان کو نسا کا لیکن اکثر نے نیشاپور کا قاضی بتایا ہے، یہ ۳۵۹ھ کا واقعہ ہے، اس زمانہ میں دولت سامانیہ کی طرف سے نیشاپور میں ابوالنصر محمد بن عبدالجبار عثمی کی ولایت قائم تھی، امام صاحب محکمہ قضا کے فرائض سے اس قدر خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے کہ دوبارہ ان کو جر جان کا عہدہ قضا پیش کیا گیا لیکن انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا مگر بعض مورخین نے ان کے جر جان کے قاضی مقرر کئے جانے کی تصریح کی ہے۔

امام صاحب پر دولت سامانیہ اور اس کے امر و حکام کو بڑا اعتماد تھا، امیر ابوالحسن ان سے مشورے طلب کرتا تھا اور بنی بویہ کے پاس سفارت کے لیے بھیجتا تھا، امام صاحب نے بنی بویہ اور سامانی حکومت کے درمیان سفارتی فرائض بڑی اچھی طرح انجام دیے۔

ان کو ملی و اجتماعی کاموں سے بھی یک گونہ دلچسپی تھی، ایک زمانہ میں مدرسہ دارالسنّت کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری انہی کے سپرد تھی، ان کے استاذ احمد بن اسحاق ضعی نے اپنی وفات کے بعد مدرسہ کے امور و معاملات کی نگرانی اور اوقاف کی تولیت واہتمام کے بارے میں ان کو وصیت کی تھی۔ (۲)

مقبولیت و مرجعیت: امام صاحب اپنے گونا گوں کمالات کی وجہ سے مسلمانوں کے مقتدا و امام اور ان کی عقیدت و توجہ کا مرکز بن گئے تھے اور خواص و عوام سب میں یکساں مقبول اور

(۱) البدایہ و النہایہ ج ۱۱ ص ۳۵۵ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵، الطریقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵

دبیمین کذب المغتری ص ۲۲۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۶۔

ہر و عزیز تھے، علامہ ابن سبکی کا بیان ہے کہ ان کی عظمت شان، جلالت قدر اور امامت فن پر سب کا اتفاق ہے، وہ ان ائمہٴ اعلام میں تھے جن کے ذریعہ اللہ نے اپنے دین مبین کی حفاظت کا کام لیا ہے، لوگ دور دراز سے ان کی خدمت میں آ کر اپنی علمی تشنگی بجھاتے تھے، وہ جس بزم میں پہنچ جاتے اس کی رونق بڑھ جاتی، لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے اور شایان شان استقبال کرتے، اکابر محدثین و نامور ائمہٴ فن کے مجمع میں بھی تشریف لے جاتے تو لوگوں کو اپنے علمی تبحر اور خوش کلامی سے متاثر کر لیتے تھے، عبدالغافر امام حاکم کی مدح و ستائش میں نہایت رطب اللسان رہتے تھے، ان کا بیان ہے کہ ہمارے اساتذہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ کے اکثر فضلا و ارباب کمال جیسے صلحو کی اور ابن فورک وغیرہ ان کو اپنے سے فائق اور مقدم سمجھتے تھے اور ان کے حفظ و معرفت حدیث میں انفرادیت کی بنا پر ان کی فضیلت و برتری کے معترف اور ان کی عزت و احترام کا پورا خیال رکھتے تھے، ان کی تصنیفات، طرق حدیث میں ان کے علم و نظر، علمی مباحث و امالی وغیرہ میں ان کے تصرفات و کمالات کا جو جائزہ لے گا وہ ان کے فضل و کمال کا ضرر، اعتراف کرے گا اور اس کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ اپنے سے پہلے کے علماء پر بھی فوقیت رکھتے تھے، حاکم اپنے کمالات کی وجہ سے اس بلند مقام پر فائز تھے، جہاں پہنچنا دوسروں کے لیے ممکن نہیں تھا، وہ اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے، ان کی موت سے جو خلا ہوا ہے وہ پر نہیں ہو سکتا۔ (۱)

وفات: امام صاحب نے اپنے وطن نیشاپور میں منگل یا بدھ ۳ صفر ۴۰۵ھ کو دفعۃً انتقال کیا، حمام سے غسل کر کے نکل رہے تھے اور صرف تہہ باندھے ہوئے تھے کہ ایک آنکھینی اور روح قفسِ عنصری سے پرہ از کر گئی، عصر بعد تجہیز و تکفین کی گئی، قاضی ابو بکر حیری نے جنازہ کی نماز پڑھائی، ظیل بن عبداللہ نے ارشاد میں ۳۰۳ھ سنہ وفات لکھا ہے لیکن علامہ ابن سبکی وغیرہ

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۸۵، الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵، تبیین کذب المفتری ص ۲۲۹

نے اس کی تردید کی ہے۔

حسن بن اشعث قرظی نے خواب دیکھا کہ حاکم نہایت اچھی وضع قطع میں ایک گھوڑے پر سوار ہو کر کہہ رہے ہیں کہ مجھے نجات مل گئی، میں نے سب پوچھا تو فرمایا کہ حدیث کی تحریر و کتابت کی وجہ سے اللہ نے مجھ کو نجات دی ہے۔ (۱)

تصنیفات: امام ابو عبد اللہ حاکم کی تصنیفات کثرت و کیفیت دونوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں، ان کا خود بیان ہے کہ ”میں نے زمرم کا پانی پی کر خدا سے حسن تصنیف کی دعا کی تھی، ان کی دعا مقبول ہوئی، ارباب سیر کا اتفاق ہے کہ تصنیفی حیثیت سے ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا، سعد بن علی زنجانی سے جب چارہم عصر محمد شین کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے ہر ایک کی جدا جدا خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سب میں حاکم سب سے بہتر تصنیف والے تھے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ ”حاکم نے علوم حدیث میں بے نظیر تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں“ سمعانی کا بیان ہے کہ انھوں نے علوم حدیث اور دیگر فنون میں بڑی عمدہ کتابیں لکھیں، شاہ عبدالعزیز صاحب ”لکھتے ہیں“ حاکم را در فن تصنیف و ترتیب دخل تمام بود۔“

ان کی تصنیفات کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے، بعض دو گوں نے پانچ سو، بعض نے ایک ہزار اور بعض نے ڈیڑھ ہزار جز کے بقدر تعداد بتائی ہے، (۲) لیکن قدما کی طرح ان کی بھی اکثر کتابیں اب معدوم اور ناپید ہیں، جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱- الاربعین، ۲- الامالی، ۳- امالی العشیات، ۴- تراجم

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۸۵ والطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵ و تبیین کذب المفتری ص ۲۲۹ تذکرۃ

الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۶ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ والطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۷ و تذکرۃ الحفاظ

ج ۳ ص ۲۳۸ و بستان المحدثین ص ۴۱۔

الشیوخ، ۵- تراجم المسند علی شرط الصحیحین . ۶- التلخیص،  
 ۷- فضائل الامام الشافعی، ۸- فضائل العشرة المبشرة، ۹- فضائل  
 فاطمہ، ۱۰- فوائد الخراسانیین، ۱۱- فوائد الشیوخ،  
 ۱۲- فوائد العراقیین، ۱۳- ماتفرد باخراجه کل واحد من الامامین،  
 ۱۴- کتاب المبتدا من اللالی، ۱۵- مناقب الصدیق۔

۱۶- کتاب العلل: علل میں امام مسلم اور دارقطنی کی کتابیں اہم سمجھی جاتی ہیں،  
 حاکم کی کتاب کا بھی ان ہی کے ساتھ نام لیا جاتا ہے، ۱۷- تفسیر القرآن: علامہ سیوطی اور  
 صاحب کشف الظنون نے تیسری اور چوتھی صدی ہجری کی اہم کتب تفسیر میں اس کو شمار کیا  
 ہے، سیوطی لکھتے ہیں ”پھر ابن ابو حاتم، ابن ماجہ، حاکم، ابن مردویہ، ابن حبان اور ابن منذر  
 وغیرہ کی تفسیریں ہیں، ان میں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے آثار سنداً بیان کئے گئے  
 ہیں۔“ (۱)

### ۱۸- تخریج الصحیحین: اس کا نام المدخل الی معرفۃ

الصحیحین بھی ہے اور غالباً حاکم نے رسالہ المدخل میں اسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے  
 کہ ”حجاز، عراق اور شام کے لوگ صحیح حدیثوں کی معرفت میں اہل خراسان کی برتری  
 اور تقدّم کے معترف ہیں، اس کی وجہ شیخین (بخاری و مسلم رحمہما اللہ) کی اس فن میں مہارت  
 و انفرادیت ہے، اللہ ان دونوں بزرگوں کو اسلام کی اس خدمت کی جزائے خیر عطا کرے،  
 میں نے ان کی کتابوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے، اس میں ان کی صحیح و سقیم  
 حدیثوں کی متفق علیہ اور مختلف فیہ شرطوں کا ذکر ہے، (۲) اس کی ابتدا میں حدیثوں کی حفظ  
 و اشاعت کے بارے میں حدیثیں اور آثار اور جھوٹی حدیثیں گھڑنے کے متعلق وعیدیں  
 بیان کی گئی ہیں، پھر ان لوگوں کے نام تحریر کئے گئے ہیں جن کا صحیحین یا ان میں سے کسی ایک

(۱) الاقان ج ۲ ص ۱۹۰ (۲) المدخل الی علم الحدیث ص ۶۔

کے اندر ذکر ہے، اس کے بعد ان اشخاص کا ذکر ہے جن سے امام بخاری نے روایتیں کی یا سنی ہیں، حافظ محمد طاہر مقدسی نے اس کتاب کے اکثر مباحث الجمع بین رجال الصحیحین میں درج کئے ہیں۔

۱۹- مزکی الاخبار: معرفۃ علوم الحدیث کے بعض قلمی نسخوں میں اس کا نام کتاب المزکین لرواۃ الاخبار لکھا ہوا ہے، حاکم خود اس کے متعلق لکھتے ہیں ”اس میں راویوں کے دس طبقوں کا ذکر ہے، ہر طبقہ میں ایک دور کے چار بلند پایہ روایات شامل کئے گئے ہیں، اس طرح کل چالیس راویان حدیث کا اس میں ذکر ملتا ہے، پہلے طبقہ میں حضرت ابو بکر و عمر، علی اور زید بن ثابت (رضی اللہ عنہم) کا ذکر ہے، کیوں کہ ان بزرگوں نے راویوں کی جرح و تعدیل اور روایات کی صحت و سقم کی بحث و تحقیق کی ہے، دسویں طبقہ میں ابواسحاق ابراہیم بن حمزہ اصہبانی، ابوعلی نیشاپوری، ابوبکر محمد بن عمر بن سالم بغدادی اور ابوالقاسم حمزہ بن علی کتابانی مصری کا ذکر ہے۔ (۱)

۲۰- کتاب الاکلیل: بعض مصنفین نے اس کا نام اکلیل فی الحدیث لکھا ہے، یہ کتاب انھوں نے بعض امرا کی فرمائش پر لکھی تھی، اس کے بعد انھوں نے اصول حدیث میں اپنی مشہور تصنیف المدخل الی الاکلیل کے نام سے بھی ایک رسالہ لکھا، اس کے آخر میں وہی باتیں مذکور ہیں جو اکلیل میں بیان کی گئی ہیں، یعنی صحیح حدیثوں کے رموز و طبقات (۲) وغیرہ، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ ”یہ بڑی مفید کتاب ہے اور مفسر (۳) کو اس کے بغیر چارہ نہیں، علامہ ابن عساکر نے حاکم کی ایک کتاب کا نام ”الاکلیل فی دلائل النبوة“ بھی بتایا ہے، غالباً یہ کوئی اور کتاب ہوگی یا ممکن ہے نام میں تصحیف ہو گئی ہو۔

۲۱- المدخل الی علم الحدیث: المدخل الی معرفۃ الصحیح والصحیح من الاخبار اور

(۱) معرفۃ علوم الحدیث ص ۵۲ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۱۳۵ (۳) مفسر کا لفظ یہاں کتابت کی غلطی

معلوم ہوتا ہے صحیح محدث ہوگا۔

المدخل الی علم الصحیح بھی اسی کے نام ہیں اور غالباً علامہ ابن صلاح اور صاحب کشف الظنون نے المدخل الی اکلیل بھی اسی کا نام تحریر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب الاکلیل کا مقدمہ ہے، خود امام صاحب کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں میں نے اس کو امیر مظفر کی استدعا پر کتاب الاکلیل کی صحیح و سقیم حدیثوں کی نشاندہی کے لیے لکھا تھا۔ (۱) اس میں پہلے علم اسناد و روایت کی اہمیت، محدثین کی فضیلت اور کتب حدیث کے بعض طبقات کا اجمالاً ذکر کرنے کے بعد صحیح حدیثوں کی دس قسمیں بیان کی گئی ہیں، ان میں پانچ قسمیں متفق علیہ اور پانچ مختلف فیہ ہیں، پھر نقد و جرح پر گفتگو کی گئی ہے اور آخر میں اکلیل کی حدیثوں کے متعلق ان امور کا ذکر ہے، جن سے ان کی صحت و ضعف کا پتہ چل جاتا ہے لیکن حاکم نے اس میں متفق علیہ اور مختلف فیہ حدیثوں کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے، بعض علما نے اس پر اعتراضات بھی کئے ہیں، شیخ محمد راغب طباطبائی نے مطبوع علمی حلب سے جمادی الاول ۱۳۵۱ھ میں اس مفید رسالہ کو شائع کیا ہے۔

۲۲- تاریخ نیشاپور: یہ بڑی ضخیم کتاب ہے، اس میں خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد کی طرح علما و مشاہیر فن کے تراجم درج ہیں اور حوادث و واقعات کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، (۲) اسی لیے اس کا نام تاریخ علمائے نیشاپور بھی ہے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ ”حاکم کے اس عظیم الشان کارنامہ کے سامنے نامور محدثین و فقہاء کو سرنگوں ہو جانا پڑا جو اس کا بغور مطالعہ کرے گا اس کو ان کے گونا گوں کمالات اور مختلف علوم میں جامعیت کا پورا اندازہ ہو جائے گا۔“ ابو الفضل بن فلکی ہمدانی فرماتے ہیں کہ ”میرے نیشاپور کا سفر کرنے اور وہاں اقامت اختیار کرنے کی ایک وجہ حاکم کی اس تاریخ کو دیکھنا بھی تھا۔“

عبدالغافر بن اسماعیل فارسی نے اس کا ذیل لکھا تھا، اس میں ۵۱۸ھ تک وفات پانے والے لوگوں کا ذکر ہے اور علامہ ذہبی نے ”مختصر تاریخ حاکم“ کے نام سے اس کا

(۱) المدخل الی علم الحدیث ص ۳۲ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۵۳۳۔



اختصار لکھا تھا۔ (۱)

۲۳- معرفۃ علوم الحدیث: یہ علوم حدیث پر ایک اہم اور مفید کتاب ہے، امام حاکم کو اپنے زمانہ میں بدعتوں کی کثرت، سنن سے عام ناواقفیت اور حدیثوں کے ضبط و تحریر میں اہمال اور لاپرواہی کی وجہ سے اس کی ترحیب و تصنیف کا خیال ہوا تھا۔ (۲) اس سے پہلے علوم حدیث میں جو کتابیں لکھی گئی تھیں، ان کی حیثیت متفرق اجزا کی تھی، ابو محمد حسن بن عبدالرحمن بن خالد رامہرمزی (م ۲۶۰ھ) کی کتاب الحدیث الفاصل بین الراوی والواعی، اس موضوع کی پہلی باقاعدہ کتاب ہے لیکن اس میں مکمل استیعاب و استقصا نہیں کیا گیا تھا، (۳) حاکم کے بعد خطیب بغدادی اور علامہ ابن صلاح کی کتاب التمام و معلومات کے لحاظ سے اہم ہیں لیکن حاکم کا شرف و تقدم مسلم ہے، مگر حافظ ابن حجر مانتے ہیں کہ ”حاکم اپنی کتاب کی باقاعدہ ترتیب و تہذیب نہیں کر سکے۔“ (۴) لیکن یہ بیان محل نظر ہے، علامہ ابن خلدون رقمطراز ہیں کہ ”علوم حدیث میں لوگوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں لیکن اس فن کے یگانہ روزگار ائمہ و علمائے فحول میں ابو عبد اللہ حاکم ہیں، ان کی کتابیں مشہور ہیں، انھوں نے اس فن کو باقاعدہ مرتب و مہذب کیا اور اس میں بعض انواع کا اضافہ کیا اور اس کے محاسن اچھی طرح منقح اور نمایاں کئے (۵) اور ملا جلی لکھتے ہیں کہ ”اس فن کی جانب سب سے پہلے ابو عبد اللہ حاکم نے اعتناء کیا، اس کے بعد علامہ ابن صلاح نے علوم الحدیث کے نام سے بڑی اہم اور قابل ذکر کتاب لکھی جو مقدمہ ابن صلاح کے نام سے مشہور ہے، اس میں انھوں نے بعض انواع کا مفید اضافہ کیا ہے لیکن حاکم کی حیثیت متقدم و متبوع کی ہے اور ابن صلاح ان کے تابع ہیں انھوں نے اکثر چیزیں حاکم کے حوالہ سے لکھی ہیں۔“ (۶)

(۱) کشف الظنون ص ۲۳۴ (۲) مقدمہ حاکم ص ۱۰۱ (۳) تدریب الراوی ص ۹ و نخبۃ الفکر فی شرح نہبۃ النظر ص ۳ (۴) تدریب الراوی ص ۹ و نخبۃ الفکر فی شرح نہبۃ النظر ص ۳ (۵) مقدمہ ابن خلدون ص ۲۸۵ (۶) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۲۹۔



اس تفصیل سے ثابت ہو گیا کہ اس موضوع پر یہ دو شرح باقاعدہ اور پہلی مکمل و جامع کتاب ہے، جو پانچ اجزا اور باون انواع پر مشتمل ہے، اس میں مصنف نے حدیث کے اسناد و متون وغیرہ گونا گوں انواع و اقسام اور راویوں کے مختلف درجات و طبقات، ان کے مراتب اور اصول حدیث کے مہمات مسائل پر سیر حاصل اور عمدہ بحثیں کی ہیں، ہر بحث کی تعریف، اہمیت، نوعیت اور ضرورت کو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں متقدمین کے کاموں کا ایک حد تک ذکر بھی آ گیا ہے، ہر بحث میں پہلے احادیث و آثار سنداً بیان کئے گئے ہیں اور آخر میں ان سے مصنف نے جو حقائق اور معنی خیز نتائج اخذ کئے ہیں، ان کا ذکر ہے۔ ضمناً اکثر صحابہ و راویان حدیث کے بعض خصوصیات سنہن و فوات اور ان کے بارے میں دوسرے مختلف النوع معلومات بھی تحریر کئے گئے ہیں۔

معرفیہ علوم الحدیث کے قلمی نسخے یورپ، ترکی، مصر، شام اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، ان سب کی مدد و مقابلہ و تصحیح کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات و عربی کے سابق صدر ڈاکٹر سید معظم حسین نے اس کو ایڈٹ کیا تھا جو ۱۹۳۵ء میں مصر سے دائرۃ المعارف حیدرآباد کے اہتمام میں شائع ہوا ہے، اس کے شروع میں فاضل مرتب نے ایک جامع و مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے، اس میں مصنف کے حالات و کارنامے اور اصول حدیث کی مہمات کتب کا تذکرہ کیا گیا ہے اور حواشی میں نسخوں کے فرق و اختلاف اور کمی بیشی کی تصریح کی ہے۔

حافظ ابو نعیم اصبہانی نے اس پر مستخرج لکھا تھا اور علامہ طاہر جزائری نے توجیہ النظر میں اس کا مخلص شامل کیا ہے۔ (۱)

۲۴- المستدرک علی الصحیحین: یہ حاکم کی سب سے اہم اور شہرہ

آفاق کتاب ہے، ذیل میں اس کے متعلق ضروری معلومات پیش کئے جاتے ہیں:

(۱) مقدمہ صحیح۔

مستدرک کی تعریف: محدثین کی اصطلاح میں حدیث کی وہ کتابیں مستدرک کہلاتی ہیں جن میں ان حدیثوں کو نقل کیا جاتا ہے جو حدیث کی کسی اور کتاب کی شرط کے مطابق ہونے کے باوجود اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہوں۔ (۱) اس طرح کی حدیث کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ابو عبد اللہ حاکم کی المستدرک علی الصحیحین زیادہ مشہور و متداول ہے، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم پر مستدرک ہے، یعنی اس میں ان حدیثوں کو شامل کیا گیا ہے جو حاکم کے خیال میں صحیحین کے معیار و شرائط کے مطابق ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔

مستدرک کی تالیف کی وجہ: حاکم نے مستدرک کے شروع میں اس کی جمع و تالیف کا سبب و مقصد اور ان حالات کا ذکر کیا ہے جو اس کی ترتیب و تصنیف کا باعث ہوئے تھے، وہ لکھتے ہیں:

”ائمہ حدیث میں ابو عبد اللہ محمد اسماعیل بنی ابوالحسین، مسلم بن حجاج قشیری نے صحیح حدیثوں کے دو نہایت عمدہ اور بیش قیمت مجموعے مرتب کئے ہیں، ان دونوں کتابوں کی چار دانگ عالم میں شہرت ہے لیکن دونوں بزرگوں میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ بجز ان حدیثوں کے جن کی انہوں نے تخریج کی ہے اور کوئی حدیث صحیح نہیں ہے مگر ہمارے زمانہ کے بعض مبتدعین اور اہل ابوا جو محدثین پر سب و شتم کرنے میں بہت جری واقع ہوئے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے، رہے وہ اسانید جو ایک ہزار یا اس سے کچھ کم و بیش اجزا پر مشتمل ہیں سب کے سب سقیم اور غیر صحیح ہیں، اس صورت حال کے پیش نظر اس شہر کے کچھ اعیان و مشاہیر اہل علم نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایسی کتاب مرتب و مدون کروں جو ان حدیثوں پر مشتمل ہو جن کے اسانید اسی طرح کے..... ہوں جس طرح کے

اسانید کو شیخین نے صحیح اور قابل احتجاج قرار دیا ہو اس لیے کہ جو حدیث علت

قادحہ سے خالی ہو اس کو صحیح سے خارج کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔“ (۱)

مستدرک کی اہمیت: مستدرک کا شمار حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہوتا ہے اور بعض حدیثوں سے اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کو محسوب کیا ہے، (۲) اس طبقہ میں مسند دارمی، سنن دارقطنی، مسند ابوداؤد طیالسی اور مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ جیسی اہم اور بلند پایہ کتابیں ہیں، بعض محدثین نے اس کا پایہ صحیح ابن حبان کے قریب قریب بتایا ہے، (۳) اور اس کا نام بھی صحیح ابن خزمیہ اور صحیح ابن حبان کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، حافظ ابن صلاح اور علامہ نووی نے صحاح کے بعد حدیث کی جن کتابوں کو زیادہ اہم، قابل اعتماد اور پر از منفعت قرار دیا ہے، ان میں امام دارقطنی کی سنن کے بعد اسی کا نام لیا ہے۔ (۴)

مستدرک کی حدیثوں کی نوعیتیں: اوپر حاکم کا جو بیان گذرا ہے، اس سے اور حاکم کی دوسری تصریحات سے مستدرک کی حدیثوں کی مندرجہ ذیل نوعیتوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱- مستدرک میں شیخین (امام بخاری و امام مسلم) کی ان متروک حدیثوں کو جو ان کے معیار و شرائط کے مطابق ہیں جمع کیا گیا ہے۔

۲- دونوں بزرگوں میں سے صرف ایک کی متروک حدیثوں کو بھی درج کیا گیا ہے۔

۳- مستدرک میں ایسی حدیثیں بھی شامل ہیں جو صحیحین کے اصول و شرائط کے

مطابق تو نہیں ہیں لیکن امام حاکم کی تحقیق میں وہ صحیح اور علل و اسقام سے پاک ہیں۔ (۵)

۴- حاکم کے (۶) بیان کے مطابق بعض ایسی حدیثیں بھی مستدرک میں ہیں

(۱) المستدرک ج ۱ ص ۳۰۲ (۲) بحوالہ تانفہ مع فوائد جامعہ (۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۸ (۴) مقدمہ

ابن صلاح ص ۱۹۲ تدریب الراوی ص ۳۰، ۳۱ و ۲۶ (۵) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱ (۶) یہ حاکم کا خود

بیان ہے ورنہ عام اہل فن نے تو مستدرک میں ضعیف اور موضوع حدیثوں کی کثیر تعداد بتائی ہے۔

جن پر کلام کیا گیا ہے اور وہ ان کے معیار و شرائط کے مطابق بھی نہیں ہیں لیکن انھوں نے ان کو شاہد و متابعات کی حیثیت سے یا اور کسی خاص اضطرار وغیرہ کی بناء پر نقل کیا ہے۔

حاکم نے مستدرک میں کہیں کہیں ایک مقدمہ کا حوالہ دیا ہے جس میں انھوں ان اصول و خصوصیات اور شرائط کا مفصل ذکر کیا تھا جن کو مستدرک کی تالیف و ترتیب میں مدنظر رکھا تھا لیکن یہ مقدمہ مستدرک کے مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں ہے، وہ یا تو محفوظ نہیں رہا یا حاکم نے اس کو مرتب ہی نہ کیا ہو اور اس بنا پر کہ اس کو لکھنے کا ارادہ تھا، اس کا حوالہ دے دیا ہو، اگر یہ مقدمہ موجود ہوتا تو اس سے مستدرک کے اصول و شرائط اور اس کی حدیثوں کی نوعیت اور خصوصیات معلوم کرنے میں بڑی آسانی ہوتی، جہاں انھوں نے اس کے حوالے دیے ہیں ان سے بھی مستدرک کی حدیثوں کی نوعیت اور خصوصیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، اس ذیل میں مستدرک کی حدیثوں کی بعض نوعیتیں ان حوالوں کی مدد سے لکھی جاتی ہیں۔

۵- مستدرک میں ایک صحابی کی حدیث دوسرے صحابی سے بشرطے کہ وہ صحیح

طریق سے ثابت ہو درج کی جائے گی۔ (۱)

۶- اگر کسی صحابی سے کسی ایک ہی معروف تابعی کی روایت کا پتہ چل سکا ہو تو اس

کو بھی مستدرک میں بطور حجت پیش کیا جائے گا اور اس کو صحیح قرار دیا جائے گا۔ (۲)

۷- ثقات کے تفرد اور اضافے کی تخریج بھی کی جائے گی، بشرطے کہ وہ مرتب

کے خیال میں علتوں سے خالی ہوں کیوں کہ ثقہ کا اضافہ مقبول ہوتا ہے۔ (۳)

۸- کسی موصول و مسند حدیث کو اگر ارسال اور موقوفاً بھی روایت کیا گیا ہو تو

موصول و مسند حدیث کو محض دوسری حدیث کے وقف و ارسال کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا

جائے گا، کیوں کہ ہمارے اصول اور قاعدے کے مطابق ایسی صورت میں مسند و موصول

روایت کرنے والے کی حدیث قابل قبول ہوگی۔ (۴)

(۱) المسند رک ج ۱ ص ۱۱۸، ۱۱۹، (۲) ایضاً ص ۲۳، (۳) ایضاً ص ۳۲، ج ۲ ص ۵۸، (۴) ایضاً ج ۱ ص ۱۷۲۔

۹- حلال و حرام کے متعلق احادیث میں زیادہ احتیاط اور سختی برتی جائے گی، مگر فضائل اعمال کے سلسلہ کی حدیثوں میں زیادہ سختی سے کام نہ لیا جائے گا، اس اصول کے متعلق انھوں نے کتاب الدعوات میں شیخین کی متروک حدیثوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ابوسعید عبدالرحمن بن مہدی کا یہ قول بھی تحریر کیا ہے کہ:

”ہم لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حلال و حرام سے متعلق حدیثیں روایت کرتے ہیں تو اسانید و رجال کو پرکھنے میں زیادہ شدت برتتے ہیں اور پوری احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہیں مگر فضائل اعمال اور ثواب و عقاب، مباحات و دعوات سے متعلق روایات کے اسانید میں تساہل سے کام لیتے ہیں۔“ (۱)

المدخل میں اس قول کے ساتھ امام احمد کا بھی اسی طرح کا ایک قول نقل کیا ہے:

”جب ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرویات بیان کرتے ہیں تو حلال و حرام اور سنن و احکام کے سلسلہ میں تشدد سے اور فضائل اعمال اور غیر احکامی حدیثوں میں لینت اور نرمی سے کام لیتے ہیں۔“ (۲)

تلاش و تفحص: امام ابو عبد اللہ نے ان ہی اصول و شرائط کے مطابق مستدرک میں حدیثیں جمع کی ہیں اور جو حدیثیں ان کے بیان کے مطابق نہیں ہیں، ان کو نقل کرنے سے احتراز کیا ہے، چنانچہ کہیں کہیں مستدرک میں اس کی تصریح و توضیح کی ہے، اس سے مستدرک کی جمع و تالیف اور ترتیب و تدوین میں ان کی تلاش و محنت اور چھان بین کا پتہ چلتا ہے، بعض مواقع پر انھوں نے خود بھی اس تلاش و تحقیق کا ذکر کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

”میں نے مشہور حدیث ”من سئل عن علم فکتہ جیبی بہ“

یوم القيامة وقد الجم بلجام من نار۔“ کے متعلق جو متعدد طرق و اسانید

سے مروی ہے، امام دارقطنی سے دریافت کیا کہ کیا عطار کی روایت کے متعدد اسناد

(۱) المستدرک ج ۱ ص ۳۹۰ (۲) المدخل ص ۴۔

میں کوئی سند صحیح ہے، انھوں نے جواب دیا کہ نہیں، میں نے وجہ دریافت کی تو کہا کہ عطا نے حضرت ابو ہریرہؓ سے سماع نہیں کیا ہے لیکن جب میں نے اس کی مزید تحقیق کی تو متعدد لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ انھوں نے ابو ہریرہؓ سے عطاء کے سماع کا ذکر کیا ہے، اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ حدیث صحیح سندوں سے مروی ہے اور اس میں کوئی سقم نہیں ہے، میری اس تحقیق کو امام دارقطنی نے بھی پسند کیا اور اس بارے میں وہ میرے معترف اور ہمنوا ہو گئے۔“ (۱)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

”زکوٰۃ کی تفسیر و توضیح کرنے والی حدیثوں کی تخریج میں جس قدر ممکن ہو سکا ہے، میں نے اپنی غیر معمولی محنت و کاوش صرف کر دی ہے اور ان کی صحت کے بارے میں خلفائے اربعہ، صحابہ اور تابعین کے صحیح اسناد، ان کے تعامل اور شہرت و قبول سے استدلال بھی مہیا کر دیا ہے جو غور و فکر کرنے والوں کے لیے کافی ہے۔“ (۲)

حاکم کی کاوش کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مستدرک میں ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن سے حدیث کی دوسری کتابیں خالی ہیں۔

مستدرک کے خصوصیات: مستدرک کے بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱- حاکم نے اس کی ترتیب، ابواب کی تیویب اور احادیث کے نقل و انتخاب میں حسن و موزونیت کے علاوہ بعض مقامات میں جدت و اختراع سے بھی کام لیا ہے، اس سے ان کی محنت اور جانفشانی کا اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

”جہاں تک تلاش و اجتہاد نے میری رسائی کی ہے میں نے خلفائے

اربعہ کے لمسائل سے متعلق وہ تمام حدیثیں جمع کر دی ہیں جو صحیح سندوں سے مروی

ہیں اور جن کو شیخین نے ترک کر دیا ہے، پھر میں نے اس کتاب کے نظم و ترتیب

کے لحاظ سے یہ مناسب سمجھا کہ ان بزرگوں کے مناقب کے بعد دیگر صحابہ کے

فضائل و فیات کی ترتیب پر جمع کروں۔“ (۱)

عام محدثین کے برخلاف انھوں نے کتاب الفتن والملاحم کے بعد کتاب  
الاہوال کا بھی ایک علاحدہ باب علامہ ابن خزیمہ کے تتبع میں قائم کیا ہے، اس کا ذکر کرتے  
ہوئے لکھتے ہیں:

”میرے مبلغ علم کے مطابق آخری زمانہ کے فتن کے متعلق آں حضرت

صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ مروی تھا، وہ سب میں نے اس کے اندر بہتر سندوں  
کے ساتھ بیان کر دیا ہے، شیخین نے قیامت اور حشر و نشر کے اہوال کی حدیثیں  
کتاب الفتن ہی میں شامل کر دی ہیں لیکن میں نے اس سلسلہ میں ابو بکر بن محمد

بن اسحاق بن خزیمہ کے انداز پر اس کو باب الفتن سے علاحدہ ذکر کیا ہے۔“ (۲)

امام بخاری وغیرہ محدثین نے کتاب البیوع میں متعدد مستقل ابواب مثلاً کتاب  
السلم، شفعہ اور اجارہ وغیرہ قائم کئے ہیں لیکن حاکم نے کتاب البیوع کے جامع عنوان ہی  
میں ان سب ابواب کو بھی جمع کر دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

”میں نے اسی کتاب (کتاب البیوع) کے ضمن میں ان کتب کو بھی

درج کر دیا ہے جن کے لیے امام بخاری نے کتاب البیوع کے آخر میں مستقل  
عنوانات قائم کئے ہیں، یہ وضاحت اس لیے کر دی گئی تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ

میں نے کتاب البیوع کو ان ابواب سے خالی رکھا ہے۔“ (۳)

فضائل صحابہ میں صرف صحابہ کے مناقب و فضائل ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا  
ہے بلکہ ان کے سنین اور مختصر حالات بھی تحریر کئے ہیں۔

۲- دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری و امام مسلم کی کتابوں کی بھی بعض

(۱) ایضاً ج ۳ ص ۱۸۰ (۲) المسد رک ج ۳ ص ۵۵۸ (۳) ایضاً ج ۲ ص ۶۶ و ۶۷۔



خصوصیات و اصول اور اس کے متعلق مفید معلومات اس سے معلوم ہو جاتے ہیں، مثلاً:  
 (الف) شیخین نے بعض غیر معلل حدیثوں کو نقل کرنے سے اس لیے احتراز کیا ہے کہ ان کے رواۃ میں کوئی راوی قلیل الروایت رہا ہو، چنانچہ ایک حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

”اس حدیث کے از اول تا آخر تمام رواۃ سے بجز یوسف بن ابی بردہ کے شیخین نے حجت قائم کی ہے اور جو کچھ اس سلسلہ میں مجھ کو معلوم ہوا ہے، وہ یہ کہ ان دونوں حضرات نے کسی جرح و ضعف کی وجہ سے ان کو نہیں چھوڑا ہے بلکہ ان کی قلبی روایت کی وجہ سے۔“ (۱)

(ب) شیخین نے بعض صحیح حدیثوں کو کسی ایک راوی کے تفرّد یا اس حدیث کے دوسرے رواۃ کی کسی مخالفت و عدم متابعت کی وجہ سے اس کو نظر انداز کر دیا ہے، حاکم اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت عثمانؓ سے وضو کے متعلق جو حدیث مروی ہے، اس کے طرق کی تخریج پر شیخین نے بھی اتفاق کیا ہے لیکن ان کی روایات میں داؤسی کے تین بار خلال کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، حالانکہ یہ بھی صحیح اسناد سے ثابت ہے اور ان دونوں بزرگوں نے عامر بن شقیق کے سوا اس کے تمام رواۃ سے حجت قائم کی ہے لیکن عامر کے متعلق مجھ کو کسی طعن کا کوئی علم نہیں۔“ (۲)

(س) شیخین کے غیر معمولی حزم و احتیاط کی بنا پر روایت ترک کر دینے کا اصول بھی اس سے معلوم ہوتا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

”یہ حدیث صحیح الاسناد ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے عبد اللہ بن محمد

بن عقیل ابن ابی طالب کے تفرّد اور ان کی جانب سوء حفظ کی نسبت کی وجہ سے اس

کی تخریج نہیں کی ہے مگر ہمارے ائمہ متقدمین کے نزدیک وہ ثقہ و مامون شخص ہیں۔“ (۱)

(ج) شیخین کے کسی راوی سے استشہاد کا حال معلوم ہوتا ہے۔

(د) شیخین یا ان میں سے ایک کے بارے میں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے حاکم کے کن کن رواد سے احتجاج کیا ہے۔

(ہ) حدیثوں کے شیخین کے شرائط کے مطابق ہونے کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حدیثوں کو انھوں نے مکمل یا مختصر صورت میں یا قدرے فرق و اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے، چنانچہ کتاب العلم کی ایک حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

”اس کو شیخین نے مفصل و مختصر دونوں طرح ذکر کیا ہے، میں نے اس کا

اعادہ اس وجہ سے کیا ہے کہ اس کے سوا مجھے ان کے یہاں اجماع کی حجیت ثابت

کرنے والی اور کوئی حدیث نہیں ملی، باقی ان ابواب میں اس موقع پر میں نے

متعدد ایسی حدیثیں نقل کی ہیں جن کی ان لوگوں نے تخریج نہیں کی ہے۔“ (۲)

۳- مستدرک میں فقہی مسائل سے کم تعرض کیا گیا ہے تاہم ان کے ذکر سے یکسر

خالی نہیں ہے اور حاکم نے بعض فقہی اختلافات میں مرجع واولیٰ کی نشاندہی بھی کی ہے، جس

سے ان کی اجتہادی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۴- مستدرک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض حدیثوں کے مراجع

ومصادر کی نشاندہی بھی کی ہے، اس سلسلہ میں جامع بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن

نسائی، مؤطا امام مالک، المہموط امام شافعی اور صحیح ابن خزیمہ کے نام لیے ہیں لیکن بعض کتب

ومسانید ووجدان کا نام لیے بغیر بھی ذکر کیا ہے۔

۵- بعض ابواب اور مضامین کی حدیثوں کو جمع کرنے میں بڑا اہتمام کیا ہے اور

بعض حدیثوں کے اسناد و طرق کو جمع کرنے میں بڑے استقصا سے کام لیا ہے، اسی لیے مستدرک میں بکثرت ایسی حدیثیں ہیں جن سے دوسری کتب حدیث خالی ہیں۔

۶- حدیثوں کی تصحیح و تصویب، ان کے قوی عزیز، ضعیف و شاذ اور غریب ہونے کی نشاندہی، وقف و ارسال، رفع و اتصال اور علوے اسناد کی تصریح، حفظ و ضبط اور اتقان کے لحاظ سے اس کے اولیٰ و احسن ہونے اور علت و ضعف اور سقم و عیب سے خالی ہونے کا ذکر، راویوں کی توثیق، دور و اوتوں اور راویوں میں باہمی موازنہ، راوی کے شک و وہم، اس کے تفرّد، مخالفت، عدم متابعت اور سماع و لقا یا عدم سماع بقا کی توضیح اور بعض حدیثوں کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ اس کو کس جگہ کس وقت اور کس ماہ و سنہ میں انہوں نے روایت کیا ہے، اسی طرح روایات کے شواہد و متابعات، فنی مباحث کے متعلق علمائے جرح و تعدیل کے اقوال، روایات و رواۃ کی صحت و قوت یا ضعف و جرح کو واضح کر کے اس کے دلائل بھی بیان کئے ہیں اور حدیث کے مفہوم وغیرہ کے سلسلہ میں بھی مختلف النوع وضاحتیں کی ہیں جن کو آگے لکھا جائے گا۔

طرز استدلال: مستدرک کے محاسن و خصوصیات کا اندازہ اس کے طرز استدلال سے بھی ہوتا ہے، لیکن اکثر دلائل خالص فنی نوعیت کے ہیں، اس لیے جب تک ان کا اصل پس منظر اور پوری تفصیل سامنے نہ ہو ان کو نقل کرنا نذ زیادہ مفید ہوگا اور نہ عام لوگوں کے لیے اس میں دلچسپی کا کوئی سامان ہے لیکن حاکم کے استدلال کی خصوصیت اور ان کے نقد و نظر کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں ان کے ان انتقادات کا ذکر کیا جاتا ہے جو انہوں نے شیخین پر کئے ہیں، شیخین پر حاکم کے نقد و تبصرہ دو طرح کے ہیں، ایک تو وہ جن میں کسی حدیث کے بارے میں صرف شیخین کی عدم تخریج کا ذکر ہے، دوسرے وہ جن میں شیخین کے عدم تخریج کے وجوہ و اسباب کا ذکر کرنے کے بعد ان پر تنقید کی گئی ہے، ان میں سے دوسری نوع کی بعض تنقیدیں یہاں درج کی جاتی ہیں:

”یہ حدیث صحیح اور ثقہ محدثین کے یہاں متداول ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے اس لفظ کے ساتھ اس کی تخریج نہیں کی ہے، میرے خیال میں ان لوگوں نے اس کے راوی ہصان بن کامل (یا کاہن) کی وجہ سے اس کو چھوڑ دیا ہے، کیوں کہ ان سے روایت کرنے والے معروف شخص محض حمید بن ہلال عدوی ہیں لیکن ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ ان سے قرہ بن خالد نے بھی روایت کیا ہے، علاوہ ازیں خود شیخین نے بھی بعض ثقہ لوگوں سے ایسی روایتوں کی تخریج کی ہے جن سے صرف ایک شخص نے روایت کیا ہے، اس اصول کے بموجب ان دونوں بزرگوں کو اسی جیسی دوسری حدیث کی تخریج بھی کرنی چاہیے تھی۔“ (۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”شیخین اعلیٰ بن عبداللہ کنڈی کے ترک اور عدم احتجاج پر متفق ہیں اور ان سے ان کی ناراضگی کی وجہ محض عبداللہ بن بریدہ کی ایک حدیث کی روایت ہے، حالانکہ اس میں تین ثقہ راویوں نے ان کی متابعت کی ہے، پس یہ حدیث صحیح ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔“ (۲)

امام دارقطنی نے بھی کتاب الاثرات علیٰ العظیمین کے نام سے متدرک علی کی طرح ایک کتاب لکھی تھی، امام حاکم نے اس کے حوالہ سے بھی شیخین پر نقد کیا ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے۔

”یہ صحیح حدیث ہے، اس میں کوئی علت نہیں پائی جاتی لیکن شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے کیوں کہ عروہ، کرز بن علقمہ سے روایت کرنے میں منفرد ہیں اور کرز بن علقمہ صحابی ہیں اور ان کی حدیث ان کے مسانید میں درج ہے۔ میں نے علی بن عمر سے سنا ہے کہ امام بخاری و مسلم کے لیے کرز کی اس حدیث کی

(۱) المسند رک ج ۸ ص ۸ (۲) ایضاً ج ۲ ص ۷۷۔

تخریج لازم تھی، کیوں کہ اس کو عمروہ بن زبیر نے اور ان سے زہری و عبد الواحد جیسے اکابر نے روایت کیا ہے، امام ابوالحسن کے بیان کی واضح دلیل یہ ہے کہ شیخین متنبان ابن مالک جن کے گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی حدیث پر متفق ہیں، حالانکہ ان سے روایت کرنے والے تنہا محمود بن ربیع ہیں۔“ (۱)

حزم و احتیاط: امام حاکم کے اصول و شرائط اور بحث و استدلال سے مستدرک کی تالیف میں ان کی احتیاط کا بھی اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے وہی احادیث و روایات نقل کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کے اصول و معیار کے مطابق غیر معلل اور ضعف و سقم سے خالی ہیں، اس لیے حدیث نقل کرنے کے بعد عموماً انھوں نے اس کی صراحت بھی کر دی ہے کہ وہ قدح و علت اور سقم و عیب سے پاک ہے لیکن حاکم کا عام رجحان یہ ہے کہ کوئی صحیح اور غیر معلل حدیث چھوٹے نہ پائے، اس لیے احتیاط کے باوجود بھی مستدرک میں لہنت و مدہہنت کو راہ مل گئی ہے، اس پر آگے مستقل بحث کی جائے گی۔

احادیث کے متعلق وضاحتیں: امام ابو عبد اللہ حاکم نے احادیث کے بارے میں مختلف النوع وضاحتیں کی ہیں، ان سے احادیث کے متعلق مفید معلومات فراہم ہوتے ہیں، یہ وضاحتیں مختلف طرح کی ہیں۔

۱- کسی حدیث کے متداول ہونے یا کسی خاص مقام میں مروج ہونے کا ذکر۔  
۲- بعض حدیثوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ کسی خاص مسئلہ میں اصل و بنیاد اور حجت و دلیل ہیں۔

۳- بعض حدیثوں کے کسی باب میں نقل کرنے کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔  
۴- حاکم نے بعض حدیثوں کی اپنے زمانہ کے حالات کے لحاظ سے خاص اہمیت و ضرورت واضح کی ہے، مثلاً احکام کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

(۱) المستدرک ج ۱ ص ۴۳۔

”عسرت اور تنگی کے موقع پر مسلمانوں کی مواسات سے احتراز کے زجر و توبخ کے بارے میں جو اخبار و احادیث وارد ہیں، ان کا ذکر یہاں بہت ضروری ہے، کیوں کہ اس وقت مسلمان ان ہی حالات سے دوچار ہیں۔“ (۱)

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

”یہ چھ حدیثیں نہایت تلاش و جستجو کے بعد یہاں نقل کی گئی ہیں، گو یہ ہماری اس کتاب کی شرط کے موافق نہیں ہیں تاہم چون کہ لوگ اس ضیق میں مبتلا ہیں (اللہ اس کو شتم کرے) اس لیے یہاں ہم نے ان کو نقل کر دیا ہے۔“ (۲)

۵- انھوں نے کہیں کہیں ابواب کے شروع یا درمیان میں نوٹ لکھے ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں مثلاً فضائل صحابہ کے ابواب کے شروع میں لکھتے ہیں:

”ہم نے صحابہ کے ذکر میں پہلے ان کے نسب و وفات کا ذکر کیا ہے، پھر ان کے مناقب میں وہ حدیثیں درج کی ہیں جو شیخین کی شرطوں کے مطابق ہیں لیکن انھوں نے ان کی تخریج نہیں کی، ہم کو اعتراف ہے کہ ہم اس باب میں محمد بن عمر و اتدی اور ان کے جیسے لوگوں کی روایات سے صرف نظر نہیں کر سکے ہیں۔“ (۳)

اصحاب صفہ کے بیان میں حاکم نے ان کے متعلق روایات کی مدد سے ان کے ناموں کی مفصل فہرست دی ہے، ان کے طبقات وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور ان کے اشغال و معمولات اور امتیازی خصوصیات کے سلسلہ میں ان سے اصحاب تصوف کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ (۴)

مستدرک کی تلخیصات: جن علمائے مستدرک کے ساتھ اعتنا کیا ہے، ان میں علامہ ذہبی

(۱) المستدرک ج ۲ ص ۱۱ (۲) مستدرک ج ۲ ص ۱۳ (۳) ایضاً ج ۳ ص ۶۱ (۴) ایضاً کتاب الحجرۃ

(م ۷۲۸ھ) کا نام زیادہ مشہور ہے، انھوں نے مستدرک کی تلخیص لکھی جو بہت مشہور ہے، اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا کہ خود ان کی اور بعض دیگر علما کی رائے میں اس کو دیکھے بغیر مستدرک کی تصحیح پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اس میں ذہبی نے طویل حدیثوں اور اسناد کا اختصار ہی نہیں کیا ہے بلکہ جا بجا حاکم پر نقد و تعقب بھی کر کے احادیث کی تصحیح میں ان کے تسامح، روایتوں کے ضعف و نکارت اور وضع نیز راویوں کے جرح و سقم وغیرہ کو بھی واضح کیا ہے۔

علامہ ذہبی نے اپنی تلخیص میں بعض مواقع پر حاکم کے استدراک کی توثیق و تائید اور بعض مواقع پر سکوت اختیار کیا ہے، یہ بھی حاکم کی رائے سے اتفاق ہی ہے، رہا ان کا نقد و تعقب تو اس کی مختلف نوعیتیں ہیں:

(الف) حاکم نے کسی حدیث کو شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرائط کے مطابق بتایا ہے اور ذہبی نے اس کی تردید کی ہے۔

(ب) حاکم نے کسی حدیث کو دونوں بزرگوں کے شرائط کے مطابق قرار دیا ہے لیکن ذہبی کی تحقیق میں وہ صرف ایک ہی کی شرط کے مطابق ہے۔

(س) حاکم نے احادیث کی صحت اور رجال و اسناد کی قوت کا ذکر کیا ہے اور ذہبی نے ان کا ضعف و وضع، جرح و قدح اور سقم و نکارت ثابت کیا ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ ذہبی نے بڑی دقت نظر سے مستدرک کی تلخیص کی تھی اور ان کے نقد و تعقب کا زیادہ حصہ صحیح ہے لیکن کہیں کہیں اس میں بھی فروگزاشتیں ہیں مثلاً کسوف کے بیان میں ایک حدیث نقل کرنے کے بعد حاکم نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ (والس یخرجاہ) یعنی شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے، ذہبی نے اس پر یہ تنقید کی ہے:

واسنادہ حسن وما هو علی

شرط واحد منهما. (۱)

سے کسی کی شرط کے مطابق نہیں ہے

(۱) المستدرک کتاب البحر ج ۱ ص ۳۲۵۔

حالاں کہ حاکم نے یہاں سرے سے حدیث کے شیخین کی شرط کے مطابق ہونے کا ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ صرف یہ لکھا ہے کہ انہوں نے اس کی تخریج نہیں کی تھی، اس بنا پر ذہبی کا یہ نقد صحیح نہیں ہے۔

متدرک اور تلخیص کے مصححین نے بھی علامہ ذہبی کے نقد پر تعجب کیا ہے، مثلاً ایک جگہ حاکم نے ایک حدیث کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے، اس پر نقد کرتے ہوئے ذہبی نے لکھا ہے:

عبدالرحمن لم یسمع من  
عبدالرحمن نے اپنے والد سے سماع  
ایہ و عبدالرحمن ومن  
نہیں کیا تھا اور عبدالرحمن اور ان کے  
بعده سوا بحجة  
مابعد کے راوی حجت نہیں۔  
صحیح لکھتے ہیں:

”تقریب احمدیہ میں عبدالرحمن کو ثقہ اور صغار تابعین میں بتایا گیا ہے، ان کا انتقال ۷۹ھ میں ہوا تھا، انہوں نے اپنے والد سے سماع کیا ہے لیکن بہت کم، اسی طرح عبدالرحمن کے صاحبزادے قاسم کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ ثقہ و عابد اور طبقہ رابعہ میں ہیں، پس ذہبی کا ان لوگوں کو مطلقاً عدم حجت قرار دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔“ (۱)

ذہبی ایک جگہ ایک راوی ابو الصہباء کے متعلق لکھتے ہیں کہ ”صحیح بخاری میں ان سے روایت نہیں کی گئی ہے گو واقعہ کے لحاظ سے یہ بات درست ہو لیکن علامہ ذہبی کا منشا حاکم پر نقد اور اس راوی کو ضعیف قرار دینا ہے، جو صحیح نہیں ہے، تقریب ہی کے حوالہ سے صحیح لکھتے ہیں کہ وہ طبقہ رابعہ اور مقبول رواۃ میں ہیں۔“ (۲)

بعض مقامات پر اصل اور تلخیص میں معمولی فرق بھی ہے مثلاً روزے کے بیان

(۱) المستدرک من تلخیص ج ۱ ص ۵۰۹ (۲) ایضاً ص ۵۲۵۔



میں حاکم نے ایک حدیث میں صرف ”والتلت العروق“ لکھا تھا مگر ذہبی نے اس کو تلخیص میں ”والتلت العروق بالماء“ لکھا ہے، (۱) ایک اور جگہ حاکم نے ”انار“ لکھا تھا، ذہبی نے اس کو ”انان“ کر دیا ہے، (۲) ایک جگہ حاکم نے ”ثنا یعقوب بن ابراہیم“ لکھا ہے، ذہبی نے اس کو بدل کر ”رواہ یعقوب الدورقی“ (۳) کر دیا ہے، گو یعقوب بن ابراہیم اور یعقوب الدورقی ایک ہی شخص ہیں لیکن اس تصرف سے اشتباہ ہو سکتا ہے، دوسرے ذہبی نے ثنا کو جو خود مختصر تھا رواہ کر دیا ہے۔

مستدرک کی یہ تلخیص بھی اس کے ساتھ چار ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

۲- امام سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے توضیح المستدرک فی تصحیح المستدرک لکھی تھی جو ایک

جلد میں ناتمام ہے، اس میں بھی حدیثوں کی تلخیص ہے۔ (۴)

۳- مستدرک کی موضوع حدیثوں کو بھی ایک جزی میں جمع کیا گیا تھا جو تقریباً ایک

سود حدیثوں پر مشتمل ہے، (۵) بعض لوگوں نے اس کو بھی ذہبی کی تصنیف بتایا ہے۔

مستدرک کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، دائرة المعارف

حیدرآباد نے جس کے اسلامی علوم و فنون کی خدمت اور علمائے اسلام کی بیش قیمت اور

کیاب کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں کارنامے اظہر من الشمس ہیں، اس شہرہ آفاق

کتاب کو بھی اس کے کئی مخطوطات کی مدد سے چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا تھا، پہلی جلد

۱۳۳۳ھ اور باقی جلدیں؛ ترتیب ۱۳۳۰ھ تا ۱۳۳۲ھ میں تصحیح و تہذیب کے بعد شائع کی ہیں۔

فاضل مصحح نے مستدرک اور تلخیص پر کہیں کہیں مختصر مگر مفید نوٹ لکھے ہیں،

مستدرک کی اشاعت کے بعد دارالمصنفین کے سابق رفیق اور مشہور صاحب علم و قلم مولانا

ابوالجلال ندوی نے اس پر ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا، اس میں مستدرک کے ناشرین کو بعض

(۱) المستدرک مع تلخیص ج ۱ ص ۲۲۲ (۲) ایضاً ج ۲ ص ۳ (۳) ایضاً ج ۱ ص ۱۱۵ (۴) کشف الظنون

ج ۲ ص ۲۲۷ (۵) ایضاً۔

مشورے دیے تھے، اس کے جواب میں دائرۃ المعارف کے رکن مولانا ہاشم ندوی کا مضمون بھی اسی زمانہ میں چھپا تھا۔ (۱)

صحیح مستدرک اور حاکم پر بعض اعتراضات کا جائزہ: حاکم اور ان کی مستدرک پر چند اعتراضات بھی کئے گئے ہیں، ان میں سے بعض تو غلط ہیں اور بعض اگر غلط نہیں ہیں تاہم وہ بحث و تنقیح طلب ضرور ہیں، اس لیے مستدرک کی اہمیت و خصوصیت بیان کرنے کے بعد ان کا جائزہ لینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

امام حاکم اور ان کی مستدرک پر سب سے مشہور الزام تساہل کا ہے، اس سلسلہ میں چند اور ضمنی الزامات بھی عائد کئے گئے ہیں، گوان کا اصل تعلق بھی تساہل ہی سے ہے لیکن ان پر علاحدہ علاحدہ اور مستقلاً گفتگو کرنا زیادہ مفید و مناسب ہوگا۔

مستدرک اور صحیحین: پہلے گذر چکا ہے کہ مستدرک کی تالیف کا مقصد صحیحین کی ان متروک حدیثوں کو جمع و مدون کرنا ہے جو حاکم کے خیال میں ان کی شرطوں کے مطابق صحیح ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں کی گئیں، اس سلسلہ میں بحث طلب امر یہ ہے کہ حاکم نے جن حدیثوں کے صحیحین کی شرطوں کے مطابق صحیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے وہ واقع میں صحیح ہیں یا نہیں۔

۱- ابو سعید مالینی کا بیان ہے کہ ”میں نے مستدرک کا مطالعہ کیا تو مجھ کو اس کی ایک حدیث بھی شیخین کے شرائط کے مطابق نہیں ملی۔“ (۲)

۲- دوسرے علمائے فن کے نزدیک مستدرک کی تمام حدیثیں تو نہیں متعدد ایسی ضرور ہیں جن کے متعلق حاکم کا یہ دعویٰ خلاف واقعہ ہے کہ وہ شیخین کی شرائط کے مطابق صحیح ہیں، ابراہیم بن محمد ارموی کا یہ بیان اکثر کتابوں میں مذکور ہے کہ:

(۱) پہلا مضمون معارف کے جولائی واگست ۲۶ء کے دوسرا نومبر دسمبر ۲۶ء کے شماروں میں شائع ہوا تھا  
(۲) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹ و بستان المحمدین ص ۴۲۔

”ابو عبد اللہ حاکم نے مستدرک میں بہت سی ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن کے بارے میں گمان کا خیال ہے کہ وہ شیخین کی حدیثوں کی طرح صحیح ہیں جیسے من کنت مولاه ارح اور حدیث طبر وغیرہ لیکن علمائے کبار نے اس سلسلہ میں حاکم کو غلط ٹھہرایا ہے اور ان پر سخت نکیر کی ہے۔“ (۱)

پہلی رائے کو عام طور پر حقیقت سے بعید اور زیادتی پر محمول کیا گیا ہے، علامہ ذہبی نے اس کی نہایت پر زور تردید کی ہے، ان کی تردید اس لیے قابل لحاظ ہے کہ انھوں نے مستدرک کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اس کی تلخیص لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں:

”مستدرک کے متعلق مالینی کی رائے سراسر زیادتی، صریح تا انصافی اور سخت غلو پر مبنی ہے، انصاف کی بات یہ ہے کہ مستدرک کا تقریباً نصف حصہ ایسی حدیثوں پر مشتمل ہے جو شیخین یا کسی ایک بزرگ کے شرائط کے مطابق ہے، البتہ اس کے چوتھائی حصہ میں ایسی حدیثیں ہیں جن کے اسناد تو بظاہر صحیح ہیں لیکن وہ شیخین کی شرطوں کے مطابق نہیں ہیں، بقیہ چوتھائی حصے میں ضعیف و منکر بلکہ موضوع حدیثیں بھی شامل ہیں، میں نے اپنی تلخیص میں ان کی تصریح و تنبیہ کی ہے۔“ (۲)

اس سے دوسری رائے رکھنے والوں کی تائید ہوتی ہے یعنی مستدرک کی بعض حدیثوں کے بارے میں حاکم کا دعویٰ صحیح نہیں ہے لیکن اکثر کے متعلق صحیح ہے۔

اس مسئلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بہت مناسب اور حقیقت پسندانہ توجیہ کی ہے وہ لکھتے ہیں:

حاکم نے صحیحین پر مستدرک لکھا ہے، اس کی حدیثوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ شیخین کی شرطوں کے مطابق ہیں لیکن انھوں نے ان کی تخریج نہیں کی ہے، میں نے

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹، وبتان الحمدین ص ۴۳۔ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹ وبتان

جب مستدرک کا تتبع اور چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ ایک حیثیت سے حاکم کا بیان صحیح ہے لیکن دوسری حیثیت سے صحیح نہیں ہے، اس کی تفصیل و توجیہ یہ ہے۔

مستدرک میں ایسی حدیثیں ہیں جو شیخین کے رجال و اسناد اور ان کی شرائط صحت و اتصال کے مطابق ہیں، اس پہلو سے حاکم کا شیخین پر استدراک صحیح ہے لیکن دوسرے پہلو سے صحیح نہیں ہے کیوں کہ شیخین اسی حدیث کا ذکر کرتے ہیں جس کی صحت پر ان کے شیوخ نے نقد و جرح کر کے اجماع کر لیا ہو، امام مسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی صحیح میں وہی حدیثیں لکھی ہیں جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے لیکن مستدرک کی اکثر متفرّد حدیثیں ایسی ہیں جو شیخین کے زمانہ کے شیوخ اور محدثین پر مخفی اور مستور رہ گئی تھیں، گو بعد میں ان کی شہرت ہو گئی ہو یا ایسی حدیثیں ہیں جن کے رجال کے بارے میں محدثین نے اختلاف کیا ہے کیوں کہ شیخین محض قاعدہ و اصول سے حدیث کی صحت تسلیم نہیں کرتے بلکہ اپنے شیوخ کی طرح احادیث کے وصل و انقطاع وغیرہ کی باقاعدہ بحث و تحقیق کرتے ہیں اور اس میں انہوں نے اس قدر شدت برتی ہے کہ صحت و استناد کا مسئلہ پوری طرح ظاہر ہو گیا ہے، اس کے برخلاف امام حاکم کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ صرف محدثین کے عام قواعد و ضوابط پر اعتماد کر کے حدیثوں کو صحیح قرار دیتے ہیں، مثلاً یہ قاعدہ کہ ثقہ راوی کی زیادتی مقبول ہوتی ہے، یا جب اہل فن وصل و ارسال یا وقف و رفع میں مختلف الرائے ہوں تو اس راوی کا قول حجت مانا جائے گا، جس کے بیان میں اضافہ ہو اور اس نے اس کو یاد رکھا ہو، یہ حقیقت ہے کہ محدثین کے یہاں احادیث کی تصحیح اور جانچ کے اس معیار کی بنا پر خرابی اور خلل پیدا ہوا ہے اور اسی حیثیت سے شیخین اور حاکم کے یہاں فرق پایا جاتا ہے، واللہ اعلم۔ (۱)

علامہ زبیلی حقی کا بھی ایک بصیرت افروز بیان اس سلسلہ میں قابل غور ہے، وہ جہر یا سئلہ کی حدیثوں پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”کسی شخص کے بارے میں مجرد کلام سے اس کی حدیث کو ساقط نہیں قرار دیا جاسکتا کیوں کہ اس طرح تو سند و حدیث کا بیشتر سرمایہ ہی متروک ہو جائے گا، اس لیے کہ جرح و کلام سے اس شخص کے علاوہ جس کو خود اللہ نے معصوم و محفوظ بنا دیا ہو کوئی شخص بھی محفوظ نہیں ہے، صحیحین تک میں ایسے لوگوں کی روایتوں کی تخریج کی گئی ہے جن پر کلام کیا گیا ہے، جیسے جعفر بن سلیمان ضعیفی، حارث بن عبداللہ یادی، ایمن بن نائل حبشی، خالد بن خالد قطوانی، سوید بن سعید حرثانی اور یونس بن اسحاق سیمی وغیرہ لیکن شیخین نے ایسے حکم فیہ لوگوں کی ان ہی روایات کی تخریج کی ہے جن کی متابعت بھی کی گئی ہے اور جن کے شواہد ظاہر و باہر ہیں اور جن کی اصل معروف و معلوم ہے لیکن اس طرح کے راویوں کے تفر و کونہیں بیان کیا اور قبول کیا ہے، خصوصاً ایسے مواقع پر جہاں ان راویوں نے ثقافت کی مخالفت کی ہے، جیسے امام مسلم نے ابواویس کی حدیث ”قسمت الصلوٰۃ بیننی و بین عبدی“ کی اس لیے تخریج کی ہے کہ وہ اس کو بیان کرنے میں متفر و نہیں ہیں بلکہ دوسرے ثقہ و ثابت رواۃ مالک، شعبہ اور ابن عیینہ نے بھی اس کو بیان کیا ہے، اس لیے یہ حدیث متابع ہو گئی ہے، یہ علامت صحیحین پر استدراک کرنے والوں کے یہاں بھی راہ پا گئی ہے، اس لیے ان کے استدراک میں تسامیل پایا جاتا ہے، ان لوگوں میں سب سے زیادہ تسامیل ابو عبداللہ حاکم نے متدرک میں کیا ہے، وہ جن کی حدیثوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ شیخین کی یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہیں ان میں یہ علت موجود ہوتی ہے، صحیحین میں کسی راوی کی روایت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ راوی جس حدیث میں بھی پایا جائے وہ حدیث صحیحین کی شرط کے مطابق ہو جائے گی، حاکم عموماً ایسی حدیث بھی نقل کرتے ہیں جس کے رواۃ کی وجہ سے صحیحین میں اس کی تخریج نہیں کی گئی ہے،

اب اگر اس طرح کی کوئی حدیث حضرت عکرمہؓ سے مروی ہو اور انھوں نے اس کو حضرت ابن عباسؓ سے بیان کیا ہو تو محض اس بنا پر کہ شیخین نے بھی عکرمہ سے ابن عباسؓ کے مرویات کی تخریج کی ہے، اس لیے اس کو بھی صحیحین کے شرائط کے مطابق قرار دیا جائے تو یہ سراسر تساہل ہے، اسی طرح وہ ایسی حدیث بھی نقل کرتے ہیں جس کے بعض رجال بخاری کے اور بعض مسلم کے ہوتے ہیں اور وہ ان کو شیخین کے شرائط کے مطابق قرار دیتے ہیں جو تساہل ہے یا کبھی ایسی حدیث بیان کرتے ہیں جس میں کوئی ایسا راوی ہوتا ہے جس سے شیخین نے اس کی وہ روایت کی ہے جس کو اس نے اپنے کسی خاص استاذ اور متعین شیخ سے سنا ہے کیوں کہ راوی کا اپنے خاص استاذ سے زیادہ اہم تعلق ہوتا ہے اور وہ اس کی حدیث کے حفظ و ضبط میں مشہور ہوتا ہے لیکن وہی راوی جب اپنے دوسرے شیخ سے کوئی روایت کرتا ہے تو اس کی شیخین تخریج نہیں کرتے کیوں کہ اس شیخ سے روایت کرنے میں وہ ضعیف، غیر ضابط اور غیر مشہور یا اسی قسم کی کوئی اور وجہ مانع ہوتی ہے لیکن حاکم نے اس راوی کی ایسی حدیثیں بھی جن کو اس نے اپنے مخصوص متعین شیخ کے بجائے کسی اور شیخ سے بیان کیا ہے، تخریج کی ہے اور کہا ہے کہ روایت شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہے، یہ بھی ان کے تساہل ہی کا نتیجہ ہے، کیوں کہ شیخین اس راوی پر صرف اس صورت میں اعتماد کرتے ہیں جب اس نے حدیث کو اپنے مخصوص متعین شیخ سے روایت کیا ہو مگر جب وہ اپنے دوسرے شیوخ سے روایت کرتا ہے تو اس پر اعتماد نہیں کرتے، مثلاً انھوں نے خالد بن مخلد قطوانی کی ایک حدیث کی جس کو انھوں نے سلیمان بن بلال سے روایت کیا ہے، تخریج کی ہے لیکن ان کی اس روایت کی تخریج نہیں کی ہے جس کو انھوں نے عبداللہ بن شہی کے واسطے سے روایت کیا ہے، کیوں کہ خالد، ابن شہی

سے روایت کرنے میں معروف نہیں ہیں ایسی صورت میں اگر کوئی شخص خالد کی اس روایت کے بارے میں جو وہ ابن شنی سے بیان کریں یہ کہے کہ وہ شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہے تو یقیناً تسائل کہا جائے گا، اسی طرح حاکم ایسی حدیث بھی بیان کرتے ہیں جس کے اسناد میں کوئی رلوی ضعیف یا کذب سے متہم ہوتا ہے، مگر اس کے اکثر رجال صحیح دقوی ہوتے ہیں، اس کے باوجود وہ اس کے متعلق بھی کہہ دیتے ہیں کہ وہ شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہے، یہ بھی سخت قسم کا تسائل ہے، جو شخص مستدرک کا بغور مطالعہ کرے گا اس پر یہ

سب باتیں جو ہم نے بیان کی ہیں خود منکشف ہو جائیں گی۔ (۱)

علامہ زیلیعی حنفی نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی مثالیں ضرور مستدرک میں ملتی ہیں لیکن ایسے بعض مواقع پر جن کا ذکر زیلیعی نے کیا ہے، حاکم نے خود بھی تصریح کر دی ہے، مثلاً جس سند کے تمام رجال صحیح ہوں اور کوئی ایک راوی ضعیف ہو اس کے بارے میں حاکم نے یہ بتا دیا ہے کہ شیخین نے اس حدیث کو قفلاں راوی کی وجہ سے ترک کر دیا ہے، پھر انہوں نے اس راوی کو صحیح و ضابطہ قرار دینے کی کوشش کی ہے، یا اس کے بارے میں علمائے جرح و تعدیل کا اختلاف بیان کر کے لکھ دیا ہے کہ اگر اس کا قوی ہونا ثابت ہو جائے تو یہ روایت بالکل صحیح ہوگی، یہی حال دوسری مثالوں کا ہے، حاکم نے عموماً شیخین کی عدم تخریج کے اسباب بھی بیان کر دیئے ہیں، جن سے ان کے استدرکات کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، تاہم اس میں شبہہ نہیں کہ زیلیعی کی اکثر مثالیں صحیح ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ شیخین کے متعلق حاکم کے سب دعوے خواہ صحیح نہ ہوں لیکن سب غلط بھی نہیں ہیں، حافظ ذہبی نے اپنی تنقیص میں غلط دعووں کی وضاحت کے ساتھ صحیح کی توثیق بھی کی ہے اور جن کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے، اس سے بھی حاکم کی

(۱) نصب الرایہ جلد اول ص ۳۳۲ طبع جدید۔

لصویب ظاہر ہوتی ہے۔

ضعیف و موضوع حدیثیں: دوسرا ضمنی اعتراض یہ ہے کہ مستدرک میں ضعیف اور موضوع حدیثیں بھی ہیں، چنانچہ علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

”اس میں شک نہیں کہ مستدرک میں ایسی حدیثیں بھی ہیں جو شرائط صحت کے خلاف ہیں، بلکہ موضوع حدیثیں بھی ہیں جو اس کے شایان شان نہیں۔“ (۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”گو حاکم حدیث میں امام ذہبی کے روق تھے، تاہم انھوں نے مستدرک میں سابق حدیثوں کی بھی تصحیح کر دی ہے۔“

اوپر ان کا یہ بیان گذر چکا ہے کہ مستدرک کا تقریباً چوتھائی حصہ منکر و داعی اور موضوع حدیثوں پر مشتمل ہے، انھوں نے تنجیص میں بھی حدیث کا ضعف و نکارت اور وضع دکھایا ہے اور حاکم کی موضوع حدیثوں کو ایک مستقل جز میں جمع کیا گیا تھا جو تقریباً ایک سو حدیثوں پر مشتمل تھا، حافظ ابن جوزی نے بھی ان کی ساٹھ موضوع حدیثوں کا ذکر کیا ہے گو اس کو محدثین نے مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا ہے، اکثر تذکرہ نگاروں نے مستدرک کی ضعیف و موضوع حدیثوں کی مثال دیتے ہوئے ”من کنت مولاہ فعلی مولاہ“ اور ”حدیث طبر“ وغیرہ کو پیش کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کا شمار حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں کیا ہے اور اس طبقہ کے متعلق ان کا اور ان کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا یہ بیان ہے کہ:

”اگرچہ کتابوں کے مؤلفین علوم حدیث میں ماہر، ثقہ اور ضبط و عدالت

کی صفات سے متصف تھے لیکن ان میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں پائی



جاتی ہیں، بلکہ ان کی بعض حدیثیں موضوع بھی ہیں، گو ان کے اکثر رواۃ عدالت

کی صفت سے متصف تھے تاہم بعض مستور اور مجہول الحال ہیں۔“ (۱)

ان سب بیانات سے مستدرک میں ضعیف و منکر بلکہ موضوع حدیثوں کا بھی یقینی طور پر پایا جانا ثابت ہو جاتا ہے لیکن موضوع حدیثوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، حافظ ابن جوزی نے ساتھ حدیثوں کی نشاندہی کی ہے لیکن ان میں سے اکثر کو محدثین نے تسلیم نہیں کیا ہے، زہبی ضعیف حدیثیں تو وہ موضوع کے ساتھ شامل ہو کر چوتھائی حصہ کے بقدر ہوں گی، ضعیف حدیثوں سے کوئی کتاب بھی خالی نہیں ہے لیکن مستدرک میں ان کی تعداد اس لیے زیادہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ خود ضخیم کتاب ہے اور اس کی ضخامت کے اعتبار سے یہ تعداد زیادہ نہیں، اس کا زیادہ حصہ جیسا کہ: زہبی کے بیان سے ظاہر ہے، صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں:

”مستدرک میں جو نہایت ضخیم کتاب ہے، صحیحین کی متروک حدیثوں کو

شامل کیا گیا ہے، گو اس کی بعض حدیثوں کے بارے میں کلام کیا گیا ہے لیکن اس

کا بڑا حصہ صحیح ہے۔“ (۲)

گو مستدرک کی ضعیف و موضوع حدیثوں کی وجہ سے اس کا پایہ گھٹ ضرور گیا ہے، تاہم ان سے حاکم کے علوئے مقام اور عظمتِ شان میں فرق نہیں آتا، علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:

”حاکم کا درجہ و مرتبہ نہایت بلند ہے، وہ کسی طرح ضعیف میں شمار کئے

جانے کے مستحق نہیں ہیں، ان کی جانب سے یہ معذرت کی جائے گی کہ مستدرک

ان کے آخر عمر کی تصنیف ہے، جب ان کی حالت متخیر ہو گئی تھی اور اس وقت ان پر

ذہول و نسیان بھی طاری رہتا تھا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اس میں بعض

(۱) مجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۵ (۲) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۰۔

ایسے راویوں کو بھی صحیح قرار دے دیا ہے اور ان لوگوں کی حدیثیں بھی درج کر لی ہیں جن کا وہ اپنی کتاب الضعفا میں تذکرہ کر چکے ہیں اور جن کے ناقابل حجت ہونے اور جن کی حدیثوں کے ترک کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے، مثلاً عبدالرحمن بن زید بن اسلم کی ایک حدیث کی تخریج کی ہے، حالانکہ ان کا ضعف میں تذکرہ کیا ہے اور ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے والد کے واسطے سے ایسی موضوع حدیثیں بیان کی ہیں جن کا ضعف وضع غور و تامل کرنے والے اہل فن سے مخفی اور پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔“ (۱)

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ حاکم نے متدرک کی بعض حدیثوں کو ضعیف سمجھنے کے باوجود شواہد و متابعات کی حیثیت سے یا اور کسی مصلحت کی بنا پر نقل کیا ہے اور ایسے مواقع پر انھوں نے ان اسباب کی صراحت بھی کر دی ہے جو ضعیف حدیث کی روایت ذکر کرنے کا باعث ہوئے ہیں، علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

وربما اورد فيہ مالم يصح  
عنده منبها على ذلك (۲)  
بعض اوقات وہ غیر صحیح روایت لائے  
ہیں مگر اس کے متعلق تنبیہ کر دی ہے۔

یہ بھی ہے کہ حاکم خود صاحب فن تھے، ان کی تحقیق میں بعض حدیثیں اور رواۃ قوی صحیح تھے لیکن بعض دوسرے اہل فن نے ان کو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے۔  
تسائل کا التزام: اب تک جن الزامات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی دراصل تسائل ہی کے تحت آتے ہیں لیکن اب اس کا مستقل طور سے ذکر کیا جاتا ہے، پہلے جو باتیں نقل کی گئی ہیں ان کے علاوہ بعض مزید تفصیلات ملاحظہ ہوں۔  
علامہ ابن صلاح کا مشہور بیان ہے۔

هو واسع الخطوفى شرط  
ده صحیح روایت کے شرائط کے بارے

(۱) لسان المیزان تذکرہ حاکم (۲) تدریب الراوی ص ۳۱۔

الصحيح ، متساهل فى  
القضاء. (۱)

میں بڑے توسع پسند اور صحیح حکم لگانے  
میں نہایت تساہل تھے۔

علامہ زبیلی کا بیان ہے کہ:

فالحاكم عرف تساهله  
وتصحیحه بالاحادیث  
الضعیفة بل الموضوعة. (۲)

پس حاکم کا تساہل اور ضعیف بلکہ  
موضوع حدیثوں کی تصحیح مشہور  
ومعروف ہے۔

مولانا عبدالرحمن مبارک پوری لکھتے ہیں:

”حدیث کی تصحیح میں حاکم کا تساہل اسی طرح مشہور ہے جس طرح علامہ  
ابن جوزی کا تضعیف حدیث میں تساہل مشہور ہے، شیخ الاسلام علامہ ابن حجر  
فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے تساہل نے ان کی کتابوں کا فائدہ معدوم کر دیا  
ہے۔ (۳)

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محدثین کے نزدیک حاکم کا تساہل مشہور و مسلم  
ہے مگر یہ بحث توضیح و تنقیح طلب ہے۔

حاکم پر جس شد و مد کے ساتھ یہ الزام عائد کیا گیا ہے، اس سے بظاہر حاکم کا  
احادیث میں زیادہ غیر محتاط و مداہن ہونا ثابت ہوتا ہے جو صحیح نہیں ہے اور نہ تساہل کا یہ  
مطلب ہے کہ انھوں نے رطب و یابس ہر قسم کی روایات بلا تحقیق و تفتیش نقل کر دی ہیں، ان  
کی تلاش و تفحص، جزم و احتیاط اور احکامی روایتوں میں شدت کا ذکر پہلے آچکا ہے، ان کا بلند  
پایہ محدث اور علوم حدیث میں ماہر ہونا مسلم ہے، روایات کے قبول و رد کے اصول و ضوابط کی  
وہ پابندی بھی کرتے تھے اور ان کے بارے میں غیر محتاط نہ تھے البتہ جہاں انھوں نے ان  
اصولوں کو ترک کیا ہے، اس کی صراحت کر دی ہے، جرح و تعدیل حاکم کا خاص فن تھا، اس

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱ (۲) نصب الراية ص ۳۶۰ (۳) مقدمہ فتح الاحوذ ص ۷۷۔

میں انھوں نے ایسی مہتمم بالشان کتابیں لکھی ہیں جن کے حوالوں سے رجال کی کوئی کتاب خالی نہیں ہے، ان باتوں سے ان کے حزم و احتیاط کا پتہ چلتا ہے، اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

”حدیث کے طالب علم کو محدث کے حالات کی بحث و تفتیش کرنی ضروری ہے، اس کو سب سے پہلے محدث کے متعلق یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ عقیدہ توحید کو مانتا اور انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کا پابند ہے یا نہیں؟ پھر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ وہ صاحب ہونے تو نہیں ہے جو لوگوں کو اپنی خواہشات کے مطابق دعوت دیتا ہے کیوں کہ داعی بدعت کی حدیث قبول نہ کرنے پر ائمہ مسلمین کا اجماع ہے، اس کے بعد سن و سال کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ اس کا اپنے ان شیوخ سے جن سے وہ حدیثیں روایت کرتا ہے، سماع ممکن ہے یا نہیں، کیوں کہ ہم نے ایسے شیوخ دیکھے ہیں جنھوں نے اپنے شیوخ سے ایسے سن میں حدیثیں بیان کی ہیں جس سن میں ان کی ان شیوخ سے ملاقات ممکن ہی نہیں۔“ (۱)

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

”صحیح حدیث کی معرفت مجرد روایت سے نہیں ہوتی بلکہ اس کو عقل و فہم، حفظ و ضبط اور کثرت سماع وغیرہ سے معلوم کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں اہل علم و معرفت کے مذاکرہ سے بڑھ کر کوئی چیز معاون نہیں ہے، اسی سے مخفی علت ظاہر ہوتی ہے پس جب اس طرح کی کوئی حدیث صحیح اسانید سے پائی جائے اور وہ شیخین کی کتابوں میں مروی نہ ہو تو ایسی صورت میں حدیث کے طالب علم کو اس کی تحقیق اور کرید کرنا نیز اس کی معرفت رکھنے والوں سے مذاکرہ لازم ہے تاکہ اس

کی علت کا پتہ چل سکے۔“

جس امام کے یہ خیالات ہوں اور جس کا روایات کے رد و قبول میں یہ معیار ہو، اس کو غیر محتاط یا حاطب اللیل کس طرح کہا جاسکتا ہے، اس لیے ان کے تساہل کا صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ دوسرے محدثین نے جو غیر معمولی تشدد روا رکھا تھا اور جس کے نتیجہ میں بے شمار صحیح حدیثیں ان کے معیار پر پوری نہ اتریں اور نہ ان کے انتخاب میں آسکیں۔ حاکم نے اس طرح کا تشدد اس لیے روا نہیں رکھا تا کہ کوئی صحیح و ثابت حدیث محفوظ ہونے سے نہ رہ جائے، اسی نیک جذبہ نے ان کے یہاں قدرے نرمی اور مدارحت پیدا کر دی ہے، اس لیے حدیث کی تصحیح میں حاکم کا تساہل اگرچہ مسلم ہے لیکن اس کی نوعیت وہ نہیں ہے جو غلو و اغراق کی وجہ سے اس کو دے دی گئی ہے۔

حاکم کے تساہل کے چند اسباب تھے جن کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے:

۱- خود ان کا یہ بیان گذر چکا ہے کہ مستدرک منکرین حدیث، اہل اہوا اور مبتدعین کے اس الزام اور مغالطہ کے جواب میں لکھی گئی ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد بہت کم ہے، حاکم نے اس شبہ کی تردید میں یہ بھی لکھا ہے کہ صحیح حدیثیں صرف صحیحین ہی میں منحصر نہیں ہیں، جیسا کہ خود شیخین نے بھی اس کی صراحت کی ہے اور ابن صلاح، نووی اور دوسرے اساطین فن کا بھی بیان ہے، اس بنا پر حاکم نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ اپنے علم و امکان بھر زیادہ سے زیادہ صحیح روایات کا مجموعہ مرتب کر دیں اس کی وجہ سے مستدرک میں تساہل ہو گیا ہے۔

۲- حاکم نے حدیثوں کی تائید و توثیق کے لیے کثرت سے شواہد و متابعات نقل کئے ہیں، ان میں اور فضائل اعمال کی حدیثوں میں انھوں نے زیادہ شدت اور احتیاط نہیں برتی ہے، چنانچہ مستدرک کی اس قسم کی حدیثوں میں زیادہ تساہل پایا جاتا ہے۔

۳- حافظ ابن حجر وغیرہ نے لکھا ہے کہ مستدرک حاکم کے آخر عمر کی تصنیف ہے، اس زمانہ میں ان کی دست دگرگوں ہو چلی تھی، ان کو نظر ثانی اور حک و اصلاح کا موقع بھی

نہیں ملا تھا، اس لیے مستدرک میں تساہل زیادہ پایا جاتا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ”حاکم کے یہاں تساہل کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کتاب کا مسودہ تو مکمل کر لیا تھا لیکن اس کی تنقیح نہیں کر سکے تھے، مستدرک کے چھ جڑوں میں صرف ڈیڑھ جز تک مجھ کو حاکم کا املا ملا ہے، بقیہ اجزا کی حاکم کی بطریق اجازت روایت کی گئی ہے اور ان اجزا میں ان جڑوں کے مقابلہ میں جن کا حاکم نے خود املا کرایا ہے، زیادہ تساہل پایا جاتا ہے۔ (۱)

حاکم کا تساہل تو متعارف و مسلم ہے لیکن اس الزام سے بعض اکابر محدثین بھی بری نہیں ہیں، چنانچہ بعض محدثین کے نزدیک تساہل کے اعتبار سے صحیح ابن حبان بھی مستدرک ہی کے لگ بھگ ہے، ابن خزیمہ کی عظمتِ شان میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، ان کا اور ان کی صحیح کا پایہ ان دونوں سے بہت بلند ہے لیکن علامہ سخاوی لکھتے ہیں:

|                         |                                       |
|-------------------------|---------------------------------------|
| و کم فی کتاب ابن خزیمہ  | ابن خزیمہ کی کتاب میں کتنی ایسی       |
| ایضاً من حدیث محکوم منہ | حدیثیں ہیں جن کی صحت کا حکم لگایا گیا |
| بصحتہ و هو لایرتقی عن   | ہے، حالاں کہ وہ حسن کے مرتبہ سے       |
| رتبۃ الحسن۔ (۲)         | اوپر کی نہیں ہیں۔                     |

امام دارقطنی اور امام ترمذی پر بھی (اول الذکر حاکم کے استاذ اور موخر الذکر امام بخاری کے ممتاز شاگرد اور ائمہ صحاح میں ہیں) یہی الزام عائد کیا گیا ہے، علامہ ذہبی جیسے نقادین کا بیان ہے:

|                            |                                            |
|----------------------------|--------------------------------------------|
| ان العلماء لایعتدون بتصحیح | علمائے فن ترمذی اور حاکم کی تصحیح کو زیادہ |
| الترمذی ولا الحاکم۔ (۳)    | قابل اعتناء نہیں سمجھتے۔                   |
| علامہ زبیلی فرماتے ہیں:    |                                            |

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۲۷ و تدریب الراوی ص ۳۱ (۲) فتح المغیب ص ۱۳ (۳) الرسالة المصغرہ ص ۲۰۔

حتی قیل ان تصحیحه دون  
تصحیح الترمذی والدار  
قطنی۔ (۱)

یہاں تک کہا گیا ہے کہ حاکم کی تصحیح امام  
ترمذی ودارقطنی کی تصحیح سے بھی کم تر  
ہے۔

حافظ سخاوی کہتے ہیں:

بل وفيما صححه الترمذی  
من ذلك جملة مع انه ممن  
يفرق بين الصحيح  
والحسن۔ (۲)

بلکہ امام ترمذی کی تصحیح میں بھی تساہل کا  
بڑا حصہ شامل ہے، حالانکہ وہ ان  
لوگوں میں ہیں جو صحیح و حسن میں امتیاز  
کرنے والے ہیں۔

اسی طرح ضیاء مقدسی، ابن عوانہ، ابن سکن اور جارود وغیرہ نامور محدثین کی  
تفصیلات اگرچہ صحیح کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں لیکن ایک جماعت نے ان پر بھی انصاف نایا  
تصباً نقد کیا اور تساہل کا الزام لگایا ہے۔ (۳)

اس لیے جس طرح ان ائمہ کی تصنیفات کی خامیوں کی وجہ سے ان کے جلالیت  
قدر میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح حاکم کی عظمت میں بھی ان کے تساہل کی بنا پر کلام  
نہیں کیا جاسکتا۔

حاکم کی تصحیح کا حکم: حاکم کا تساہل تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان کی  
توثیق تصحیح کا کیا حکم ہوگا؟ محدثین اور علمائے فن کے نزدیک چند صورتوں کو چھوڑ کر عام طور پر  
حاکم کی تصحیح کا لحاظ کیا جائے گا، یہ مستثنیٰ صورتیں حسب ذیل ہیں:

(الف) جس حدیث کی حاکم نے توثیق کی ہو وہ کسی دوسری صحیح و ثابت حدیث سے:

کے خلاف ہو، علامہ زبیلی جہر بالمسئلہ کے بیان میں لکھتے ہیں:

وتصحیح الحاكم لا يعتد به  
حاکم کی تصحیح کا اعتبار نہیں کیا جائے گا،

(۱) نصب الرایح ص ۲۵۳ (۲) فتح المغیث ص ۱۲ (۳) فتح المغیث ص ۱۳۔

سیما فی هذا الموضوع فقد عرف تساهله فی ذلك ..... وتوثیق الحاکم لایعارض ما یثبت فی الصحیح خلافه لما عرف من تساهله. (۱)

خصوصاً اس مقام پر، کیوں کہ ان کا تساہل یہاں معروف و معلوم ہے..... اور حاکم کی توثیق کو اگر وہ صحیح و ثابت حدیث کے خلاف ہو، اس کے معارض نہیں قرار دیا جائے گا، کیوں کہ ان کا تساہل معروف ہے۔

زیلعی کے اس بیان سے حاکم کی تصحیح کا سرے سے ناقابل اعتبار ہونا ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

حتى قيل ان تصحيحه دون تصحيح الترمذی والددار قطنی بل تصحيحه كتحصين الترمذی واما ابن خزيمة وابن حبان فتصحيحهما ارجح من تصحيح الحاکم بلانزاع. (۲)

یہاں تک کہا گیا ہے کہ حاکم کی تصحیح کا درجہ امام ترمذی اور دارقطنی کی تصحیح سے کم تر ہے، بلکہ ان کی تصحیح کی حیثیت امام ترمذی کی تحمیں کی طرح ہے، رہے ابن خزیمہ اور ابن حبان تو ان کی تصحیح بلا اختلاف حاکم کی تصحیح سے راجح ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیلعی کے نزدیک حاکم کی تصحیح بالکل ساقط اور ناقابل اعتبار نہیں ہے، بلکہ جب وہ صحیح حدیث کے معارض ہو تو ناقابل اعتبار ہوگی۔

(ب) حاکم نے جس حدیث کی تصحیح کی ہو اگر اس کے بارے میں دوسرے محدثین کا فیصلہ اس کے برعکس ہو تو حاکم کی تصحیح کا لحاظ نہیں ہوگا، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ حاکم کی تصحیح کا اسی وقت اعتبار کیا جائے گا جب کہ اس کے بارے میں دوسرے ائمہ کی

(۱) نصب الراية ج ۱ ص ۳۴۴ (۲) نصب الراية ج ۱ ص ۳۵۴۔



اس کے خلاف کوئی تصریح موجود نہ ہو۔

(س) جس حدیث کی حاکم نے تصحیح کی ہو اس میں ضعیف کر دینے والی کوئی علت موجود ہو، ابن صلاح اور نووی نے اس کی تصریح کی ہے۔

ان صورتوں کے سوا حاکم کی تصحیح کو معتبر اور حجت سمجھا جائے گا، البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ ان کی تصحیح کے بارے میں کس قسم کا حکم لگایا جائے گا، ابن صلاح اور حافظ نووی کے نزدیک اس کو حسن پر محمول کیا جائے گا، ابن صلاح فرماتے ہیں:

فالاولیٰ ان نتوسط فی امره  
فنقول ما حکم بصحته ولم  
نجد ذالک فیہ لغيره من  
الأئمة ان لم یکن من قبیل  
الصحیح فهو من قبیل  
الحسن یحتج به ویعمل به  
الا ان تظہر فیہ علة توجب  
ضعفه. (۱)

ہمارے نزدیک حاکم کی تصحیح کے بارے  
میں بیچ کی راہ اختیار کرنا زیادہ مناسب  
ہے پس جس حدیث کے صحیح ہونے کا  
انہوں نے فیصلہ کیا ہو اور اس میں  
دوسرے ائمہ کی کوئی تصریح موجود نہ ہو  
اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ  
اگر وہ صحیح کے قبیل سے نہیں ہے تو حسن  
کے قبیل سے ہے، اس کو لائق حجت اور  
قابل اعتماد سمجھا جائے گا، بشرطے کہ  
اس میں کوئی ایسی علت نہ ہو جو ضعف  
کی موجب ہو۔

نووی لکھتے ہیں:

فما صححه ولم نجد فیہ  
لغيره من المعتمدین

جس حدیث کی حاکم نے تصحیح کی ہو اور  
اس کی صحت یا ضعف کے متعلق

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱۔

تصحیحا ولا تضعیفا حکمنا  
 بانہ حسن الا ان ینظہر فیہ  
 علة توجب ضعفه. (۱)

دوسرے معتبر محدثین کی تصریح موجود  
 نہ ہو تو ہم اس کو حسن قرار دیں گے،  
 بشرطے کہ اس کو ضعیف قرار دینے والی  
 علت موجود نہ ہو۔

زیلعی کے اوپر کے بیان میں بل تصحیحه کتحسین الترمذی سے بھی  
 یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ جزائری نے محدث ابن صلاح کے بیان "وان لم یکن من  
 قبیل الصحیح فهو من قبیل الحسن" کا دوسرا مفہوم بتایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:  
 "جس حدیث کی تصحیح میں حاکم منفرد ہوں اور دوسرے محدثین کا اس کے  
 بارے میں کوئی فیصلہ موجود نہ ہو تو اس کو احتیاطاً صحیح و حسن کے درمیان دائر سمجھا  
 جائے گا لیکن لوگوں نے ان کے بیان کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس پر محض حسن کا حکم  
 لگایا جائے گا۔" (۲)

لیکن متاخرین کے نزدیک حاکم کی تصحیح کے بارے میں اقتضائے حال کے مطابق  
 حکم لگایا جائے گا، جزائری کا بیان ہے کہ:

"اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ جس حدیث کی تصحیح میں حاکم منفرد ہوں  
 اس کے متعلق بحث و تحقیق کی جائے گی اور اس پر اس کے اقتضائے حال کے  
 مطابق صحت یا حسن یا ضعف کا حکم لگایا جائے گا۔" (۳)

بذریعہ بن جمانہ سے بھی یہی منقول ہے اور عراقی، سخاوی (۴) اور سیوطی وغیرہ نے  
 بھی اس کی تائید کی ہے، علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

"صحیح طریقہ یہ ہے کہ حاکم کی تصحیح کی تحقیق کر کے اس کے اعتبار سے

(۱) تدریب الراوی ص ۳۱ (۲) مقدمہ تلمذ الاحوذی ص ۸ (۳) ایضاً ص ۷ (۴) الفیہ ص ۷ و فتح المغیث

حسن، صحیح یا ضعیف ہونے کا حکم لگایا جائے، عراقی نے بھی اس کی موافقت کی ہے اور کہا ہے کہ اس پر محض حسن ہی کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔“ (۱)

مولانا عبدالرحمن مبارک پوری لکھتے ہیں:

”غالبا ابن صلاح نے یہ مسلک اس لیے اختیار کیا ہے کہ ان کے خیال میں اب لوگ تصحیح کے اہل نہیں رہے، اس لیے اس کا قصہ ہی ختم ہو گیا جو درست نہیں ہے، تصحیح کا معاملہ ختم نہیں ہوا ہے، بلکہ اب بھی اگر کسی شخص میں اس کی اہلیت موجود ہو اور اس میں اس کے اوصاف و شرائط موجود ہوں تو وہ تصحیح کا فیصلہ کر سکتا ہے۔“ (۲)

باقی رہی حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی یہ تحریر کہ:

”ذہبی نے یہ کہا ہے کہ کسی شخص کو میری تلخیصات و تعقیبات دیکھے بغیر حاکم کی تصحیح سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔“ (۳)

اور

”محمد ثین کا فیصلہ یہ ہے کہ ذہبی کی تلخیص دیکھے بغیر مستدرک حاکم پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔“ (۴)

اوپر کے بیانات کے معارض نہیں ہے اور نہ اس سے حاکم کی تصحیح کا مطلقاً باطل ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔

**رفض و تشیع کا التزام:** امام ابو عبد اللہ حاکم پر سب سے بڑا الزام رفض و تشیع کا عائد کیا گیا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- محمد بن طاہر روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابو اسماعیل انصاری سے حاکم کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ ”وہ حدیث میں ثقہ مگر سخت رافضی تھے۔“ (۵)

(۱) تدریب الراوی ص ۳۱ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۸ (۳) بتان الحمدین ص ۳۱ (۴) ایضاً

ص ۳۳ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۷

۲- دوسری جماعت ان کے رفض کی نفی و تردید کرتی ہے لیکن وہ بھی ان کو شیعیت سے متعم کرتی ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں، وہ شیعیت میں ضرور مشہور تھے لیکن شیخین کے مسئلہ میں تعرض نہیں کرتے تھے، ابواسامعیل انصاری کا قول خلاف انصاف ہے، درحقیقت حاکم رافضی نہ تھے، بلکہ شیعہ تھے۔“ (۱)

مگر خود ابن طاہر کے بیان سے جنہوں نے حاکم کے رافضی ہونے کی ابواسامعیل سے روایت کی ہے، رفض کا کوئی پتہ نہیں چلتا، چنانچہ وہ کہتے ہیں حاکم اندرونی طور (۲) سے تو شیعوں سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن خلافت و تقدیم کے مسئلہ میں وہ تسنن کا اظہار کرتے تھے۔ (۳)

حاکم کی شیعیت کے بارے میں سب سے مشہور روایت وہ ہے جس کو خطیب بغدادی نے اور ان کے حوالہ سے بعض دوسرے ارباب سیر و تذکرہ نے نقل کیا ہے کہ:

”حاکم ثقہ تھے مگر تشیع کی جانب میلان رکھتے تھے، مجھ سے ابراہیم

بن محمد ارموی نے جو ایک صاحب علم اور صالح شخص تھے بیان کیا کہ حاکم نے ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن کے بارے میں ان کا گمان ہے کہ وہ صحیحین کے شرائط کے مطابق ہیں اس لیے شیخین پر ان کی تخریج ضروری تھی، چنانچہ اسی قسم کی حدیثوں میں حدیث طیر اور من کنت مولاہ فعلی مولاہ بھی ہیں جو حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب میں وارد ہیں اور ان کی وجہ سے محدثین نے ان پر نکیر و ملامت کی ہے۔“ (۴)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاکم پر رفض کا الزام صحیح نہیں ہے بلکہ سراسر

(۱) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۸۵ (۲) یہاں اس پر کوئی تبصرہ کرنا مقصود نہیں ورنہ کسی کے باطن کے متعلق اس قسم کا فیصلہ کرنا بجائے خود کتا درست اور مقتضائے انصاف ہے، فقہا کا عام قاعدہ یہ ہے کہ محسن حکم بالظاہر (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۸ (۴) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۷۷

بے بنیاد ہے، علامہ ذہبی کے مذکورہ بالا بیان کے علاوہ دوسرے بیانات سے بھی جو آئے نقل کئے جائیں گے اس کی پوری تردید ہوتی ہے، علامہ ابن سبکی نے بھی اس کی پر زور تردید کی ہے، یہ الزام محض ابواسامعیل انصاری سے مروی ہے، بعض دوسرے محدثین کے متعلق بھی ان کے اس قسم کے غیر معروف اور منفرد اقوال مروی ہیں جن کو محققین اور ناقدین فن نے خلاف واقعہ اور مطرد قرار دیا ہے، حاکم پر بھی ان کے الزام کی یہی نوعیت ہے، اس لیے اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

البتہ شیعیت کا الزام بظاہر قوی معلوم ہوتا ہے، اس لیے اس کا یہاں مفصل جائزہ لیا جاتا ہے:

جن لوگوں نے حاکم پر شیعیت کا الزام عائد کیا ہے، ان کے اقوال کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حاکم کی شیعیت کا خلفائے ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام کے سب و شتم یا حضرت علیؑ کی تفضیل اور خلافت میں ان کی تقدیم سے کوئی تعلق نہیں تھا، ابن طاہر جیسے مخالف شخص کو بھی اعتراف ہے کہ تقدیم و خلافت کے مسئلہ میں وہ تسنن کا اظہار کرتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی فرماتے ہیں:

”بعض علماء منقول ہے کہ ان کے تشیع کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضرت

عثمان پر حضرت علیؑ کی فضیلت (۱) کے قائل تھے جو اسلاف کی ایک جماعت کا بھی

مذہب ہے۔“ (۲)

اس لیے یہ امر بھی مسلم ہے کہ امام ابو عبد اللہ حاکم حضرت علیؑ کو نہ شیخین سے افضل مانتے تھے اور نہ ان کو ان بزرگوں کے مقابلہ میں خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے اس لیے اب صرف دو چیزیں لائق بحث رہ جاتی ہیں۔

(۱) حضرت شاہ صاحب کا یہ بیان محل نظر ہے، آئندہ مباحث سے اس کی تردید ہو جائے گی (۲) بستان المحدثین ص ۳۱۔

۱- پہلی چیز حضرت علیؑ کی محبت و عقیدت میں غیر معمولی غلو و افراط ہے، جس کا ثبوت خطیب کی روایت میں ملتا ہے کہ حاکم نے حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب میں ضعیف و موضوع حدیثیں روایت کی ہیں۔

۲- دوسری چیز حضرت امیر معاویہؓ سے ان کی برہمی ہے، چنانچہ علامہ ذہبی رقمطراز ہیں:

”ان کا حضرت علیؑ کے مخالفین سے انحراف اگرچہ کھلا ہوا ہے لیکن وہ شیخین کو ہر حال میں فائق و معظم سمجھتے تھے، اس لیے وہ شیعہ ضرور تھے لیکن رافضی نہیں تھے۔“ (۱)

اور ابن طاہر کا یہ بیان نقل کیا ہے:

”حاکم حضرت امیر معاویہؓ اور ان کی اولاد سے برگشتہ تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے اور اس کے متعلق کوئی معذرت نہیں کرتے تھے۔“ (۲)

ابن عماد کا بیان ہے کہ:

”علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ حاکم خلفائے ثلاثہ خصوصاً شیخین کی پوری تعظیم کرتے تھے، البتہ حضرت معاویہؓ کے بارے میں انہوں نے کلام کیا ہے، اس کی وجہ سے ان کو زد و کوب بھی کیا گیا تھا۔“ (۳)

حافظ ابن جوزی اور علامہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

”ابو عبد الرحمن سلمیٰ کا بیان ہے کہ ابو عبد اللہ بن کرام کے اصحاب نے حاکم کو عبث تنگ کر رکھا تھا، ان کا منبر تو زڈالاتھا اور ان کے لیے گھر سے نکلتا اور مسجد میں جاتا تک دشوار کر دیا تھا، میں نے یہ حالت دیکھ کر ان سے کہا کہ اگر آپ حضرت امیر معاویہؓ کے مناقب میں کسی حدیث کی تخریج یا اٹلا کر ادیں تو

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۳۸ (۲) ایضاً (۳) شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۷۷۔

اس مشقت وابتلا سے آپ کو چھٹکارا مل جائے، حاکم نے اس کے جواب میں تین دفعہ کہا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔“ (۱)

جہاں تک حضرت علیؓ کی محبت میں افراط و غلو کا معاملہ ہے تو اس کو اعتراض و ملامت یا شیعیت کی بنیاد قرار دینا صحیح نہیں ہے، بہت سے اکابر اور ائمہ اسلام کو حضرت علیؓ اور اہل بیت کی محبت میں غلو رہا ہے، اس لیے حاکم کا غلو اسی وقت قابل اعتراض ہو سکتا ہے جب دوسرے صحابہ کی عظمت و جلالت کا انھوں نے پاس و لحاظ رکھا نہ ہو، یا وہ حضرت علیؓ کو اجلہ صحابہ پر فضیلت دیتے ہوں لیکن خود حاکم کو شیعی قرار دینے والوں کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ وہ شیخین کی تنقیص نہیں کرتے تھے بلکہ عام اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق وہ ان کو حضرت علیؓ سے افضل اور خلافت کے لیے اقدم و انسب سمجھتے تھے، اس لیے ان کا غلو نہ قابل اعتراض ہے اور نہ شیعیت کا ثبوت، حاکم کے حالات و واقعات زندگی اور تصنیفات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے خلفائے ثلاثہ پر حضرت علیؓ کو ترجیح دی، یا کم از کم ان بزرگوں کی کوئی تنقیص کی ہے لیکن اس بارے میں علامہ ابن سبکی کے ان اصولوں کی رہنمائی میں فیصلہ زیادہ مناسب ہے، وہ لکھتے ہیں:

”اگر کسی شخص کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جائے یا اس پر کوئی الزام عائد کیا جائے تو انصاف پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کے شیوخ و اساتذہ اور رفقاء و تلامذہ وغیرہ کے متعلق بحث و تفتیش کی جائے، اس کے بعد اس کے ماحول اور ان حالات کا جائزہ لیا جائے جن میں اس کی نشوونما ہوئی ہے، پھر ان معاصرین، ہم وطنوں اور اعزہ و اقربا کے اقوال و آثار معلوم کئے جائیں جو اس کے حالات و واقعات زندگی سے زیادہ واقف اور باخبر ہوتے ہیں، معاصرین کے متعلق اس کی تحقیق ضرور کر لینی چاہیے کہ ان کے متہم شخص سے تعلقات کی

(۱) المغتظم ج ۷ ص ۲۷۵ و البدایہ و النہایہ ج ۱۱ ص ۵۵۔

نوعیت کیا تھی؟ وہ اس کے موافق، حمایتی اور دوست تھے، یا معاند و مخالف اور معترض و نکتہ چیں یا بالکل غیر جانبدار لیکن غیر جانب دار بہت کم ہوتے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں امام حاکم کے تشیع و تفضیل علیؑ کے الزام پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، یہ تو مسلم ہے کہ وہ جلیل القدر محدث تھے، ان کی اس حیثیت میں ان کے مخالفین کو بھی کوئی کلام نہیں اور محدثین میں ایسے عقائد شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد حاکم کے ان شیوخ پر غور کیا جائے جن سے انھوں نے علم و فن کی تحصیل کی ہے، خصوصاً ان لوگوں کو دیکھا جائے جن سے ان کو زیادہ تعلق اور قربت رہی ہے، تو معلوم ہوگا کہ ان کے شیوخ میں اکابر اہل سنت اور ایسے لوگ ہیں جو عقائد میں امام ابوالحسن اشعری سے وابستہ تھے جیسے ابو بکر بن اسحاق ضحیٰ، ابو بکر بن نورک اور ابوسہل صلحو کی وغیرہ، یہی وہ لوگ ہیں جن سے حاکم کی مجالست تھی اور اصول و دیانات وغیرہ میں مباحثے اور مجادلے رہتے تھے۔

اسی طرح حاکم نے اپنی تاریخ میں اہل سنت کے جو تراجم لکھے ہیں، ان میں ان کی پوری توصیف و تعریف کی گئی ہے کہیں بھی ان کے عقائد پر طنز و تعریض نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ابن عساکر نے ان کو ان اشاعرہ کے زمرہ میں شامل کیا ہے جو اہل رفض و تشیع کو مبتدع کہتے اور ان کے عقائد سے تمہری ظاہر کرتے ہیں یہ چیزیں حاکم پر لگائے جانے والے الزام کو مشکوک بنا دیتی ہیں، آگے جو تفصیلات بیان کی جائیں گی ان سے یہ شکوک و شبہات سراسر یقین و اذعان میں تبدیل ہو جائیں گے اور پوری طرح ثابت ہو جائے گا کہ حاکم کا دامن رفض و تشیع کے الزام سے بالکل پاک ہے۔ (۱)



آگے علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں:

”حاکم کے اندر تشیع کی جانب میلان کا ذکر کیا جاتا ہے، اگر یہ شریعت کے مطلوب و اقتضا سے بھی بڑھ کر رہا ہو تو بھی یہ اس حد و انتہا کو نہیں پہنچا ہوا تھا کہ وہ شیخین کی مذمت و تنقیص کرتے رہے ہوں یا حضرت علیؑ کو ان سے افضل مانتے رہے ہوں بلکہ میں تو اس کو بھی بالکل بعید سمجھتا ہوں کہ وہ حضرت عثمانؓ پر حضرت علیؑ کو فوقیت دیتے رہے ہوں کیوں کہ میری نظر سے ان کی کتاب الاربعین میں ایک باب خلفائے ثلاثہ کی عظمت و تفضیل پر گزرا ہے، اس میں انھوں نے جملہ صحابہ کے مقابلہ میں ان ہی تینوں حضرات کی عظمت کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے، اسی طرح مستدرک میں انھوں نے حضرت علیؑ سے پہلے حضرت عثمانؓ کا ذکر کیا ہے اور اس میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

|                           |                                       |
|---------------------------|---------------------------------------|
| اول حجر حملہ النبی صلی    | مسجد (نبوی) کی تعمیر کے لیے پہلا پتھر |
| اللہ علیہ وآلہ وسلم لبناء | خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا |
| المسجد ثم حمل ابوبکر      | پھر دوسرا حضرت ابوبکرؓ نے، نیر؛       |
| حجرا آخر ثم حمل عمر ثم    | حضرت عمرؓ نے اور چوتھا پتھر حضرت      |
| حمل عثمان حجرا            | عثمانؓ نے رکھا، میں نے کہا اے اللہ    |
| آخر فقلت یا رسول اللہ     | کے رسول دیکھئے کس طرح یہ لوگ آپ       |
| الاترى السى هؤلأ كيف      | کی معاونت کر رہے ہیں، آپ نے           |
| يساعدونك فقال يا عائشة    | فرمایا اے عائشہ یہی لوگ میرے بعد      |
| هؤلأ الخلفاء من بعدى.     | میرے خلفا اور جانشین ہوں گے۔          |

گو اس روایت کی صحت میں علامہ ذہبیؒ وغیرہ نے کلام کیا ہے لیکن قابل غور امر صرف یہ ہے کہ جو شخص اعتراضات کی پرواہ کئے بغیر ایسی حدیث کی تخریج

کر سکتا ہے جو خلفائے ملاحی کی خلافت کے متعلق تقریباً ایک منصوص اور قطعی امر کی حیثیت رکھتی ہے، کیا اس کے بارے میں رفض و تشیع کا گمان کیا جاسکتا ہے؟  
حضرت عثمانؓ کے فضائل میں انھوں نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ:

|                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                                              |                                                                                                                                                                                                                                                                                                      |
|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|
| حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ جس میں حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، عبد الرحمن بن عوف اور سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہم تھے، ابن حشفہ کے گھر میں تھے (اس موقع) پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر شخص کو اپنے ہمسر کے ساتھ ہو جانا چاہیے اور آپ نے خود حضرت عثمانؓ کے ساتھ ہو کر ان سے معاف کیا اور فرمایا کہ تم میرے دنیا و آخرت میں ولی ہو۔ | عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما قال بینما نحن فی بیت ابن حشفة فی نفر من المهاجرین فیہم ابوبکر وعمر و عثمان و علی و طلحة والزبیر و عبد الرحمان بن عوف و سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم فقال رسول اللہ ﷺ لیسنھض کل رجل منکم الی کفوہ فنحفض النبی ﷺ الی عثمان فاعتنقہ وقال انت ولی فی الدنیا والآخرة۔ |
|--------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------------|

اس حدیث میں بھی کلام کیا گیا ہے، حاکم نے ان کے علاوہ اور بھی متعدد حدیثیں حضرت عثمانؓ کی فضیلت میں بیان کی ہیں، جن میں سے بعض کو صحیح مانا گیا ہے اور بعض پر استدراک و اعتراض کیا گیا ہے، اسی طرح حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ وغیرہ کے فضائل و مناقب کی حدیثیں بھی جمع کی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی جانب میلان اور عقیدت میں وہ ایسے غلو و اغراق سے کام نہیں لیتے تھے، جو بدعت

یاد دوسرے صحابہ کے سب و شتم کا باعث ہو۔ (۱)

غرض حاکم کا حضرت علیؓ کے بارے میں غالی و مفرط ہونا اولاً تو ثابت ہی نہیں ہے اور اگر کسی درجہ میں ثابت بھی ہو جائے جب بھی قابل اعتراض اور موجب تشیع نہیں ہے کیوں کہ:

۱- انھوں نے خلفائے اربعہ کا جہاں ایک ساتھ تذکرہ کیا ہے، وہاں اسی ترتیب کے مطابق کیا ہے جو اہل سنت نے ان بزرگوں کے درمیان قائم کی ہے، چنانچہ مستدرک کے فضائل صحابہ کے ابواب میں یہی ترتیب ہے، یعنی پہلے بالترتیب خلفائے ثلاثہ کا اور ان کے بعد حضرت علیؓ کا تذکرہ ہے۔

ایک جگہ معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

|                           |                                      |
|---------------------------|--------------------------------------|
| النوع السابع من هذا العلم | اس علم و فن کی ساتویں نوع صحابہ کرام |
| معرفة الصحابة على         | کے مراتب کے لحاظ سے ان کی            |
| مراتبهم۔                  | معرفت ہے۔                            |

اس نوع میں انھوں نے مراتب ہی کے اعتبار سے صحابہ کے بارہ طبقوں کا ذکر کیا ہے، پہلے طبقہ میں خلفائے اربعہ کے نام اس ترتیب کے ساتھ لیے ہیں۔

|                            |                                                 |
|----------------------------|-------------------------------------------------|
| فاولهم قوم اسلموا بمكة مثل | اول طبقہ میں وہ لوگ ہیں جو مکہ میں              |
| ابى بكر وعمر وعثمان وعلي   | اسلام لائے جیسے ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ |
| وغيرهم رضی الله عنهم۔ (۲)  | وغیرہ                                           |

محدثین کے سنین اور عمروں کے بیان میں بھی انھوں نے خلفائے ثلاثہ کے بعد حضرت علیؓ کا سنہ وفات تحریر کیا ہے۔ (۳)

۲- عام اہل سنت کی طرح حاکم بھی ان چاروں بزرگوں کو خلیفہ برحق سمجھتے تھے

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷۰ (۲) معرفت علوم الحدیث ص ۲۲ (۳) ایضاً ص ۲۰۲ و ۲۰۳۔

اور اپنی تصنیفات میں خلاصا کی حیثیت سے ان کا ذکر بھی کیا ہے۔

۳- ان بزرگوں کے مناقب میں جو حدیثیں اور آثار جمع کئے ہیں ان سے بھی ان کی وہی فضیلت و عظمت اور ان کا وہی درجہ و مرتبہ ثابت ہوتا ہے جو عام امت نے ان کو دیا ہے، یعنی حضرت ابو بکر متفقہ طور پر امت میں سب سے برگزیدہ و برتر ہیں، حاکم نے بھی احادیث و آثار سے یہی ثابت کیا ہے، یہاں تک کہ خود جناب امیرؓ کے ایسے اقوال نقل کئے ہیں جن سے حضرت ابو بکرؓ کا سب سے فائق و برتر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

حضرت ابو بکرؓ کی بیعت میں جناب امیرؓ کی تاخیر اور آپ کی آزر دگی کا مسئلہ آج تک امت کے درمیان بحث و نزاع کا موضوع بنا ہوا ہے لیکن حاکم جناب امیرؓ ہی کی زبانی اس کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال علی والزبير ما غضبنا  
الا لاننا قد اخبرنا عن  
المشاورة وانانرى ابابكر  
احق الناس بها بعد رسول  
الله صلى الله عليه وسلم  
انه لصاحب الغار وثانى  
اثنين وانانعلم بشرفه  
وكبره ولقد امره رسول الله  
صلى الله عليه وسلم  
بالصلوة بالناس وهو  
حى. (۱)

حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ عظمیٰ ہیں  
کہ ہم کو غصہ اس وجہ سے تھا کہ ہم  
لوگوں کو مشورہ میں نظر انداز کیا گیا تھا،  
ورنہ ہم لوگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کے بعد حضرت ابو بکرؓ ہی کو سب  
سے زیادہ خلافت کا مستحق سمجھتے تھے، وہ  
غار میں آپ کے ساتھ اور وہیں کے  
دوسرے تھے ہم کو ان کا فضل و شرف  
خوب معلوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ان کو حکم دیا  
تھا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

(۱) المسحرک ج ۳ ص ۶۶، ۶۷۔

جہاں تک شیخین کی عظمت کا معاملہ ہے، اس میں معترضین کو بھی اعتراف ہے کہ حاکم نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے، البتہ حضرت عثمان کا معاملہ ضرور مختلف فیہ ہے حالانکہ یہ بھی خلاف واقعہ ہے، حاکم حضرت عثمان غنی کو تیسرا اور برحق خلیفہ مانتے تھے اور ان کے قتل کو ناحق سمجھتے تھے، معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

قتل عثمان بن عفان رضی  
حضرت عثمان مظلوم قتل کئے گئے تھے۔

اللہ عنہ صبرا۔ (۱)

خلافت میں حضرت عثمان کی ترتیب کے متعلق جو اشارات بعض حدیثوں میں ملتے ہیں وہ مستدرک میں بھی ہیں ابن سبکی نے اس قسم کی دو حدیثیں مستدرک سے نقل کی ہیں یہاں دو اور روایتیں ملاحظہ ہوں:

”حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رات ایک صبح شخص نے خواب دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ابوبکرؓ سے حضرت عمرؓ اور حضرت عمرؓ سے حضرت عثمانؓ جڑ گئے، راوی حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھے تو یہ بات چیت کر رہے تھے کہ صبح آدمی سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں اور جڑ جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے امور کے ذمہ دار ہوں گے۔“ (۲)

دوسری حدیث حضرت انس بن مالک کی ہے، وہ فرماتے کہ:

”نبی مصطلق کے لوگوں نے مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ ہم لوگ آپ کے بعد کس کو صدقات دیں، آپ نے فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ، ان لوگوں نے کہا جا کر پوچھو ابوبکرؓ کے بعد کس کو

(۱) معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۰۳ (۲) مستدرک ج ۳ ص ۷۱-۷۲۔

ہم دیں گے، آپ نے حضرت عمرؓ کا نام لیا، تیسری دفعہ پھر بھیجا تو آپ نے فرمایا  
کہ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کو دینا۔“ (۱)

اسی طرح حاکم نے حضرت علیؓ کے مناقب میں جو روایتیں نقل کی ہیں ان سے  
خلفائے ثلاثہ اور عام صحابہ کی کوئی تنقیص نہیں ہوتی۔

عام محدثین کی طرح حاکم کا بھی یہ مسلک ہے کہ صحابہ کرام کی عدالت میں طعن  
اور ان کی تنقیص کرنے والے کی روایت قبول نہیں کی جائے گی، مذاہب محدثین کی معرفت  
کے بیان میں لکھتے ہیں:

”علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ ابواسرائیل ملانی کا پایہ حدیث میں بلند  
نہیں تھا کیوں کہ وہ حضرت عثمانؓ کا برائی کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔“

اسی طرح علی بن حسین سے روایت ہے کہ حسین نے سدی کے یہاں جانا اس  
لیے ترک کر دیا تھا کہ وہ شیخین کو سب و شتم کرتے تھے۔ (۲)

درحقیقت متقدمین کے نزدیک حاکم صحابہ کے معاملہ میں جادہ حق اور مسلک  
اعتدال سے منحرف نہیں تھے جن لوگوں نے ان کو شیعی قرار دیا ہے، انہوں نے بھی اس کے  
ثبوت میں کوئی واقعہ یا ان کی تصنیفات سے کوئی مثال نہیں پیش کی ہے، رہیں وہ دونوں  
روایتیں جو صاحب مستدرک کے رفض و تشیع کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں، تو ان سے بھی  
اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

پہلی حدیث یعنی ”من كنت مولاه فعلى مولاه“ کی حاکم نے تین طرق  
سے تخریج کی ہے، اور سب کی تصحیح و تصویب کی ہے، (۳) امام ترمذی نے اپنی جامع میں،  
امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور امام احمد نے مسند میں بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے،  
ان کے علاوہ طبرانی نے معجم میں ضیاء مقدسی نے مختارہ میں اور امام نسائی نے خصائص علیؓ میں

(۱) المسند رک ج ۳ ص ۷۷ (۲) معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۳۷ (۳) ملاحظہ ہوا المسند رک ج ۳ ص ۱۰۹ و ۱۱۰۔

اس کی تخریج کی ہے گو حاکم کے بعض رجال پر کلام کیا گیا ہے اور ان کی روایتوں میں بعض ایسے اضافے ہیں جو صحاح اور مسند احمد بن حنبل میں نہیں ہیں، تاہم روایت کے جس حصہ کو قابل بحث، وجہ اعتراض اور شیعیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، یعنی "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" وہ سب میں مشترک ہے، اسی لیے اکثر محدثین نے اس حدیث کو ضعیف اور بے اصل نہیں قرار دیا ہے، علامہ ذہبی نے جنھوں نے مستدرک کی تلخیص میں جا بجا حاکم پر نقد و تعقب کیا ہے اور اسی باب یعنی فضائل علیؑ کی متعدد ضعیف و دوائی حدیثوں پر تشبیہ کی ہے، جس میں بعض جگہ ان کا لہجہ بہت تیز و تند ہو گیا ہے مثلاً:

|                         |                                     |
|-------------------------|-------------------------------------|
| العجب من الحاكم وجرأته  | حاکم پر اور ان کی ایسی اور اس جیسی  |
| فی تصحيح هذا وامثاله من | باطل حدیثوں کی تصحیح کی جرأت پر سخت |
| البواطيل۔ (۱)           | حیرت ہے۔                            |

لیکن زیر بحث روایت کے صرف ایک طریق کے ایک راوی محمد کے علاوہ انھوں نے کسی پر کلام نہیں کیا ہے (۲) اور تذکرہ میں اس صراحت کے باوجود کہ مستدرک میں غیر صحیح حدیثیں پائی جاتی ہیں، اس حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

|                        |                                 |
|------------------------|---------------------------------|
| واما حدیث من کنت مولاہ | رہی حدیث من کنت مولاہ الخ تو    |
| الخ فله طرق جيدة وقد   | اس کے طرق جید ہیں اور میں نے اس |
| افردت ذلك۔ (۳)         | کے لیے علاحدہ رسالہ لکھا ہے۔    |

ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں، مستدرک میں حاکم کی ساقط روایات کی تصریح کی ہے لیکن اس حدیث کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، ضعاف و موضوعات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے، علامہ سیوطی نے اس کو حدیث سنن قرار دیا ہے۔ (۴) البتہ امام ترمذی نے اس کو غریب بتایا

(۱) تلخیص مستدرک ج ۳ ص ۱۲۷ (۲) ایضاً ص ۱۱۰ (۳) تذکرۃ الخطاط ج ۳ ص ۲۳۵ (۴) الجامع الصغیر

ہے، مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوری لکھتے ہیں:

”امام ترمذی نے اس کو حدیث حسن غریب بتایا ہے لیکن امام احمد، نسائی اور ضیاء نے بھی اس کی تخریج کی ہے، اس باب میں امام احمدؒ نے حضرت بریدہؓ سے اور انھوں نے اور ابن ماجہ نے براء بن عازبؓ سے امام ابن ماجہ نے سعد بن

ابی وقاص سے اور امام احمدؒ نے حضرت علیؓ سے روایتیں کی ہیں۔“ (۱)

اور علامہ اسماعیل بن محمد عجلونی (م ۱۱۶۳ھ) نے تو اس کے متعلق یہاں تک لکھا

ہے کہ:

”حدیث من کنت مولاہ کی امام طبرانی، احمد اور ضیاء نے مختارہ میں

زید بن ارقم، حضرت علی اور میں صحابہ سے اس لفظ ”اللہم وال من والاہ وعاد

من عاداہ“ کے ساتھ تخریج کی ہے، پس یہ حدیث مشہور یا متواتر ہے۔“ (۲)

لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ بعض علمائے فن اور محدثین نے اس روایت کی تضعیف کی ہے، علامہ زبیلی نے اس کے ضعیف ہونے کی نصب الرایہ میں صاف تصریح کی ہے، تاہم یہ حدیث چاہے صحیح ہو یا ضعیف و موضوع، مجرد اس کو نقل کرنے کی بنا پر حاکم کو شیعہ قرار دینا یا ان کو مطعون کرنا سراسر زیادتی اور نا انصافی ہے جب مستدرک میں اور بھی ضعیف و موضوع حدیثیں موجود ہیں اور ان کی بنیاد پر حاکم کے عقیدہ و مسلک کے بارے میں کوئی خاص رائے نہیں قائم کی گئی ہے، یہاں تک کہ خود خلفائے ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام کے مناقب میں بھی کمزور اور ساقط روایتیں درج ہیں لیکن ان کی بنیاد پر کسی نے حاکم پر ان بزرگوں کی عقیدت میں غلو و افراط کا الزام عائد نہیں کیا ہے، اس لیے اس روایت کو ان کے عقیدہ و مسلک کی بنیاد اور حضرت علیؓ کی محبت میں بے جا افراط و غلو کی دلیل کس طرح ثابت

(۱) جامع ترمذی مع شرح تحفۃ الاحوذی ج ۳ ص ۳۲۶ و ۳۲۷ (۲) کشف الخفا و مزیل الالباس ج ۲



کیا جاسکتا ہے، پھر جب اس کی تخریج متعدد ائمہ کبار نے کی ہے اور اس کی وجہ سے ان کو رفض و تشیع سے متم نہیں کیا گیا تو آخر حاکم ہی کو ہدف طعن اور شیعہ قرار دینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

اگر اس حدیث کی حجیت یقینی اور مسلم بھی مان لی جائے جب بھی اس کے مفہوم سے رفض و شیعیت کی کوئی تائید نہیں ہو سکتی، عربی زبان میں مولیٰ کا لفظ کئی معنوں میں آتا ہے اور جیسا کہ شارحین نے لکھا ہے یہاں مولیٰ اور ولی کا لفظ دوست اور ساتھی کے معنی میں ہے، ملا علی قاری کا بیان ہے کہ من کنذت مولاه الخ من کنذت تولاه کے مفہوم میں ہے، یعنی یہ ولی سے ہے جو عدو کا ضد ہے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ”میں جس سے محبت کرتا ہوں علی بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔“ دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”جو مجھ سے محبت کرتا ہے اس سے علی بھی محبت کرتے ہیں۔“ (۱) پہلے مفہوم کی تائید ان حدیثوں سے بھی ہوتی ہے، جن میں حضرت علیؑ سے محبت کرنے والے کو مومن اور بغض و نفرت کرنے والے کو منافق کہا گیا ہے۔

دوسرے اس قسم کے الفاظ بعض اور صحابہ کرام کے بارے میں بھی حدیثوں میں آئے ہیں، خود حاکم نے حضرت عثمانؓ کے متعلق ایک روایت نقل کی ہے جو پہلے گزر چکی ہے کہ آپؓ نے حضرت عثمانؓ کو دنیا و آخرت دونوں میں اپنا ولی بتایا ہے، اس طرح یہ حضرت علیؑ کی کوئی ایسی اہم اور خاص خصوصیت نہیں ہے جس میں دوسرے صحابہ شریک نہ ہوں۔

تیسرے بریدہ سلمیٰ اور عمران بن حصین کی حدیثوں سے جو مستدرک اور مذکورہ بالا کتابوں میں مذکور ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب امیرؓ کے متعلق یہ الفاظ ایک خاص موقع پر فرمائے تھے، جب بعض لوگوں نے ان کے کسی طرز عمل سے آزرده ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شکایت کی تھی، اس پر آپؓ نے ناگواری ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ ”علیؑ سے بغض و نفرت کا اظہار کر کے تم لوگ مجھ سے نفرت کا اظہار کر رہے ہو، کیوں کہ جس کا میں دوست ہوں علیؑ بھی اس کے دوست ہیں۔“

اس واقعہ کی روشنی میں یہ حدیث صحیح ہو یا ضعیف، اس سے شیعیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

دوسری حدیث تو اس کو حاکم نے دو طرق سے مستدرک میں نقل کر کے صحیح اور شیخین کے شرائط کے مطابق قرار دیا ہے، بلکہ پہلے طریق کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس کو حضرت انسؓ سے ان کے تیس شاگردوں نے روایت کیا ہے اور یہ حضرت علیؓ، ابوسعید خدریؓ اور سفینہؓ سے بھی صحت کے ساتھ مروی ہے، (۱) ”حدیث طیر“ کا معرفتہ علم الحدیث میں بھی انھوں نے ذکر کیا ہے لیکن وہاں اس کی صحت و سقم کے بارے میں کوئی رائے نہیں ظاہر کی ہے۔

”حدیث طیر“ کو حاکم کے علاوہ امام ترمذی نے اپنی جامع (۲) میں اور امام نسائی نے خصائص علیؓ (۳) میں نقل کیا ہے۔

حاکم کی دونوں روایتوں میں ایسی تفصیلات اور اضافے ہیں جو امام ترمذی وغیرہ کی روایتوں میں نہیں ہیں، حاکم کے مقابلہ میں امام ترمذی و نسائی کی حدیثیں بہت مختصر ہیں، مسئلہ کی وضاحت و تنقیح کے خیال سے یہاں ترمذی کی روایت نقل کی جاتی ہے۔

|                         |                                       |
|-------------------------|---------------------------------------|
| عن انس بن مالك رضى الله | حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے           |
| عنه كان عند النبي صلى   | ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے |
| الله عليه وسلم طير فقال | پاس ایک چڑیا تھی، آپ نے فرمایا کہ     |

(۱) ملاحظہ ہو المستدرک ج ۳ ص ۱۳۰ ۱۳۲ (۲) تحفۃ الاحوذی مع ترمذی ج ۳ ص ۳۲۸ (۳) یہ رسالہ ۱۳۰۸ھ میں مصر سے شائع ہوا ہے، اس میں یہ حدیث موجود نہیں ہے لیکن مولوی سید اولاد حسین صاحب نے جنوابع رام پور کے مصاحب خاص دواعظ دربارتھے، خصائص مرتضوی کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جو مجلہ جوہری لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، اس میں حدیث طیر کا متن اور اردو ترجمہ موجود ہے، ملاحظہ ہو خصائص مرتضوی ص ۴۔

اللهم ائتني باحد خلقك  
اليك ياكل معي هذا الطير  
فجاء علي فاكل معه.

اے اللہ تو اس شخص کو میرے پاس بھیج  
دے جو تیرے نزدیک، تیری مخلوق  
میں سب سے زیادہ محبوب ہے تاکہ وہ

میرے ساتھ یہ چڑیا کھائے، چنانچہ  
حضرت علیؓ تشریف لائے اور انھوں  
نے آپ کے ساتھ اس کو تناول فرمایا۔

امام نسائی کی روایت میں ہے کہ پہلے ابو بکرؓ پھر حضرت عمرؓ تشریف لائے، مگر ان کو  
باریابی کی اجازت نہیں ملی، تیسری دفعہ جب پھر حضرت علیؓ تشریف لائے تو آپ نے  
اجازت مرحمت فرمائی، حاکم کی دونوں حدیثیں نہایت طویل ہیں، ان کا ملخص اور ما حاصل  
یہ ہے کہ آن حضورؐ کی دعا "اللهم ائتني الخ" سن کر حضرت انسؓ نے دعا کی کہ اے اللہ! یہ  
محبوب بندہ قبیلہ انصار کا کوئی آدمی ہو، چنانچہ جب دو دفعہ حضرت علیؓ ہی تشریف لائے تو  
حضرت انسؓ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت سے تشریف  
لے گئے ہیں مگر جب تیسری دفعہ بھی حضرت علیؓ ہی آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
فرمایا ان کو لو آؤ، تم ہی پر موقوف نہیں ہے، ہر شخص کو اپنی قوم سے محبت ہوتی ہے۔

امام ترمذی نے اپنی روایت کے متعلق فرمایا ہے کہ:

هذا حديث غريب لا نعرفه  
من حديث السدي الامن هذا  
الوجه وقد روى هذا الحديث  
من غير وجه عن انس.

یہ حدیث غریب ہے، سدی سے صرف  
اسی سند اور طریق سے ان کی حدیث کا  
ہم کو علم ہے حالانکہ یہ حضرت انسؓ سے  
متعدد وجوہ و طرق سے مروی ہے۔

علامہ ذہبیؒ تلخیص میں حدیث طبر کے پہلے طریق کے بارے میں لکھتے ہیں:

ابن عياض لا اعرفه ولقد  
ابن عياض کے بارے میں مجھ کو

واقفیت نہیں ہے، میرا ایک زمانہ تک خیال تھا کہ حاکم نے حدیث طبر کو مستدرک میں نقل کرنے کی جسارت نہ کی ہوگی لیکن جب میں نے یہ تعلق لکھی تو مجھ کو ایسی ہولناک موضوع حدیثیں اس میں ملیں جن کے مقابلہ میں حدیث طبر بلند پایہ ہے، کیوں کہ اس کے متعلق خود حاکم نے کہا ہے کہ اس کو حضرت انسؓ سے تیس سے زیادہ اشخاص نے بیان کیا ہے اس کے علاوہ یہ حضرت علیؓ، ابوسعیدؓ اور سفینہؓ سے بھی صحت کے ساتھ مروی ہے۔

كنت زمانا طويلا اظن ان حديث الطير لم يجسر الحاكم ان يودعه في مستدركه فلما علفت هذا الكتاب رأيت الهول من الموضوعات التي فيه فاذا حديث الطير بالنسبة اليها سماء قال وقدر واه عن انس جماعة اكثر من ثلاثين نفسا ثم صحت الرواية عن علي وابي سعيد وسفينة. (۱)

اور دوسرے طریق کے ایک راوی ابراہیم بن ثابت کو ساقط قرار دیا ہے۔ (۲)  
تذکرہ میں اس حدیث کے متعلق ذہبی کا رویہ مزید نرم ہو گیا ہے، چنانچہ فرماتے

ہیں:

رعی حدیث طبر تو یہ بکثرت طرق سے مروی ہے، میں نے ان سب کو ایک مستقل رسالہ میں جمع کیا ہے، ان سب کے مجموعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بے اصل نہیں ہے۔

واما حديث الطير فله طرق كثيرة جدا افردها بمصنف وبمجموعها يوجب ان يكون الحديث له اصل. (۳)

(۱) تخمیں مع مستدرک ج ۳ ص ۱۳۱ (۲) ایضاً ص ۱۳۲ (۳) تذکرۃ الصحاح ج ۳ ص ۲۴۵۔

ذہبی کے ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو حدیث طبر کے ضعیف یا موضوع ہونے کے بارے میں شرح صدر نہیں تھا اور امام ترمذی نے اگرچہ اس کو غریب بتایا ہے تاہم انھوں نے اس کے کثرت طرق وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی یہ موضوع اور ضعیف نہیں ہے۔

لیکن عام علما نے حدیث طبر کو صحیح تسلیم نہیں کیا ہے جیسا کہ حاکم پر ان کے اعتراضات سے ظاہر ہوتا ہے، البتہ بعض کے نزدیک ضعیف ہے اور بعض کے نزدیک موضوع، علامہ ابن سبکی نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، وہ فرماتے ہیں:

”حدیث طبر پر وضع کا الزام لگانا صحیح نہیں ہے، ہمارے دوست حافظ صلاح الدین ظلیل بن کیکلہ علائی نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے متعلق صحیح فیصلہ یہ ہے کہ اس کے بعض طرق حسن کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ اس کو ضعیف کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے تمام طرق کا موضوع ہونا ثابت نہیں ہوتا، انھوں نے اس کی سند کے تمام رجال کو بجز احمد بن عیاض کے، ثقہ و معرف بتایا ہے لیکن میری نظر سے ان کی جرح یا توثیق کے بارے میں کوئی قول نہیں گذرا ہے۔“ (۱)

علامہ زبیلی نے بھی جن کی رائے آگے نقل کی جائے گی، اس کو ضعیف ہی قرار دیا ہے۔

لیکن جن لوگوں نے اس کو موضوع قرار دیا ہے، ان کی تعداد زیادہ ہے، علامہ ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے، وہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

”حاکم نے حدیث طبر کو صحیح بتایا ہے لیکن ابن ناصر کہتے ہیں کہ یہ موضوع ہے اور اہل کوفہ میں سے ساقط الاعتبار قسم کے لوگوں نے کچھ مشہور اور کچھ مجہول

راویوں کے واسطے اس کو حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کیا ہے۔“ (۱)

علامہ ابن کثیر نے بھی یہی لکھا ہے۔ (۲)

علامہ شوکانی فرماتے ہیں:

مختصر میں کہا گیا ہے کہ اس کے بہت سے طرق ہیں جو سب ضعیف ہیں اور علامہ ابن جوزی نے اس کا موضوعات میں تذکرہ کیا ہے مگر حاکم نے مستدرک میں اس کی تخریج کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے اس کی وجہ سے اکثر علما نے ان پر اعتراضات کئے ہیں جس کو اس کی مفصل بحث دیکھنی ہو وہ سیر النبلاء (۳) میں حاکم کا ترجمہ دیکھیے۔

قال فی المختصر له طرق كثيرة كلها ضعيفة وقد ذكره ابن جوزي في الموضوعات واما الحاكم فاخرجه في المستدرک وصححه واعترض عليه كثير من اهل العلم ومن اراد استيفاء البحث فلي نظر ترجمة الحاكم في النبلاء (۳)

علامہ محمد بن طاہر بیہقی نے بھی اس کو موضوع بتایا ہے۔ (۵)

حاکم نے مستدرک میں اس کی صحت ثابت کرنے کے لیے کثرت طرق کا سہارا

لیا ہے مگر علامہ زبیلی فرماتے ہیں:

کتنی حدیثیں ایسی ہیں جن کے رواۃ

و کم من حدیث کثرت رواۃ

زیادہ اور طرق متعدد ہوتے ہیں لیکن وہ

وتعددت طرقه وهو حدیث

(۱) المنتظم ج ۷ ص ۲۷۵ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۵۵ (۳) الفوائد المجموعہ فی الاحادیث

الموضوعہ ص ۲۰۸ (۴) افسوس ہے کہ سیر النبلاء کی یہ جلد ہماری نظر سے نہیں گذری (۵) تذکرۃ الموضوعات

ضعیف کحدیث الطیر      حدیثیں ضعیف ہوتی ہیں حدیث طیر،  
 وحديث الحاجم والمحجوم      حدیث حاجم و محجوم اور حدیث من  
 وحديث من كنت مولاه      كنت مولاه فعلى مولاه.  
 فعلى مولاه. (۱)

امام دارقطنی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے سامنے اس حدیث کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے مستدرک اور حاکم پر اظہار تکبیر کیا، خود حاکم کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بعد میں اس حدیث کو موضوع سمجھ کر مستدرک سے خارج کر دیا تھا، ابو محمد بن سمرقندی کا بیان ہے کہ حاکم کو 'حدیث طیر' کے متعلق جب امام دارقطنی کی تکبیر و ملامت کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا" (۲)

علامہ ذہبی کے ایک بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:  
 "حاکم شاگرد ابو عبد الرحمن شاذلی جی کہتے ہیں کہ سید ابوالحسن کی مجلس میں ہم لوگوں نے حاکم سے حدیث طیر کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ "یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ اگر اس کو صحیح مانا جائے تو رسول اللہ کے بعد کوئی شخص حضرت علیؑ سے افضل نہ ہوگا، مگر میرا خیال ہے کہ اس کے متعلق بعد میں حاکم کی رائے بدل گئی تھی اور انھوں نے اس کو مستدرک میں شامل کر دیا تھا، اس طرح یہ حدیث مستدرک میں باقی رہ گئی۔" (۳)

بہر حال حاکم نے چاہے حدیث طیر کو مستدرک سے خارج کیا ہو یا نہ کیا ہو، اس کا موضوع اور باطل ہونا اکثر علمائے فن اور محدثین کے نزدیک مسلم ہے۔

(۱) نصب الراية ج ۱ ص ۳۶۰ (۲) طبقات الشافعية ج ۳ ص ۶۸ (۳) دیکھو تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۳۵،

علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں "ہمارے استاذ علامہ ذہبی کا بیان درست اور بجا ہے، مستدرک میں حدیث طیر کا وہ جانا تسارح کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، پہلے تو میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

تذکرۃ المحمّدین.... گلستان حدیث کے ہر کئے گلابوں کا ایمان افزہ تحقیقی تذکرہ

638

گو محمد ثین اور اصحاب فن کے نزدیک اس حدیث کا موضوع ہونا مسلم ہے لیکن اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے جب بھی اس سے شیعیت کی تائید نہیں ہوتی کیوں کہ اس سے حضرت علیؑ کا علی الاطلاق سب سے افضل و برتر ہونا یقینی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔

شافعیات میں غلو اور تعصب کا الزام: امام حاکم شافعی المذہب تھے، ان پر الزامات کی فہرست میں ایک الزام یہ بھی ہے کہ ان کو اس مذہب میں بے جا غلو اور تعصب تھا لیکن اس

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) حاکم کے تخریج نہ کرنے کے باوجود اس حدیث کو مستدرک میں شامل کر دیا گیا ہو، اس

لیے میں نے اس کی تحقیق کے لیے مستدرک کے قدیم نسخوں کا جائزہ لیا لیکن مجھ کو اس سلسلہ میں شرح صدر

نہ ہوا مگر جب امام دارقطنی کے استدراک و کبیر سے حاکم نے مطلع ہونے کے بعد اس کو خارج نہیں کیا تو

خیال ہوا کہ ممکن ہے حاکم نے اس کی پہلے تخریج کی ہو اور بعد میں خارج کر دیا ہو لیکن بعض نسخوں میں یہ صحیح

رہ گئی ہو، اگر یہ ثابت ہو جائے تو دونوں روایتیں درست ہو جائیں گی اور صورت واقعہ یہ ہوگی کہ حاکم نے

اس حدیث کی تخریج کی تھی، مگر جب ان کو اس کا باطل ہونا قطعیت کے ساتھ معلوم ہو گیا تو انھوں نے اس

کو مستدرک سے خارج کر دیا، جیسا کہ اس روایت سے جس کی سندوں کو ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے، معلوم

ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض نسخوں میں یہ حدیث یا تو کتاب کے مشتمل اور شائع ہو جانے کی وجہ سے

باقی رہ گئی ہو یا حاکم کے مخالفین اور نکتہ چینوں نے اس کو اس میں شامل کر دیا ہو (طبقات الشافعیہ ج ۳

ص ۱۷) علامہ ابن سنی نے مخالفین کے بارے میں جس شبہہ کا اظہار کیا ہے، وہ بے بنیاد نہیں ہے، خود ابن

طاہر کا بیان ہے کہ میں نے حاکم کے قلم سے ایک ضخیم مجموعہ میں حدیث طبرہ دیکھی تو اس کو تعجب کی وجہ سے

نقل کر لیا ممکن ہے اسی طرح بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہو، اس طرح سے اس

کو عام شہرت ہو گئی ہو اور جن لوگوں کو حاکم کی بعد کی رائے کی اطلاع نہ ہو سکی ہو انھوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ

حدیث مستدرک میں شامل ہے اور مستدرک کے بعض نسخوں میں یہ حدیث موجود تھی، اس لیے جامعین

دورترین سے عدم امتیاز کی بنا پر تسامح ہو گیا، اس طرح وہ مستدرک کے متداول نسخوں میں بھی باقی رہ گئی

ہے۔ ”ض“



الزام کا ان کے سوانح نگاروں نے ذکر نہیں کیا ہے، اس کو مشہور عالم اور ندوۃ المستفین دہلی کے سابق رفیق مولانا عبدالرشید نعمانی نے زیادہ شد و مد سے لکھا ہے، وہ اپنی ایک عربی تصنیف ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ میں تحریر فرماتے ہیں:

”علامہ ابن صلاح نے ائمہ خرمہ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور

نسائی) کے بعد جن اکابر محدثین کا ذکر کیا ہے، یعنی دارقطنی، حاکم، عبدالغنی بن

سعید مصری ابو نعیم اصبہانی اور ان کے بعد کے طبقہ میں ابن عبدالبر، بیہقی

اور خطیب، یہ سب کے سب عبدالغنی بن سعید اور ابن عبدالبر کے علاوہ ائمہ شافعیہ

میں ہیں اور ان لوگوں کو اس مذہب کے بارے میں شدید تعصب تھا۔“

حافظ ابن جوزی المختصر میں لکھتے ہیں:

”..... اسماعیل بن ابوالفضل قوسمی اصبہانی سے یہ کہتے ہوئے

سنا گیا ہے کہ وہ تین محدثین کو ان کے سخت تعصب اور انصاف کی کمی کی وجہ سے

ناپسند کرتے تھے۔ ۱- حاکم ابو عبداللہ ۲- ابو نعیم اصبہانی ۳- ابو بکر خطیب،

اسماعیل نے بالکل صحیح کہا ہے، وہ ثقہ و صدوق اور کبار محدثین میں تھے، ان کو

رجال و متون کی اچھی اور عمدہ معرفت حاصل تھی اور وہ بڑے متدین تھے۔ (۱)

مولانا نے آگے چل کر ان محدثین میں سے بعض کے تعصب کی مزید وضاحت

کی ہے لیکن حاکم کے متعلق یہاں صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے مگر حاکم کے رسالہ

المدخل الی علم الحدیث پر ان کا ایک طویل مضمون ماہنامہ برہان دہلی کے کئی نمبروں میں شائع

ہوا ہے، اس میں المدخل کے بعض مختصر مباحث کی توضیح و تفصیل کے علاوہ اس پر نقد و تعقب

بھی کیا گیا ہے، اس مضمون کے شروع میں کسی قدر تفصیل اور تیز لہجہ میں اس الزام کا اعادہ کیا

گیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

(۱) ماتمس الیہ الحاجۃ ص ۱۳ بحوالہ المختصر ج ۸ ص ۲۶۹۔

”حاکم کی تصانیف کے مطالعہ کے وقت دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں، اولاً ان کا نقد و نظر میں تساہل، ثانیاً تعصب، ان کا تساہل تو ایک متعارف چیز ہے، مگر تعصب پر ممکن ہے، ظاہر بینوں کو یقین نہ آئے لیکن یہ صرف ہمارا بیان نہیں بلکہ ائمہ فن کی تصریح ہے، حافظ عبدالرحمن بن جوزی نے بسند صحیح حافظ اسماعیل بن ابی الفضل قوسی کا یہ قول نقل کیا ہے، (۱) المدخل میں بھی ائمہ احناف کا جس طریقہ پر ذکر کیا ہے، اس سے حافظ اسماعیل کے بیان کی توثیق ہو جاتی ہے، ضعفا سے روایت کے باب میں جہاں ائمہ کا نام لیا ہے، امام مالک کا ذکر اس عظمت شان کے ساتھ کیا ہے ”وہذا مالک بن انس امام اہل الحجاز بلا مدافعة۔ اسی طرح امام شافعی کا نام لینے کے بعد لکھتے ہیں: ”وہو الامام لاهل الحجاز بعد مالک۔“ لیکن امام ابو حنیفہ: اور صاحبین کے صرف نام بتانے پر اکتفا کی ہے، چنانچہ تحریر ہے، ”وہذا ابو حنیفہ ثم بعدہ ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم القاضی و محمد بن الحسن الشیبانی اور ابو عاصمہ نوح بن ابی مریم پر جو امام ابو حنیفہ کے تلامذہ میں سے ہیں اور فقہا میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، وضع حدیث کا الزام لگایا ہے اور ایک مجہول شخص کے بیان سے استدلال کیا ہے۔“ (۲)

مذکورہ بالا دونوں تحریروں کا تجزیہ کرنے سے حاکم کے تعصب کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں:

۱- رسالہ المدخل میں حاکم نے امام مالک اور امام شافعی کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے اس عظمت کے ساتھ امام ابو حنیفہ کا نہیں کیا ہے۔

(۱) یہ بیان پہلی تحریر میں گزر چکا ہے، اس لیے اس کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے (۲) ماہنامہ برہان فروری

۲- حاکم نے امام ابوحنیفہ کے ایک شاگرد ابوعمصہ نوح ابن ابی مریم پر جو فقہ میں امتیاز رکھتے تھے، ایک مجہول شخص کے بیان پر اعتماد کر کے وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔ پہلا تجزیہ یقیناً صحیح ہے، المدخل میں حاکم نے ان ائمہ کا اسی حیثیت سے ذکر کیا ہے، (۱) لیکن غالباً اس کو امام اعظم کی تنقیص اور شافعیوں میں غلو و تعصب کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ

۱- امام اعظم کے بارے میں معتدل محدثین کو اگرچہ پوری طرح تسلیم تھا کہ فقہ و اجتہاد میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا لیکن حدیث میں وہ ان کا پایہ زیادہ بلند نہیں مانتے تھے، بلکہ بعض کا تو یہاں تک خیال ہے کہ روایت و حدیث کے معاملہ میں وہ ضعیف اور کمتر تھے (۲) یہ خیال خواہ تمام تر غلط یا سراسر غلط فہمی پر مبنی ہو لیکن واقعہ یہی ہے، ان کے مقابلہ میں وہ ائمہ ثلاثہ خصوصاً امام مالک اور امام احمد کو حدیث میں نہایت بلند پایہ اور عالی مرتبہ سمجھتے تھے، اسی لیے محدثین ائمہ ثلاثہ سے امام اعظم کے مقابلہ میں زیادہ قریب بھی ہیں اور ان کے زیادہ ہم نوا بھی اور وہ ان ائمہ کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اس عظمت کے ساتھ امام ابوحنیفہ کا نہیں کرتے لیکن محض اس بنا پر محدثین کی پوری جماعت کو امام اعظم کا مخالف و معاند اور ان ائمہ کا بیجا ہمنوا اور حمایتی نہیں قرار دیا جاسکتا، اس لیے حاکم کا بھی ان ائمہ کے مقابلہ میں امام ابوحنیفہ کا اس عظمت شان کے ساتھ ذکر نہ کرنا جس عظمت شان کے ساتھ کرنا چاہیے، درحقیقت شافعیوں میں غلو اور تعصب کا نتیجہ نہیں ہے۔

۲- حاکم عام محدثین کے برخلاف امام ابوحنیفہ کو صرف فقہ و اجتہاد ہی میں امام اور بلند پایہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ حدیث و روایت میں بھی ان کی اہمیت کے قائل تھے چنانچہ یہاں بھی سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے امام مالک اور امام شافعی کی طرح ان (۱) المدخل ص ۵- (۲) اس کے متعلق مفصل بحث کے لیے راقم کا مضمون ”کیا امام دارقطنی امام ابوحنیفہ سے تعصب رکھتے تھے“ مطبوعہ معارف ستمبر ۱۹۶۹ء اچھ کیجئے۔

کا اور صاحبین کا بھی ذکر ائمہ محدثین ہی کی حیثیت سے کیا ہے، جیسا کہ ابتداءً "فمن الاثمة الماضین" اور صاحبین کا نام لینے کے بعد وکذا لک من بعد ہما من ائمة المسلمین" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو ان بزرگوں کی امامت فن اور معرفت حدیث سے انکار نہیں تھا لیکن امام شافعی اور امام مالک کے ساتھ انھوں نے جو تو صیغہ و تکریم کا انداز اختیار کیا ہے اس کا غالباً سبب یہ ہے کہ ان کو بالاتفاق محدثین کی جماعت بھی حدیث و روایت میں امام سمجھتی تھی لیکن امام ابوحنیفہ کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہے۔

حاکم کے نزدیک حدیث میں امام ابوحنیفہ کی اہمیت اور درجہ کا اندازہ خود مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب کی اس تحریر سے بھی ہوتا ہے:

”حاکم اپنے مستدرک میں امام ابوحنیفہ سے استشہاد بھی کرتے ہیں اور ان کو ائمہ اسلام میں بھی شمار کرتے ہیں، انھوں نے ان کا اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث کی انچاسویں نوع میں ان مشہور ثقہ ائمہ تابعین و تبع تابعین میں ذکر کیا ہے جن کی حدیثیں حفظ و مذاکرہ اور تبرک کے لیے لکھی جاتی ہیں اور جن کا مشرق و مغرب میں شہرہ ہے۔“ (۱)

۳- حاکم شافعی المذہب تھے، اس لیے ظاہر ہے کہ ان کو غلو، جیسا کہ مولانا نے بھی لکھا ہے، اسی مذہب میں ہوگا لیکن یہ بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے امام مالک کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس عظمت شان کے ساتھ امام شافعی کا ذکر نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں ان پر اگر کوئی الزام عائد ہو سکتا ہے تو وہ مالکیت میں غلو کا نہ کہ شافعییت میں، حقیقت یہ ہے کہ حدیث و روایت میں امام مالک کا درجہ امام شافعی سے بڑھ کر تھا، اس لیے حاکم نے اپنے امام مذہب کے مقابلہ میں ان کا اگر زیادہ عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے تو یہ دراصل ان کے تعصب کا نہیں بلکہ انصاف پسندی کا نتیجہ ہے۔

(۱) ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ ص ۳۲۔

متذکرۃ الحدیثین.... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

643

۴- اس عبارت میں جس طرح انھوں نے امام اعظم اور صاحبین کے ناموں کے ساتھ امام وغیرہ کا لفظ نہیں لکھا ہے، اسی طرح کتاب کے دوسرے مقامات و مباحث میں حدیث و روایت کے کئی اساطین و اکابر جیسے امام احمد، امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ کا صرف سادہ نام دیدیا ہے اور عموماً عربی مصنفین کا یہی قاعدہ بھی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ صحیح ہے کہ حاکم کو امام مالک اور امام شافعی کی طرح امام اعظم اور صاحبین کا بھی اسی تعریف و تکریم کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے تھا ممکن ہے انھوں نے ایسا کیا ہو مگر بعد میں جب حق پسندی کی جگہ عصیت نے لے لی ہو تو ناقلین نے اسے حذف کر دیا ہو۔

رہا دوسرا جز تو واقعہ کے اعتبار سے وہ بھی صحیح ہے، حاکم نے ابو عصمہ کے متعلق المدخل میں یہ ضرور لکھا ہے کہ:

”بعض لوگوں نے ثواب کے خیال سے بھی حدیثیں وضع کیں، ان لوگوں نے خود ہی بیان کیا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو فضائل اعمال کی دعوت و تلقین کرنے کے لیے ایسا کیا جیسے ابو عصمہ نوح بن ابی مریم مروزی، محمد بن عکاشہ کرمانی، احمد بن عبد اللہ جوہاری، محمد بن قاسم طائکانی اور مامون بن عبد اللہ ہروی وغیرہ۔ میں نے محمد بن یونس مقری سے، انھوں نے جعفر بن احمد بن نصر سے اور انھوں نے ابو عمار مروزی سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ابو عصمہ سے کہا گیا کہ آپ کو عکرمہ کی وہ حدیث کیسے ملی ہے، جس کو انھوں نے عباسؓ سے قرآن کے فضائل کے سلسلہ میں روایت کیا ہے، تو انھوں نے کہا کہ میں نے لوگوں کو قرآن سے بے نیاز اور درگرداں ہو کر امام ابو حنیفہ کی فقہ اور محمد بن اسحاق کے مغازی میں مشغول پایا تو ثواب کے خیال سے یہ حدیث وضع کر لی۔“ (۱)

(۱) المدخل ص ۱۹، ۲۰، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی، نوح کا یہ بیان نقل (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مگر ابو عاصمہ کے متعلق حاکم کی یہ منفرد رائے نہیں ہے، کم و بیش تمام ائمہ جرح و تعدیل نے ان کو غیر ضابط، منکر الحدیث اور وضاع و کذاب تک کہا ہے، ان کے بارے میں سب سے نرم رائے ابن عدی کی ہے، مگر وہ کہتے ہیں ہم نے ان سے جو روایتیں کی ہیں وہ سب عموماً ایسی ہیں جن میں ان کی متابعت نہیں کی گئی ہے لیکن ان کے ضعف کے باوجود ان کی حدیثیں لکھی جائیں گی اور سب سے سخت رائے ابن مبارک کی ہے وہ ان پر نکیر کرتے، ان کی حدیثوں کو ناپسند کرتے اور انہیں وضعی اور جعلی قرار دیتے تھے، ایک بار و کعب سے انہوں نے فرمایا کہ ہمارے یہاں ایک شیخ ہیں، ان کا نام ابو عاصمہ ہے، یہ اسی طرح حدیثیں وضع کرتے ہیں جس طرح معلیٰ بن ہلال کرتے تھے۔

ابو عاصمہ کے متعلق ذیل میں متعدد نقادان فن کے اقوال اور جرحیں درج کی جاتی

ہیں:

امام احمد: وہ حدیث میں بلند پایہ نہ تھے، بلکہ منکر حدیثیں بیان کرتے تھے۔

یحییٰ ابن معین: نہ حدیث میں ان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ان کی حدیثیں لکھی

جائیں گی۔

وکعب: ان کا کیا اعتبار؟ ابن مبارک ان سے روایت نہیں کرتے۔

امام بخاری: ان کی حدیثیں غیر صحیح اور وہ منکر الحدیث و ذاہب الحدیث ہیں۔

ابو حاتم: دولابی، امام مسلم اور امام دارقطنی: متروک الحدیث۔

ابوزرعہ: ضعیف الحدیث۔

امام نسائی: ابو عاصمہ غیر ثقہ و غیر مامون اور ساقط الحدیث ہیں، ان سے حدیث

نہیں لکھی جائے گی۔

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ) کرنے کے بعد لکھتے ہیں "وایں عذرا و بدتر از گناہ است زیرا کہ احادیث صحیحہ کہ

در فضائل قرآن وارد شدہ برائے ترفیب کافی بودہ۔" (ملاحظہ ہو) (عالم نافعہ مع فوائد ص ۲۵)

جوز جانی: ساقط الحدیث

ابن حبان: ابو عاصمہ سندوں کو الٹ پلٹ دیتے تھے اور ثقہ لوگوں کی جانب منسوب کر کے حدیثیں بیان کرتے تھے، وہ کسی حال میں بھی اعتبار و احتجاج کے لائق نہیں، ان کا لقب اگرچہ جامع تھا، مگر وہ صدق کے سوا ہر چیز کے جامع رہے ہوں گے۔

ابن عمیرہ و ابو علی نیشاپوری: وہ کذاب تھے۔

خلیلی: ان کے ضعف پر محدثین کا اجماع ہے۔

ساجی: متروک الحدیث ہیں، ان کے پاس باطل حدیثیں ہوتھیں۔

ابوسعید الخدش: انھوں نے موضوعات کی روایت کی ہے۔

حافظ ذہبی و ابن عماد: متروک الحدیث، ذہبی نے ان کی بعض ضعیف اور وہابی

حدیثوں کی مثالیں بھی دی ہیں۔

حافظ ابن حجر: لوگوں نے حدیث میں ان کو کاذب قرار دیا ہے، انھوں نے

زہری اور ابن منکدر کو ضرور پایا تھا، مگر ان سے حدیثیں بیان کرنے میں تدریس سے کام لیتے

تھے، ابن مبارک نے ان کی ایک طویل حدیث کو بے اصل قرار دیا ہے، واقعہ اس میں وضع

کے آثار و علامات بالکل ظاہر و واضح ہیں، ابو جعفر طبری نے اپنی تاریخ کی ابتدا میں بدء الخلق

کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی عدم صحت کی جانب اشارہ بھی کیا ہے۔

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے حاکم کا مذکورہ بالا بیان بلا نقد و تبصرہ نقل کیا ہے،

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک حاکم کا بیان قابل اعتراض نہیں ہے۔ (۱)

ائمہ جرح و تعدیل کے ان متفقہ آراء و اقوال کے بعد یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ

(۱) ائمہ جرح و تعدیل کے ان بیانات کے لیے میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۵ تہذیب المعجم ج ۱ ص ۱۰

ص ۲۸۹۵ تقریب المعجم ص ۲۶۳، خلاصہ تہذیب ص ۲۰۵ المعجم ج ۱ ص ۲۶۳ تاریخ الصغیر امام

بخاری اور کتاب الضعفاء والمتروکین امام ذہبی ملاحظہ ہو۔

امام حاکم نے برہنائے تعصب نوح کو واضح حدیث قرار دیا ہے، اگر ان کی روایت مجہول شخص کے واسطے سے بھی ہو تو ان آرا کی موجودگی میں اس کے صحیح ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، آخر ابن حجر اور ذہبی نے بھی تو حاکم کے بیان پر کوئی رد و کد نہیں کیا ہے اسی طرح مولانا عبدالحلیم چشتی نے جو اس دور کے مشہور فاضل اور اچھے اہل قلم ہیں، ابو عصمہ نوح بن ابی مریم کے ضعیف و متروک ہونے کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

ابو عصمہ نوح نے امام زہری، ثابت بنانی، یحییٰ بن سعید انصاری اور ابن ابی لیلیٰ وغیر ہم سے حدیث پڑھی اور ان سے شعبہ اور عبداللہ بن مبارک رحمہما اللہ راوی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ ثقہ تھے لیکن اور محدثین کی نظر میں متروک ہیں ان پر بڑا بڑا غلبہ تھا..... حافظ ذہبی کتاب العمر میں لکھتے ہیں..... وهو متروک الحدیث..... (فوائد جامعہ برعالمہ نافعہ ص ۵۲۴ و ۵۲۵)

مولانا عبدالرشید صاحب نے اپنے خیال کی تائید و توثیق میں اسماعیل بن ابوالفضل قومی کا ایک بیان بھی نقل کیا ہے جس کا صرف حافظ ابن جوزی جیسے متشدّد شخص نے ائمتہ منظم میں خطیب بغدادی کے تذکرہ میں ذکر کیا ہے لیکن ان تمام سوانح نگاروں کے اقوال کے مقابلہ میں اس شاذ اور منفرد قول کی اہمیت ہو سکتی ہے؟ جنہوں نے حاکم کے مفصل ترجمے لکھے اور ان پر عائد کیے جانے والے الزامات گنائے، مگر اس الزام کا ذکر تک نہیں کیا، مولانا کو چاہیے تھا کہ وہ دیگر ائمہ اور ناقلمین خصوصاً حاکم کے اساتذہ، تلامذہ اور معاصرین وغیرہ کے اقوال سے ثبوت اور سندیں پیش کرتے یا پھر احکام و مسائل میں حاکم کے غلو و تعصب کی مثالیں بیان کرتے تو ممکن ہے، ”ظاہر بینوں“ کو بھی حاکم کے تعصب کا یقین ہو جاتا۔

متدرک کے بعض مقامات میں حاکم نے ضرور شافعی مذہب کی تائید و حمایت کی



متذکرۃ الحمدین..... گلستان حدیث کے ہستے گلایوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

647

ہے لیکن اس کا غلو و تعصب سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اسی طرح کے بعض مواقع پر انھوں نے امام شافعیؒ کے بجائے بعض دوسرے ائمہ جیسے ابن خزیمہ وغیرہ سے اپنی عقیدت کا ظہار کیا ہے ظاہر ہے کسی کے اپنے فقہی مسلک کی ترجیح اور اپنے امام مذہب کی تائید کو اس کے غلو و تعصب پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔



## امام ابوالقاسم تمام رازی

(متوفی ۴۱۳ھ)

نام و نسب: تمام نام، ابوالقاسم کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: تمام بن محمد بن عبد اللہ بن جعفر بن عبد اللہ بن جنید۔ (۱)

ولادت، خاندان اور وطن: امام ابوالقاسم تمام کا اصل آبائی وطن رے تھا لیکن اسلامی عہد میں ان کا خاندان دمشق میں آباد ہو گیا تھا، یہیں وہ ۳۳۰ھ میں پیدا ہوئے، اسی لیے رازی اور دمشقی کہلاتے ہیں، بجلی کی نسبت سے بھی مشہور ہیں، کیوں کہ ان کے خاندان کا عرب کے مشہور قبیلہ بجیلہ سے ولا کا تعلق تھا، ان کے والد بزرگوار ابوالحسین محمد بھی بلند پایہ محدث تھے۔ (۲)

اساتذہ: اپنے والد ماجد کے علاوہ جن محدثین سے ان کو شرف تلمذ حاصل ہے، ان کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن احمد بن حزام، ابوعلی احمد بن محمد بن فضالہ، ابو میمون بن راشد، ابو یعقوب اذرعی، ابوعلی حسن بن حبیب، سمسار بن، (۳) خثیمہ بن سلیمان طرابلسی، محمد بن حمید جواری وغیرہ۔

ابوعمر و بن العلاء (۴) علی غلام سبک سے فن قرأت کی تحصیل کی تھی۔

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۴۲ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۵۸ (۳) شاہ عبدالعزیز صاحب نے حسن بن ملت حضار کی لکھا ہے (بستان ص ۹۲) (۴) حافظ ذہبی نے ان کا نام علی احمد بن عثمان غلام لکھا ہے۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن (۱) میدانی، ابوعلی اہوازی، احمد بن عبدالرحمن طریفی، احمد بن محمد عتقی، حسن بن علی الباد، عبدالعزیز بن احمد کتانی اور عبدالوہاب کلابی وغیرہ۔ (۲)  
حفظ وضبط: وہ حفظ حدیث میں بے نظیر تھے، ابو بکر حداد کا بیان ہے کہ حفظ و روایت میں ہم نے ان سے زیادہ جامع اور باکمال شخص نہیں دیکھا، عبدالعزیز کتانی فرماتے ہیں کہ اہل شام کی روایتوں کے یہ سب سے بڑے اور اچھے حافظ و ضابط تھے۔

ثقافت: ان کی عدالت و ثقافت بھی مسلم ہے، کتانی نے اس کا اعتراف کیا ہے، حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ و مامون تھے۔

علل و اسماء الرجال میں مہارت: علل اور رجال حدیث کے ماہر تھے، اہوازی کا بیان ہے کہ تمام فن حدیث میں تبحر، علل سے واقف اور رجال کی معرفت میں بڑا درخور رکھتے تھے، میں نے ایسا ماہر فن نہیں دیکھا۔ (۳)

حدیث میں درجہ: ان تصریحات سے حدیث میں ان کی اہمیت و عظمت کا اندازہ ہوتا ہے، علمائے فن نے ان کو عارف و عالم بالحدیث اور محدث الشام وغیرہ کہا ہے۔

وفات: چوراسی سال کی عمر میں ۳ محرم الحرام ۴۱۴ھ کو انتقال کیا۔ (۴)

تصنیفات: ان کی صرف ایک ہی کتاب فوائد کا نام معلوم ہو سکا ہے، یہ تیس جزوں پر مشتمل تھی۔ (۵)

(۱) ذہبی نے ابوالحسن کے بجائے ابوالحسن لکھا ہے (تذکرہ ج ۳ ص ۲۵۸) (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۲۲ و تذکرہ ج ۳ ص ۲۵۸ و بستان الحمد شین ص ۹۲ (۳) ایضاً (۴) ایضاً (۵) الرسالة المسطر ف ص ۷۹۔

☆☆☆

# امام ابو بکر بن مردویہ الکبیر اصہبانی

(۴۱۶ھ)

نام و نسب: احمد نام، ابو بکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن موسیٰ بن مردویہ بن فزک۔ (۱)

اپنے دادا مردویہ کے نام پر ابن مردویہ کے لقب سے معروف ہیں، الکبیر بھی ان کے نام کا جز ہے، کیوں کہ ان کے پوتے ابو بکر احمد بن محمد بھی ابن مردویہ کے لقب سے مشہور ہیں اور ان کو ابن مردویہ الصغیر کہا جاتا ہے، ابن مردویہ صغیر کی اپنے دادا ابن مردویہ کبیر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ان کا انتقال ۴۹۸ھ میں ہوا۔

ولادت و وطن: ۳۲۳ھ میں اصہبان میں پیدا ہوئے۔ (۲)

اساتذہ: بعض اساتذہ و شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابو ہبل بن زیاد القطان، احمد بن عبد اللہ بن دلیل، احمد بن عیسیٰ خفاف، احمد بن محمد بن عاصم کرمانی، اسحاق بن محمد بن علی کوفی، اسماعیل خطی، محمد بن احمد بن علی اسواری، محمد بن عبد اللہ بن علم الصقار، محمد بن علی بن دحیم شیبانی اور میمون بن اسحاق خراسانی۔

تلامذہ: ابن مردویہ کبیر کے ممتاز شاگردوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

ابو عبد اللہ ثقفی، ابو القاسم عبد الرحمن بن مندہ، عبد الوہاب بن مندہ، ابو الخیر محمد بن

احمد دردا، ابو بکر محمد بن حسن، ابو منصور محمد بن سکرویہ، ابو مطیع محمد بن عبد الواحد مصری۔ (۳)

(۱) المختصر ج ۷ ص ۲۹۴ والبدایہ ج ۱۲ ص ۸۸ (۲) تذکرہ ج ۳ ص ۲۵۳ (۳) ایضاً۔

سفر: حدیث کی تحصیل اور علوم و فنون کی تکمیل کے لیے ان کے عراق، نجد، تشریف لے جانے کا ذکر ملتا ہے۔

حدیث میں درجہ: حدیث میں بلند مرتبت تھے، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ وہ اس فن کے ممتاز ماہر اور رجال کی اچھی پرکھ رکھتے تھے، ابن عماد کا بیان ہے کہ وہ حدیث میں نام اور اس کے واقف کار تھے، ان کا حفظ و اتقان اور ضبط و ثقاہت بھی مسلم ہے، حافظ ذہبی نے الحافظ الثبت لکھا ہے۔ (۱)

وفات: مشہور روایت کے مطابق ۲۴ رمضان ۴۱۶ھ کو انتقال ہوا (۲) لیکن ابن اثیر: جوزی اور ابن کثیر نے ۴۱۰ھ سنہ وفات تحریر کیا ہے۔ (۳)

تصنیفات: ابن مردویہ کی حسب ذیل تصنیفات کا علم ہو سکتا ہے۔

۱۔ المستخرج علی جامع الصحیح البخاری۔ ۲۔ تفسیر ابن مردویہ۔ ۳۔ تاریخ اصحابان۔ (۴)



(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۵۳ و شذرات الذهب ج ۳ ص ۱۹۰ (۲) تذکرہ وستان المحدثین (۳) تاریخ ابن اثیر ج ۹ ص ۱۰۸، المختصر ج ۷ ص ۲۹۴، البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۸ (۴) مولانا عبدالحلیم چشتی نے غلطی سے ان کی آیت تصنیف الجامع المختصر فی الطب کا ذکر کیا ہے، نوآئد جامعہ ص ۸۴ حالانکہ یہ احمد بن عبد الرحمن مندویہ اسماعیلی کی تصنیف ہے، دیکھئے کشف الظنون ج ۱ ص ۳۸۵۔

# امام ابو بکر احمد بن محمد برقانی خوارزمی

(متوفی ۴۲۵ھ)

نام و نسب: احمد نام، ابو بکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن محمد بن احمد بن غالب۔  
ولادت و وطن: امام ابو بکر برقانی ۳۳۶ھ میں خوارزم کے نواح کے ایک گاؤں برقان میں پیدا ہوئے، اسی لیے برقانی اور خوارزمی کی نسبتوں سے مشہور ہیں، برقان دریائے جیحون کے مشرقی ساحل پر ایک زرخیز اور شاداب مقام تھا پھر ویران ہو گیا (۱) اور امام برقانی نے دریائے بغداد میں سکونت اختیار کر لی اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔  
اساتذہ: ان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، بعض کے نام یہ ہیں:

ابن نحاس مصری، ابو احمد الحافظ، ابو بحر بن کوثر البر بھاری، ابو بکر احمد بن ابراہیم اسماعیلی، احمد بن ابراہیم بن حباب، احمد بن جعفر بن سلمہ، ابو العباس احمد بن محمد بن حمدان نیشاپوری، ابو بکر ابن ابی الحدید، ابو بکر بن مالک قطیعی، ابو محمد بن ماسی، ابو منصور ازہری، ابو سہیل بشر بن احمد، ابو محمد عبد الغنی ابن سعید ازدی مصری، عبد اللہ بن احمد بن صدیق، عبد اللہ بن عمر بن علق، ابو الحسن علی بن عمر دارقطنی، ابو علی محمد بن احمد بن حسین بن صواف، ابو عمرو محمد بن احمد بن حمدان، محمد بن جعفر بن بشیم بندار، ابو الفضل محمد بن عبد اللہ بن خمیر دیہ، محمد بن علی حسانی، ابو صخر محمد بن مالک، السعدی، ابو حاتم محمد بن یعقوب۔ (۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں ابو اسحاق شیرازی، امام بیہقی اور خطیب جیسے مشاہیر شامل ہیں،

(۱) کتاب الانساب ورق ۵۷ و ۵۸ مج ۲ ص ۱۳۱ (۲) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، کتاب

الانساب ورق ۵۷ و ۵۸ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۷۴ و الطبقات الکبری ج ۲ ص ۱۹۔

چند اور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابوطاہر احمد بن حسن کرجی، ابو عبد اللہ صوری، ابو الفضل بن خیرون، ابو القاسم بن ابو العلاء ابو المعالی ثابت بن بندار مقری، ابو مسعود سلیمان بن ابراہیم الحافظ، ابو یعلیٰ محمد بن احمد العبدی البصری، ابو الفضل محمد بن عبد السلام شافعی انصاری۔ (۱)

رحلت و سماع حدیث کی ابتدا: ۳۵۰ھ کے بعد انھوں نے حدیث کے سماع کی ابتدا کی اور اس کے بعد بغداد، جرجان، ہرات، دمشق، مصر، اسفرائن، مرو اور نیشاپور وغیرہ تشریف لے گئے اور ان مقامات کے اکابر شیوخ سے کسب فیض کیا، علم و فن کے اس قدر شوقین تھے کہ اس کے لیے ہر قسم کی صعوبت اور مشقت برداشت کرتے تھے، اسفرائن میں صرف ایک درہم ان کے پاس تھا، اسی پر پورا مہینہ گزار دیا، اور تیس جز کے بقدر حدیثیں لکھیں۔ (۲)

حفظ و ثقاہت: امام برقانی احادیث کے حافظ اور نہایت عادل و ضابط شخص تھے، خطیب کا بیان ہے کہ وہ ثقہ، متورع، متقن، معتبت اور ذی فہم تھے، ہمارے شیوخ میں ان سے زیادہ ثقہ و ثابت شخص کوئی نہیں تھا، میں نے ازہری سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے برقانی سے بڑھ کر متقن کسی شخص کو دیکھا ہے، انھوں نے جواب دیا نہیں، ابو الولید باجی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ حافظ تھے، ذہبی، ابن عساکر، ابن سبکی، اسنوی اور ابن عماد وغیرہ نے ان کو الحافظ الکبیر اور الحافظ الامام وغیرہ لکھا ہے۔ (۳)

فن حدیث میں امتیاز اور اس سے غیر معمولی اشتغال: امام برقانی نے اس فن کو اپنا اوڑھنا اور پچھونا بنالیا تھا، ان کا خود بیان ہے کہ مجھ کو اس فن سے اس قدر غیر معمولی لگاؤ ہو گیا تھا کہ اور چیزوں کی طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا، اسی لیے ان کا کتب خانہ حدیث کے کتابوں کا دفتر بن گیا تھا اور ان کو بیشمار حدیثیں بھی از بر تھیں، خطیب کا بیان ہے کہ وہ کثیر الحدیث تھے، اس سے اس فن میں ان کی عظمت اور بلند پائیگی کا اندازہ ہوتا ہے، تمام مورخین نے حدیث میں ان کی فہم و بصیرت، ژرف نگاہی اور علم و نظر کی وسعت کا اعتراف

(۱) تذکرہ ج ۳ ص ۲۴۴ و انسب سمعی درق ۷۵ (۲) ایضاً و المعراج ۲ ص ۱۵۶ (۳) حوالہ سابقہ۔

کیا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ برقانی حدیث کی اچھی فہم و بصیرت رکھتے تھے، ابن عساکر اور سمعانی کا بیان ہے کہ وہ حدیث کی فہم و معرفت میں ممتاز تھے، ابواسحاق شیرازی فرماتے ہیں کہ جب وہ اس فن کی جانب متوجہ ہوئے تو اس کے امام بن گئے، ذہبی نے ان کو شیخ بغداد اور شیخ الحمدین کا لقب دیا ہے، ازہری کا بیان ہے کہ برقانی امام حدیث ہیں اور ان کی وفات کے بعد اس فن کی عظمت شان باقی نہیں رہے گی۔ (۱)

تفسیر و قرآنیات: قرآن مجید کے حافظ اور علوم قرآنی کے واقف کار تھے۔ (۲)

فقہ: فقہ کے ماہر اور ممتاز فقیہ تھے، حدیث سے پہلے اس فن کی تحصیل شروع کی تھی اور اس موضوع پر بعض کتابیں بھی لکھیں۔ خطیب نے عارف بالفقہ، ابن کثیر نے عالم بالفقہ اور ذہبی نے شیخ الفقہا لکھا ہے، ابوبکر اعلیٰ اپنے پاس آنے والے طلبہ کے سامنے ایک ورق خود پڑھنے کے بعد ان سے پڑھواتے تھے لیکن برقانی کے سامنے دو ورق پڑھتے اور فرماتے کہ تم لوگوں پر ان کو اس لیے ترجیح دیتا ہوں کہ یہ فقیہ بھی ہیں، فقہ واجتہاد میں امام شافعی کے مذہب سے وابستہ تھے۔ (۳)

نحو و عربیت: وہ عربی ادب اور علم نحو میں اچھی دسترس رکھتے تھے۔ (۴)

شعر و سخن: شعر و سخن کا ذوق تھا اور کبھی کبھی اشعار کہتے تھے، خطیب نے ان کے آٹھ اشعار نقل کئے ہیں، (۵) ان کے شعروں سے بھی حدیث سے ان کی مناسبت کا پتہ چلتا ہے۔

ورع و تقویٰ: ان گونا گوں علمی کمالات کے ساتھ ہی وہ نہایت متدین اور بڑے عبادت گزار بھی تھے، خطیب کا بیان ہے کہ وہ صاحب ورع و تقویٰ تھے، میں نے محمد بن یحییٰ کرمانی فقیہ سے سنا ہے کہ حمدین کی جماعت میں برقانی سے زیادہ عبادت کرنے والا نہیں

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۳۶ (۲) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۷۵ و ۳۷۵ تاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۶۶

تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۷۵ و ۲۷۵ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۹ (۳) ایضاً (۴) تاریخ بغداد ج ۴

ص ۳۷۵ و ۳۷۶ (۵) ایضاً۔



دیکھا، ابن سبکی فرماتے ہیں کہ وہ مجموعہ فضائل اور عابد شخص تھے۔ (۱)

وفات: یکم رجب ۴۲۵ھ کو بدھ کے دن انتقال ہوا اور پنجشنبہ کو تدفین ہوئی، ابوعلی بن ابی موسیٰ ہاشمی نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور بغداد کے مقبرہ جامع میں باب سکہ خرقی کے قریب دفن کئے گئے۔

محمد بن علی صوری کا بیان ہے کہ میں برقانی کی وفات سے چار روز پہلے ان کی عیادت کے لیے گیا تو انھوں نے کہا آج ۲۶ جمادی الاخریٰ ہے، میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ رجب کا چاند ہونے کے بعد میرا خاتمہ ہو، کیوں کہ ایک روایت میں ہے کہ (ان اللہ عتقاء من النار) ممکن ہے اللہ کی رحمت سے میں بھی اس زمرہ میں شامل ہو جاؤں، یہ بات انھوں نے سنیچر کو کہی تھی اور اللہ کی شان دیکھئے کہ بدھ کو رجب کا چاند ہونے کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ (۲)

تصنیفات: برقانی نے علم حدیث میں کئی مفید کتابیں لکھیں، تذکرہ نگاروں نے ان کو کثیر التصانیف بتایا ہے اور لکھا ہے کہ وفات کے وقت تک وہ تصنیف و تالیف اور علمی اشتغال میں منہمک رہے، ان کی تصنیفات میں مسند مشہور ہے جو مسند خوارزمی کہلاتی ہے، مسند خوارزمی دراصل صحیحین کی حدیثوں پر مشتمل اور مستخرج ہے، (۳) حمیدی نے اپنی الجمع بین الصحیحین کے نقل میں اس کی حدیثوں پر اعتماد کیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ ۱۷۸ھ کا لکھا ہوا دارالعلوم اسلامیہ پشاور کے اور ایک یحییٰ بن ناصر کے ہاتھ کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں ہے۔ (۴)

مسند کے علاوہ انھوں نے امام ثوری، شعبہ، ایوب، سعید، عبد اللہ بن عمر، عبد الملک

بن عمیر، بیان بن بشر اور مطر الوراق کی حدیثوں کے جمع و تالیف کا کام انجام دیا۔ (۵)

(۱) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۷۵، ۳۷۶ (۲) ایضاً (۳) ایضاً والرسالة المسطرة ص ۲۷ (۴) لباب المعارف فہرست دارالعلوم پشاور ص ۵۲ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵ (۵) تاریخ بغداد و تاریخ ابن عمیر کے تذکرہ ذہبی۔

## امام ابو نعیم اصفہانی

(متوفی ۴۳۰ھ)

نام و نسب: احمد نام، ابو نعیم کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، احمد بن عبد اللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن وائل بن مہران۔

ولادت: رجب ۳۳۶ھ میں اصفہان میں پیدا ہوئے، ایک روایت ۳۳۳ھ کی بھی ہے۔  
 خاندان: گو نجم نژاد تھے تاہم ان کے خاندان کو خانوادہ نبوت سے ولایت کا شرف حاصل ہے، ان کے جد اعلیٰ مہران کو اس خاندان میں سب سے پہلے مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہوا، یہ عبد اللہ ابن معاویہ بن عبد اللہ بن جعفر بن ابوطالب کے مولیٰ تھے، ابو نعیم کے والد عبد اللہ علم و فن کے بڑے دلدادہ تھے، انھوں نے اپنے فرزند کو نہایت کم سنی ہی میں تحصیل علم اور سماع حدیث کے مقدس اور باہرکت مشغلہ میں لگا دیا تھا، چنانچہ ۳۴۴ھ میں ابو نعیم نے جب کہ سات یا آٹھ ہی سال کے تھے، احادیث کا باقاعدہ سماع شروع کر دیا تھا، ان کے نانا محمد بن یوسف بٹا مشہور زہاد اور ممتاز صوفی تھے۔ (۱)

اساتذہ: ابو نعیم کے اساتذہ اور تلامذہ دونوں کی فہرست بڑی طویل ہے، ار باب سیر کا بیان ہے کہ انھوں نے بیشار فضلا سے اور بے شمار فضلا نے ان سے استفادہ کیا تھا، حافظ ذہبی ان کے چند شیوخ کا نام گنانے کے بعد لکھتے ہیں:

وخلایق بخراسان والعراق (ان کے علاوہ) انھوں نے خراسان  
 فاکثرو تهیاء له من لقی وعراق کے بے شمار لوگوں سے کسب

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۱ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷۵۔

الکبار مالم یقع حافظ۔ (۱) فیض کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان کو جس قدر اکابر شیوخ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس سے اور محمدین محروم ہیں۔

ابونعیم کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ چھ سال کی عمر ہی میں بعض مشہور و معتبر محدثین نے تبرکاً ان کو اجازت حدیث مرحمت کر دی تھی۔ (۲) حافظ ذہبی اور علامہ ابن سبکی نے لکھا ہے کہ شام کے خیمہ بن سلیمان بغداد کے جعفر خالدی اور ابوسہل بن زیاد، واسط کے عبداللہ بن عمر بن شوزب اور نیشاپور کے ابوالعباس اصم نے ان کو اجازت عطا کی تھی۔ (۳) ان حضرات کے علاوہ ابونعیم نے مندرجہ ذیل شیوخ سے بھی روایت کی ہے۔

ابراہیم بن عبداللہ ابوالعزیم کوفی، ابواحمد محمد بن احمد بن عمال، ابوجبر بن کوشی، ابوبکر آجری، ابوبکر جعانی، ابوبکر بن خلاد نصیبی، ابوبکر بن یثم بندار، ابوشیخ بن حیان، ابوعلی بن صواف، ابوالقاسم طبرانی، ابومحمد بن فارس، احمد بن بندار عشار، احمد بن حسن مکی، احمد بن محمد قصار، احمد بن معبد سمسار، حبیب قزاز، عبداللہ بن جعفر جابری، عبداللہ بن حسن بن بندار فاروق بن عبدالکبیر خطابی۔ (۴)

تلامذہ: معاصرین و اقران کے علاوہ ان کے تلامذہ کی فہرست میں بے شمار ایسے لوگ بھی تھے جو سن و سال میں ان سے بڑے اور مدتوں پہلے فوت ہو چکے تھے، ابوعبدالرحمن سلمی نے جو اکابر صوفیہ میں اور ابونعیم سے معمر تھے، طبقات الصوفیہ میں ایک شخص کے واسطے سے ان سے روایت کی ہے چند تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر خطیب (یہ نہایت مخصوص تلامذہ میں تھے) ابوبکر بن علی ذکوانی، ابوسعید مالینی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۲ (۲) بستان الحدیث ص ۲۳ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۱ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷ (۴) ایضاً۔

ابوصالح موزن، ابوعلی المقری، ابوعلی وحشی، ابوالفضل احمد الحداد، ابوعلی حسن بن احمد حداد، سیمان بن ابراہیم، قاضی عبدالسلام بن احمد کوشیار بن لیا لیر وزجیلی، ابوبکر محمد بن ابراہیم نضار، ابومنصور محمد بن عبداللہ شروطی، ابوسعید محمد بن محمد بن مطرز، بہتہ اللہ بن محمد شیرازی، یوسف بن حسن تغلری۔ (۱)

رحمت و سفر: ان کے شیوخ مختلف اسلامی ملکوں اور شہروں سے تعلق رکھتے تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے عراق، حجاز، خراسان، شام، بغداد، واسط، نیشاپور، مکہ، بصرہ اور کوفہ وغیرہ کا سفر کیا ہوگا۔

حفظ وضبط اور ثقاہت: ابونعیم کے حفظ وضبط اور ثقاہت و عدالت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مورخین اور ارباب سیر نے ان کو الحافظ المشہور، الحافظ الکبیر اور من اکابر الحفاظ الثقات وغیرہ لکھا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ ابونعیم اور ابو حازم عبدوی، ہی کے لیے حفظ کا لفظ مطلقاً بولا جاسکتا ہے، ابن مردویہ فرماتے ہیں کہ اس وقت روئے زمین پر ابونعیم سے بڑا حافظ و مسند کوئی نہیں، وہ حافظ الدنیا ہیں، ابن سبکی تحریر فرماتے ہیں کہ وہ حفظ وضبط میں مرتبہ کمال پر فائز تھے۔ (۲)

ابونعیم صدق و ثقاہت میں بھی بلند پایہ تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ان کے بارے میں جو کچھ کلام کیا گیا ہے اس کی کوئی دلیل و بنیاد نہیں بلکہ اس کی تمام تر وجہ وہ خاصیت ہے جو ان کے اور ابن مندہ کے درمیان تھی۔ (۳)

حدیث میں درجہ و مرتبہ: وہ فن حدیث میں بڑا درخور رکھتے تھے، علمائے سیر نے ان کو محدث العصر اور من اعلام المحدثین والرواۃ کے لقب سے موسوم کیا ہے، ابن نجاد کا بیان ہے کہ ”وہ محدثین کے سر تاج اور اعلام دین میں تھے“ حدیث کی جمع و روایت کی طرح اس کی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۲ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۸ (۲) ایضاً تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵ (۳)

معرفت و درایت میں بھی شہرت و امتیاز رکھتے تھے، ابن سبکی کا بیان ہے کہ ”وہ ان ممتاز لوگوں میں تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے روایت میں علو کے ساتھ درایت میں بھی حد کمال پر فائز کیا تھا،“ حافظ ذہبی لکھتے ہیں ”وہ علوئے اسناد، حفظ حدیث اور جملہ فنون حدیث میں بحجر کے لحاظ سے پوری دنیا میں ممتاز تھے۔“ ابن عساکر فرماتے ہیں کہ ”ابو نعیم جمع و معرفت حدیث میں یکتا اور فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے۔“ (۱)

فقہ و تصوف میں بلند پایگی: حدیث کے علاوہ فقہ و تصوف میں بھی جامع کمال تھے (۲) اور مسلک شافعی تھے، تصوف و سلوک سے ان کی دلچسپی خاندانی تھی، ان کے نانا محمد بن یوسف کے متعلق پہلے گزر چکا ہے کہ وہ مشہور اہل اللہ اور اکابر صوفیہ میں تھے، ابو نعیم کو بھی اس میں کمال حاصل تھا، اس پر ان کی شہرہ آفاق کتاب حلیۃ الاولیاء شاہد ہے۔

عقیدہ: عقائد میں اشاعرہ کے ہم نوا تھے، حافظ ابن عساکر نے تبیین میں دوسرے طبقہ میں ان کا ذکر کیا ہے، (۳) حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ وہ اشعری مذہب کی جانب شدید میلان رکھتے تھے۔ (۴)

شہرت و مقبولیت اور مجلس درس کی وسعت: ابو نعیم کے علمی کمالات اور غیر معمولی فنی شہرت نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا، اس لیے ان کی مجلس درس بڑی وسیع تھی، لوگ دور دراز کا سفر کر کے ان کے پاس آتے، طلبہ کا جم غفیر ہر وقت استفادہ کے لیے موجود رہتا تھا، ہم عصر لوگوں کے علاوہ وہ لوگ بھی ان سے استفادہ کرنے کے لیے آتے تھے جو عمر میں ان سے بڑے تھے، ابن مردویہ کا بیان ہے کہ وہ ان فضلاء روزگار میں تھے جن کے پاس لوگ قصد و ارادہ سے سفر کر کے آتے اور مستفید ہوتے تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۱، ۲۹۲ و ۲۹۳ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۸۷ و تبیین کذب المفتری

ص ۲۳۶ و الفہر ج ۳ ص ۱۷۰ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷ (۳) تبیین کذب المفتری ص ۲۳۶ (۴)

المختصر ج ۸ ص ۱۰۰۔

لکھتے ہیں کہ جب ان کی مجلس درس آراستہ ہوتی تو ارباب فن اور محدثین عجز و نیاز کے ساتھ ان کے دولت کدہ پر حاضر ہو کر بڑی رغبت اور مکمل انہماک کے ساتھ اکتساب فیض کرتے تھے کیوں کہ ان کے علوے اسناد وجودتِ حفظ اور وفورِ علم کا چرچا تھا۔

درس کا سلسلہ صبح سے شروع ہو کر ظہر کے وقت تک جاری رہتا تھا اور مجلس درس ہمیشہ طلبہ و مستفیدین سے معمور رہتی تھی، روزانہ باری باری ایک شخص قرأت کرتا تھا، ظہر کے وقت جب مجلس برخاست ہوتی اور وہ گھر آنے لگتے تو شائقین راستے میں بھی ایک جزء کے بندر پڑھ لیتے تھے، اس سے ان کو کوئی آزر دگی اور ناگواری نہیں ہوتی تھی، کیوں کہ علم حدیث سے ان کا اشتغال اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ بقول حافظ ذہبی۔

لم یکن له عداہ سوى حدیثیں سنا اور سنانا اور ان کی جمع  
التسمیع والتصنیف۔ (۱) وتالیف ہی ان کی غذا تھی۔

ابونعیم کے خلاف شورش و ہجیان: اس زمانہ میں حنابلہ کا زور و اثر بہت بڑھ گیا تھا، ان کی سخت گیری اور تشدد کے بعض واقعات بھی تاریخوں میں مذکور ہیں، ان کے اور اشاعرہ کے درمیان سخت کشمکش اور آویزش رہتی تھی، اوپر گذر چکا ہے کہ ابونعیم کا میلان اشعریت کی جانب تھا، اس کے نتیجہ میں ان کے خلاف شورش و ہنگامہ برپا ہوا اور ان کو شدید و محن سے دوچار ہونا پڑا، محمد بن عبد الجبار فرسانی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ابو بکر بن ابی علی معدل کی مجلس درس میں ایک شخص نے کہا کہ ابونعیم کی صحبت میں جانے والوں کو یہاں سے اٹھ جانا چاہیے کیوں کہ وہ اپنے اعتقادات کی وجہ سے ان لوگوں میں غیر مقبول اور مغضوب تھے۔

ابونعیم کے خلاف اس قدر ہجیان برپا ہو گیا تھا کہ اہل صفہان نے ان کا جامع مسجد میں داخلہ تک بند کر دیا تھا، (۲) حنابلہ کی شدت پسندی کے علاوہ اس کا یہ سبب بھی ہو سکتا

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۲، گلستان الحدیثین ص ۴۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۲، ۲۹۳ و طبقات

ہے کہ ابو نعیم کے فضل و کمال اور غیر معمولی شہرت و مقبولیت نے ان کی ذات کو محسوس و مغضوب بنا دیا ہو۔

وفات: ۹۴ رسال کی عمر میں محرم الحرام ۳۳۰ھ میں انتقال کیا، ابن خلکان نے محرم کے بجائے صفر کا مہینہ لکھا ہے، تاریخ وفات ۱۸، ۲۰ اور بعض نے ۲۱ محرم الحرام لکھی ہے، ظہر کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی۔ (۱)

تصنیفات: ابو نعیم سے بے شمار کتابیں یادگار ہیں، جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

- ۱- کتاب الاربعین، ۲- تثبیت الروایا، ۳- جزء فضل سورة الاخلاص، ۴- کتاب حرمة المساجد، ۵- رسائل مختصرہ، ۶- ریاضة السعالمین یا ریاض السعالم، ۷- کتاب ریاضة والادب، ۸- کتاب صفة الجیز، ۹- کتاب الطب یا کتاب الطب النبوی، ۱۰- طرق حدیث (ان اللہ تسعدو تسعین اسماً)، ۱۱- عمل الیوم واللیلہ (۲)، ۱۲- کتاب الفتن (۳)، ۱۳- کتاب فضائل الخلفاء، ۱۴- کتاب فضائل الصحابہ، ۱۵- فضل السواک، ۱۶- کتاب فضل العالم العفیف، ۱۷- کتاب الفوائد، ۱۸- کتاب مختصر الاستیعاب، ۱۹- کتاب المستخرج علی البخاری، ۲۰- کتاب المعتمد، ۲۱- کتاب معرفة الصحابہ، ۲۲- کتاب معجم الشیوخ: ۳ جلدوں پر مشتمل تھی، ۲۳- کتاب معجم الصحابہ: حافظ ابن کثیر کے پاس اس کا ایک نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ (۴)

۲۴- کتاب علوم الحدیث: حاکم کی اصول حدیث میں مشہور تصنیف کتاب معرفة علوم الحدیث پر مستخرج ہے۔

۲۵- کتاب المستخرج علی التوحید: علامہ ابن خزیمہ کی مشہور کتاب التوحید

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۳، ۲۹۴ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۹ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵ و المختصر ج ۸ ص ۱۰۰ (۲) امام نسائی اور ان کے شاگرد ابن سنی کی بھی اس نام کی کتابیں ہیں (۳) کتاب الفتن والملامہ کے نام سے امام ابو عبد اللہ نعیم بن حماد خزاعی کی کتاب بہت مشہور ہے (۴) البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۴۵۔

والصفات پر مستخرج ہے۔

۲۶- کتاب المہدی: اس میں امام مہدی کے اوصاف وخصائص اور ان کے

خروج کی حقیقت وغیرہ کا ذکر ہے، حافظ ابن قیم کی بھی اس نام کی ایک کتاب ہے۔ (۱)

۲۷- کتاب تاریخ اصہبان: اصہبان کی تاریخ میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ ان

سب میں زیادہ اہم اور مشہور سمجھی جاتی ہے، اس کے قلمی نسخے مکتبہ شیخ الاسلام مدینہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد مکتبہ سندھیہ اور کتب خانہ رام پور میں موجود ہیں، رام پور کا مخطوطہ مکتبہ سندھیہ کے مخطوط سے منقول ہے۔ (۲)

یہ غیر مطبوعہ کتابوں کے نام تھے، ذیل میں مطبوعہ کتابوں کا مختصر تعارف اور ان کی

خصوصیات درج ہیں۔

۲۸- دلائل النبوة: اس کتاب میں وہ تمام واقعات وروایات سند بیان کی گئی ہیں

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص و کمالات اور فضائل و مکارم نیز دلائل نبوت اور معجزات وغیرہ سے متعلق ہیں، پہلے قرآن مجید کی روشنی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و خصوصیات بیان کئے گئے ہیں اور تائید میں روایات بھی پیش کی گئی ہیں، پھر آپ کے حسب و نسب کی فضیلت اور قدیم کتابوں اور انبیاء کے صحیفوں میں آپ کے بارے میں جو پیشینگوئیاں ہیں ان کو ذکر کیا ہے اور اس کے بعد آپ کی ولادت سے وفات تک کے تمام حیرت انگیز واقعات اور معجزات اور آپ کی پیشینگوئیاں اور امور غیب سے متعلق خبروں کا مفصل ذکر ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید اور خود آپ کی پاکیزہ

زندگی اور عمدہ سیرت و اخلاق تھے، ان دونوں کی حیرت انگیز تاثیر نے بے شمار لوگوں کے قلوب کو مسخر کر کے ان کو حلقہ بگوش اسلام کر دیا تھا، امام ابو نعیم نے اس طور پر ایمان لانے

(۱) روایات الجہنات ص ۶۷ وکشف الظنون ج ۲ ص ۳۰۴ (۲) تذکرۃ النوادر ص ۸۳۔



والے متعدد افراد کے مکمل واقعات تحریر کئے ہیں، اس حیثیت سے یہ صرف دلائل و معجزات نبوی ہی کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ عہد نبوی کے مختلف النوع اہم واقعات و حالات اور بعض غزوات و سرایا کا مکمل مرقع بھی ہے، مصنف نے بعض واقعات کی تفصیل اور ان کے دلائل و علامت کی نوعیت وغیرہ بھی بیان کر دی ہے اور بعض شبہات و اشکالات کو بھی رفع کیا ہے، آخر میں بعض مشہور انبیاء کے کرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا تقابلی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے، اس میں بعض جلیل القدر انبیاء کے خاص اور اہم معجزات کا تذکرہ کرنے کے بعد دکھایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی نوعیت کے معجزات عطا کئے گئے تھے۔ گو فنی حیثیت سے اس کی تمام حدیثوں اور روایتوں کا معیار یکساں نہیں ہے، تاہم اس کا شمار معتبر کتابوں میں ہوتا ہے اور اس کے اکثر اہم واقعات حدیث و سیر کی کتابوں میں موجود ہیں۔

دلائل النبوة کا پہلا ایڈیشن ۱۳۳۰ھ میں اور دوسرا زیادہ جامع اور مکمل صورت میں ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوا ہے، اس کی ترتیب و تصحیح میں بعض قلمی نسخوں کے علاوہ حدیث، سیر و تاریخ اور اسماء الرجال کی مشہور کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۲۹- حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیاء: یہ ابو نعیم کی سب سے مشہور و مقبول عمدہ اور بے نظیر کتاب ہے، علامہ ابن خاکان نے اس کو بہترین اور صاحب کشف الظنون نے عمدہ اور معتبر کتاب بتایا ہے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ ایسی عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی، علامہ ذہبی نے اس کو عدم النظیر کتاب بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ مصنف کی زندگی ہی میں اس کو پوری شہرت اور غیر معمولی حسن قبول و اعتبار حاصل ہو گیا تھا اور یہ اسی زمانہ میں جب نیشاپور پہنچی تو لوگوں نے چار سو دینار میں اسے خریدا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ اسلامیات میں ایسی نادر اور بے مثال کتاب نہیں لکھی گئی، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ اس سے مصنف کی وسعت نظر، ان کے شیوخ کی کثرت اور مخارج و طرق حدیث سے پوری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ طبقات صوفیہ میں یہ نہایت اہم اور عمدہ کتاب ہے، اس سے پہلے جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کو ایسی شہرت و قبولیت نصیب نہیں ہوئی، بعد کی کتابوں میں حافظ ابن جوزی کی صفوۃ الصوفہ گواہم اور مشہور کتاب ہے لیکن دراصل اس کی بنیاد و ماخذ یہی ہے۔

حلیۃ الاولیاء میں ان صحابہ کرم، تابعین عظام، تبع تابعین اور مابعد کے ائمہ اعلام و متقین کا ذکر ہے جو زہد و سنک اور معرفت و تصوف میں ممتاز اور صاحب کمال تھے، مصنف نے ان بزرگوں کے فضائل و مناقب خصوصاً ان کے زہد و سنک سے متعلق واقعات و حکایات جمع کر کے ان کا تصوف میں درجہ و مرتبہ بھی دکھایا ہے اور ان سے مروی حدیثیں اور ان کے عارفانہ اقوال و ملفوظات بھی درج کئے ہیں، پہلے خلفائے اربعہ اور بقیہ صحابہ مبشرہ اور ان کے بعد دوسرے عارف و زاہد صحابہ کرام کا تذکرہ ہے، پھر اصحاب صفہ اور عابدہ و زاہدہ صحابیات کا علاحدہ علاحدہ ذکر ہے، صحابہ کے بعد تابعین و تبع تابعین وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں اولیاء اللہ کے فضائل و محامد، ان کے اوصاف و کمالات اور تصوف کی حقیقت وغیرہ پر لطیف بحث ہے، اصحاب فن نے اس کے طول اسناد، روایات و حکایات کے تکرار اور موضوع سے غیر متعلق بعض چیزوں کے ذکر کئے جانے پر نقد کیا ہے (۱)، اس میں امام ابو حنیفہ کا تذکرہ شامل نہ کئے جانے کی وجہ سے ان پر تعصب کا الزام عائد کیا گیا ہے، علاوہ ازیں یہ صحیح، حسن، ضعیف اور بعض موضوع روایتوں پر بھی مشتمل ہے۔ (مستطرفہ ص ۱۱۵)

حلیۃ الاولیاء کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ بعد میں لکھی جانے والی اکثر کتابوں کا یہی ماخذ ہے اور اس کے زوائد و مختصرات بھی لکھے گئے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- ابوالحسن نور الدین ہنشی نے حدیث کی متعدد کتابوں کی طرح اس کے زوائد

بھی ایک ضخیم جلد میں جمع کئے تھے۔ (۱)

۲- ابوالفرج عبدالرحمن بن علی جوزی (م ۵۹۷ھ) نے صفوۃ الصفوہ کے نام سے اس کا نہایت عمدہ اختصار اس طرح کیا ہے کہ وہ مستقل کتاب ہو گئی ہے، اس میں انھوں نے ابو نعیم پر نقد و تعقب بھی کیا ہے، اس کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، اس کا بھی احاسن الحاسن کے نام سے اختصار کیا گیا تھا۔ (۲)

۳- محمد بن حسن شافعی (م ۷۷۶ھ) نے مجمع الاخبار فی مناقب الاخیار کے نام سے اختصار کیا اس میں نہ حلیہ کی طرح زیادہ طوالت ہے اور نہ صفوہ کی طرح زیادہ اختصار، اس کی ترتیب میں حلیہ کا تتبع کیا گیا ہے اور بعض تراجم کا اضافہ بھی ہے۔

ابن مرزوق ابوالمعالی سعد بن علی وراق خطیری (م ۵۲۸ھ) نے بھی مختصرات

لکھے تھے۔ (۳)

ابو نعیم پر بعض اعتراضات: امام ابو نعیم پر بعض اعتراضات بھی کئے گئے ہیں گو یہ زیادہ اہم نہیں ہیں، تاہم ان کا ذکر کیا جاتا ہے، ان پر سب سے اہم اعتراض تسابیل کا عائد کیا گیا ہے، خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ ”میں ان میں تسابیل کی بعض چیزیں پاتا ہوں، جیسے اجازت کے سلسلہ میں ان کا تسابیل اور مسموع کو مجاز سے ممیز و واضح نہ کرنا۔ عبدالعزیز نخعی کا بیان ہے کہ ”ابوبکر بن خالد سے حارث بن ابی اسامہ کی مکمل مسند کا سماع نہ کرنے کے باوجود وہ اس کے تمام حصوں کی روایت کرتے تھے۔“ (۴) حافظ ذہبی نے ان بیانات کا جائزہ لے کر ان کی مکمل تردید کی ہے۔ (۵)

۲- ابو نعیم پر ان کے معاصر اور بلند پایہ محدث امام ابو عبداللہ بن مندہ نے سخت

(۱) تدریب الراوی ص ۲۹ و المسطر ذہ ص ۱۳۱ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۳۵۲ و ۳۵۳ (۳) کشف

الظنون ج ۲ ص ۳۸۱ و ۳۰۹ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۳ و ۲۹۵ و المنتظم ج ۸ ص ۱۰۰ و البدایہ و النہایہ

ج ۱۲ ص ۲۵ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۳۔

تفہید یں کی ہیں لیکن محدثین اور علمائے فن نے ان کو معاصرت پر جو منافرت کی اصلی بنیاد ہے، محمول کر کے ان کو ناقابل اعتنا قرار دیا ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

”ان دونوں بزرگوں میں باہم رنجش تھی، اس لیے ابو نعیم پر ابن مندہ کی تفہید لائق التفات نہیں ہو سکتی، وہ ان علمائے اعلام اور ثقہ و معتبر لوگوں میں تھے جن پر دلیل و حجت کے بغیر ہی کلام کیا گیا ہے، غالباً ابن مندہ کی تفہید کی وجہ یہ ہے کہ خود ابو نعیم نے بھی ان پر تفہید کی ہے۔“ (۱)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

”گواہن مندہ کے اعتراضات نہایت سخت ہیں مگر ان دونوں میں کسی کی بات بھی دوسرے کے حق میں قابل قبول نہیں ہو سکتی، دونوں کے اعتبار و وثوق میں کلام نہیں لیکن معاصرین کی ایک دوسرے پر نکتہ چینی قابل اعتنا نہیں ہوتی کیوں کہ وہ حسد و عداوت پر مبنی ہوتی ہے، انبیا و صدیقین کے علاوہ کسی زمانہ کے لوگ بھی اس فتنے سے محفوظ نہیں رہے۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا  
خداوند! تو ایمان والوں کے لیے ہمارے  
لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوفٌ  
دلوں میں کھوٹ نہ بنائیو، خداوند! تو بڑا  
رَحِيمٌ۔ (۲)

مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

۳- صاحب روذات الجنات نے شیعیت کو بھی ان کی جانب منسوب کیا ہے (۳) لیکن اس بیان میں وہ منفرد ہیں، علاوہ ازیں وہ خود بھی اسی مسلک سے وابستہ تھے، اس لیے ان کا بیان صحیح نہیں ہو سکتا، ابو نعیم کی کتابوں سے بھی اس کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی۔

(۱) میزان الاعتدال ج ۱ ص ۶۵۲ (۲) لسان المیزان ج ۱ ص ۲۰۱، ۲۰۲ (۳) روذات ص ۷۶۔

## ابو محمد حسن خلّال

(م ۳۳۹ھ)

نام و نسب: حسن نام، ابو محمد کنیت اور خلّال لقب ہے، نسب نامہ یوں ہے: حسن بن محمد بن حسن بن علی۔ (۱)

ولادت: ۳۵۲ھ میں پیدا ہوئے۔

وطن: دارالسلام بغداد کو ان کے مولد و منشا ہونے کا فخر حاصل ہے، شروع میں ان کا قیام یہاں کے ایک مشہور اور بڑے محلہ نہر القلائین میں تھا لیکن بعد میں باب البصرہ میں منتقل ہو گئے تھے۔ (۲)

اساتذہ: خلّال کے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر بن شاذان، ابوبکر قطیبی، ابوبکر وراق، ابوالحسن بن لوّ لوّ وراق، ابوالحسین بن مظفر ابوسعید حرقی، ابوعبداللہ بن عسکری، ابو عمر بن حیویہ، ابوالفتح قواس، ابوحفص عمر بن محمد زیات، ابوعلی محمد بن احمد عطسی۔

تلامذہ: بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر خطیب، ابوالحسین بن طیوری، ابوسعید احمد بن طیوری، جعفر بن احمد سراج، جعفر بن محسن سلماسی، علی بن احمد دینوری اور معمر بن ابی عمامہ الواعظ وغیرہ۔ (۳)

حفظ و ثقافت: خلّال حدیث کی معرفت، اس کے حفظ و ضبط اور عدالت و ثقافت میں

(۱) تذکرہ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۷ و المختصر ج ۸ ص ۳۲۲ و بستان المحمدین ص ۹۵ (۲) ایضاً (۳) ایضاً۔

ممتاز تھے، خطیب کا بیان ہے کہ ہم نے خلال سے روایتیں نقل کی ہیں، وہ ثقہ و ضابط اور معرفت حدیث میں ممتاز تھے، ابن جوزی لکھتے ہیں وہ ثقہ اور عادل تھے اور حدیث کے معاملہ میں واقف کار اور بیدار مغز تھے، محمد بن علی صوری سے مروی ہے کہ میری آنکھوں نے عبدالغنی بن سعید کے بعد ابو محمد خلال بغدادی سے بڑھ کر حدیثوں کا حافظ نہیں دیکھا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ:

”در حفظ حدیث سرآمد ابنائے وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں حفظ روزگار بود۔“  
حدیث کے لحاظ سے نہایت فائق و برتر

تھے۔ (۱)

وفات: ۸۷ سال کی عمر میں جمادی الاولیٰ ۳۳۹ھ میں خلال کی وفات ہوئی اور باب حرب کے مقبرہ میں دفن کئے گئے۔ (۲)

تصنیفات: ۱- خلال کی تصنیفات میں ان کی مسند زیادہ مشہور ہے، یہ دراصل صحیحین پر مستخرج ہے۔ (۳)

حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

خرج المسند علی  
الصحیحین وجمع ابوابا  
و تراجم کثیرة۔ (۴)

۲- کرامت اولیا: شاہ عبدالعزیز صاحب نے خلال کی تصنیفات میں اس کا

بھی ذکر کیا ہے۔ (۵)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۷ والنظم ج ۸ ص ۱۳۲ وبتان الحدیثین ص ۹۵ (۲) ایضاً (۳) الرسالة  
المسطر ذم ۲۷ (۴) العمر ج ۳ ص ۱۸۹ (۵) بتان الحدیثین ص ۹۵۔

# امام ابو عبد اللہ قضاعی

(التونی ۴۵۴ھ)

نام و نسب: محمد نام، ابو عبد اللہ کنیت، شہاب الدین لقب اور نسب نامہ یہ ہے: محمد بن سلامہ بن جعفر بن علی بن حکمون بن ابراہیم بن محمد بن مسلم۔ (۱)

وطن و خاندان: قبیلہ بنو قضاعہ سے جو معد بن عدنان یا حمیر کی شاخ ہے خاندانی تعلق اور مصر وطن تھا، خاندان کی نسبت سے قضاعی کہلاتے تھے، سمعانی کا بیان ہے کہ اس نسبت سے بے شمار لوگ مشہور ہیں، متاخرین میں امام ابو عبد اللہ قضاعی کا نام قابل ذکر ہے۔ (۲)

اساتذہ و شیوخ: امام قضاعی کے چند اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن بن جہضم، ابو عبد اللہ تمیمی، ابو محمد بن نحاس، احمد بن برہال، احمد بن

عمر حیرى، ابو مسلم محمد بن احمد کاتب۔ (۳)

تلامذہ: ان سے استفادہ کرنے والوں میں ابو بکر خطیب، ابونصر بن ماکولا اور حمیدی صاحب الجمع بین الصحیحین جیسے مشاہیر ارباب کمال کے علاوہ ابو عبد اللہ رازی، سہیل بن بشر اسفرائینی، ابوسعید عبدالجلیل نیشاپوری اور محمد بن برکات سعید وغیرہ شامل ہیں، سمعانی کہتے ہیں، ابو بکر محمد بن عبد الباقی انصاری نے امام قضاعی سے اجازت روایت کی ہے۔ (۴)

رحلت و سفر: طلب علم کے لیے ان کے سفر کا حال معلوم نہیں ہو سکا لیکن وہ مصریوں کے سفیر کی حیثیت سے روم تشریف لے گئے تھے، ابن سبکی لکھتے ہیں کہ یہ عجیب لطف کی بات

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۳ (۲) ایضاً و کتاب انساب ورق ۴۵۷ (۳) ایضاً (۴) ایضاً و طبقات

رتذکرۃ المحدثین..... گلستان حدیث کے ہسکتے گلابوں کا ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

670

ہے کہ اس سفر میں ان کی قسطنطنیہ میں ایک شیخ سے ملاقات ہوئی، ان سے انھوں نے سماع و روایت کی۔ (۱)

حدیث: علمائے سیر نے لکھا ہے کہ وہ صاحب کمال محدث تھے، سلفی کا بیان ہے کہ وہ ثقات و اثبات میں تھے۔ (۲)

فقہ: فقہ میں زیادہ دستگاہ رکھتے تھے، ان کا فقہائے شافعیہ میں شمار ہوتا ہے، فقہ میں کمال کی بنا پر وہ عہدہ قضا پر فائز تھے۔

تاریخ و تراجم: حدیث و فقہ کی طرح تاریخ و طبقات اور رجال پر بھی اچھی نظر تھی، ان فنون میں ان سے بعض کتابیں یادگار ہیں۔

فضل و کمال: ابن ماکولا کا یہ بیان تمام ارباب سیر نے ذکر کیا ہے کہ وہ متعدد علوم میں جامع تھے، میں نے مصر میں ان کے پایہ کا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ (۳)

عہدہ قضا: اپنے فضل و کمال کی وجہ سے وہ مصر کے قاضی مقرر کئے گئے اور پھر ترقی کر کے قاضی القضاة ہو گئے۔

امامت و مقبولیت: علمائے انساب و طبقات نے ان کو امام لکھا ہے اور ابن سبکی نے مرضی الجملہ کہا ہے، اس سے ان کی مقبولیت و محبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ (۴)

مسلک: اوپر گزر چکا ہے کہ وہ فقہائے شافعیہ میں تھے، ابن سبکی نے اسی حیثیت سے طبقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

وفات: انھوں نے ۳۵۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، ابن خلکان نے ۱۶ رذو وقعدہ اور سیوطی نے ۱۷ رذو وقعدہ تاریخ وفات لکھی ہے، مگر شاہ عبدالعزیز صاحب نے ذی الحجہ کا مہینہ بتایا ہے، وفات مصر میں، جمعرات کو ہوئی اور جمعہ کے دن عصر بعد مصلیٰ نجار میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ (۵)

(۱) طبقات سبکی و ابن خلکان ج ۲ ص ۲۳۳ (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) ایضاً (۵) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۳۴

حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۶۹ و بستان المحدثین ص ۸۳۔



تصنیفات: امام قضاعی کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں:

شہاب الاخبار: اس کا پورا نام شہاب الاخبار فی الحکم والامثال والاداب من الاحادیث النبویہ ہے، یہ کتاب مسند قضاعی اور الشہاب الموعظ والاداب کے نام سے بھی موسوم ہے۔ اس میں حکم وامثال، وصایا واداب اور موعظ وغیرہ سے متعلق ایک ہزار چھوٹی چھوٹی حدیثیں بلا سند نقل کی گئی ہیں اور خاتمہ میں ادعیہ کے متعلق دو سو کلمات حدیث درج کئے گئے ہیں، یہ کتاب دس جزوں پر مشتمل اور کلمات حدیث پر مرتب کی گئی تھی لیکن حروف میں ترتیب کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے، اس عمدہ اور لطیف کتاب کی کئی شرحیں اور خلاصے لکھے گئے ہیں اور بعض علمائے توبعینہ اسی طرز پر اپنی کتابیں مرتب کی ہیں، ان کتابوں میں فردوس الاخبار دلیلی، مشارق الانوار صفائی اور جامع صغیر سیوطی بہت مشہور ہیں، شرحوں اور مختصرات کے نام یہ ہیں:

۱- شیخ نجم الدین الغیثی، محمد بن احمد بن اسکندری (م ۹۸۴ھ) نے شہاب کا خلاصہ کیا۔

۲- ابن اثیر نے ضوء الشہاب کے نام سے مختصر لکھا۔

۳- امام حسن بن محمد صفائی (م ۶۵۰ھ) نے مشارق کی طرح کشف الحجاب عن احادیث الشہاب کے نام سے بھی اس کی عمدہ ترتیب کی۔

۴- امام سیوطی نے جامع صغیر کی ترتیب پر ایک اور کتاب اسعاف الطلاب بترتیب الشہاب کے نام سے لکھی جو اس کا خلاصہ تھی۔

۵- ابوالمظفر محمد بن اسعد معروف بابن حکیم خنی (م ۵۶۷ھ) نے شہاب کی شرح کی۔

۶- شیخ عبدالرؤف منادی نے ایک مزوج شرح لکھی، اس کا نام رفع العقاب عن کتاب الشہاب ہے، یعنی نے امعان الطلاب بشرح ترتیب الشہاب نام بتایا ہے لیکن بعض

فہرستوں میں اسعاف الطلاب بترتیب الشہاب بھی نام درج ہے۔  
 ۷۔ وحشی محمد بن حسین موصلی کی شرح کا ابراہیم بن عبدالرحمن وادیسی (۵۷۰ھ) نے خلاصہ کیا۔

۸۔ استاد ابوالقاسم بن ابراہیم وراق عالی نے بھی ایک شرح لکھی۔  
 ۹۔ ایک شرح کا نام حل الشہاب ہے۔  
 ۱۰۔ صاحب کشف الظنون نے ایک اور شرح کا بھی ذکر کیا ہے مگر اس کا اور شارح کا نام نہیں لکھا ہے۔ (۱) شہاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیوہ مصر میں ہے۔ (۲)  
 ۲۔ نخط مصر: اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، پہلی کتاب ابو عمر محمد بن یوسف کندی کی اور دوسری قضاعی کی بتائی جاتی ہے۔  
 ۳۔ دستور الحکم۔

۴۔ مختصر التاریخ: یہ تراجم القضاعی کے نام سے بھی مشہور اور پانچ جزوں پر مشتمل ہے اس میں مصنف نے ابتدا سے اپنے دور تک کے حالات اختصار کے ساتھ تحریر کئے ہیں۔

۵۔ کتاب الانباء عن الانبیاء وتواریخ الخلفاء: نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں انبیاء و خلفاء کے حالات و واقعات درج ہوں گے۔  
 ۶۔ کتاب مناقب الشافعی واخبارہ۔  
 ۷۔ معجم الشیوخ۔

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۷۲ و الرسالة المسطر ذہ ص ۶۳ (۲) فہرست کتب خانہ خدیوہ مصر ج ۱





## گلستانِ حدیث کے مہکتے گلاب

کیا ہی شاندار اور قابل رشک زندگیاں تھیں ان جلیل القدر اور قسمت کے ذہنی انسانوں کی! کہ جنہوں نے اپنی زندگی کا محور و مرکز حدیث رسول مقبول ﷺ کو بنائے رکھا۔ ان کی جنسیں اور شاہیں قَسَالَ قَسَالَ رَسُولُ السَّلَہِ کی دلنواز صداؤں میں بسر ہوئیں۔ رسول اللہ سے عملی محبت کا ثبوت یہ ہوتا کہ ان کو آپ کے فرامین بعد سند سینکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں حفظ ہوتے۔ دنیا ان کے حافظے سے انگشت بدنداں تھی، وہ حدیث رسول کی تلاش و جستجو میں قریہ بستی بستی چلے پھرتے، جہاں سے حدیث رسول اور فرمان رسول، حکم رسول ملتا تحقیق تفتیش کے بعد اسے محفوظ کر لیتے اور امت محمدیہ تک آپ کے فرامین پہنچانے کا بندوبست کرتے۔ یوں جستجوئے حدیث میں ان کی زندگیاں گزر جاتیں اور وہ امت محمد کے ہاتھوں میں فرامین رسول کا گرانقدر مجموعہ دے کر اگلے جہان جا پہنچتے۔ ان کی زندگیوں کا لمحہ لمحہ اس شعر کا مصداق ہوتا:

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم

إلا حدیث یار را نکھار می کنیم

گلشنِ حدیث کے ان مہکتے گلابوں کی خوشبو سے امت محمدیہ کے ہر ہر فرد کی سانسیں مہکی ہوئی ہیں۔ ان رجالِ عظیم کی زندگیاں کیسے اور کن عظیم کاموں میں گزریں۔ انہوں نے آقائے دو جہاں سے عملی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے خدمتِ حدیث کے لیے کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ محدثین کرام کی زندگیوں کے روشن مگر پردہ اخفا میں سہرے گوشوں کو آشکار کرنے اور آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

محمد طاہر نقاش

دارالابلاغ



کتاب و سنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ